# ادب اور احتجاج نمبر

مدیر: انیس امروہوی

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

قصے کہتے رہو، تا کہ لوگ کچھ تو غور و فکر کریں۔

القرآن الحکیم

سُورۃُ الأعراف

تم نے اس سلسلۂ طباعت کا نام قصے رکھ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ افسانہ، داستان اور ناول یہ سب حقائق زندگی اور تجربات و مشاہدات کے قلمی ذکر و بیان ہوتے ہیں، مگر قصہ کسی غیر حقیقی تخلیق کی یا طبع زار داستان سرائی کا پیداوار نہیں ہوتا۔ قصہ مجرد اور حقیقی ہوتا ہے۔ اسی لیے اقبالؔ نے اپنے لکچر میں قصص قرآنی کی اصطلاح استعمال کی ہے، یعنی وہ قصے جو قرآن جیسی معتبر، منفرد اور آسمانی کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تخیل کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ شخصیت کے قالب پر منڈھے ہوئے حالات ہیں۔ ہر کردار زندہ کردار ہے، خواہ وہ حضرت ابراہیمؑ کا ہو یا حضرت عیسیٰؑ کا۔ ان انفرادی تراجم حیات کے علاوہ قرآن میں مختلف اقوام کے وارداتِ حیات کو اشارات اور بلاغت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قصے عملی زندگی کے چاک پر اترے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔ حکایت، افسانہ، ناول یہ سب کسی مصنف کے ذہن کی پیداوار اور استنباطی ہوتے ہیں۔ یعنی چند مشاہدات کو فسانہ طراز کے قالب میں ڈھال کر نتائج کا استنباط کیا جاتا ہے۔

دعاگو

(حکیم) کلب شاہد امروہوی


فخریہ پیش کش

**تخلیق کار پبلشرز**

104/B۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

مثبت تخلیقی رویوں کا عکاس کتابی سلسلہ

ماہنامہ قصے دہلی

مدیر — انیس امروہوی

معاون مدیر — مسعود التمش

خصوصی شمارہ — ادب اور احتجاج نمبر

سرورق — نسیم امروہوی

قانونی مشیر — ناصر عزیز ایڈوکیٹ

کمپوزنگ — لیزر پوائنٹ 1710- کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

جلد : ۱۴

شمارہ : ۲۔ فروری ۲۰۰۰ء

عام شمارہ : ۲۵/روپے

زر سالانہ : ۲۵۰/روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے : ۳۰۰/روپے

بیرونی ممالک سے

فی شمارہ : ۵/امریکی ڈالر

زر سالانہ : ۶۰/امریکی ڈالر

ISBN-81-87231-24-6

ہمارے تقسیم کار:

- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۶
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۶
- اہلووالیہ بکڈپو، ۹۹۸۸/۴۵۔ نیو روہتک روڈ، دہلی۔ ۵
- نصرت پبلشرز، امین آباد پارک، لکھنؤ (یو۔ پی)
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (یو۔ پی)
- سینٹرل نیوز ایجنسی، کناٹ پلیس، نئی دہلی۔ ۱

اس شمارے کی قیمت : ۹۰/روپے



رابطہ : 104/B، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

Ph: 2442572



ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر انیس امروہوی نے شکتی پرنٹرس، انصاری روڈ، دریا گنج سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ قصے 104/B- یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲ سے شائع کیا

# اردو اکادمی، دہلی کی چند اہم مطبوعات

## گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

**اردو مابعد جدیدیت: ایک مکالمہ**

مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۱۸۰ روپے، صفحات ۵۴۴

**اٹل بہاری باجپئی کی نظمیں**

پیش کش: اردو اکادمی، دہلی

قیمت: ۵۰ روپے، صفحات: ۱۳۲

**ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت اور کارنامے**

مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۷۰ روپے، صفحات ۲۳۲

**میلوں لمبا پُل**

مصنف: راجی سیٹھ، قیمت: ۴۰ روپے، صفحات: ۱۳۶

**اس آباد خرابے میں (خود نوشت سوانح عمری اخترالایمان)**

قیمت: ۶۰ روپے، صفحات ۲۴۴

**زمستاں سرد مہری کا**

اخترالایمان کا آخری مجموعہ کلام، قیمت: ۳۵ روپے، صفحات ۱۲۸

**فراق گورکھپوری: ذات و صفات**

مرتب: مخمور سعیدی

قیمت: ۶۰ روپے، صفحات: ۲۰۸

**ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعرا**

مرتبین: پروفیسر گوپی چند نارنگ، عبداللطیف اعظمی

قیمت: ۲۰۰ روپے، صفحات ۷۱۴

**کلیات مکاتیب اقبال (جلد چہارم)**

مرتب: ڈاکٹر سید مظفر حسین برنی

قیمت: ۲۵۰ روپے، صفحات ۱۲۰۸

**مضامین نہرو**

مرتب اور مترجم: آنند نرائن ملا

قیمت: ۴۰ روپے، صفحات ۱۸۰

**رسوم دہلی**

مصنف: سید احمد دہلوی، مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم

قیمت: ۲۸ روپے، صفحات ۲۰۸

**واقعات دارالحکومت دہلی (تین جلدوں میں)**

مصنف: مولوی بشیرالدین احمد، قیمت ۶۰۰ روپے (مکمل سیٹ)

صفحات ۲۸۷۶ (دوسرا ایڈیشن)

**ہندی اسلامی فن تعمیر (دو جلدوں میں)**

مرتب: صبہا وحید، قیمت: ۲۰۰ روپے، صفحات ۵۷۸

**حواشی ابوالکلام آزاد**

مرتب: سید مسیح الحسن، قیمت: ۶۵ روپے، صفحات ۵۷۹

**عالم میں انتخاب دلی**

مصنف: مہیشور دیال

قیمت: ۷۰ روپے، صفحات ۵۳۱ (تیسرا ایڈیشن)

**مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین**

مرتب: ڈاکٹر اسلم پرویز، قیمت: ۴۰ روپے

صفحات ۲۷۵ (تیسرا ایڈیشن)

**مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب**

مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت: ۳۱ روپے، صفحات ۲۹۶

**داغ دہلوی حیات اور کارنامے**

مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت: ۵۰ روپے

صفحات ۲۳۷ (دوسرا ایڈیشن)

## احتجاج اوّل

کارگل کے اُن شہیدوں کے نام

جو

دو ملکوں کی

گندی سیاست

کی

بھینٹ چڑھ گئے

○○

# ترتیب

**ادب اور احتجاج**

## اس شمارہ میں

# صدی کے آخر میں ایک مکالمہ قاری سے

**صدی** کے آخر میں اس رسالہ کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ لکھنے والوں پر لکھنے والے یعنی نقاد حضرات نے گوگول کی طرح اصل گیند اٹھا کر اپنی جیب میں ڈالی ہے۔

اصل ہم ہیں ـــــ

بہتر ہم ہیں ـــــ

یعنی پروڈکٹ اہم نہیں رہا، تخلیق اہم نہیں رہی، تھیوری اہم نہیں رہی، فلسفہ اہم نہیں رہا۔ اب ہر کام کرنے والے، تخلیق سے اپنی روزی روٹی کا انتظام کرنے والے نقاد اچانک چند برسوں میں سب سے اہم ہو گئے۔

جو تخلیق کار نہیں ہیں انہیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی ان کا سارا تام جھام بغیر سوچے سمجھے چل رہا ہے ـــــ وہ نقادوں کے بھی چہیتے ہیں، ادب میں بھی سربلند ہیں، انعامات و اعزازت سے بھی ان کے دامن بھرے جا رہے ہیں۔

سوچنا تخلیق کار کو ہے جو صرف لکھنا جانتا ہے۔ لکھنے کے علاوہ ایسا کوئی تام جھام وہ نہیں جانتا۔ اس کا کوئی P.R.O بھی نہیں ہے۔ ایسا کیونکر ہو رہا ہے کہ تخلیق پر تنقید حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ لکھنے والے سے لکھنے والے پر لکھنے والا بڑا ہوتا جا رہا ہے۔

آپ چاہے اس کا نتیجہ جو بھی نکالیں لیکن اس المیہ کو صرف ایک جملے میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ یعنی

ـــــ لکھنے والے کو اپنے لکھے پر اعتماد نہیں رہا۔

یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کے لیے وہ نقاد کا سہارا لینے پر مجبور ہوا۔ لیکن ذرا سوچیے، یہ اعتماد کی کمی اس کے اندر کیوں آئی؟ جواب تفصیل طلب ہے اور اس کے لیے ہر فنکار کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت پڑے گی۔

☆☆

یہ شمارہ **ادب اور احتجاج** کے نام ہے۔ میری ادنیٰ سی رائے میں ادب بذات خود

احتجاج کا نام ہے، آج کی فضا میں ہمارے ملک کے بیشتر لکھنے والوں کو قلمی اور عملی طور پر یہ رویہ اپنانا چاہئے تھا۔ مگر افسوس، مشینی عہد میں احتجاج کا یہ جذبہ بھی سو چکا ہے۔ ہمارا یہ احتجاج آج کے ادب کے لیے بھی ہے، مذہب کے لیے بھی ہے، بے راہ روسیاست کے لیے بھی، نیوکلیائی تجربوں کے لیے بھی ہے، اور سارے معاشرے میں پھیلی اشانتی کے خلاف بھی ہے۔

☆☆

ہمیں بہر حال خود کو زندہ رکھنا ہے۔ سب کچھ ہم تھوڑی سی خوشی کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی سی خوشی کو پانا کتنا مشکل کام ہو گیا ہے۔

یہ شمارہ اس ناآسودگی کے نام بھی ایک احتجاج ہے، کاش کہ ادب میں بھی اس گمشدہ محبت کی بازیافت ہو سکے، اور حقیقی زندگی میں بھی۔

☆☆

آج جب کہ ساری دنیا میں تناؤ اور رسہ کشی کی فضا عام ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اس احتجاج کو سنہری اور جلی حرفوں میں پڑھا جائے اور یہ عالمی انسانیت کی کتاب میں درج ہو۔

☆☆

ساہتیہ اکادمی کے اصول و ضوابط کے مطابق انعام کے لیے زیر غور کتاب میں کم از کم ساٹھ فیصد تخلیقات تازہ ہونی چاہئیں جو، مصنف کی کسی دوسری کتاب میں شامل نہ ہوں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ "آس" کی تقریباً ۸۰ فیصد غزلیں بشیر بدر کے مجموعہ ہائے کلام اکائی، امیج، آمد، اور آسمان، سے لی گئی ہیں۔ پھر بھی "قصے" کی جانب سے ہم بشیر بدر کو ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازے جانے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کاش یہ انعام انہیں تب ملا ہوتا جب وہ واقعی اچھی شاعری کر رہے تھے۔

☆☆

آج جبکہ پوری دنیا "فاصلہ نما" (ٹیلی وژن) کے زیر اثر ہے اور الیکٹرانک میڈیا کو سب سے طاقتور بنا دیا گیا ہے، انتہائی افسوسناک بات ہے کہ ابھی تک اردو والوں نے اردو چینل کا کوئی اہتمام نہیں کیا ہے۔ گزشتہ دنوں بڑے زور شور سے اردو کے فلک چینل کا ذکر ہوا تھا مگر وہ بھی اردو کے دوسرے پروگراموں کی طرح خواب و خیال ثابت ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اردو والے مکمل طور پر اردو چینل چلانے کا خیال فی الحال ملتوی کر کے صرف چند

گھنٹوں کے لیے ہی کسی دوسرے چینل پر چینگ خرید لیں۔ یہ طریقہ کارگر بھی ہو سکتا ہے اور ممکن بھی۔ فاصلہ نما پر مختلف چینلوں پر جو پروگرام پیش کئے جارہے ہیں، ان کی زبان تقریباً ۸۰ رفیصد اردو ہی ہے، مگر انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ مکمل طور پر اردو کے پروگرام نشر کرنے سے لگ بھگ تمام چینل ہی گریز کررہے ہیں۔ حال ہی میں ذی چینل نے ہندوستان کی کئی صوبائی زبانوں کے پروگرام شروع کئے ہیں، مگر اردو پروگرام انہوں نے بھی شروع نہیں کیا ہے۔ یہ کام اردو والوں کو ہی کرنا ہوگا۔

☆☆

ہندوستان کو فخر رہا ہے کہ اس نے دنیا کو حساب کتاب کے لیے صفر دیا ہے۔ مگر یہی ہندوستان جب نئی صدی کی شروعات کی بات آتی ہے تو مغربی ممالک کی ہاں میں ہاں ملانے لگتا ہے، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اپنے پروڈکٹ کو بڑے پیانے پر فروخت کرنے کے لیے یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں کچھ بھی کرسکتی ہیں۔ جانے والی صدی کو ایک برس پہلے ہی الوداع کہہ سکتی ہیں، آنے والی صدی کا استقبال ایک سال پہلے ہی کرسکتی ہیں۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ جب سن عیسوی کی شروعات ہوئی تو سن ایک سے ہوئی نہ کہ سن صفر سے۔ لہٰذا جب تک دو ہزار واں سن پورا نہ کرلیں تب تک اہم اکیسویں صدی میں کیسے جاسکتے ہیں؟ ابھی ہمارے پاس خرچ کرنے کے لیے پورا ایک سال (دو ہزارواں) موجود ہے۔ ابھی ہم نے اس صدی کے ۹۹ برس پورے کئے ہیں، ۱۰۰ رواں برس ہم نے شروع کیا ہے۔ جب یہ برس پورا ہو جائے گا تب ہی ہم اگلی صدی میں جاسکیں گے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے بھی مغربی ممالک، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور الیکٹرانک میڈیا کے شور شرابے میں اس طرف غور نہیں کیا اور نئی صدی میں داخل ہونے کا اعلان کردیا۔

☆☆

ہمیں احساس ہے کہ اولیّن شمارے کی اشاعت میں کافی تاخیر ہو چکی ہے...... اس درمیان سیاسی صورتحال تو بدلتی رہی، لیکن جان بوجھ کر ہم نے سیاسی نوعیت کے مضامین میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔

آپ کا

ـــــ انیس امروہوی

منڈی

کے بعد

**مشرف عالم ذوقی**

کا ایک اور اہم افسانوی مجموعہ

# غلام بخش اور دیگر کہانیاں

## کی اشاعت پر مبارکباد

اس افسانوی مجموعہ میں کچھ کہانیاں ایسی بھی شامل ہیں جو آنے والی صدی کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں، جہاں تخلیق کار اپنی بات کہنے کے لئے کسی نقاد کے بنائے رہنما اصولوں کا پابند نہیں ہوگا۔۔۔ اور قاری کہانی کے زیادہ قریب ہوگا۔

نیک خواہشات کے ساتھ

# گنتر گراس: ایک تعارف



## پیدائش / تعلیم / مصروفیت:

۱۶ر کتوبر ۱۹۲۷: دکانداروں کے گھرانے میں (Danzig) میں پیدا ہوئے (جو پہلے جرمنی میں تھا اب پولینڈ میں Gdansk کے نام سے مشہور ہے)

۱۹۳۰: دوسری جنگ عظیم شروع ہوتے ہی چودہ برس کی عمر میں ہٹلر کی فوج میں داخل ہونے پر مجبور ہوئے۔

۱۹۴۴: امریکہ کے جنگی قیدی بنائے گئے جب جرمنی کی شکست ہوئی۔

۱۹۴۸-۵۴: ڈوسل ڈروف (Dossel Drof) اور برلن (Berlin) میں فائن آرٹس کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۴۵: سوئزرلینڈ کی Anna Margeretha سے شادی ہوئی جن سے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

۱۹۷۹: (پہلی رفیق حیات سے طلاق کے بعد) Ute Grunert سے شادی ہوئی اور اب وہ ان کی شریک زندگی ہیں۔ کچھ عرصہ ولی برانٹ کے لیے کام کیا، صدر ہائزخ لیو بکے سے مخالفت کی، چرچ سے اسقاط حمل کے مسئلے پر اختلاف کیا، انٹی نیوکلیئر تحریک کے حق میں بولے اور امیگرنٹس کے لیے آواز اٹھائی، دونوں جرمنی کے اتحاد کو بتدریج ہونے پر اصرار کیا، نئے حکمراں گرہارڈ شروڈر کو وژن کی کمی کا طعنہ دیا اور فلاحی بجٹ پر زور دیا۔

۱۹۸۶-۸۷: ایک سال بھارت (کلکتہ) میں رہے کہ وہ قوت مشرق سے جمع کریں جو مغرب کھو چکا ہے۔ طویل عرصہ برلن میں گزارا اور آج کل لیو بک میں رہتے ہیں۔ قلم ہی ان کا سہارا اور تحریر ذریعہ معاش رہی۔ چالیس سال قبل لکھے گئے ناول پر نوبل انعام ملا۔

## تصنیفات:

۱۹۵۸: "دی ٹن ڈرم" (The Tin Drum) ناول

۱۹۶۱: "کیٹ اینڈ ماؤس" (Cat and Mouse) ناول

۱۹۶۳: "ڈاگ ایرز" (Dog Years) ناول

۱۹۶۹: ''لوکل انیستھیٹک(Local Anesthetic) ناول

۱۹۷۲: ''فرام دی ڈائری آف اے اسنیل''(From the Dairy of a Snail) ناول

۱۹۷۷: ''دی فلاؤنڈر'' (The Flounder) ناول

۱۹۷۹: ''دی میٹنگ ان ٹلگٹے(The Meeting in Telgte) ناول

۱۹۸۶: ''دی ریٹ'' (The Rat) ناول

۱۹۹۵: ''اے فار ہورائزن''(A Far Horizon) ناول

۱۹۹۹: مائی سینچری(My Century) ناول

۱۹۵۶-۶۰: منتخب نظمیں(Selected Poems) نظمیں

## اعــزازات

1965: GEORGE BUECHNER PRIZE

1968: FONTANE PRIZE

1969: THEODOR HEUSS PRIZE

1978: VIAREGGIO PRIZE

1994: LITERATURE PRIZE OF BARARIAN ACADEMY

1999: NOBEL PRIZE

ان کے علاوہ برلن فائن آرٹس اکیڈمی کے (Berlin Fine Arts Academy) کے چار سال صدر رہے۔ ہائنرخ بال (Heinrich Boell) کے ساتھ امریکہ میں جرمن ادیب کی حیثیت سے پذیرائی ملی۔ امریکہ کی Ohio University اور Harward University سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند ملی، American Academy Fine Arts and Science کے ممبر بنے، اٹلی کے بڑے ایوارڈ سے نوازے گئے۔ سارتر، نوبوکوف، میلر اور سولزتنس کے برابر مانا گیا اور آج انتیس برس قبل بھی نوبل انعام کے لیے نامزد ہوئے۔ انہوں نے ناولوں اور شعری مجموعوں کی تصنیف کے علاوہ بہت سے مقالات لکھے، تقاریر کیں اور بڑے سیاسی نقاد بھی تسلیم کیے گئے۔ وہ ادب اور سیاست کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ ان کے دو اہم انٹرویوز اسی سال لیے گئے (ایک نوبل انعام ملنے سے پہلے اور ایک بعد میں) جن کا ترجمہ براہ راست جرمن سے اردو میں جدید فکشن رائٹر اور گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کراچی کے جرمن زبان وادب کے استاد جناب شمیم منظر کی خصوصی توجہ سے پیش کیا جارہا ہے۔ ہم جناب ایس اے فاروق کے مشکور ہیں جو لائبریری کے روح رواں ہیں۔

OO

تجزیہ : شمیم حنفی



# (The Tin Drum)

# ٹن ڈرم: دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں

## گنتر گراس کا نوبل انعام یافتہ ناول

آسکر بڑا ہونا ہی نہیں چاہتا ہے۔ آسکر ذہنی طور پر ارتقائی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس کے چاروں طرف زندگی تماشہ بنی چکر کاٹ رہی ہے۔ آسکر کا ڈھول انوکھا ہے۔ اس کی آواز مختلف ہے۔ اس میں شور ہے، مزاحمت کا شور جو معاشرے میں پھیلی منافقت کے شور کو دبانے میں ارد گرد پڑی شیشے کی بنی اشیاء کو کرچیوں میں بدل دیتا ہے۔ لوگوں کی توجہ چند لمحوں کے لیے اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے اور بس۔

The Tin Drum کی ابتداء ایسے وقتوں میں ہوئی جب جرمنی دو مختلف نظاموں کے تحت اپنی معاشرتی، تہذیبی اور معاشی ترقی کے لیے کوشاں تھا۔ یہ کوئی سیاسی ناول نہیں ہے۔ گنتر گراس کا سوشلسٹ ہونا ایک طرف (یہ ان کا ذاتی خیال ہے) لیکن "دی ٹن ڈرم" کا لکھنا (دوسری طرف) ایک فنکاری ہے جس میں معاشرے کی عکاسی ایک مصوری (پینٹنگ) کی طرح نظر آتی ہے۔ گراس ایک ایسا فنکار ہے جو ذہن و دل میں پیدا ہونے والی لہروں کو لفظوں میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ نہ جانے کتنی سمتوں کی تشریح ہوتی ہوئی محسوس ہو سکے۔

اس ناول میں کرداروں کی ایک قطار ہے۔ آسکر اپنی آنکھوں سے ان کرداروں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی جسمانی حرکت سے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی، جب کہ کبھی جسم اور چہرے کے تاثرات کا مختلف ہونا سامنے آجاتا ہے۔

"میں مانتا ہوں کہ میں پاگل خانے میں رہ رہا ہوں۔" ابتداء کے اس جملے میں کتنی تلخی ہے۔ لیکن یہ چیز بہت ساری تکلیفوں کے لیے مرہم کا کام کرتی نظر آتی ہے۔ گنتر گراس روشن خیالی کے تصور کو آگے بڑھانے کی کوشش میں انسانی ذہن میں موجود پیچیدگیوں کے

لیے راستہ بناتے نظر آتے ہیں۔ پاگل خانے سے باہر کی دنیا میں الجھاؤ ہے جبکہ پاگل خانے میں موجود انسان باہر کی دنیا کے اثر سے محفوظ ہے۔ آسکر کا کردار جو ادراک (Perception) کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے لیکن اپنے آپ کو دوسرے کرداروں سے الگ (isolate) کر کے اپنے ڈھول سے ایسے سروں کو پیدا کرتا ہے جو دوسرے ڈھول سے پیدا نہیں ہوتے۔ کہانی Danzig Triology کا حصہ ہے۔ The Tin Drum اس سلسلے کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۵۸ میں لکھا گیا اور وہ فوراً انہیں شہرت کی بلندیوں تک لے گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ نوبل انعام کے لیے (اسی ناول پر) انہیں مزید ۴۰ برسوں تک انتظار کرنا پڑا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کے حالات آج کے یورپ سے مختلف تھے۔ معاشرتی اور تہذیبی اقدار اہم کردار ادا کرتے ہوئے مذہبی اقدار میں لپٹے نظر آتے تھے۔ ذہن کی آزادی کا دارومدار اس کے اطراف کی دنیا پر منحصر تھا۔ انسان کی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف اخلاقی قدریں ہیں جو مذہب کے زیر اثر تھیں دوسری طرف فرد کی آزادی جو اپنے جکڑے ہوئے ذہن کو کلیسا کے اثر سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ اخلاق کی تعریف ہر فرد کے لیے ایک ہی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی دورخی سوچ کے خلاف جدوجہد شروع ہو گئی۔ آزادی انسان کا انتہا motive بن گیا۔ گنتر گراس روشن خیالی کے فلسفے کو The Tin Drum میں سامنے لاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی ورائے حقیقت پسند فطرت (surrealist nature) علامتوں سے کام لیتے ہوئے زندگی کے آلام کو اجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ ناول میں آسکر بیان کنندہ (narrater) کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو کہانی کی ابتداء اپنی دادی سے کرتا ہے۔ لیکن پھر اس کے دنیا میں آتے ہی منافقت سے سامنا اسے اپنے آپ کو پاگل سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ جب وہ تین سال کا ہوتا ہے تو تہیہ کرتا ہے کہ اب اس کا قد کبھی نہیں بڑھے گا اور وہ اپنی موجودہ شکل کو برقرار رکھے گا۔ یہاں پر قاری کے ذہن میں سوالات پرے باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آسکر نے ایسا کیوں سوچا، اس دنیا میں خرابی کیا ہے؟ گنتر گراس اپنے ناول کو ایک بچے کی زبان سے بیان کیوں کرنا چاہتا ہے؟ بچہ بھلا ایسا کیوں کر سوچ سکتا ہے؟ اس کی چیخ میں وہ کون سی خاصیت ہے جس سے کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے کرچیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں؟ وہ اکیلا کیوں رہتا ہے؟ وہ اپنی ماں کو چاہتے ہوئے بھی اسے شک کی نگاہ سے کیوں دیکھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کہانی ایک بچے کی زبانی کیوں بیان کی جارہی ہے، جو دماغی امراض کے ہسپتال میں موجود اپنے گزرے ہوئے زمانے کو ٹین کے ڈھول کے ساتھ تلاش

کرتا ہے۔ زندگی جو مختلف اشکال میں ہوتی ہے کسی نہ کسی طرح کلیسا کے زیر اثر ہے اور تخفیف کے عمل میں ہے۔ مورال مذہب کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے دائرے سے یا پھر آزادی کی متلاشی بھٹکتی ہوئی لایعنیت (absurdity) کا شکار ہو جاتا ہے۔

آسکر کی فیملی ایک نچلے درمیانی طبقہ کی (لوئر مڈل کلاس فیملی) ہے جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے اپنی روایات کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ آسکر کو سب سے زیادہ قربت اپنی ماں اور اپنی دادی سے ہے۔ وہ اکثر اپنی دادی کے کپڑوں کے نیچے جا چھپتا ہے یا پھر میز کے نیچے جس پر اس کی ماں باپ اور ماں کے ایک رشتے کا بھائی جس سے اس کی ماں چھپ چھپ کر ملتی ہے تاش کھیل رہے ہوتے ہیں۔ آسکر کی ماں اگنس ہفتے میں ایک دن ایک سستے ہوٹل میں جا کر اپنے رشتے کے بھائی کے ساتھ جنسی تسکین حاصل کرتی ہے جبکہ آسکر ایک یہودی کی دکان پر اپنی ماں کا انتظار کرتا ہے۔ کہانی اس طرح آگے بڑھتی ہے۔ پھر نازی آہستہ آہستہ منظر عام پر آتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کا ہونا اور جنگ کے ختم ہونے کے بعد جرمنی کے ایک دماغی امراض کے ہسپتال میں آسکر کا ہونا کہانی کو مختلف موڑ دیتے ہیں۔

گنتر گراس نے آسکر کے کردار سے زندگی کو کئی پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ زندگی جو تلخ بنادی گئی ہے نام نہاد روایتوں کے ذریعے سے جہاں فرد کی آزادی مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ زندگی مذہب (عیسائیت) کے زیر اثر ہے اور صحیح طور پر پروان چڑھنے سے قاصر ہے۔ زندگی ایک انسان کی دوسرے انسانوں کو استعمال (manipulate) کرنے کی کوشش میں آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ زندگی قومیت کے نظریے کے تحت دوسرے انسانوں سے ہونے والے رابطے میں مخل ہوتی ہے۔ زندگی فرد کے نارمل ہونے کو پاگل پن قرار دیتی ہے۔ ان نکات کو آسکر کے کردار کے ذریعے پیش کر کے دنیا میں ہونے والی زیادتیوں کو بڑے کینوس کی تصویر بنا کر ورائے حقیقت (Surrealaistic) انداز میں گنتر گراس نے پیش کیا ہے۔

ہر کردار جس سے آسکر کا سامنا (confontration) ہوتا ہے، وہ الجھاؤ کا شکار ہے۔ آسکر خود بھی مذبذب (confuesd individual) کے طور پر حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ وہ معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی لاتعلق رہتا ہے۔ احتجاج کی کیفیت اس کی طبیعت میں رعونت (arrogance) کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو چرچ کی چھت پر چڑھ کر سب سے بڑا سمجھنے لگتا ہے اور اپنی چیخ سے آس پاس کھڑی عمارتوں کے شیشوں کو توڑ دیتا ہے۔ آسکر کا چرچ کی چھت پر چڑھ کر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسری طرف نہ بڑھنے کی قسم کھانا

ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ لیکن اس صورتحال کے کئی مطالب بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ روایت اور مذہب سے ٹکراؤ جو منافقت کی شکل میں پورے شہر میں پھیلا ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس کہ میں چھوٹا ضرور ہوں لیکن تم سب سے یقیناً بڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ بڑا نہیں ہو سکتا ہوں آسکر جان بوجھ کر بچہ بنا دنیا میں ہونے والی منافقت کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ اکثر قصداً لوگوں کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔ جو غالباً احتجاج کی ایک شکل ہوتی ہے۔ وہ عورتوں سے جنسی تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں ناکام ہو جاتا ہے۔ آسکر کی ایک اور شکل کہ وہ دوسروں کی طرح نہیں ہو سکتا۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی سوتیلی ماں کے حمل کا اسقاط ہو جائے۔ یہاں پر دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آسکر ایک اور آسکر کے دنیا میں آنے سے ڈرتا ہے یا ایک اور بچے کو آسکر بنتے نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔

گنتر گراس کا کردار آسکر مہملیت (absudity) میں رہتے ہوئے جدلیاتی (dialectic) سوچ کا حامل ہے۔ وہ زندگی کو اس طرح سے پیش کرتا ہے جیسی ناقابل قیاس (unpredicable) وہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی زندگی کا ایک تنقیدی جائزہ بھی لیتا ہے۔ آسکر زندگی گزارنے کا فلسفہ پیش نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی نظریے کو سنجیدگی سے نہیں لیتا ہے۔ بلکہ بہتا چلا جاتا ہے۔ آخرش وہ سوالوں کو بھول بھلیوں میں پھنس کر خود کلامی کی کیفیت سے دوچار کہتا ہے۔ ”مجھے کہنا چاہیے یا نہیں کہنا چاہیے۔“ قاری اکثر آسکر سے الجھنے لگتا ہے۔ لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ اور جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے، آسکر اس میں آہستہ آہستہ ضم ہونے لگتا ہے۔ قاری تمام کرداروں کو آسکر کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ ایک مضحکہ خیز مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے پیچھے ایک سنجیدہ انسان چھپا چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنے آپ کو پاگل گردانتے ہوئے دنیا سے الگ کر لیتا ہے لیکن اس کی شمولیت (involvement) اس میں جاری رہتا ہے۔

گنتر گراس کا ناول ”ٹین کا ڈھول“ بیسویں صدی میں لکھے جانے والے شاہکار ناولوں میں سے ایک ہے جو قاری کو اپنی قید میں لینے کے بعد روشن خیالی کی شاہراہ پر لا کر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ اس کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔ OO

گنتر گراس: ادب کا نوبل انعام یافتہ ۱۹۹۹

# کول کوتا: تیری زبان کتنی کالی

ملینیم صدی کے آخر کا نوبل انعام ایک بار پھر ایک ایسے شخص کو دیا گیا ہے، جو ادیب بھی ہے، سیاستداں بھی، جو مختلف تحریکوں اور آندولن سے جڑا ہے۔ جس کی شخصیت کے بہت سارے Shades ہیں۔ یہ بات اس لیے بھی اہم ہے کہ اب نوبل جیسے اہم انعامات کے لیے آپ کی شخصیت میں ایک خاص طرح کا پھیلاؤ ہونا بہت ضروری ہے ......... یعنی ختم ہوتی ملینیم صدی ایک ادیب کو محدود پیمانے میں دیکھنے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں ہے، اور آگے آنے والی ملینیم صدی ایسے ادیبوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہے، جن کی شخصیت نہ صرف سدابہار ہو بلکہ وہ ادب و سیاست یعنی ہر جگہ حاوی رہنے کا فن جانتے ہوں......

گراس کے ساتھ ایک اہم بات اور بھی ہے۔ گراس نے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۷ء یعنی پورے ایک برس کول کوتا میں گزارے۔ کول کوتا، یعنی امیری غریبی کے اس عجیب و غریب سنگم نے جس قدر بنگالیوں کو متاثر کیا ہے، اسی قدر باہر سے آنے والوں کو بھی ...... City of Joy سے لے کر پتہ نہیں کتنی کتنی کتابوں، کہانیوں، داستانوں، کویتاؤں اور نظموں میں یہ شہر الگ الگ رنگوں میں اپنی اہمیت کے ساتھ شامل ہوا ہے۔ مشہور شاعر حرمت الاکرام کی طویل نظم کلکتہ: ایک 'رباب' ہو یا پھر گنتر گراس Show your Tongue......

کول کوتا، کتنی کالی تیری زبان......

گنتر گراس کی اس کاوش میں کالی ماں اپنی زبان نکالے کول کوتا کو دیکھ رہی ہیں ...... یہاں غریبی ہے۔ دکھ ہے...... عالیشان عمارتیں ہیں۔ کوڑا کچرا ہے، درد کی تصویریں ہیں اور ایک کالی ماں ہے...... کالی ماں ان درد بھری تصویروں کو دیکھ رہی ہے

گنتر گراس ۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۷ کو جرمنی میں پیدا ہوئے۔ شروع سے ہی گراس کو لکھنے

پڑھنے کا شوق تھا۔ دوسری عالمی جنگ نے انہیں خاص طور سے متاثر کیا۔ نتیجہ، اس کا اثر ان کے ادب میں بھی در آیا۔ ۲۵ سال کی چھوٹی سی عمر تک گراس فکشن اور ڈرامے میں اپنی ایک خاص جگہ بنا چکے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں ان کا پہلا جرمن ناول منظر عام پر آیا۔ دی ٹن ڈرم۔ اس کا انگریزی ترجمہ بازار میں آتے ہی گنتر گراس کی دھوم مچ گئی۔ اور محض اس ایک ناول سے گراس پوری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ میں کیٹ اینڈ ماؤس، ۱۹۶۳ء میں ڈاگ ایرس، منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد لوکل اینستھیٹک کے شائع ہوتے ہی گراس ایک بار پھر بحث کا موضوع بن گئے۔ ابھی حال میں گراس کی نئی کتاب مائی سنچوری شائع ہوئی ہے......

گراس نے نازیوں کی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ہٹلر کے یوتھ موومنٹ میں رہے۔ جنگ لڑے۔ زخمی ہوئے۔ قید بھی رہے۔ اور پھر ملک چھوڑنے کی نوبت آئی تو پیرس چلے گئے۔ پیرس جانے کے بعد بھی ان کی پریشانیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا...... جدوجہد کے پاؤں پاؤں چلتے ہوئے گراس صحیح معنوں میں زندگی کی پرخطر شاہراہوں سے گزرتے چلے گئے......اور یہی وہ شب و روز تھے جس نے گراس کے ادبی گراف کو کافی اونچا اٹھا دیا......

گراس کی ایک مشہور زمانہ نظم تو مجھے پوری طرح یاد نہیں، مگر بار بار اس نظم کے توسط سے مجھے کلکتہ کی یاد آتی ہے......

کول کوتا!
تم ابھی بھی میری آنکھوں میں جھانک رہے ہو
میں دیکھ رہا ہوں۔
تم پر ایک گھنا سایہ ہے۔
بیشک یہ کوئی دیوی ہے،
جس نے مکمل طور پر تمہیں ڈھک رکھا ہے......
کیا تم اسے پہچانتے ہو......

میرے کول کوتا!
آہ! اب تو لاچاری کے تلوے سے بھی لہو جاری ہونے لگا ہے
وہ غریب رکشے والا......
آدمی کو اپنے پائیدان پر بیٹھا کر کھینچنے والا آدمی،

کول کو تا،
تم بہت خراب ہو
تم بار بار میرے سپنے میں کیوں آتے ہو

کول کو تا،
تم پر کالی ماں کا سایہ ہے......
کالی ماں جو ہر بار تم کو بچاتی ہے......
ظلم سے، بربریت سے، آندھی سے اور طوفان سے
اپنی سرخ 'جیبھا' نکالے وہ ڈراتی ہے
ظالموں کو / مکاروں کو / خون کی تجارت کرنے والوں کو......
کالی ماں
کول کو تا!
تم ابھی بھی میری آنکھوں سے جھانک رہے ہو......

خوشی کی بات یہ ہے کہ گنتر گراس بھی ان لوگوں میں رہے ہیں، جنہوں نے بھارت کو قریب سے دیکھا ہے...... یہ اور بات ہے کہ گراس صرف اور صرف ایک سال تک بھارت میں رہے...... لیکن بھارت کی تہذیب اور غریبی کی جھلک بھی ان کے ادب میں کہیں کہیں دیکھی جا سکتی ہے......

گراس کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب ابھی بھی کسی تہہ خانے میں قید ہے جہاں کسی سوراخ یا روزن سے ہوا کے کسی بھی خوشگوار جھونکے کے آنے کی امید نظر نہیں آتی۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ ہم تمام اردو والوں نے خود کو بہت محدود دائرے میں سمیٹ رکھا ہے...... اور یہی حال ان کی شخصیت کا بھی ہے۔ نوبل انعام بڑا انعام ضرور ہے لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اس سے بھی بڑی چیز صرف اور صرف تخلیق ہے...... اردو ادیبوں کی منزل بھی یہ انعام ہو سکتی ہے مگر انہیں اپنے اپنے خول سے باہر نکلنا ہوگا اور کسی درخشاں ستارے کی طرح ہر محاذ پر چمکنا ہوگا......
○○

# قصے، ادب اور احتجاج

قصہ ہو یا داستان، یہ زندگی کا احتجاج ہے اور احتجاج قید و بند کے خلاف ایک مسلسل جدو جہد، جینے کا اسلوب ہے، ایک اسٹائل۔ آپ چاہیں تو اسے ازلی طرزِ حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔

جب بچہ ماں کے بطن سے آزاد ہوتا ہے تو وہ روتا ہے، اور یہ اس کا پہلا احتجاج ہوتا ہے۔ احتجاج ہوا کی زنجیروں کے خلاف یہیں سے شروع ہوتا ہے، اور وجود کے آخری لمحے تک جاری رہتا ہے۔ یہی بامعنی زندگی کی شرط ہے اور بقا کا قصہ بھی۔

چھوڑیئے یہ تو محض تمہید ہے۔

ایک وہ قصے تھے جن سے الاؤ کی چنگاریاں اُڑیں۔ کبھی درختوں کی چھاؤں میں، کبھی جنگلوں کے جھنڈ میں جن کے تنوں کو آگ کی تپتی ہوئی زبانیں چاٹتی رہتی ہیں، رات رات بھر۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا ہے، کبھی بھور کی خنک خوشبو تھپکیاں دے رہی ہے نیند کے پپوٹوں کو، اور سناٹا آواز دے رہا ہے خوابوں کے دھندلکوں کو۔ یہی خواب رزم و بزم کی جان ہیں، ریوڑوں کی جان جنہیں پیغمبروں نے سچائی کا وہ سبق پڑھایا جو دراصل آفاق کی تہہ داریوں کا راز داں ہے۔ اور ہم رات کے الاؤ سے اپنے قصے چنتے ہیں اور ان کو صلیب پر لٹکا دیتے ہیں۔ صلیب ظلم کے خلاف احتجاج کا خاموش اعلان ہے، اور نیک دل انسان اتنے جری ہیں کہ صلیب پر چڑھنے کے لیے مستعد ہیں۔

اسپار ٹکس ...... ایک اور قصہ روم کے مقتل کا اور زندگی کے احتجاج کا مصلوب اور مقتول ...... روم کے کولیسیم، جن کے کھنڈر آج بھی اسپار ٹکس کی کہانی کے عبرتناک قصے سنا رہے ہیں، یہ قصہ آج بھی اتنا ہی خار دار اور ستم آشنا ہے، اتنا ہی خنجر آزما، جس کی دھار پر چل کر انسان کا قصہ یہاں تک پہنچا ہے۔ قصہ زندہ ہے، اس لیے کہ انسان زندہ ہے۔ اسپار ٹکس سے روز نبرنگ تک کا فاصلہ کتنا ہے؟ زمانہ ...... صدیاں ...... تیر و تفنگ سے ایٹمی ہتھیاروں تک کا فاصلہ۔ پھر بھی آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے۔ احتجاج کی پوری

تاریخ احتجاج کارزار ہے۔

بہار میں برگد کا ایک پیڑ ہے جس کے سائے میں ایک گہرے فلسفے نے جنم لیا، جو صدیوں اور قرنوں میں ایک چھتنار پیڑ بنا۔ جب بھی میں نے اس پیڑ کو دیکھا، مجھے لگا کہ صدیوں کی بوُچھال کی طرح اتر اتر کر چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ کبھی کبھی میں ادھر کی طرف دیکھتا ہوں جہاں گوتم بدھ کی اولین لاٹ تھی۔ پتھر کے یہ ستون دور دور تک مہاتما بدھ کے ہندوستانی فلسفے کے امین تھے۔ اس فلسفے کی بنیاد جو تاریخ میں ہندوستان کا پیغام لے کر چاروں کھونٹ کا طواف کرتی رہی ہے۔

کہتے ہیں اشوک نے قسم کھائی تھی کالنگا کی جنگ کے بعد کہ اس جنگ کے بعد خون کی ایک بوند بھی ماتر بھومی کی دھرتی پر نہیں ٹپکے گی۔ اور اس طرح ہندوستان کی سرزمین سے قافلے نکلے اور چین اور انڈونیشیا تک یہ پیغام لے گئے۔ اور اشوک کی سرزمین پر کبھی خون نہیں بہایا گیا۔

لیکن خباثت کی طاقتوں نے اپنی مہم جاری رکھی۔ پھر ہمیشہ کی طرح زمانے نے زمانے کو بدلتے دیکھا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ گاندھی اور نہرو کے تصورات نے زمانے کی آزادی کے ہر کارواں کو ایک نیا راستہ دکھایا اور اس طرح آزادی کی لڑائی کو تعصبات سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

ہاں تو میں برگد کے درخت کا ذکر کر رہا تھا۔

برگد کے درخت کا اور روحانی ورثے کا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو مجھ پر پاکیزگی اور وارفتگی کا پر اسرار احساس واضح ہونے لگتا ہے، تب میں برگد اور اس کی چھال کے بارے میں سوچتا ہوں، تب مجھ پر ستاروں بھرا آسمان برستا ہے، اپنے ستاروں سمیت، اور ان کی خوبصورتی کا احساس ہوا میں رچ بس جاتا ہے۔ یہ آسمان زندگی میں زمین پر احتجاجی تانے بانے بُنتا ہے، اس لیے کہ زمین پر ناانصافیاں ہیں، بُزدلی ہے اور خوابوں کا لہو ہے، اس لیے کہ زندگی اثبات بھی ہے اور احتجاج بھی۔ اور یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آیا ہے۔

یہ دنیا ایک موجیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ اس کے سماجی تانے بانے ارتقائی ہیں اور انقلابی بھی۔ یہ رقص شر ہی نہیں، شبنم کی نرم روی بھی ہے۔ اور لمس واحساس کی جادوگری بھی۔ یہ اس دور کا شعور ہے جس نے ان حکایتوں کے ساتھ سفر کیا ہے، اور مجھے یہاں تک

پہنچنے میں مدد دی ہے۔ سماجی حرص و ہوس نے کب ہماری ذات سے دامن چھڑایا۔ محض اپنے قصے کو دہرانے کا مزہ اس تکرار میں ہے جو ایک اہم قسم کے تجربے سے جنم لیتی ہے۔

بعض مرتبہ جیسے جیسے شام کے سائے درختوں سے جھانکتے ہیں، ہم پر بہت سے راز کھل جاتے ہیں، تب جٹادھاری درختوں کو آپ ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک ہی جست میں سارا نظریۂ حیات بدل جاتا ہے۔ شام ہے اور دور سے مغرب کی اذان سنائی دے رہی ہے، اور قصے لکھے جارہے ہیں، یا سنائے جارہے ہیں، حقیقت خواب بنتی جارہی ہے اور خواب حقیقت۔ تب رات کے سناٹے میں قصے جوان ہوتے ہیں اور ان کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر حیرت اور استعجاب کی لکیریں پھیل جاتی ہیں، خوابوں کی نیند پھیکی پڑ جاتی ہے۔ یہ ایک لمحے کی نیند نہیں ہے، صدیوں کی نیند ہے۔ قرنوں کا طلسم جو خاموش بھی ہے اور رجزیہ بھی۔ اور ہم نہیں جانتے کہ ماجرا کیا ہے۔ ہم دھند میں لپٹی ہوئی دھند ہیں۔

جہاں تک فن کی تخلیقیت کا تعلق ہے کلاسیکی سطح اور لوک لہر ایک دوسرے میں کھو جاتی ہیں، یہ ایک حیرتناک تجربہ ہے۔ ہر زمانے میں دست و گریباں ہونے کے قصے ہماری لوک کلا کی چھب دکھاتے ہیں۔ موسم کی طرح رنگِ حنا میں مدغم، یہ دھنک کی چھب ہے اور جمالیات کی گل کاری۔ یہ سب مل کر اس قصے کے تانے بانے بُنے جاتے ہیں، جس کی پیاس زندگی کے ہر دروازے پر دستک دیتی ہے۔ یہ خوبصورت پیاس بہت مہمیز کار ہے۔ اس میں ریگستان کے ببول بھی ہیں اور گل بنفشہ کی نرم زرکاری بھی۔

پس منظر کی یہ TAPESTRY زندگی کو رنگارنگ سانچوں میں ڈھالتی ہے۔

اجتہاد کا یہ پہلو صرف گل کاری اور جمالیات کے نمونوں میں نہیں ہے، یہ زندگی کے وسیع و عریض کینوس کا حصہ ہیں، اور وہ قصہ بھی جس کا سلسلہ اٹوٹ ہے۔

ہندوستان میں اکثر شاہ کار علم و ہنر کے خزانے ہیں، جیسے نالندہ یا سہسرام یا کوہستانوں سے بہتے ہوئے جھرنے۔

اسی طرح شاہ کار علم و ہنر کے خزانے ہیں۔ ایک بار جب میں سہسرام کے سفر پر تھا، شیر شاہ کے روزے میں اوپر کے محرابی دروازے پر کسی نے مجھے روک کر بتایا کہ دیکھو، اس جالی سے کیا نظر آتا ہے۔ وہاں نیم گول کنواں جیسا تھا۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں اندر ایک زنجیر پڑی تھی۔ گنبد میں ایک پنجہ تھا جو آسمانی شمشیر کی زد میں آکر اپنے وجود سے محروم ہو چکا تھا۔ وہ جزا اور سزا کی اخلاقی قدروں کی داستان تھا۔ اس سے سماجی قدروں کی طہارت کا پتہ چلتا ہے جو گزری ہوئی دنیا کے در شہوار تھے۔ اسی طرح اجنتا اور ایلورا کا ورثہ ایک اجتہاد کا ورثہ

ہے۔ یہ بدھ مت کے خلاف ہندو راجاؤں اور راجکماروں کی مہم کا نتیجہ تھے۔ اور بدھ کے بھکشوؤں نے ان گپھاؤں میں پناہ لی، جو آج بھی ایام ماضی کی یادگار ہیں۔ یہ گپھائیں، جہاں 'سانولی راجکماری' اور مہاتما بدھ کی معنی خیز مسکراہٹ کی تجلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ راجکمار بدھ کی پر اَسرار شخصیت، گیان دھیان اور فلسفے کے تین روپ ان گپھاؤں میں ایک نور کی طرح پر پھیلا رہے ہیں۔ اسی میں ہندوستانی قصے کا نچوڑ ہے۔

○○

یہ تو ساری باتیں ہیں اور ان کا پس منظر افق تک جنگل کی گھاس کی طرح، ہواؤں کی لہروں کے ساتھ آہستہ آہستہ تیر رہا ہے۔ یہ احتجاج نہیں ہے، یہ زندگی کا افسانہ ہے۔ انسان نے ہمیشہ رکاوٹوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور لڑائی کی ہے، اس لیے کہ اگر لڑائی نہ کی جائے تو رکاوٹیں کیسے ہٹیں۔ اور انسان کا ارتقائی سفر کس طرح جاری رہے؟

وقت ہماری تلاش میں ہے، اور ہم وقت کی تلاش میں ہیں۔ احتجاج ہمارا ہم سفر ہے۔ وقت نے، حالات نے، ہمیں خود اپنے آپ سے، اپنے تضادات سے لڑنا سکھایا ہے۔ تمام مظاہر، مظاہر حیات کی طرح تخلیقی اظہار نے سب کچھ، تمام تمناؤں اور تجربوں کو سمیٹ کر اپنے دل کا آئینہ خانہ بنالیا ہے۔ آئینہ خانے کے پیکر جو صدیوں میں بنے ہیں، ان میں سے بعض ہماری طرز نگارش کا حصہ بن گئے ہیں۔ شاعری، صورت گری کی تخلیقیت کی جلوہ گری ہے۔ ناولوں کے کردار، فکشن کی سحر کاری، انسان کا درد، محبت اور نفرت، بیزاری اور سرشاری...... یہ سب دولتیں ہمارے افسانے اور قصے کے الاؤ ہیں۔ حالانکہ میں کوہ طور، طوفان نوح اور حاتم طائی کی بات کر سکتا تھا، لیکن یہاں نہیں۔ زندگی تجربوں کے دھندلکوں سے گزرتی رہی ہے، درختوں پر بہار بھی آئی ہے اور خزاں بھی، اس کے افق پر سورج ڈوبتا بھی ہے اور جاگتا بھی ہے۔

انہیں دھندلکوں میں زندگی قافلہ در قافلہ چل رہی ہے۔ اسی قافلے میں منشی پریم چند کے کفن کے کردار بھی چل رہے ہیں، جو زندگی کے علم بردار ہیں۔ چونکہ یہ کردار زندگی کے علمبردار ہیں، اور زندہ کردار ہیں، اس لیے فنا کی قوتوں کے آگے صف آرا ہیں۔ اسی لیے یہ تضادات کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں نفی کے خلاف جدوجہد، اسی لئے کہ نفی اجتہاد اور احتجاج، یعنی زندگی کا اثبات ہے۔

آیئے اب دیکھیں کہ میری ان باتوں کی معنویت کیا ہے۔

'کفن' کا بھرپور فکشنل جواب خود 'کفن' میں ہے۔ اور سماجی جواب و جواز 'گئودان'

اور 'میدانِ عمل' کا قصہ ہے۔ باقی محض جدو جہد ہے یا الیوژن ہے اور سادہ لوحی۔ وہ زمانہ یاد ہے مجھے جب آئے دن فوجداریاں ہوا کرتی تھیں۔ جب گوہار میں گنڈاسوں اور برچھیوں سے زخمی گاؤں والے آتے تھے، اور جاڑے ہوں یا برسات، اپنے بستر لگا کر اسپتال کے کمپاؤنڈ میں پڑ جاتے تھے اور ڈاکٹر کے جذبہ ترحم کا انتظار کرتے تھے۔ تب تمام دشمنیاں زخموں میں سمٹ آتی تھیں۔ اور ان کا درد ایک ٹیس بن جاتا تھا۔ شاید وہ باری باری، یا ایک ساتھ اجتماعی سوال کرتے تھے، آخر ہم کس کے لیے لڑ رہے ہیں؟ سرخاب کے پر تو کہیں نظر نہیں آتے......

راتوں رات ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں موڑ دیا جانے والا پانی، خون کی لمبی لکیر کے ساتھ، زندگی کی کن صعبتوں کا سفر شروع کر چکا ہے...... کھیت، پانی، چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی تڑپ، سرکنڈے کی چلمنوں سے جھانکتی ہوئی پرتھوی راج چوہان کی آنکھیں صبح و شام جھلملاتی نظر آ رہی ہیں، آج تک یہ آنکھیں سفر کر رہی ہیں...... باز بہادر کی آنکھوں میں، جھانسی کی رانی کے گھوڑے کی ایال میں...... موتیوں کی طرح...... خوابوں کے موتیوں میں رَسلے ہوئے، انیسویں صدی کے اسپ تازی پر سوار اور ہوا سے باتیں کرتے ہوئے۔ یہ بھی جھانسی کی رانی کی طرح، چاند بی بی کے قلعے میں مقید اور آزاد۔ سب سے بڑی آزادی ضمیر کی آزادی ہے اور قوم کا مقدر، جس کے قصے تب بھی آزاد تھے، آج بھی آزاد ہیں، اور ضمیر اور تاریخ سازی جن کا عہد ہے۔ دریا، کوہسار، کبوتروں کے جھنڈ جنہوں نے مندروں اور مسجدوں میں ایک ہی طرح کا بکوں کا جال سا بن دیا تھا، تا کہ وہ آنے والی صدیوں میں محفوظ رہیں، اور گزرتے ہوئے زمانوں کو صدیوں کے قصے سناتے رہیں۔

عام طور پر تخلیقی ورثے کو اس کے سوتوں سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ وقت آئے گا، وہ صدیاں واپس آئیں گی جو انصاف کی صدیاں تھیں، اور صحیح ترازو کو اٹھا لیں گی اور انصاف کریں گی۔ تب ہمیں، آنے والی نسلوں کو اندازہ ہو گا کہ قصے کی قیمت کیا ہے، اور وہ کون سے عناصر ہیں جو قصے کو قصہ بناتے ہیں۔ ○○

## احتجاج کا اوّلین سفر

# مکالمہ

ترجمہ: ڈاکٹر شہناز شاہین

یہ سقراط کا آخری مکالمہ ہے۔ وہ قید خانے میں ہیں اور انہیں سورج غروب ہونے پر زہر پینا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ روح کی ابدیت کے موضوع پر سارے دن بحث و مباحثہ کرتے رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دنیا نہایت پرکشش ہے۔ اور ہمارے اعضاء حقیقی علم کو حاصل کرنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ انسانی شکل میں پیدا ہونے کے بعد، ہم لوگوں کا پہلا فرض علم کو حاصل کرنا ہوتا ہے اور روح کو دنیاوی لگاوٹ سے آزاد کرنا۔ روح ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔ وہ اپنی باتوں کو مثالوں کے ذریعے، بحث و مباحثے کی مدد سے اپنے دوستوں کو سمجھاتے ہیں۔ دراصل سقراط کے یہی خیالات پلاٹو کو مفکر و فلسفی بنانے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

سورج غروب ہونے پر سقراط، پرسکون ہو کر اپنی ابدیت کو پالیتا ہے۔

## کردار

- ☆ سقراط
- ☆ کرایتو
- ☆ سمیعس
- ☆ سیبیس
- ☆ آپولودورس
- ☆ قید خانے کا ملازم
- ☆ (گفتگو میں فیدو، فلیعس کے باشندہ آخیکراتمیس کو ان کے خیالات سناتا ہے۔)

## منظر

فلیعس، جہاں فیدو آخیکراتیس کو سقراط کی آخری گفتگو سناتا ہے۔

آخیکراتیس : فیدو: کیا تم اس دن سقراط کے پاس جیل میں تھے، جبکہ اس نے زہر پیا تھا؟

فیدو : ہاں :میں وہاں موجود تھا۔

اخیکراتیس : میں سقراط کی موت کے متعلق جانا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے آخری لمحوں میں کیا کہا؟ ہم لوگ تو یہ جانتے ہیں کہ وہ زہر پینے سے مر گیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ مزید اور کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ اب کوئی بھی فلیعس کا باشندہ ایتھینس نہیں جاتا ہے۔ اور بہت دنوں سے کوئی ایتھینس کا باشندہ اس جانب نہیں آیا ہے۔ اس وجہ سے ہم لوگوں کو صحیح خبر نہیں مل سکی۔

فیدو : کیا تم نے مقدمے کی کارروائی کے بارے میں نہیں سنا؟

اخیکراتیس : ہاں! ہم لوگوں نے کسی کی زبانی مقدمے کے متعلق سنا، لیکن یہ سمجھ نہیں پائے کہ انہیں سزا سننے پر فوراً کیوں نہیں مارا گیا...... بلکہ ایک طویل عرصے کے بعد کیوں مارا گیا؟ اس کی وجہ کیا تھی؟

فیدو : وہ تو اتفاق سے ایسا ہوا...... ان کا مقدمہ جس دن چلا اس سے ایک دن قبل ایتھینس کے باشندوں کے ذریعے دیلوس بھیجے جانے والے جہاز کی سہرا بندی ہوئی تھی۔

اخیکراتیس : کیسا جہاز؟

فیدو : ایتھینس کی روایت کے مطابق تھیسیس نے ان چودہ نوجوانوں کو اسی جہاز کے ذریعے کریٹ روانہ کیا تھا۔ اس نے وہاں پر اپنے ساتھ ان کو بھی بچایا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس وقت اپولو دیوتا سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ لوگ بچ گئے تو ہر سال دیلوس کی جانب مذہب کی تبلیغ کرنے والی جماعت کو بھیجا کریں گے۔ اور یہ روایت ابھی بھی چلی آ رہی ہے۔ بحری سفر کا یہ پورا وقت بہت ہی مقدس قرار دیا جاتا ہے۔ اس وقت کی شروعات اس دن سے مانی جاتی ہے جب کہ اپولو کے پادری کے ذریعے اس جہاز کو روانہ کیا جاتا ہے۔ اور اس وقت ملزموں کو پھانسی دے کر

ریاست کو ناپاک نہیں کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مخالف ہوائیں جہاز کو روکتی ہیں۔ اس حالت میں آنے جانے میں بہت طویل عرصہ لگتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جہاز کی روانگی مقدمہ چلنے سے ایک روز قبل ہوئی تھی۔ اس لیے سقراط جیل میں پڑا رہا اور سزا پانے کے باوجود بہت دنوں تک اسے زندہ رکھا گیا۔

انخیکراتیس : وہ کس طرح مرا؟ س وقت کیا کچھ کہا گیا...... کیا کیا گیا......؟ اس کے دوستوں میں سے کون کون اس کے پاس تھا......؟ جیل کے حکام نے ان کے وہاں رہنے پر بندش تو نہیں لگائی، جس سے مرتے وقت اس کے پاس کوئی دوست نہیں رہا ہو......؟

فیدو : نہیں...... نہیں...... ان میں سے بہت سارے لوگ ان کے پاس موجود تھے۔

انخیکراتیس : اگر تم برا نہیں مانو...... تو مہربانی کر کے اس واقعہ کا ذکر جتنی بھی باریکی سے ہو سکتا ہے...... کرو......!

فیدو : نہیں، مجھے تو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ میں تمہاری خواہش ضرور پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ خواہ میں خود سقراط کے متعلق گفتگو کروں یا کسی دوسرے کی زبانی اس کے بارے میں سنوں...... اس کی یادیں ہی مجھے بے حد خوشی دیتی ہیں۔

انخیکراتیس : ایسا ہی خیال تمہارے سننے والے رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس واقعہ کا ذکر بہت ہی باریکی سے کرو گے۔

فیدو : مجھے سقراط کے پاس بیٹھ کر انوکھا تجربہ ہوا تھا۔ میں ذرا بھی یہ محسوس نہیں کر پاتا کہ میں اپنے ایک دوست کے مرنے پر موجود ہوں۔ اس وجہ سے انخیکراتیس! اس کے لیے میرے دل میں ذرا بھی رحم نہ آیا۔ وہ بہادری سے مرا...... اس کے الفاظ...... اس کے انداز...... اس قدر مہذب اور شائستہ تھے کہ...... پوچھئے نہیں...... جیسے اس کو بہت ہی خوشی مل رہی ہو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”سقراط! تم ہمیشہ زندہ رہو!“ اس کی موت کائنات فطرت کی زندہ جاوید طاقت ہے اور وہ جنت میں پہنچ کر خوش رہے گا (اگر ایسا ہوتا ہے)۔ اس وقت میرے دل میں ذرا بھی

ہمدردی کا جذبہ نہیں ابھرا، جب کہ ایسا ہونا فطری عمل بھی تھا۔ لیکن ہاں! مجھے وہ خوشی محسوس نہیں ہوئی جو عام طور پر مجھے فلسفیانہ گفتگو میں ہوا کرتی ہے (ہمارے بحث و مباحثہ کا موضوع فلسفہ ہی تھا)۔ میں خوش تو تھا لیکن اس خوشی میں غم بھی پنہاں تھا۔ کیوں کہ ذہن میں بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اب فوراً اس کو مر جانا ہے۔ اس ملے جلے جذبات کو سبھی بخوبی محسوس کر رہے تھے۔ ہم لوگ کبھی ہنستے اور کبھی روتے ...... بالخصوص اپولو دورس، تم کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح کا انسان ہے۔

اخیکراتیس : ہاں! میں اسے خوب جانتا ہوں۔

فیدو : وہ تو بالکل آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں اور دوسرے افراد غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اخیکراتیس : وہاں کون کون موجود تھا؟

فیدو : ایتھنس کے باشندوں میں سے اپولودورس کے علاوہ کرارتوبولس اور اس کے والد کرائتو، ہرموگینس، اپی گینس، اخینس، انتی تھینس موجود تھے۔ اسی طرح پے نیا کے علاقے سے استے سپّس مینی خینس اور کچھ دوسرے افراد بھی تھے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے پلاٹو بیمار تھا۔

اخیکراتیس : کیا کچھ اجنبی لوگ بھی وہاں موجود تھے؟

فیدو : ہاں! تھے تو ...... تھیبیس کا سمیعس، سیبیس اور فیدوندلیس اور میگارا کے رہنے والے ایوکلا اور ترپیس اونؔ بھی آئے تھے۔

آخیکراتیس : کیا ارست پوپس اور کلیومبر ونس بھی آئے تھے؟

فیدو : نہیں! میں نے سنا کہ وہ ایگینا میں تھے۔

آخیکراتیس : اور بھی کوئی تھا؟

فیدو : میرے خیال میں صرف اتنے ہی لوگ تھے۔

اخیکراتیس : اچھا، تمہاری گفتگو کا موضوع کیا تھا؟

فیدو : میں شروع سے تمام باتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ ہم لوگ صبح ہوتے ہی اس جگہ پر یکجا ہو جاتے تھے جہاں پر مقدمہ کی کارروائی ہوتی تھی۔ وہ مقام جیل خانہ کے نزدیک ہی ہے۔ جیل کا پھاٹک صبح سویرے نہیں کھلتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے اس کے

کھل جانے کا انتظار کرتے تھے...... اور اندر جاکر تقریباً بیشتر وقت سقراط کے ہمراہ ہی گزارتے تھے...... ہم لوگ ان کے آخری دن بھی مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی جمع ہوگئے تھے۔ کیوں کہ ہم لوگوں نے...... شام کو جیل خانے سے جاتے ہوئے یہ سنا تھا کہ دیلوس سے وہ مقدس جہاز لوٹ آیا ہے...... اس لیے ہم لوگوں نے وقت سے پہلے ہی آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جیلر نے ہم لوگوں کے وہاں پہنچنے پر پھاٹک کھولا...... لیکن ہمارے اندر جانے کے بجائے وہ خود ہی باہر آیا اور یہ اطلاع دی کہ ہم لوگوں کو جب تک اندر آنے کی اجازت نہیں دی جائے...... وہاں پر انتظار کرنا ہے۔ کیوں کہ ایکادش، سقراط کے پاس تھے اور اس کی زنجیر کھول رہے تھے۔ وہ اسے حکم بھی سنا رہے تھے کہ اس کی موت آج ہی ہوگی۔ جیلر اندر گیا...... اور جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ اس نے ہم لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دی۔ جیسے ہی اندر قدم رکھا۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ زنجیروں کو بس کھولا ہی گیا ہے۔ جان تھپےّ اس کے بچے کو گود میں لے کر اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ (جیسا کہ عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی ہے) "یہ وہ لمحہ ہے، جب آپ اپنے دوستوں کے ساتھ اور وہ آپ کے ساتھ آخری ملاقات کریں گے۔" اس پر سقراط کراتیو کی جانب مڑا اور اس سے کہا۔

"کراتیو! اس کو ذرا گھر تو پہنچاؤ......"

کراتیو کے نوکر، اس کو روتے، بلکتے...... سینہ کوبی کرتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ جب وہ چلی گئی تو سقراط نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے...... ذرا نیچے جھک کر...... اپنے پیروں کو رگڑا اور کہنے لگے۔ "خوشی بھی کیا نرالی چیز ہے...... اس کا دکھ کے ساتھ کتنا انوکھا رشتہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے برعکس قرار دیے گئے ہیں۔ کیوں یہ ایک ہی وقت، ایک ہی ساتھ...... انسان کے پاس موجود ہوتے ہیں...... لیکن پھر/ بھی ان میں سے ایک کو پانے کے لیے دوسرے کو بھی ضبط کرنا پڑتا ہے...... ان کا وجود دو ہوتا ہے...... لیکن وہ ایک ہی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسوپ کو اس کا خیال ہوتا تو وہ ضرور ہی اس بارے میں ایک ایسی کہانی تخلیق کرتا، جس میں وہ خدا تعالیٰ کو ان دونوں کی لڑائی کو نپٹانے کی کوشش کرتے ہوئے دکھاتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے، پھر بھی اس کے دونوں کناروں کو ملا دیا، اور

یہی وجہ ہے کہ ان میں سے جب ایک کو آنا ہوتا ہے تو دوسرا بھی اس کے پشت پر موجود ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں خود اپنے تجربے سے جانتا ہوں۔ میرے پیروں کو...... زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد، مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔"

اس پر سیبیس نے کہا" میرے لیے کتنی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ایسوپ کو یاد کیا...... اس سے مجھے ایک سوال یاد آیا...... یہ سوال کتنوں نے پوچھا ہے اور مجھ سے شاعر اوینس نے یہی سوال پرسوں پوچھا تھا۔ وہ ضرور یہ سوال پھر پوچھے گا۔ اس لیے اگر آپ کی خواہش ہو کہ میں اس کا جواب دوں...... تو مہربانی کر کے مجھے بتایئے کہ میں کیا جواب دوں؟ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ آج کل جیل میں ایسوپ کی کہانیوں کو شاعری میں کیوں لکھ رہے ہیں اور ساتھ ہی اپولو کے اعزاز میں یہ تعریفیں کو لکھیں جب کہ آپ نے ساری زندگی میں کبھی شاعری نہیں کی۔"

سقراط نے جواب دیا کہ اوینس سے صحیح بات ہی کہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ یا اس کی شاعری کے ساتھ، کوئی مقابلہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں...... ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اپنے خوابوں کو پانے کے لیے...... اپنے شبہات کو دور کر سکتا ہوں یا نہیں۔ مجھے زندگی بھر، اپنے خوابوں کے ذریعہ شاعری کرنے کی تلقین ملتی رہی۔ مجھے یہ خواب کبھی ایک شکل میں...... اور کبھی دوسری طرح...... سامنے آئے۔ لیکن ہر بار یہ اشارہ ملتا یا ایسے الفاظ سننے کو ملتے کہ "سقراط! تم شاعری کی جانب دھیان دو...... اور ایک دھن تیار کرو...... میں آج تک یہ سمجھتا رہا کہ یہ باتیں مجھے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہیں یا مجھے روکتی ہیں...... کیوں کہ میرے خیال میں، فلسفہ جس کا زندگی بھر مطالعہ کیا...... وہ سب سے اچھی اور عظیم شاعری ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ خواب مجھے وہی کام کرنے کو کہتے ہیں جو میں پہلے سے کر رہا ہوں۔ ٹھیک اسی طرح...... جس طرح دیکھنے والے دوڑ کے مقابلے میں حصہ لینے والے ایک فرد سے دوڑنے کے لیے کہتے ہیں جبکہ وہ دوڑ میں حصہ لے رہا ہے۔ لیکن مجھے اپنے سوچنے کے انداز پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ شاعری کا سبب روایتی معنی سے ہے۔ اب موت کی سزا کا اعلان ہونے کے باوجود تہوار کی وجہ سے سزا پانے میں دیر ہوئی۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر میں نے اپنے خوابوں کے مطابق، کچھ نظموں کی تخلیق کرنے کو سوچا، میں نے سب سے پہلے تہوار کے ایشٹ دیوتا کی شان میں حمد لکھی۔ اور پھر یہ سوچا کہ شاعر کہلانے کے لیے صرف لفظوں کو تخلیق کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان میں کہانیوں کا بھی

وجود ہونا چاہیے۔ لیکن میں کہانی کار نہیں ہوں...... اس لیے میں نے ایسوپ کی کچھ کہانیوں کو لے کر نظموں میں ترجمہ کیا۔ مجھے سب سے پہلے اس کا خیال آیا تھا...... اور چونکہ اس کی تخلیقات میرے پاس موجود تھیں۔ سیبیس! تم یہ ساری باتیں اوینس کو بتانا اور اسے خوش رہنے کی تلقین کرنا۔ تم یہ بھی کہنا کہ اگر وہ عقلمند ہے تو میرے نقش قدم پر چلنے میں دیری نہیں کرے...... اور یہ بھی کہ آج میرا جانا یقینی ہے...... اس لیے کہ ایتھنیس کے باشندوں کی یہی خواہش ہے۔

سمیعس نے کہا: "کیسا پیغام اور کس شخص کو؟ میں ہمیشہ اس سے ملتا رہتا ہوں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کی رائے کو صرف مجبوری کی حالت میں ہی اپنا سکتا ہے۔"

"کیوں، اوینس ایک فلسفی مفکر نہیں......؟" سقراط نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو ہے......" سمیعس نے کہا۔

"تب وہ...... یا...... کوئی مفکر و فلسفی انسان مرنے کا خواہش مند ہو سکتا ہے...... لیکن ہاں!...... وہ خودکشی نہیں کرتا...... کیوں کہ ایسا کرنا کائنات فطرت کے خلاف ہے......"

اس وقت اس نے اپنے بدن کے رخ کو بدلا اور ٹانگوں کو چارپائی سے نیچے کر کے، اپنی باقی باتیں بیٹھ کر جاری رکھیں۔

اب سیبیس نے پوچھا: "آپ ایسا کیوں کہتے ہیں کہ انسان کو خودکشی نہیں کرنی چاہیے اور ایک فلسفی کو مرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے؟" سقراط نے سیبیس اور سمیعس کو جواب دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم دونوں فیلولائس کے شاگرد ہو...... کیا تم لوگوں نے اس کو کبھی اس موضوع پر بولتے ہوئے نہیں سنا؟"

"سنا تو ہے...... مگر سقراط ان کی زبان صاف نہیں تھی۔"

"میرے لفظوں میں ان کے خیالات پوشیدہ ہیں۔ میں نے جو کچھ سنا ہے...... وہ ضرور دہراؤں گا...... اور ہاں چونکہ میں بہت جلد یہاں سے روانہ ہونے والا ہوں، اس لیے مجھے فوراً اپنے سفر کے متعلق سوچنا ہے...... لیکن اس کی فطرت کے موضوع پر بولنا اچھا نہیں لگے گا۔ اس لمحے اور آفتاب غروب ہونے کے بیچ مجھ سے اور کون بھلا کام ہو سکتا ہے؟"

"ہاں تو فرمائیے کہ خودکشی کو غلط کیوں مانیں۔ میں نے یقیناً یہ باتیں فیلولائس کی زبانی بھی سنی تھیں...... جب وہ میرے ہمراہ تھیبس میں قیام پذیر تھے۔ وہی فیلولائس جن کے بارے میں آپ ابھی پوچھ رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں جو ان کی باتوں کو جانتے ہیں...... ان لوگوں کی باتوں کا مطلب کبھی بھی سمجھ نہیں پایا۔"

سقراط نے جواب دیا۔ "ان باتوں کو سمجھنے کا وقت آئے گا...... میرے خیال میں تم اس بات پر حیران ہو کہ جب دوسری بری باتیں کسی خاص حالت میں کچھ دوسروں کے لیے بھلی ہو سکتی ہیں تو موت کی بات کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر انسان کی بھلائی مرنے میں ہے تو اس کو خود وہ اپنا فائدہ مند کیوں نہیں بنائے؟ اسے دوسروں کی رضامندی کا کیوں انتظار کرنا ہوتا ہے؟"

سیبیس نے کہا۔ "ہاں بالکل مانتا ہوں۔"

"اچھا اگر تمہاری ذاتی جائداد میں سے مثال کے طور پر کوئی بیل یا گدھا ختم کرنے کی ہمت کرلے، جب کہ تم نے ان کو مارنے کے لیے ابھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا ہو تو کیا تم کو اس پر غصہ نہیں آئے گا۔ اور تم ان کو سزا نہیں دو گے؟"

"ضرور دوں گا۔" سیبیس نے کہا۔

"اگر اس مسئلہ کو اس نظریئے سے دیکھا جائے تو یہ کہنا ہوگا کہ نہ صرف فرد کو خودکشی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کو وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب تک کہ خدا نہیں بلائے، جیسا کہ اس نے مجھے بلایا ہے۔"

سیبیس نے جواب دیا: "ہاں سقراط! آپ نے جو کچھ فرمایا وہ ٹھیک ہی لگتا ہے۔ لیکن ابھی ابھی آپ نے کہا ہے کہ فلسفیوں و مفکروں کو مرجانا چاہیے اور اب آپ اس سچائی سے ملتے جلتے اصولوں کی بات کر رہے ہیں کہ خدا ہی میرا محافظ ہے اور ہم لوگ اس کی جائداد۔ ان دونوں باتوں کو کیسے اپنایا جا سکتا ہے؟ وہ افراد جو قابل و معزز ہیں ...... اس کام کو نہیں کرتے، جس میں ان کا اصول سب سے اعلیٰ حکومت کرنے والے یعنی دیوتاؤں کے ذریعے ہو رہا ہے تو یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں سوچ سکتا ہے کہ دیوتاؤں کی نگہبانی سے آزاد ہونے پر وہ ان سے کہیں زیادہ اچھی طرح اپنا دھیان رکھ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایک کم عقل فرد یہ سوچ کر کہ اپنی نگرانی سے بھاگ کر میں فائدہ میں رہوں گا۔ اس کو یہ معلوم نہیں رہتا ہے کہ اس کا فرض، اسے بھلائی سے دور نہیں بھگاتا اور اپنی جگہ پر ٹک کر رہنا ہی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتا ہے کہ بھاگ نکلنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو عقل مند ہوتا ہے وہ ہمیشہ اپنے سے زیادہ عقل مند کے نزدیک رہنا پسند کرے گا۔ ہاں سقراط! یہ بحث ابھی کہی گئی باتوں کے برعکس ہے۔ کیوں کہ اس نظریے کے مطابق موت کے وقت عقل مند و باہوش انسان کو غم زدہ اور بے وقوف لوگوں کو خوش ہونا چاہیے۔"

سیبیس کے جوش کو دیکھ کر سقراط خوش ہونے لگا۔ پھر ہماری جانب مڑ کر کہنے

لگا۔ ”یہ فرد ہمیشہ پوچھ تاچھ کرتا رہتا ہے اور کسی بھی بات کو سن کر فوراً مانتا نہیں ہے۔“

اس بات پر سیبیس نے کہا۔ ”یقیناً سیبیس کی پرزور مخالفت کی گئی ہے۔ کیوں کہ وہ فرد جو حقیقی معنیٰ میں قابل اور عقل مند ہے اپنے سے بہتر محافظ کو معمولی سی بات پر چھوڑ کر بھاگنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میرے خیال میں سیبیس آپ کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ آپ ہم لوگوں اور دیوتاؤں کو (جن کو آپ ہمارا محافظ مانتے ہیں) چھوڑنے کے لیے بہت ہی زیادہ خواہش مند ہیں۔ سقراط نے جواب دیا۔ ”تمہاری بات ٹھیک ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں صفائی پیش کروں۔“

”ہم آپ سے یہی امید کرتے ہیں۔“ سیبیس نے کہا۔

تب مجھے تمہارے سامنے صفائی پیش کرنی پڑے گی۔ سیبیس اور سمیعس میں یہ ماننے پر تیار ہوں کہ مجھے مرنے پر دکھ ہونا چاہیے لیکن دو باتیں ذہن میں ہیں۔ ایک یہ کہ میں بھلے اور قابل دیوتاؤں کے پاس جا رہا ہوں (اس بات کی سچائی پر مجھے پورا یقین ہے) دوسری یہ کہ میں ان مرے ہوئے لوگوں کے پاس جا رہا ہوں۔ جو ان لوگوں سے کہیں اچھے ہیں جن کو میں پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہوں (حالانکہ اس دوسری بات کے سلسلے میں اس قدر یقین نہیں رکھتا ہوں) اور یہی وجہ ہے کہ میں غم زدہ نہیں ہوں جیسا کہ مجھے ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ مجھے پوری امید ہے کہ مرنے والوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ دکھ ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے **نیک خصلت** لوگوں کو ملنے والے پھل، برے لوگوں کو ملنے والے پھل سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔“

”کیا سقراط! آپ اپنی سوچ و فکر کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟“ سمیعس نے پوچھا۔ ”کیا آپ ان باتوں کو ہم لوگوں کے سامنے نہیں رکھیں گے؟ کیا ہم لوگوں کو ان خیالات سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیں گے؟ اس کے علاوہ اگر آپ ہم لوگوں کو صفائی پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھا جائے گا کہ آپ نے اپنے اوپر لگائے ہوئے الزامات کی صفائی پیش کر دی۔“

”ٹھیک ہے، میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا، لیکن پہلے ذرا کراتیو کی باتیں سن لوں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

اس پر کراتیو نے کہا...... ”سقراط! مجھ کو صرف یہ کہنا ہے کہ جس عہدیدار کے ہاتھ سے آپ کو زہر پینا ہے، وہ مجھ سے کہتا رہا ہے کہ آپ کو یہ پیغام دے دوں کہ آپ کو زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ باتیں کرنے سے جسم میں حرارت پیدا ہو گی، جو زہر کے رد عمل کی راہ میں رکاوٹ کھڑا کرے گی۔ اس وجہ سے کبھی کبھی مجبور ہو کر زہر کی

دوسری یا تیسری خوراک بھی دینی پڑتی ہے۔"

"اس کو اپنے کام کا دھیان رکھنا چاہیے اور ضرورت پڑنے پر دوسری یا تیسری بار زہر پلانے کے لیے تیار رہنا چاہیے، بس!"

"کراتیو نے کہا کہ مجھے معلوم تھا تمہارا جواب یہی ہوگا، لیکن میں اس کی خواہش کی وجہ سے مجبور تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" سقراط نے کراتیو سے کہا اور پھر سمیعس اور سیبیس سے اس نے کہا...... "اب تم لوگوں کے سامنے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موت کو نزدیک دیکھ کر ایک فلسفی و مفکر انسان کو خوش رہنا ٹھیک ہے اور یہ بھی کہ موت کے بعد وہ مزید خوشی پانے کی امید کر سکتا ہے...... ایسا کیوں؟ میں اب یہی سمجھانے کی کوشش کروں گا، سمیعس اور سیبیس، یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ اس بات کو غلط سمجھیں۔ دراصل وہ لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے ہیں کہ فلسفی ہمیشہ ہی موت کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اس حالت میں موت کے قریب آنے پر وہ غم زدہ کیوں ہو جبکہ وہ اپنی ساری زندگی اس کی ہی تلاش کرتا رہا ہو۔"

اس پر سمیعس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سقراط! آپ کی باتیں سن کر مجھے ہنسی آئی۔ مجھے یہ خیال آیا ہے کہ آپ کی ان باتوں کو سن کر سبھی یہ کہیں گے کہ آپ نے اپنے فلسفوں کو بیان کیا ہے۔ ہمارے گھر پر ہمارے رشتہ دار یہی کہیں گے کہ فلسفی حقیقت میں موت کو ہی زندگی مان کر زندہ رہتا ہے۔"

سمیعس ان لوگوں کا ایسا کہنا یا سوچنا جائز ہے۔ لیکن یہ الفاظ ان کے خیال میں پورا سچ نہیں ہیں۔ کیونکہ سچا فلسفی کس موت کو چاہتا ہے، اس موت کی کیا فطرت ہوتی ہے، اور وہ کس طرح کی موت کے لائق ہے، یہ سبھی باتیں عام آدمی کیا جانے؟ خیر انہیں رہنے دو۔ اس مسئلے پر ہم لوگ آپس میں ہی گفتگو کریں گے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ہم لوگوں کو 'موت' جیسی کسی چیز پر یقین ہے یا نہیں؟"

"بالکل ہے۔" سمیعس نے جواب دیا۔

"کیا یہ روح و جسم کی جدائی نہیں؟ اس جدائی کے دائرے کا پورا ہونا موت ہے۔ جب جسم کو روح چھوڑ دیتی ہے اور روح جسم سے چھٹکارا حاصل کر کے خود میں گھل جاتی ہے، تو یہ حالت موت نہیں تو اور کیا ہے؟

"ہاں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک دوسرا سوال بھی ہے، جس پر متفق ہو جانے سے ہمارے موجودہ مسئلے کا حل

نکلے گا۔ کیا ایک مفکر و فلسفی کو اپنے کھانے پینے جیسے آرام دہ چیزوں کی فکر کرنی چاہیے؟"

"بالکل نہیں" سمیعس نے جواب دیا۔

"اور دوسری آرام دہ چیزوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ ان چیزوں کی فکر کرنی چاہئے کیا؟"

"کسی بھی حالت میں نہیں......"

"اور کیا وہ اپنے جسم کی تسکین کے لیے دوسرے وسائل کی فکر کرے گا؟ مثال کے طور پر بیش قیمت لباس، زیورات...... جوتے چپل کی فکر اسے لگی رہے گی کہ فطرتی ضرورت کی چیزوں کے علاوہ باقی چیزوں سے اسے نفرت ہوگی؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال کے مطابق ایک سچا فلسفی ان چیزوں سے نفرت ہی کرے گا۔"

"تو کیا تم اس بات کو نہیں مانتے ہو کہ وہ جسم کو چھوڑ کر صرف روح کا ہی دھیان رکھتا ہے؟ وہ جتنا بھی اس سے ہو سکے جسم سے دور بھاگ کر روح میں ڈوبے رہنا چاہے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"اس طرح کی باتوں میں، دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ، صرف فلسفی ہی، ایک الگ ڈھنگ سے روح و جسم کے رشتے کو بیان کرتے ہیں۔"

"ہاں۔"

"جب کہ سمیعس...... دنیا میں دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ عیش و عشرت کی زندگی سے بیگانہ ہیں وہ زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے ہیں اور جو لوگ ان چیزوں سے نفرت کرتے ہیں...... وہ مردہ انسانوں کی طرح ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک نہیں۔"

"اچھا...... قابلیت کی حقیقت کے متعلق ہمارے کیا خیال ہیں؟ اگر اس کا تجزیہ کرنے کے لیے "جسم" کو بھی سامنے رکھا جائے تو یہ مددگار ثابت ہوگا یا اس کے برخلاف؟ میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے اور سننے کی طاقت میں کوئی سچائی ہے کیا؟ کیا وہ...... جیسا کہ شاعر لوگوں کا خیال ہے، جھوٹے گواہ نہیں؟ اور اگر یہ جھوٹ اور صاف ہے، تو باقی اعضاء کے متعلق کیا کہا جائے، کیونکہ یہ اعضاء تو تجربے حاصل کرنے کے وسیلہ میں اہم ہیں۔

"ضرور......" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر روح کو سچ کا احساس کیسے ہو؟ دھیان رہے کہ جسم کی مدد سے کسی بھی چیز پر فکر کرنے سے دھوکا ہو جاتا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے!"

"تو کیا حقیقت کا راز اگر اسے حاصل ہو تو خود اپنے وجود کے اندر سوچنا ہو گا......
ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں......"

"اور سوچنے کی طاقت اس وقت ہی کامیاب ہوتی ہے جب کہ وہ روح میں جذب ہو گئی ہو اور آواز، دیکھنا، درد یا آرام یہ سب کچھ اس کے کام میں کوئی پریشانی نہیں ڈالیں یعنی روح پر جسم کا کوئی اثر نہیں ہو......وہ آزاد ہو......اسے صرف سچائی جاننے کی خواہش ہو......"

"ضرور ہی......یہ ٹھیک ہے......"

"اس طرح ایک فلسفی اپنے جسم کا استعمال کرتا ہے۔ اس کی روح......اس کے جسم سے الگ تھلگ ہو کر زندہ رہنا چاہتی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"ہاں! سمیعس، ایک اور بات ہے......زندہ جاوید انصاف......یہ کوئی چیز ہوتی ہے یا نہیں۔؟"

"ضرور ہوتی ہے......"

"اور ہمیشہ زندہ رہنے والا حسن اور خوشی......"

"ہاں! وہ بھی ہوتے ہیں......"

"لیکن کیا ان میں سے کسی کو بھی کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

"بالکل نہیں......"

"کیا تم کبھی کسی دوسرے اعضاء سے ان کو محسوس کر پائے؟ کیا انسانی اوصاف کو ان کے جسم کے ذریعے محسوس کیا ہے؟ یا پھر ایسا کہیں، کیا وہی لوگ ان چیزوں کو حاصل نہیں کرتے جو اپنے ذہن کی آنکھوں سے......ہر ایک نقطے کو نہایت باریکی سے سمجھ لیں؟"

"یقیناً"

"اور صرف وہی لوگ ان چیزوں کا صحیح علم حاصل کریں گے، جو ان میں ہر ایک کو ذہن کی آنکھوں سے دیکھیں اور مراقبے میں اپنی آنکھوں یا کسی دوسرے اعضاء کا استعمال نہیں کریں، بلکہ صرف اپنے ذہن کے چراغ سے اور اس کی مدھم روشنی میں ہر چیز کی حقیقت کی تلاش کریں، اور وہ جو آنکھوں، کانوں یا یوں کہو کہ سارے جسم سے، جتنا بھی ہو سکے آزاد ہو جائے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ساری چیزیں صرف دھوکا ہیں، جو کہ روح کو مسخ کر کے سچائی اور علم کو حاصل کرنے میں حائل ہوتی ہیں۔ اگر ایسے آدمی کو نہیں، تو سچائی کا علم اور

کس کو حاصل ہو سکتا ہے......؟"

سمیعس نے جواب دیا "سقراط تو آپ کی باتوں سے عجیب و غریب سچائی چھلکتی ہے۔"

"جب ایک حقیقی فلسفی ان سب باتوں کو سمجھ لے تو وہ اس طرح نتیجہ نکالیں گے اور کہیں گے ...... کیا ہم نے سوچنے کا ایسا راستہ نہیں پایا ہے، جو ہمیں اور ہمارے بحث و مباحثوں کو نتیجے تک پہنچائے؟ وہ کیا ہے؟ یہی کہ جب تک ہم لوگوں کا ساتھ جسم سے ہے اور جب تک "روح" جسم کی برائیوں سے ملوث ہے، ہماری خواہشات پوری نہیں ہوں گی اور ہماری خواہش سچ کو پانا ہے کیونکہ صرف کھانے پینے کی ضرورت ہونے کی وجہ سے ہمارے دکھ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں سچائی کی کھوج میں روکاوٹ بنتی ہیں۔ ان سب وجوہات سے ہم لوگ پیار و محبت، ہوس، ڈر اور اس طرح کی امنگوں سے یا دوسری بے وقوفیوں کو اپنانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے ان لڑائیوں کی، جنگوں کی ......اور ان ہنگاموں کی؟ کیا جسم اور اس کی ہوس اس کی وجہ نہیں؟ دولت سے محبت کرنے پر جنگ ہوتی ہے اور جسم کی ضرورت کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح کی سبھی رکاوٹوں کی وجہ سے ہم لوگ فلسفے کی جانب مائل نہیں ہوتے؟ آخری بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم لوگوں کو فرصت ملتی ہے اور ہم لوگ خود کسی موضوع پر سوچتے ہیں تو ہمیشہ ہی جسم جیسے بادل آکر ہم پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ہمارے اندر ہل چل مچا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم پریشان ہو کر 'سچ' کی تلاش نہیں کر پاتے۔ ہم لوگوں کو تجربہ یہ سکھاتا ہے کہ اگر ہم لوگ کسی بھی چیز کا حقیقت میں علم حاصل کرنا چاہیں تو وہ ہم لوگوں کو جسم سے الگ ہو کر ہی مل سکتا ہے۔ جس علم کو ہم لوگ پانا چاہتے ہیں، وہ ہم لوگوں کو اس زندگی میں نہیں، بلکہ موت کے بعد ہی مل سکتا ہے، کیونکہ اگر جسم کو رکھتے ہوئے روح کو حقیقی علم نہیں ملتا تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یا تو عقل حاصل ہو ہی نہیں سکتی ہے اور اگر ہوتی ہے تو موت کے بعد ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ تبھی روح جسم سے الگ رہ کر "خود" میں جذب ہو گی۔ اس زندگی میں ہم لوگ علم کے نزدیک تبھی ہو سکتے ہیں جب ہمارا اپنے جسم کے ساتھ کم سے کم مکالمہ اور ملن ہو۔ اور ہم لوگ جسمانی ضروریات سے بچ کر تب تک 'خود' کو پاک رکھیں جب تک کہ خدا ہم کو اپنی خواہش سے آزاد نہ کر دے۔ اس طرح جسم سے آزاد ہو کر ہم پاک ہو جائیں گے اور ابدیت ملے گی۔ تب ہم لوگ اس بکھرتی ہوئی شعاعوں کو ہر جگہ پائیں گے، جو کہ حقیقت میں سچائی کی روشنی ہے۔

سمیعس! علم سے محبت کرنے والے محبوب اس طرح کی باتیں اور ایسی باتیں کیے بغیر زندہ

نہیں رہ سکتے۔ اس بات کو مانتے ہو کہ نہیں؟"

"ضرور مانتا ہوں...... سقراط"

"لیکن اے دوست! اگر یہ سچائی ہے...... تو مجھے یہ امید کرنی چاہیے کہ اپنے اس سفر کی منزل پاؤں گا تو مجھے اپنی ساری زندگی کا پھل ملے گا۔ اس لیے میں یہ سفر نہایت خوشی سے پورا کر رہا ہوں۔ صرف میں ہی نہیں، بلکہ ہر وہ شخص، جس کو یہ یقین ہے کہ اس نے ابدیت پائی...... تو اس سفر میں خوشی محسوس کرے گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" سمیعس نے جواب دیا۔

"اور یہ پاکیزگی کیا ہے؟ بس یہی روح کا جسم سے الگ ہونا یا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، روح کے مطابق...... جسم سے الگ ہو کر، ہر سمت سے خود کو سمیٹ کر، خود میں ہمیشہ کے لیے جذب ہو جانا۔ جتنا بھی اس سے ہو سکے، دوسری زندگی کے مانند، اس زندگی میں بھی اکیلے ہی اپنے مقام پر رہنا، جسم جیسی زنجیروں سے آزاد ہونا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"اور روح کا جسم سے آزاد ہونا ہی موت ہے؟"

"ہاں، کہتے ہیں۔"

"اور سچے مفکر یا فلسفی ہی روح کو آزاد کرانا چاہتے ہیں...... اور کیا یہ ان کا مقصد نہیں؟"

"ہاں، ہے تو......"

"اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، اگر کوئی شخص جتنا بھی اس سے ہو سکے، مردہ بن کر رہنا چاہتا ہو، اور وہی شخص حقیقی موت کے آنے پر غم کرے، یہ ایک مضحکہ خیز بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

"یہ بات تو صاف ہی ہے۔"

"اور سمیعس، جیسے فلسفی ہمیشہ موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس سے دوسروں کے مقابلے میں ان کو ذرا بھی خوف نہیں ہوتا۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ لوگ جسم کے دشمن ہمیشہ اور ہر طرح سے رہے ہیں صرف روح کی ہی دوستی چاہتے ہوں اور پھر ان کی یہی خواہش پوری ہوتی ہے تو ان کا اخلاق کیسا ہوگا، اگر وہ لوگ اس موقع پر کانپنے لگیں یا غم کریں، جبکہ انہیں خوشیاں منانا چاہئیں، تب وہ لوگ اس جگہ پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہوتے ہیں، جہاں پہنچ کر انہیں زندگی بھر کی خوشیاں ملنے

کی امید ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنے دشمن یعنی جسم سے بھی آزادی ملتی ہے۔ خدا کے یہاں دنیاوی آرام ملے گا۔ وہاں پر ہم اپنی بیوی اور بیٹوں سے ملیں گے، ان سے بات چیت کریں گے، اس طرح کی باتیں ہر کسی کو خدا کے پاس جانے کے لیے متوجہ کرتی ہیں۔ لیکن جو علم سے سچا پیار کرتا ہو اور کامل یقین رکھتا ہو کہ وہ صرف اوپر ہی اس طرح کے آرام پاسکتا ہے، کیا وہ کبھی موت کو آتے دیکھ کر غم زدہ ہو سکتا ہے؟ کیا وہ خوشی سے روانہ نہیں ہوگا؟ اے دوستوں! اگر وہ سچا فلسفی ہوگا تو بخوشی وہاں جانے پر رضامند ہوگا، اور اگر یہ سچ ہے، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، تو موت سے ڈرنا اس کے لیے بہت ہی بے وقوفی و بزدلی کی بات ہوگی۔"

"بلاشبہ بزدلی ہی ہوگی...... "سیمس نے جواب دیا۔

"اور اگر موت پر کوئی آدمی غم زدہ ہو تو اس کی ہچکچاہٹ کیا اس بات کا پکا ثبوت نہیں کہ وہ علم کو سچے دل سے پیار نہیں کرتا ہے، بلکہ جسمانی محبت کے ساتھ ساتھ اس کو دولت اور رتبہ دونوں کا لالچ ہو؟"

"ہاں ہو سکتا ہے......"

"اور ہاں، سمیعس، کیا ہمت خاص طور پر فلسفہ کا پہلو نہیں"؟

"ہاں ہے تو......"

"پھر صبر کو دیکھو...... عام لوگ بھی جانتے ہیں کہ صبر کرنا دراصل اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ کیا صبر ایسی طاقت نہیں، جو صرف جسم سے نفرت کرنے والوں اور فلسفیوں میں ہی ہو سکتا ہے؟"

"یقیناً ہو سکتا ہے۔"

"کیونکہ اگر دوسرے لوگوں کے متعلق سوچا جائے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس میں 'ہمت' اور 'صبر' ہونا چاہیے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے کہا کہ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ زیادہ تر لوگ موت کو ایک بہت بڑی بلا سمجھتے ہیں۔"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔" سمیعس نے کہا۔

"اور ہمت ور لوگ موت سے زیادہ بھیانک بلاؤں سے ڈرنے کی وجہ سے موت کا سامنا کرتے ہیں نا؟"

”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“

”اس طرح فلسفیوں کو چھوڑ کر دوسرے سبھی لوگ خوف زدہ ہونے کی وجہ سے ہی بہادر بنتے ہیں اور یہ بات بھی کس قدر عجیب و غریب ہے کہ کوئی شخص ڈرپوک ہونے کی وجہ سے بہادر ہوتا ہے۔“

”ہاں، بہت ہی عجیب و غریب بات ہے۔“

”اور کیا صبر کرنے والے لوگوں کا بھی یہی انجام نہیں ہے؟ وہ لوگ صابر ہیں کیونکہ ان میں صبر کرنے کی قوت نہیں ہے۔ یہ قول عجیب و غریب ہیں، لیکن پھر بھی اس 'صبر' کے متعلق سچائی یہی ہے۔ کیونکہ کچھ ایسی بھی آسائشیں ہیں جن کو لوگ کھونا نہیں چاہتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی آرزو میں، دوسری آسائشوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان پر دراصل دوسری آسائشوں کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ لوگ کچھ آسائشوں کے ذریعے ہارنے کے بعد دوسری آسائشوں پر فتح حاصل کرتے ہیں اور میرے کہنے کا یہی مطلب ہے کہ ایک طرح سے وہ لوگ صبر نہ کرنے پر صابر بنتے ہیں۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“

”اور پھر ایک ڈر یا آسائش یا درد کے دوسرے خوف، آسائش یا درد سے تبدیل کرنا اور پھر بڑے کا چھوٹے کے ساتھ، جیسے وہ سکے ہوں، کوئی اصل خرید و فروخت تو نہیں ہے۔ میرے عزیز دوست سمیعس، کیا 'علم' ہی ایسا سچا سکہ نہیں، جس کے ساتھ ہر چیز کی خرید و فروخت کرنا چاہئے؟ صرف اس کے ذریعے ہی کسی بھی چیز کی صحیح خریداری ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ہمت ہو، صبر ہو یا انصاف۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس خوف یا آرام یا دوسرے بھلے و بُرے کرموں کا پھل ہے۔ لیکن مذہب جو اچھی باتوں سے بنا ہوا ہے، وہ صرف مذہب کا نام ہی رہ جاتا ہے، جبکہ ان چیزوں کا 'علم' سے الگ ہو کر آپس میں تبادلہ ہوتا ہے اور اس مذہب میں تب کسی طرح کی صفائی یا سچائی یا حقیقت نہ رہ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف سچائی میں ان سب چیزوں کو پاک کیا جاتا ہے اور صبر، انصاف، بہادری اور علم و امن، کے ہی حقیقی اشکال ہیں۔ اس بنیاد پر ان باتوں کو کہنے والے سچے قرار دیے جاتے ہیں۔ یہ کوئی بے وقوفی کی بات نہیں اس لیے سمیعس اور سبیس! میرا یقین ہے کہ تم سے اور دنیا میں واقع اپنے مالکوں سے بچھڑنے پر میرا دکھ نہ کرنا ہی ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے مرنے کے بعد، خدا کے یہاں اچھے دوست اور مالک ملیں گے۔ زیادہ تر لوگ اس بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ اس لیے اچھا ہی ہو گا کہ میں ایتھنس کے 'ججوں' سے زیادہ تمہیں اپنے لفظوں

کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

سیبیس نے جواب دیا۔ "میں آپ کی کہی گئی باتوں کو مانتا ہوں لیکن لوگ روح کے متعلق بے یقینی رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روح کو جسم چھوڑنے کے بعد کوئی دوسری جگہ نہیں ملے۔ مرنے کے دن وہ ختم ہو جاتی ہے، جسم سے آزاد ہونے پر وہ دھواں یا ہوا کی طرح فوراً بکھر کر محلول ہو جاتی ہے۔ اگر ان بُرے بندھنوں سے، جن کا چرچہ آپ کر رہے تھے، آزاد ہونے کے بعد وہ صرف اپنی شکل میں ہوتی ہے، تبھی سقراط، آپ کی باتوں کی سچائی ماننے کی امید کرتا ہے، لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انسان کی موت کے بعد بھی روح زندہ رہتی ہے اور اس میں طاقت و عقل ہوتی ہے، اس موضوع پر طویل بحث مباحثہ کرنے کی ضرورت در پیش آئے گی۔"

سقراط نے کہا۔ "سیبیس! تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیوں نہیں ہم لوگ اس موضوع پر تھوڑا بحث مباحثہ کریں؟"

"واہ! میں ان کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا خواہش مند ہوں۔" سیبیس نے کہا۔

اس پر سقراط یوں بولا "مجھے یقین ہے کہ اس وقت میری باتوں کو سننے والا کوئی بھی آدمی، بھلے ہی وہ میرے پرانے دشمنوں میں سے کیوں نہ ہو، وہ مجھے سزاوار نہیں ٹھہرا سکتا۔ خیر تمہارا حکم ہے تو باتیں شروع کریں۔"

"چلو، ہم اس بات پر اپنا ذہن مرکوز کریں کہ انسان کی موت کے بعد اس کی روح خدا کے پاس جاتی ہے یا نہیں۔ مجھے ایک قدیم مقولہ یاد آتا ہے، وہ اس بات کا گواہ ہے کہ روح یہاں سے جا کر اوپر خدا کے پاس رہتی ہے اور یہاں واپس آنے کے بعد دوبارہ جنم لیتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ مرے ہوئے ہی زندہ لوگ جنم لیتے ہیں، تو ہماری پیدائش سے قبل، ہماری روحیں خدا کے پاس اوپر ضرور ہوں گی۔ کیونکہ ایسا نہیں ہوتا، تو پھر ان کا وجود کیسے ہوتا؟"

"ہاں بالکل ٹھیک ہے۔" سیبیس نے جواب دیا۔

"تو ہم لوگ اس سوال پر سوچیں گے۔ صرف انسان کے بارے میں ہی نہیں، بلکہ جانوروں، نباتات اور ہر اس چیز کے بارے میں، جس کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس طرح ذرا ثبوت پانا آسان ہوگا۔ جن چیزوں کا الٹا ہوتا ہے کیا وہ چیزیں ان سے ہی پیدا نہیں ہوتیں؟" میرا کہنے کا مطلب بھلے اور برے، قانون اور غیر قانون جیسی چیزوں سے ہے۔ مثال کے طور پر، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز جو اعلیٰ قرار دی جاتی ہے وہ بہ شکل ادنیٰ ہونے

کے بعد ہی پا سکتی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"اور جو چیزیں چھوٹی ہوتی ہیں وہ کبھی بڑی رہی ہوں گی۔ اور پھر جا کر اس نے چھوٹی شکل پائی ہو گی۔"

"ہاں۔"

"اس طرح کمزور، طاقتور سے اور تیز، ست رفتار سے پیدا ہوتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"کیا یہ سبھی برعکس چیزوں کے بارے میں ہوتا ہے؟ اور کیا ہم لوگ اس بات کو اچھی طرح مانتے ہیں کہ یہ سبھی چیزیں اپنی برعکس چیزوں سے پیدا ہوتی ہیں؟

"ہاں! کیوں نہیں؟"

"اور ان چیزوں کے برعکس ہونے میں کیا دو ایسی درمیانی چیزیں نہیں، جو ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ ایک سے دوسرے کی جانب اور پھر واپس۔ اس طرح جہاں ایک زیادہ اور دوسرا کم ہو، وہ بڑھنے گھٹنے کا ایک درمیانی حصہ بھی ہو گا۔ جو پنپتا رہتا ہے، اس کو بڑھتا ہوا کہتے ہیں اور جو کم ہوتا ہے اس گھٹا ہوا۔"

"ہاں۔" اس نے کہا۔

اور بھی دوسری چیزیں ہیں جیسے بٹ جانا، محلول ہو جانا، ٹھنڈا ہونا اور گرم ہونا، جن میں ویسے ہی ایک دوسرے کے اندر اور باہر ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ باتیں چیزوں کے برعکس یا برخلاف ہونے کے متعلق ٹھیک ہے، حالانکہ اس بات کو ہمیشہ لفظوں کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں ایک دوسرے کے درمیان ایک طرح کی رفتار یا سلسلہ سا بنا رہتا ہے، ٹھیک ہے نا..... ؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا

"تو کیا زندگی کا کوئی برعکس نہیں..... جیسے سونے کا جاگنا ہے؟"

"ہونا چاہیے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"موت۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر یہ ایک دوسرے کے برخلاف ہیں تو یہ ایک دوسرے سے پیدا بھی ہوتے ہیں۔ اور اسکے بھی دو درمیانی سلسلے ہوں گے؟"

"ضرور...... ہونا چاہیے۔"

"تو لو......" سقراط نے کہا۔ "جن چیزوں کے برعکس چیزیں ہوتی ہیں...... جن کی باتیں میں نے کی ہیں، ان میں سے ایک جوڑی کے متعلق تفصیلات میں پیش کروں گا اور اس کے درمیانی سلسلے کا بھی، پھر تم میرے لیے دوسری جوڑی کا کرنا۔ اس جوڑی میں ایک کو میں نے نیند کہا اور دوسرے کو جاگنا۔ سونے کا برعکس جاگنا ہے اور نیند سے جاگنا پیدا ہوتا ہے اور جاگنے سے ہی نیند، ایک حالت میں پیدا ہونے کے سلسلے کو سو جانا اور دوسری میں جاگنا کہا جائے گا، کیوں ٹھیک ہے؟"

"ہاں، میں اس خیال سے بالکل رضامند ہوں۔"

"تو پھر تم ذرا میرے لیے موت اور زندگی کا بھی اسی طرح بیان کرو۔ کیا موت زندگی کے برعکس نہیں؟"

"ہاں۔"

"اور مری ہوئی چیزوں سے؟"

"جواب میں صرف 'جاندار' ہی کہہ سکتا ہوں۔"

"اس طرح...... اے سیبیس...... "جاندار" چاہے وہ آدمی کی شکل میں ہو یا چیز کی شکل میں...... موت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔؟"

"یہ بات تو صاف ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری روحیں 'پرلوک' یعنی دوسری دنیا میں رہتی ہیں؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"اور اس سلسلے میں ایک رابطہ براہ راست ہوتا ہے کیونکہ موت کا سلسلہ تو یقیناً ہی براہ راست ہے"۔

"بلاشبہ۔"

"تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے؟ کیا ہم لوگ اس بات کو مانیں کہ موت کائنات فطرت کا ایک رخ ہے؟ اور کیا ہم لوگوں کو موت کو بھی پیدائش کا ایک پہلو نہیں ماننا چاہیے؟"

"ضرور ماننا چاہئے۔"

"وہ سلسلہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"دوبارہ جنم لینا۔"

"دوبارہ جنم لینے سے مطلب، اس دنیا میں پھر سے موت کا جنم لینا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"تو یہ ایک نئی بحث ہے، جس کی بنیاد پر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان موت سے پیدا ہوتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے موت انسان سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ٹھیک ہے تو اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ مرے ہوئے انسان کی روحیں ایسی جگہ پر رہتی ہیں، جہاں سے وہ دوبارہ واپس آتی ہیں۔"

"ہاں سقراط! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم لوگوں کی پہلی باتوں کے مطابق یہ نتیجہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔"

"اور سیبیس ہم لوگوں کا ایسا سوچنا بے کار نہیں تھا۔ میرے خیال میں اس بات کو اس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی بھی چیز کی تخلیق ایک سیدھی لکیر کی طرح ہوتی تو کائنات فطرت نقصان و فائدہ کا اصول مرتب نہیں کرتی یا ایک دائرہ نہیں ہوتا، کسی چیز کا یکجا ہونا یا الگ ہونا نہیں ہوتا۔ اور جیسا کہ تم جانتے ہو کہ سبھی چیزیں آخر میں یکجا ہو جاتی ہیں اور پھر وہ پیدا نہیں ہوتی ہیں۔"

"آپ کی باتوں کا مطلب؟" اس نے پوچھا۔

"صرف ایک سیدھی سی بات ہے۔ میں اس کو نیند کی مثال کے ذریعے پیش کروں گا۔ تم جانتے ہو کہ اگر سونے یا جاگنے کا سلسلہ نہیں ہوتا تو نیند میں ڈوبے ہوئے اندومیون کی کہانی کا آخر میں کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، کیونکہ دوسری چیزوں کے سو جانے کے بعد اس کو ان دوسری چیزوں سے الگ نہیں سمجھا جاتا، اور چیزوں کو بانٹنا نہیں بلکہ صرف محلول ہو جانا ہوتا تو بکھرے ہوئے پنڈ کے ذریعے وہ دوبارہ، پھر سے اپنی شکل میں آجاتا۔ اس طرح پیارے سیبیس! اگر ساری زندہ چیزیں مر جاتیں اور مرنے کے بعد مردہ حالت میں ہی رہتیں، ان کا دوبارہ جنم نہیں ہوتا تو آخر میں ساری چیزیں فنا ہو جاتیں اور ایک بھی زندہ چیز نہیں بچتی، اس کا کوئی نتیجہ نکلتا کیا؟ کیونکہ اگر زندہ چیزیں، کسی دوسری چیزوں سے پیدا ہوتی اور وہ چیزیں بھی مر جاتیں تو کیا آخر میں سبھی چیزیں فنا نہیں ہوں گی؟"

"اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ سقراط مجھے آپ کی باتیں بالکل ٹھیک لگتی ہیں۔" سیبیس نے کہا۔

اس نے کہا...... "ہاں سیبیس! یہ تو ہے ہی اور میرے نظریے میں ایسا ہونا چاہئے۔ ہم

لوگوں نے ان باتوں کو اپنایا ہے اور مجھے اس بات پر یقین ہے کہ انسان کا دوبارہ جنم ہوتا ہے۔ اور مرنے والے لوگوں کی روحوں کا وجود ہوتا ہے۔"

اس پر سیبیس نے کہا...... "سقراط! اگر آپ کی باتوں کا 'علم' صرف 'یادداشت' ہے تو دوبارہ جنم لینے کے اصول کو مانا جاسکتا ہے۔ جس میں ہم نے یہ سیکھا ہے کہ یاد کرنے کی طاقت جب علم کی شکل میں ڈھلتی ہے، اور یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب روح انسان کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے کسی خاص مقام پر قیام پذیر ہو۔ اس طرح روح کی ابدیت کی یہ دوسری مثال ہے۔"

سمیس بیچ میں بول اٹھا...... "لیکن سیبیس، مجھے یہ بتاؤ کہ اس 'یادداشت' کے اصول کی کوئی مثال ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔"

سیبیس نے کہا۔ "سوالات کے ذریعے ایک اچھی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اگر تم کسی ڈھنگ سے سوالات پوچھتے ہو تو وہ ٹھیک ٹھاک اس کا جواب دے گا، لیکن جب تک اس کو 'علم' اور بحث و مباحثہ کا پہلے سے ہی علم نہیں تو کیا وہ ایسا کر سکے گا؟ اور اگر اس کو لکیروں کے ذریعے یا ویسی ہی کسی دوسری چیزوں کے ذریعے پاس لے جائیں تو یہی بات زیادہ صفائی سے سامنے آئے گی۔"

اب سقراط نے کہا...... "لیکن سمیس، اگر تم کو اب بھی یقین نہیں، اور اس بات کو دوسرے ڈھنگ سے دیکھیں، تو کیا تم میری باتوں سے راضی ہو گے؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں ابھی بھی اس بات پر شک ہے کہ 'علم' 'یادداشت' ہی ہے؟"

"مجھے شک تو کوئی نہیں ہے" سیمس نے کہا۔ "لیکن میں پھر بھی سننا چاہتا ہوں کہ آپ کیا کہنے والے تھے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں یہ کہتا...... اگر میرا خیال ٹھیک ہے تو ہم کو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ انسان جس چیز کو یاد کرتا ہے وہ یقیناً پہلے ہی اس کی جانی پہچانی ہوتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اس 'علم' اور 'یادداشت' کی فطرت کیسی ہے؟ ہمارے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دیکھ کر اور سن کر یا کسی دوسرے طریقے سے کسی بھی چیز کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی دوسری چیزوں کو بھی پاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے 'علم' کا حصہ ہوتی ہیں۔ تو اس کو اس دوسری چیز کو یاد کرتے رہنا ٹھیک ہو گیا یا نہیں؟"

"آپ کا مطلب؟"

"میرے کہنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ میں ایک دوسری مثال سے سمجھاتا ہوں۔ ایک 'وینا' (ساز) کا علم ہونا کسی فرد کا علم ہونا تو نہیں ہوتا؟

"نہیں۔"

"لیکن پھر بھی جب ایک محبوب اپنی محبوبہ کے استعمال میں آنے والی پوشاک یا ساز یا دوسری کسی چیز کو پہچانتا ہے تو اس کے جذبات کس طرح کے ہوتے ہیں؟ کیا وہ دنیا کو پہچان کر اپنے ذہن میں اس کی مالکن دوشیزہ کا ایک تخیلی پیکر نہیں تراشتے۔ یہی یادداشت ہے۔ اس طرح سمیعس کو دیکھ کر سیبیس کی یاد آسکتی ہے۔ اور اس سچائی کی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں۔"

"بلاشبہ...... بے شمار۔" سمیعس نے جواب دیا۔

"عام طور پر بھولی ہوئی باتوں کو دوبارہ یاد کرنے کو ہی 'یادداشت' کہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

ہاں! ایک 'مکان' یا 'ساز' کی تصویر دیکھ کر بھی تمہیں کسی شخص کی یاد آسکتی ہے کہ نہیں؟ سمیعس کی تصویر سے سیبیس کی یاد آسکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"یا ہمیں خود سمیعس کی بھی یاد آسکتی ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"ان سبھی سمتوں میں 'یادداشت' کی بنیاد معمولی اور بیش بہا دونوں چیزیں ہو سکتی ہیں؟"

"ہو سکتی ہیں۔"

"اور جب 'یادداشت' معمولی چیزوں سے اخذ کی جاتی ہے۔ تو ایک دوسری چیز نمودار ضرور ہو گی۔ وہ یہ کہ کہیں یہ مشابہت یاد کی ہوئی کسی چیز سے آگے یا پیچھے تو نہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"ذرا اور آگے چلیں اور دیکھیں کہ کسی بھی چیز میں مشابہت ضرور ہو سکتی ہے۔ لکڑی یا لوہے کے ایک ٹکڑے کا دوسرے ٹکڑے کے ساتھ مشابہت کی بات نہیں کرتا ہوں بلکہ اس سے اعلیٰ چیزوں کے متعلق باتیں کرتا ہوں۔ کیا ایسی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟"

"ہاں ہو سکتی ہے اور زندگی کو سامنے رکھ کر ہم لوگ اس کے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں" سمیعس نے جواب دیا۔

"کیا ہم لوگوں کو ان چیزوں کی فطرت کے متعلق علم ہے؟"

"بالکل ہے۔" اس نے کہا۔

”اور یہ علم میں نے کہاں سے پایا؟ کیا ہم نے لکڑی یا لوہے کے ٹکڑے کو دیکھ کر اس سے مختلف ایک دوسری چیز کی مشابہت کا خیال نہیں کیا؟ کیونکہ تم یہ تو مانتے ہی ہو کہ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے یا اس بات کو یوں لو کہ کیا لکڑی یا پتھر کے وہی ٹکڑے کبھی برابر اور کبھی ناہموار نہیں دکھائی دیتے؟“

”یہ تو ہمیشہ سے ہے۔“

”لیکن کیا ہموار چیز کبھی ناہمور ہوتی ہے؟ یا کیا چیز کا ہموار یا ناہموار ہونا ایک ہی بات ہے؟“

”ناممکن، سقراط۔“

”تو یہ ہموار یا ناہموار کا خیال ایک ہی بات نہیں؟“

”بالکل نہیں، جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں۔“

”کیا یہ خیال اس سے مختلف ہو سکتا ہے؟“

”ہاں۔“

”لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب کبھی ایک چیز کو دیکھ کر دوسرے کا خیال آتا ہے، چاہے وہ اس جیسی ہو یا نہ ہو تو یہ ضرور ہے کہ 'یادداشت' کرنے کی رفتار تیز ہو گی؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

”لیکن لکڑی اور پتھر کے برابر ٹکڑوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ اور ان سے کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا وہ چیزیں آپس میں برابر ہیں یا کچھ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں؟

”ہاں۔ بہت ہی زیادہ، باریکی سے“ اس نے کہا۔

”ہم کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ جب میں یا کوئی شخص کسی چیز کو دیکھ کر یہ کہے کہ وہ چیز کچھ اور بننا چاہتی ہے لیکن اپنی خامیوں کے سبب اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتی، تو اس طرح بولنے والے کو اس مقصد کا پہلے سے ہی 'علم' ہونا چاہئے، جس کی طرح ہونے پر بھی وہ اس سے کم ہے۔“

”بلاشبہ۔“

”تو ہم نے سب سے پہلے، کسی بھی چیز کو دیکھنے سے پہلے ہی برابری کی شکل کو جانا ہو گا۔ تبھی ہم نے سوچا کہ یہ سبھی ہموار چیزیں اپنے وجود کو پانے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں، لیکن کیا ان میں کمی رہ جاتی ہے؟

”یہ بات صاف ہے“

''اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کسی بھی چیز کو پورا ہونے کے لیے دیکھنے یا ہونے یا دوسرے کسی اعضاء کے ذریعے سے ہی جانتے ہیں اور صرف ان اعضاء کے ذریعے ہی جانا جاسکتا ہے۔''

''ہاں سقراط! اس بحث کے مطابق ایک عضو دوسرے کے برابر ہی ہے''

''اس طرح اعضاء کے ذریعے ہی یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ ساری چیزوں کا وجود ہونا ہی ان چیزوں کا مقصد ہوتا ہے۔ جس کے مقابلے میں وہ بہت ہی معمولی ہوتی ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو دیکھنے، سننے یا کسی دوسرے ڈھنگ سے سمجھنا شروع کرنے سے پہلے ہم کو پوری چیزوں کے متعلق علم ہو چکا ہونا چاہئے۔ نہیں تو ہم اعضاء کے ذریعے سبھی کی ہموار چیزوں کے لیے اس کے پورے وجود کو ماپ نہیں سکتے۔ سبھی چیزیں اس کو بھی اپنا مقصد بناتی ہیں اور سبھی اسی سے معمولی ہو جاتی ہیں۔

''گزشتہ گفتگو سے صرف ان باتوں کا ہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے''

''کیا ہم لوگوں نے پیدا ہوتے ہی دیکھا نہیں، سنا نہیں یا دوسرے اعضاء کا استعمال نہیں کیا؟

''ضرور کیا ہے۔''

''تو ہم لوگوں کو برابری کا علم اس سے قبل کبھی حاصل ہو چکا ہونا چاہئے؟''

''ہاں۔''

''یعنی ہمارے پیدا ہونے سے قبل۔ میرا تو یہ خیال ہے''

''یہ خیال ٹھیک ہے۔''

''اگر ہم لوگ اس 'علم' کو پیدا ہونے سے قبل جانا ہوتا اور اس کا استعمال کیا ہوتا، تو ہم لوگ اپنی پیدائش کے وقت یا اس سے قبل بھی اعلیٰ و ادنیٰ خیالات کو بھی نہیں، بلکہ سبھی دوسرے خیالات کو بھی جانتے تھے، کیونکہ ہم لوگ صرف ایک دوسرے سے برابری کی ہی باتیں نہیں کرتے بلکہ خوبصورتی، سلیقہ مندی، پاکیزگی، عدل و انصاف اور ان سبھی چیزوں کے متعلق، جن کو بحث و مباحثے کے دوران سوالات کر کے اور ان کا جواب دیتے وقت 'نتیجہ' کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ان سبھی چیزوں کی جانکاری ہم لوگوں نے پیدائش سے قبل حاصل کی ہے۔؟''

''ہاں کہہ سکتے ہیں۔''

"لیکن اگر اس علم کو حاصل کرنے کے بعد ہم لوگ ہر شعبے میں پائے گئے 'علم' کو نہیں بولتے، تو ضرور ہی ہم لوگ زندگی میں انسانی اعضاء بن کر آئے ہوتے اور ساری زندگی عالم بن کر گزار دیتے، کیونکہ علم حاصل کرنے کے بعد اس کو قائم رکھنا ہی علم کہلاتا ہے اسے بھلا دینا نہیں۔ کیوں سمیعس 'بھولنا' علم کو کھونا ہی تو ہے نا؟"

"یہ بالکل سچ ہے"

"لیکن اگر اس علم کو، جو ہم نے اپنی پیدائش سے قبل حاصل کیا، ہم پیدائش لیتے وقت کو دیتے ہیں اور بعد میں اس علم کو اپنے اعضاء کے ذریعے دوبارہ حاصل کرتے ہیں۔ تو وہ سلسلہ جس کو ہم لوگ 'سیکھنا' کہتے ہیں، حقیقت میں ہمارے پیدائشی علم کو دوبارہ حاصل کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور کیا 'یادداشت' اس کا صحیح نام نہیں ہوگا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اس سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جب ہم لوگ دیکھ کر ہنس کر یا کسی دوسرے اعضاء کے ذریعے سے کسی چیز کو سمجھتے ہیں تو اس چیز سے متعلق ہمارے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں جب کہ حقیقتاً ہم لوگ اس کو بھول جاتے ہیں جیسا کہ میں نے کہا، اس سے دو حصوں میں سے ایک کی امید کی جاسکتی ہے یا تو یہ 'علم' ہم کو پیدائش کے وقت تھا اور ساری زندگی ہم 'عالم' بن کر رہیں یا پیدا ہونے کے بعد صرف سیکھنے والوں کو ہی اس کی یاد رہتی ہے۔ اور یہی سیکھنا یادداشت ہے۔"

"ہاں! سقراط یہ تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں تو سیمس، تم دونوں حالات میں کس کو اول درجہ میں رکھو گے؟ کیا پیدا ہونے کے وقت ہم لوگوں کو علم تھا یا پیدا ہونے سے قبل جانی پہچانی باتوں کو یاد کیا؟"

"میں اس لمحے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"کچھ بھی ہو، کم از کم اتنا تو فیصلہ کر سکتے ہو کہ عالم اپنے علم کی تفصیل بتا سکتا ہے کہ نہیں؟ کیوں! کیا کہتے ہو؟"

"ضرور دے سکتا ہے۔"

"لیکن تمہارے مطابق ہر شخص ان باتوں کی تفصیلات پیش کرنے کے قابل ہے، جن کا بیان ہم کر رہے ہیں؟"

"کاش! وہ لوگ اس لائق ہوتے۔ لیکن سقراط، مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کل اس وقت ایسا کوئی بھی زندہ انسان نہیں ملے گا جو ان باتوں کو تفصیل سے بیان کر سکے گا؟"

”تو سمیس، تمہارا یہ خیال ہے کہ سبھی لوگ ان باتوں کو نہیں جانتے؟“
”بلاشبہ! نہیں جانتے۔“
”اب وہ لوگ ان باتوں کو یاد کرنے لگے ہیں، جو انہوں نے پہلے سیکھی تھی؟“
”ضرور یہی ٹھیک ہے۔“
”لیکن ہماری روح نے یہ علم کب حاصل کیا؟ انسان کی تخلیق ہونے کے بعد تو نہیں؟“
”بالکل نہیں۔“
”یا اس سے پہلے۔“
”ہاں۔“
”سمیس، تب تو انسان مشکل اختیار کرنے سے قبل ہماری روحوں کا بھی جسم سے الگ اپنا ذاتی وجود رہا ہوگا اور ان میں عقل بھی ہوگی۔“
”ضرور ایسا ہی لگا، نہیں تو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ یہ خیال ہم لوگوں کے پیدا ہونے کے وقت ملا، کیوں کہ دوسرے کسی وقت ایسا ہو نہیں سکتا۔“
”ٹھیک ہے دوست! اگر ایسا ہوتا تو ہم نے ان کو کب کھویا؟ کیوں کہ ہم یہ تو مان چکے ہیں کہ یہ باتیں پیدائش کے وقت ہمارے ساتھ نہیں تھیں، تو کیا ہم لوگ ان کو پاتے ہی کھو دیتے ہیں کیا؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر کس وقت کھوتے ہیں؟“
”نہیں سقراط، میں بغیر سوچے سمجھے ہی بے وقوفی کی باتیں کر رہا تھا۔“
”تو سمیس، جیسا کہ ہم لوگ ہمیشہ چرچا کرتے ہیں، اگر کوئی بہت حسین ہو، سلیقہ بند ہو، اور سبھی چیزوں کا وسیع معنی ہو، اگر ہم لوگ اپنے سارے اعضاء کو ان کے حوالے کر دیں، جن کے وجود کا ہمارے پچھلے جنم ہونا اب ثابت ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے پر یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری روحیں ہمیشہ زندہ رہی بھی؟ لیکن ایسا نہیں ہو تو یہ بحث کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ یہ سارے خیالات ہمارے پیدا ہونے سے قبل کے رہے ہیں اور ہماری روحوں کا وجود ہمارے پیدا ہونے سے پہلے رہا ہے۔ ان باتوں کا ثبوت ایک سا ہی ہے اور اگر یہ خیالات نہیں تھے تو روحیں بھی نہیں تھیں۔“
”ہاں سقراط میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان دونوں کا وجود ایک جیسا ہے اور یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں کہ پیدا ہونے سے قبل روح کا وجود جسم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی آپ باتیں کرتے ہیں، کیوں کہ میرے خیال کے مطابق اور کوئی چیز

اتنے حقیقی شکل میں نہیں ہوتی۔ جتنا کہ خوبصورتی، سلیقہ مندی اور وہ دوسرے خیالات، جس کا چرچا آپ ابھی کر رہے تھے۔ میں اس لیے نتیجے سے متفق ہوں۔"

"لیکن کیا سیبیس بھی تمہاری طرح متفق ہے؟ مجھے تو اس کو بھی سمجھانا چاہیے۔"

"سمیعس نے کہا: "میرا خیال ہے کہ سیبیس بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔ حالانکہ اس شخص کے جیسا شکی شاید ہی کوئی اور ہو، پھر بھی مجھے امید ہے کہ پیدا ہونے سے قبل روح کے وجود کو وہ مان چکا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد بھی روح رہتی ہے، یہ بات ابھی بھی میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ مجھے اس بات سے چھٹکارا نہیں مل رہا ہے جس کا چرچا سیبیس کر رہا تھا۔ انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح، ضرور بکھر جاتی ہے اور ہو سکتا ہے وہی ان کا خاتمہ بھی ہو۔ مان لیا کہ اس نے کہیں اور جگہ جنم لیا، بہت ساری چیزوں کے وجود سے بنی اور جنم میں داخل ہونے کے بعد بھی اس کا وجود تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جسم میں داخل ہو کر اور پھر وہاں سے نکل کر، وہ خود کو ختم کرنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" سیبیس نے کہا: "لگ بھگ آدھی باتیں ثابت ہو چکی ہیں کہ ہماری روحوں کا وجود ہمارے جنم سے قبل بھی تھا۔ دوسرا آدھا حصہ یعنی روحوں کا وجود، مرنے کے بعد بھی جنم سے پہلے ہی کی طرح رہے گا۔ ابھی ثابت کرنا باقی ہے اور اس کو ثابت کرنا ہوگا۔ تبھی جا کر یہ بحث مکمل ہوگی۔"

"اب سقراط نے کہا: لیکن سمیعس اور سیبیس وہ ثبوت تو پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ ذرا ان دونوں مبحث کو ملا کر تو دیکھو ایک تو تم نے ابھی ابھی قبول کیا ہے اور دوسرا پہلے والا یعنی ہر زندہ چیز مردہ چیز سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ اگر روح، انسان کے پیدا ہونے سے قبل کی ہوتی ہے اور پھر سے دوبارہ شکل اختیار کرنے اور پیدا ہونے کے لیے وہ صرف موت سے ہی جنم لے سکتی ہے۔ تو کیا اس کو موت سے جنم لینا نہیں کہہ سکتے۔ اسے دوبارہ زندہ ہونا ہے؟ یہ ضرور ہے کہ جو ثبوت تمہیں چاہیے وہ میں نے پہلے ہی کا پیش کیا ہے۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ تم اور سمیعس اس بحث کی گہرائی تک جانا چاہتے ہو۔ ہم لوگ بچوں کی طرح اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ جسم چھوڑنے کے بعد روح، سچ مچ ہی ہوا کے ذریعے دور پھینکی جائے گی، بکھیر دی جائے گی اور خاص کر وہ انسان جو امن و شانتی میں نہیں بلکہ کسی بڑے طوفان میں مرے۔"

اب سیبیس نے مسکرا کر جواب دیا: "سقراط، تب آپ ہمارے خوف کو اپنی بحث کے ذریعے دور بھگا ہی دیجئے۔ لیکن پھر بھی میں کہوں گا کہ جی پر کوئی ایسا خوف مسلط نہیں ہے۔"

ہاں! ایسا سمجھو، ہم لوگوں میں ایک بچہ ہے جس کے لیے موت ایک طرح کا خوف ہے۔ ہم لوگوں کو اس بات کو بھی سمجھنا ہوگا کہ اندھیرے میں اکیلا ہونے پر ڈرنا نہیں چاہیے۔"

سقراط نے کہا: "بس ڈر کے دور ہو جانے تک منتر پھونکنے والے سے اندر منتر پھونکواتے رہو۔"

"آپ کے چلے جانے کے بعد...... !اے سقراط ہم لوگوں کو اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے ایک اچھا منتر پھونکنے والا ہی کہا جاسکے گا؟"

اس نے جواب دیا: "سیبیس یونان ایک بہت بڑی جگہ ہے۔ اس میں بہت سی اچھی روحیں رہتی ہیں اور بد روحوں کو بھی یہاں کوئی کمی نہیں۔ ان سب میں اس کو ڈھونڈتے پھرنا تکلیف یا دوست کی فکر نہ کرنا، کیوں کہ دوست کو خرچ کرنے کا اس سے زیادہ اچھا طریقہ اور ہے ہی نہیں۔ خود آپس میں بھی اس کو ڈھونڈتے رہنا، کیوں کہ تم کو تلاش کرنے کے لیے خود سے زیادہ قابل انسان اور کوئی نہیں مل سکتا ہے۔"

"تلاش ضرور کی جائے گی۔" سیبیس نے کہا۔۔ ہاں اگر برا نہیں مانئے تو بحث کی شروعات پھر وہیں سے کرتے ہیں جہاں سے ہم بھٹک گئے تھے۔"

"ضرور" سقراط نے کہا۔ "مجھے اور کیا چاہیے۔؟"

"بہت اچھی بات ہے۔"

اس پر سقراط نے کہا۔ "کیسا ایسا تصور کرتے ہوئے ہم لوگوں کو خود سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے کہ جس چیز کا بکھر جانا ممکن ہے، جس کے لیے ہم کو خوف ہے وہ چیز کیا ہوگی؟ اور وہ کون سی چیز ہے جس کے لیے ہم لوگوں کو خوف نہیں ہے؟ اور پھر آگے چل کر ہم کو تلاش کرنا ہوگا کہ جو چیز بکھر جاتی ہے، اس کی فطرت روح کے جیسی ہے کہ نہیں۔ ہماری امیدیں، ہمارے خوف جیسے خود ہی ہماری روحوں کو ان سوالوں کے جوابات فراہم کریں گی۔"

"یہ بالکل سچ ہے۔"

"اچھا محلول ہونے والی چیزیں، وہ فطرتی شکل میں ویسی ہی رہتی ہیں جیسی کہ ان کی خصوصیت ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز چھوٹے چھوٹے ذروں میں تقسیم ہونے والی ہو، تو وہ صرف وہی چیز بن سکتی ہے...... جس کو محلول نہیں کہا جاسکتا ہے۔"

"ہاں میرا ابھی ایسا ہی خیال ہے" سیبیس نے کہا۔

"اور جو چیز محلول نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ایک ہی کہانی...... جس میں کوئی تبدیلی نہیں مانی

جاتی ہے۔ جب کہ محلول ہونا ہمیشہ تبدیل ہونے کی خصوصیت رکھتا ہے اور کبھی بھی آپ جیسا بنا رہتا۔"

"میں رضامند ہوں...... آپ کی باتوں سے۔"

"اب ذرا گزشتہ بحث و مباحثے کی ڈور سنبھالو، کیا وہ خیال یا نتیجہ، جس کو ہم لوگ حقیقی طاقت کا نام دیتے ہیں وہ نتیجہ کسی کی خوبصورتی یا کسی کی سلیقہ مندی کا ہو یا کسی اور چیز کا، ہاں تو میں پوچھتا ہوں کہ اس میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ یا یہ چیزیں کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتی ہیں۔؟

"سقراط، وہ تو ہمیشہ ایک سا ہی ہونا چاہیے۔" سیبیس نے جواب دیا۔

"اور دوسری خوبصورت چیزوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ خواہ وہ انسان ہو، گھوڑے ہوں یا کپڑے یا ایسے ہی ناموں کی دوسری چیزیں ہوں، جن کو خوبصورت قیاس کیا جائے۔ کیا ایسی سبھی چیزیں ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہیں۔ کبھی تبدیلی نہیں ہونے والی؟ یا یوں کہا جائے کہ چیزیں لگ بھگ بدلتی رہتی ہیں اور بہت ہی مشکل سے وہ خود اپنے یا ایک دوسرے کے برابر رہتی ہیں؟"

"ہاں دوسری بات ٹھیک ہے۔" سیبیس نے کہا۔ وہ ہمیشہ تبدیل ہونے کی حالت میں رہتی ہیں۔"

"ان کو تم چھو سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو اور اپنے اعضاء کے ذریعے ان کو محسوس کر سکتے ہو۔ لیکن بے جان چیزوں کو صرف تم ذہن کی سطح پر ہی محسوس کر سکتے ہو۔ وہ کبھی دکھائی نہیں دیتی ہیں۔"

"یہ بات تو ہمیشہ سے ہی سچ ہے۔"

"اچھا" سقراط آگے بولتا چلا گیا۔ "اب ہم دو طرح کی طاقت کو مان سکتے ہیں۔ ایک دکھائی دینے والی اور دوسری بن دکھائی دینے والی۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی مان لو۔"

"جو دکھائی دینے والے ہیں وہ تبدیل ہونے والے ہیں جو نہیں دکھائی دیتے ہیں وہ بے جان ہے۔"

"یہ بھی مان لو۔"

"اور کیا ہمارے وجود کا ایک حصہ اور دوسرا حصہ روح نہیں ہے؟"

"ہاں ہے تو۔"

''اور یہ جسم کا کون سا حصہ ہے؟''
''یہ تو بات صاف ہے کہ جسم، دکھائی دینے والا حصہ ہے۔''
''اور ہاں، روح دکھائی دینے والا حصہ ہے یا نہیں دکھائی دینے والا۔؟
''سقراط انسان کے لیے تو وہ نہیں دکھائی دینے والا ہے۔''
''یہ دکھائی دینے والے، اور نہیں دکھائی دینے والے، سے کیا مطلب ہے؟ یہی نا جس کو انسان دیکھ سکتا ہے اور جس کو وہ نہیں دیکھ سکتا ہے؟
''ہاں انسان کی آنکھ کسوٹی ہے۔''
''ہاں تو پھر روح کیا ہے؟''
''دکھائی نہیں دینے والی۔''
''ہاں۔''
''بہت زمانے پہلے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب روح جسم کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ بناتی ہے یعنی اعضا کا استعمال کرتی ہے (کیوں کہ جسم یا اعضا کے ذریعے علم کو حاصل کرنا ایک ہی بات ہے) اس حالت میں جسم روح کو بھی بدل سکتی ہے اور یہ پریشان ہو کر بھٹکتا رہتا ہے۔ اور ساری کائنات اس کے ارد گرد گھومنے لگتی ہے۔ ہم نے ایسا کیا ہے کہ نہیں۔''
''ہاں! کیا ہے۔''
''لیکن اپنے وجود میں آنے کے بعد وہ دوسری جگہ یعنی پاکیزگی، ابدیت اور کبھی نہیں تبدیل ہونے وغیرہ کو اپناتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ بغیر کسی جھجک رہتی ہے۔ تب اس کی ساری غلط حرکتیں چھوٹ جاتی ہیں اور بے جان چیزوں کے ساتھ ملنے پر وہ بھی جان بنتی ہے۔ کیا روح کی اس حالت کو دوبارہ علم حاصل کرنا نہیں کہتے ہیں؟
''سقراط یہ خوب کہی اور یہ سچائی بھی ہے۔''
''اچھا ان دونوں بحثوں سے کیا ثابت ہوتا ہے۔''
''میرے خیال میں اس بحث کا یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ روح بے جان اور یہ کبھی دیکھائی نہیں دیتی ہے۔ اس بات سے بے وقوف انسان بھی انکار نہیں کر سکتا۔''
''اور جسم ہمیشہ سے تبدیل ہونے والا ہے؟ سقراط نے پوچھا۔''
''ہاں۔''
''اچھا اس بات کے دوسرے پہلو کو دیکھو۔ جب روح و جسم کا ملن ہو جاتا ہے تو فطرت روح کو حکومت کرنے کا حق دیتی ہے اور جسم کو حکم ماننے اور خدمت کرنے کا۔ کیا تم

کو نہیں لگتا ہے کہ جس کو ابدیت دیتی ہے وہ ہمیشہ حکومت کرتا ہے اور لیکن ختم ہو جانے والی چیز اپنی فطرت کی وجہ سے ہمیشہ خدمت کرتی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"روح کو خدا تعالیٰ نے ابدیت دی ہے اور جسم ختم ہو جانے والا ہے...... سقراط اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔"

"سیبیس اب ذرا سوچو، اس ساری باتوں کے کیا نتائج نکلتے ہیں؟" اور ان سچائیوں کو فراموش کیا جا سکتا ہے؟"

"نہیں۔"

"ہاں اگر یہ ٹھیک ہے تو کیا جسم خاکی نہیں ہے؟ اور کیا روح لگ بھگ یا پوری طریقے سے خدائی نہیں ہے؟"

"بالکل ہے۔"

"تم کو اس بات کا بھی دھیان ہو گا کہ ایک انسان کی موت کے بعد، اس کا مردہ جسم یا اس کے وجود کا وہ حصہ جو دکھائی دیتا ہے، جو اس دنیا میں پڑا رہتا ہے۔ جس کو ہم لاش کہتے ہیں، جس کو خاک میں ملاتے ہیں، اس کا سڑ گل جانا یا منتشر ہو جانا فطری ہے، لیکن وہ سڑتا نہیں ہے۔ فوراً ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایسا ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اگر موت کے وقت وہ شخص جسمانی سطح پر مضبوط ہو اور موسم بھی سہانا ہو تو لاش کو سڑنے میں بہت وقت لگ سکتا ہے۔ اگر اس کو سڑنے سے بچانے کے لیے، اس پر لیپ چڑھایا جائے، جیسا کہ مصر ملک میں کیا جاتا ہے تو زمانے تک وہ پورا جسم رہ سکتا ہے۔ نقصان ہونے کی حالت میں بھی۔ اس کے کچھ حصے جیسے ہڈیاں اور ان کے جوڑ...... یہ کبھی بھی برباد نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ تم میری باتوں سے اتفاق کرتے ہو نا۔"

"ہاں۔"

بہت لوگوں کا کہنا ہے کہ روح جسم سے الگ ہونے کے بعد جنت کی جانب اور ثواب سیدھے خدا تعالیٰ کے پاس (جہاں ہماری روح بھی جلد ہی جا رہی ہے، صرف خدا تعالیٰ کی رضامندی ہونی چاہیے) ہاں! خدا تعالیٰ کے پاس جاتے جاتے وہ فوراً ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے جبکہ جنت بھی روح کی طرح نہیں نظر آنے والی، متبرک اور اعلیٰ ہوتے ہوئے اس کا حقیقی آماجگاہ ہے؟ نہیں پیارے سیبیس اور سمیعس ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے۔ حقیقتاً روح پرواز ہونے کے وقت بالکل پاکیزہ ہوتی ہے، وہ اپنے ہمراہ ان جسمانی خصوصیات کو ذرا بھی نہیں

لاتی، کیوں کہ اسی شخص کو زندگی میں اس کے جسم سے رشتہ نہیں رکھنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ خود میں ہی رہتی ہے اور اس کا یہی فاصلہ ہمیشہ کے لیے ایک فکر بن جاتا ہے یعنی وہ فلسفہ کے سچے ماننے والوں کی طرح رہتی ہے، کیوں کہ فلسفہ موت کے متعلق سوچنا ہی تو ہے؟

''اس میں کوئی شبہ نہیں۔''

''وہ روح ہمیشہ تو نظر نہیں آتی ہے اور کبھی نہیں دکھائی دینے والی جگہ پر روانہ ہوتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے پاس پہنچ کر پورا مزہ لیتی ہے اور اس کو تمام انسانی برائیوں، خوف وڈر اور دوسری کمزوریوں سے چھٹکارا ملتا ہے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے دیوتاؤں کے ہمراہ رہتی ہے۔ کیوں سیبیس ٹھیک ہے؟

''بلاشبہ۔''

''لیکن وہ روح جو ختم ہو چکی ہے اور پرواز کرنے کے وقت برائیوں سے ملوث ہو، جو جسمانی خواہشات اور ہوس سے پر ہو اور اس بات کو مانے کہ انسان کا جسم ہی حقیقت ہے۔ کیا ایسی روح پرواز کرنے کے وقت پاکیزہ ہو سکتی ہے؟

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''ایسی روح کو جسم جکڑ کر رکھتی ہے کیوں کہ جسم کے ساتھ ہمیشہ رہنے کی وجہ سے اس کی فطرت بھی جسم کے جیسی ہی ہو جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''یہ جسمانی پچ...... میرے دوست، بھاری اور بوجھل ہوتا ہے۔ دراصل یہ وہی ہے جو روح کو نیچے کھینچ کر اس دنیا میں لاتا ہے اور پھر یہ قبروں کے اردگرد چپ چاپ منڈراتا رہتا ہے۔ جیسا کہ سننے میں آتا ہے، ایسی ہی جگہوں پر کچھ محبت کرنے والی روحیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ وہی ہوتی ہیں جو پرواز کے وقت پاکیزہ بنی تھیں۔ ایسی روحیں، نظر نہیں آنے والی جنت یا جہنم سے ڈرتی ہیں۔''

''ہاں یہ تو بالکل ممکن ہے۔''

''بلاشبہ سیبیس! یہ روحیں برے لوگوں کی ہی ہو سکتی ہیں اور ان لوگوں کو اپنے برے کاموں کی وجہ سے سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ ہمیشہ مضطرب رہتی ہیں اور بعد میں کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسرے جسم کیسے ہوں، وہ تو ان کے پہلے جنم کی فطرت پر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔''

''کیسی فطرت؟''

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی بہت کھاتا ہے، شراب پیتا ہے اور برائیاں کرتا ہے وہ اپنی ان عادتوں سے گریز کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد گدھوں اور اسی طرح کے دوسرے جانوروں کا جسم حاصل کرتا ہے۔"

"تمہاری کیا رائے ہے۔"

"میرے خیال میں اس کی سچائی یہی ہے۔"

"اور جو ناانصافی کرے، ظالم ہو یا تشدد پیدا کرتے ہیں وہ بھیڑیوں، بازوں اور چیلوں کے جسم میں داخل ہوتے ہوں گے اور تو ان کا ہو ہی کیا سکتا ہے؟"

بلاشبہ ایسی فطرت کا انجام یہی ہوگا، سیبیس نے کہا۔

"اس طرح مختلف فطرت کے مطابق ان لوگوں کی شکلیں بنتی ہیں اور اس کے لیے مختلف حالات پیدا کرنا کٹھن نہیں ہوگا۔"

"ہاں کٹھن نہیں ہوگا۔"

"اچھا ان میں سے زیادہ خوش وہ ہیں جنہوں نے صبر واستقلال اور انصاف جیسے سبھی خصوصیات کو اپنایا...... اس لیے وہ لوگ اپنے آپ اور اپنی نئی حالت میں سب سے زیادہ خوش رہتے ہیں۔"

"وہ لوگ سب سے زیادہ خوش کیوں رہتے ہیں؟"

"کیوں کہ وہ لوگ اپنے جیسے ہی بھلے اور سماجی انسان کا جسم حاصل کر سکتے ہیں...... جیسے شہد کی مکھی کا، چیونٹی یا دوبارہ انسان کا۔ اور ہاں! ان سے ہی بھلے اور پرامن انسانوں کا اچھا ہوتا ہے...... یہ مانا جاتا ہے۔"

"ایسا بھی ممکن ہے۔"

"جو فلسفہ کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اور جو پرواز کرنے کے وقت پوری طرح پاک و صاف نہ ہوں، انہیں دیوتاؤں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف عالم ہی ان کی صحبت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ میرے پیارے سمیعس اور سیبیس، یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کے سچے ماننے والے جسم کی تمام خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہیں...... خود کو ان سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں...... وہ کسی بھی طرح کے الزام سے ڈرتے ہیں۔

"ایسی باتیں تو ان لوگوں کو پسند ہی نہیں آئیں گی۔" سیبیس نے کہا:

"بالکل نہیں" سقراط نے جواب دیا: یہی وجہ ہے کہ جو صرف جسم کو سجانے و سنوارنے کے لیے ہی زندہ نہیں رہتے، جن کو اپنے نفس و روح کی ذرا بھی فکر ہو، وہ ان باتوں

پر خود عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنی زندگی کی راہوں پر اندھے کی طرح نہیں چلتے ہی اور ان لوگوں کو فلسفہ رحمدل بناتا ہے اور برائیوں سے آزاد کرتا ہے۔ تو وہ لوگ اس کے اثر سے جھجکتے ہیں بلکہ اس کو اپناتے ہیں۔"

"سقراط! ہم لوگ آپ کی اس بات کو نہیں سمجھ پائے۔"

"میں سمجھاؤں گا" اس نے کہا" آپ عالم انسانی جسم اور روح کے مابین نازک رشتے کو جانتا ہے اور جب تک "فلسفہ" 'روح' کو اپنے آغوش میں نہیں لیتا، وہ حقیقی طاقت کو اپنے اندر محسوس نہ کرکے اسے جیل کی کھڑکیوں سے باہر کسی دور جگہ پر دیکھتا ہے۔ وہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ 'روح' ہمیشہ لاعلمی کے دلدل میں لڑھکتی رہتی ہے۔ اور اپنی فطرت کی وجہ سے خود ہی اپنے بندھن کی وجہ بن جاتی ہے۔ یہ اس کی پہلی حالت ہے اور پھر جیسا کہ میں نے کہا ہے علم کے پجاری جانتے ہیں 'فلسفہ' اس کو مانتا ہے، خوشدلی کے ساتھ نغمہ سرائی کرتا ہے اور اسے آزاد کرنے کے لیے سمجھاتا ہے کہ آنکھ، کان اور دوسرے انسانی اعضاء دھوکے باز ہیں۔ اس لیے اسے ان سے دور رہنا چاہئے اور ان کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اور اپنے آپ کو سمیٹ کر خود میں یکجا رہنا چاہئے۔ اس پاکیزہ طاقت کے لیے اپنی ذاتی زندگی کی پرہیز گاری کا خیال رکھنا چاہیے اور اپنے آپ میں اعتماد پیدا کرنی چاہئے اور جو کچھ اسے اور ذرائع سے معلوم ہو یا تبدیل ہو اس پر یقین نہیں رکھیں، کیونکہ ایسی چیزیں فلسفہ کے لائق ہیں۔ جب کہ یہ نظر نہیں آنے والی چیز ہے۔ ایک سچے فلسفی کی ہمیشہ یہی سوچ ہوتی ہے کہ اسے اس طرح آزاد کرنے سے جھجھکنا نہیں چاہئے۔ اس لیے جتنا بھی اس سے ہو سکے، وہ دنیاوی خوشی، خواہشات، دکھوں اور ڈر سے پرہیز کرتی ہے۔ وہ یہ بھی سوچتی ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ خوش، دکھ اور خواہشات کی وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ کیسی تکلیف...... ؟ صرف وہی نہیں جن کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یعنی صحت یا دولت کا نقصان، جن کو وہ اپنی عادتوں کو سدھارنے کے لیے اپناتا ہے۔ بلکہ وہ ان برائیوں یا دکھوں کو بھی...... جس کا اسے ذرا بھی خیال نہیں آتا۔"

"وہ برائی کیا ہے، سقراط؟ سیبیس نے پوچھا۔"

"برائی یہ ہے کہ جب خوشی یا دکھ کے جذبات بہت زیادہ ہوں تو اس وقت ہر شخص کی روح یہی محسوس کرتی ہے کہ اس کے جذبات پاکیزہ ہیں، جب کہ ایسی بات نہیں۔ یہ چیزیں حقیقت میں دکھائی دینے والی ہی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اور کیا یہ وہ حالت نہیں، جس میں کہ روح پر جسم کی پکڑ زیادہ طاقتور ہو؟"

"ایسا کیوں؟"

"کیونکہ ہر خوشی یاد کھ کیل کی طرح ہوتے ہیں جو کہ روح کو جسم کے ساتھ جکڑتی ہے اور آخر میں ایسی روح جس کا حصہ بن جاتی ہیں اور جسم کے ذریعے کسی چیز کو حقیقی کہنے پر وہ اسے سچ مانتی ہے۔ اس طرح جسم سے راضی ہو کر اس کی خوشی کو اپنی خوشی مان کر روح کو مجبوراً اس کی عادتوں اور رہائش گاہ کو اپنانا پڑتا ہے اور پرواز کرنے کے وقت اس میں پاکیزگی کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ جسم اس کو ہمیشہ ملوث و گندا رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جسم کے بعد دوسرے جسم میں داخل ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہاں پر اس کے انکور پھوٹتے ہیں۔ وہ بڑھتا ہے اور اس طرح صاف پاکیزہ اور صفائی طاقت کے ساتھ اس کا کبھی رابطہ نہیں ہوتا۔

"بالکل ٹھیک ہے" سیبیس نے جواب دیا۔

"اور سیبیس یہی وجہ ہے کہ علم کے ماننے والے مزاجاً اچھے اور بہادر ہوتے ہیں نہ کہ اس وجہ سے کہ جو دنیا میں ان کو بتایا جاتا ہے"۔

"ضرور ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"بالکل نہیں۔ ایک مفکر کی روح اور ہی ڈھنگ سے سوچتی ہے۔ وہ فلسفہ کی مدد سے آزاد ہو کر پھر دکھ و درد میں نہیں آنا چاہتی وہ اپنا جال بنتے رہنا چاہتی ہے۔ اس کو سلجھانا نہیں۔ وہ علم کی راہ پر چلتی ہے اور خدائی قدرت (جس میں کسی رائے کی ضرورت نہیں) کو مد نظر رکھتے ہوئے اس علم میں مشغول رہتی ہے اس طرح وہ اپنی زندگی میں ہی زندہ رہنا چاہتی ہے اور مرنے کے بعد انسانی کمزوریوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے پاس جانا چاہتی ہے اسی لیے سیبیس اور سمیعس اس خیال سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اچھے ڈھنگ سے پروان چڑھی روح جسم سے الگ ہوتے ہوئے ہواؤں سے منتشر ہو سکتی ہے اور فضا میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہے۔

"جب سقراط اپنی باتیں پوری کر چکا تو دیر تک سبھی خاموش رہے۔ اور ایسا لگا کہ ہم لوگوں کے مانند وہ بھی ان باتوں پر غور و فکر کر رہا ہے۔ صرف سیبیس اور سمیعس آپس میں کچھ بولے۔ یہ دیکھتے ہی سقراط نے ان سے پوچھا۔ "اس دلیل کے متعلق تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟" کہیں اس میں کوئی کمی تو نہیں؟" اس نے خود یہ مان لیا کہ اگر کوئی اس موضوع کی اچھی

طرح چھان بین کرے گا تو بہت سے ایسے نقطے ملیں گے جن پر ذہن بھٹک سکتا ہے اور جس میں خامیاں ہو سکتی ہیں۔" اس نے ان سے پھر پوچھا۔"اگر تم دونوں کسی دوسرے موضوع کا چرچا کر رہے ہو تو میں خاموش رہوں گا۔ لیکن اگر اس موضوع پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو خیالات کو پیش کرنے میں مت ہچکچاؤ ہم تمہارے خیالات کی قدر کریں گے اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں کسی طرح تمہارے لائق ثابت ہو سکتا ہوں تو مجھے اپنا مددگار بننے کا موقع دو۔"

سمیعس نے کہا: "سقراط میں مانتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں بہت سارے سوالات پیدا ہوئے اور ہم دونوں اس کے متعلق سوال کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اکساتے رہے۔ ہم اس سوال کا جواب چاہتے تو ہیں، لیکن یہ سوچ کر کہ اس موقع پر ہمارا سوال کرنا ٹھیک ثابت نہیں ہو، ہم لوگوں نے یہ سوال پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

اس پر سقراط نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔او سمیعس! تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ اگر میں تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ میری حالات اس وقت میری زندگی کے کسی دوسرے لمحے سے مبرا نہیں، تو میرے لیے دوسروں کو ہی یقین دلانا بالکل ہی ممکن نہیں۔ کیا تم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ بازوں کی طرح مجھ میں بھی طاقت ہے؟ کیوں کہ ساری زندگی گزارنے کے بعد وہ جب موت کو اپنے نزدیک دیکھتے ہیں تو اور بھی ان کے ساتھ گاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا یہی خیال ہے کہ اب وہ لوگ فوراً ہی اپنے مالک حقیقی کے پاس جانے والے ہیں۔ لیکن انسان تو موت سے ڈرتے ہیں، کہتے ہیں کہ نہیں آخر میں الاپتے ہیں۔ ایسا کہانیوں کی برائی کرنا ہے اور کچھ نہیں، کیوں کہ کوئی بھی پرندہ ٹھنڈ، بھوک یا مصیبت کے وقت گانا نہیں گاتا ہے۔ یہاں تک کہ بلبل، ابابیل اور ہدہد تک ایسا نہیں کرتے (میں خود اس بات کو نہیں مانتا جس طرح سے کہ ہنسوں کے متعلق یہ ضرب المثل مشہور ہے) میرا خیال ہے کہ ہنس اپولو کے لیے مقدس ہے اس لیے ان کو عقل بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کو خدا کے یہاں کی اچھی باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے آخری دن ایسا گیت گاتے ہیں، ایسی خوشی مناتے ہیں جیسی کہ وہ لوگ زندگی مین کبھی نہیں مناتے۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی ان منیوں کے مانند دیوتاؤں کا غلام ہوں۔ اور مجھے بھی انہوں نے ایسی ہی عقل دی ہے جو کہ منیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اس لیے میں اپنے مرنے پر منیوں سے کچھ کم خوشی منانے کو تیار نہیں۔ اگر تمہاری جھجک اس وجہ سے ہے تو کوئی فکر نہیں کرو۔ بولو ایتھنس کے گیارہ منصفوں کے ذریعے سنائی گئی سزا کے بچے اوقات میں تم لوگ اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی سوال پوچھ لو۔"

"بہت ہی اچھی بات ہے۔" سمیعس نے کہا۔ "اب میں آپ کو اپنا مسئلہ بیان کروں گا اور سیبیس بھی اپنا بتائے گا۔ میں یہاں محسوس کر رہا ہوں (مجھے یقین ہے کہ آپ خود بھی ایسا محسوس کرتے ہوں گے) کہ اس جنم میں ایسے سوالات کا کوئی مناسب جواب پانا بہت ہی کٹھن ہے یا یوں کہیے کہ شاید ممکن نہیں۔ پھر بھی میں اس شخص کو کمزور کہوں گا جو ان کے بارے میں مشہور جوابوں کو صحیح ثابت کرے یا جو ان کے ہر پہلوؤں پر غور کیے بغیر محبت ہار جائے۔ کیوں کہ ہر شخص کو تب تک سخت محنت کرنا چاہیے جب تک کہ ان دو باتوں میں سے ایک نہ ملے یا وہ اس کی حقیقت نہ کھوج نکالے یا اس کو دوسروں سے تعلیم کی شکل میں حاصل نہیں کرلے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو میرے خیال میں ان باتوں کو اپنا کر اپنی زندگی میں جو ایک ناؤ ہے اس کی پتوار بننا چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ اگر اس کو زیادہ حفاظت سے چلنے کے لیے خدا کا فرمان نہیں ہوا تو اس کا کام خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ اچھا، اب میں جیسی کہ آپ کی خواہش ہے، آپ سے سوال پوچھوں گا، تاکہ آگے جاکر مجھے خود کو اس بات پر پچھتانا نہیں پڑے کہ میں نے اس وقت اپنی شک و شبہات کو نہیں پوچھا۔ بات یہ ہے کہ جب میں اکیلا یا سمیعس کے ہمراہ اس موضوع پر غور و فکر کرتا ہوں تو مجھے ان کا جواب نہیں ملتا۔"

سقراط نے جواب دیا...... "ہو سکتا ہے کہ تمہاری بات ٹھیک ہو۔ لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ بحث کس پہلو سے تمہیں ٹھیک نہیں دکھائی دیتی؟"

"اس نظریے سے، مان لیجیے کوئی اس بحث کا استعمال ایک دھنیا اور اس میں سے نکلنے والے راگ کے بارے میں کرتا ہے۔ اگر کوئی دھنیا کو توڑ دے یا اس کے تاروں کو کاٹ دے تو اس بحث کو ماننے والا آپ کی طرح، بالکل اسی طرح آپ کہیں گے۔ سنگیت زندہ رہنے والا ہے، اس کا وجود مٹا نہیں ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق۔ وہ یہ تو نہیں کہے گا کہ تاروں کے بغیر وینا یا خود تار جو کہ مٹ جانے والا ہے، رہیں گے اور وہ سنگیت جو کہ زندہ جاوید ہیں اس کی فطرت ختم ہو جاتی ہے اور وہ بھی وینا سے ہے؟ آپ کی بحث کے مطابق وہ سنگیت کہیں نہ کہیں ہوگا ہی اور اس سے پہلے کہ اس کا کچھ بگڑے، وہ لکڑی اور تار دونوں ختم ہو جائیں گے۔ ایسا خیال سقراط، آپ کو بھی آیا ہوگا کہ روح کے لیے ہمارے خیالات کچھ ایسی ہے۔ اور یہ کہ اگر جسم کو گرمی، سردی، یا سوکھے سے جڑا ہوا ہو، بندھا ہوا ہو، تو روح ایک سنگیت کے مانند ہے اور ان چیزوں کا محلول ہے۔ اگر ایسی بات ہو تو جب بھی بیماری یا دوسرے زخموں کی وجہ سے جسم کے اجزاء ڈھیلا ہو جاتا ہے یا ان پر زیادہ دباؤ پڑے۔ تو روح زندہ جاوید ہوتے ہوئے بھی سنگیت یا دوسرے فنکارانہ عناصر کے مانند فوراً ختم نہیں ہوتی ہیں، جب کہ جسم کو جلانے یا ختم نہیں

کیسے جانے پر وہ بہت وقت تک رہ سکتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ روح جسم سے الگ ہونے کے بعد موت کے وقت سب سے پہلے ختم ہوتی ہے تو اس کے لیے ہمارا جواب کیا ہوگا؟"

سقراط اپنی عادت کے مطابق ہمارے چہرے پر دیر تک دیکھنے لگا اور مسکرا کر بولا۔ "سمیعس کی جانب یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیال بہت ہی پختہ ہے۔" "اس لیے تم میں سے کوئی جو مجھ سے زیادہ قابل ہے اس کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ لیکن اچھا یہی رہے گا کہ اس کا جواب دینے سے پہلے ہم سیبیس کی باتیں بھی سن لیں۔ اس سے ہم کو غور و فکر کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ دونوں کی باتیں سننے کے بعد اگر ان میں کوئی سچائی ہو تو ہم ان سے اتفاق رائے کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ہم اپنی بات پر اٹل رہیں گے۔ ہاں! سیبیس مہربانی کر کے تم بھی اپنی دشواریوں کو بیان کرو۔"

سیبیس نے جواب دیا۔ ہاں! میں بھی بتاؤں گا۔ میرے خیال میں بحث اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اس میں ابھی بھی وہی خامیاں بتائی جا سکتی ہیں، جن کو ہم نے پہلے بتایا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ جسم کو قبول کرنے سے پہلے روح کا وجود کہیں نہ کہیں ہوتا ہے۔ اس بات کو نہایت باریکی کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات ابھی بھی ثابت نہیں ہوئی ہے کہ مرنے کے بعد روح کا وجود قائم رہتا ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا ہوں کہ روح، جسم سے زیادہ مضبوط اور ٹکاؤ ہے۔ کیوں کہ میرے خیال میں روح ہر لحاظ سے جسم سے کہیں زیادہ افضل ہے۔ اس وجہ سے میرا خیال سمیعس سے الگ ہے۔ میں جو خیال رکھتا ہوں وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ سیبیس! یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ انسان کی موت کے بعد زیادہ فضول (یعنی جسم) کا وجود فوراً نہیں مٹتا، تو کیا تم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ زیادہ ٹکاؤ چیز (یعنی روح) بھی اتنے ہی وقت کے لیے ٹک سکتی ہے؟ تم اس بحث کو کیوں نہیں مانتے؟ اب دیکھیے اس موضوع پر مجھے جو شبہ ہے اس کے متعلق ایک نظر ڈالتا ہوں۔ میں ایک بوڑھے جولاہے کی مثال دوں گا۔ جولاہا مر گیا اور اس کی موت کے بعد کوئی کہتا ہے۔ "وہ مرا نہیں ہے وہ تو زندہ ہی ہوگا۔ وہ دیکھو اس کا کوٹ، جو اس نے خود بنا ہے اور جس کو وہ پہنتا تھا۔ پورا کا پورا پڑا ہوا ہے۔ اگر کوئی یقین نہیں کرے تو وہ اس سے پوچھتا ہے۔ کیوں بھائی؟ انسان زندہ رہنے والا ہے......اور جب اسے یہ جواب ملتا ہے کہ انسان نہیں مٹنے والا ہے تو وہ مان لیتا ہے اس پر اس کی بات ثابت ہوتی ہے کیوں کہ کم ٹکاؤ چیزیں (یعنی کوٹ) کے ہوتے ہوئے جولاہے کا ہونا سچائی ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا جو ٹھہرا، لیکن سمیعس یہ بات غلط ہے۔ تم بھی اس کو غلط ہی مانو گے اور دوسرے لوگ بھی نہیں اقرار کریں گے۔ سچائی تو یہ ہے کہ اس جولاہے نے بہت سارے کوٹ کو تیار

کیا اور اس کو پہنا اور پھر انہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ جب کہ اس کوٹ نے اسے ہی پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کوٹ سے زیادہ مضبوط ہے یا کمزور۔ اب دیکھیے، روح اور جسم کے متعلق اس مثال کے ذریعے بحث کی جاسکتی ہے۔ اس طرح کوئی بھی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ روح زندہ رہنے والی ہے اور جسم کمزور و ختم ہو جانے والا ہے۔ وہ یہ دلیل نہیں پیش کر سکتا ہے کہ ہر روح بہت سارے جسموں کو پیچھے چھوڑتی ہے اور خاص کر اگر انسان بہت وقت تک زندہ رہے، تو اس کے جیتے جی اس کا جسم گلنے لگتا ہے۔ ختم ہونے لگتا ہے اور روح ہمیشہ نئی شریانوں کی تخلیق کرتی ہے اور گلے ہوئے اعضاء کی مرمت کرتی ہے۔ اور جب بھی روح ختم ہوتی ہے تو ضرور ہی وہ اپنی آخری شکل میں ہو گی۔ چونکہ اس کے بعد زندہ رہے گا۔ اس طرح جب روح آخر میں ختم ہو جائے گی تو جسم اپنی کمزوریوں کو اجاگر کر کے فوراً ہی سڑ جائے گا۔ اس لیے انسان کے مرنے کے بعد روح کے ہمیشہ زندہ رہنے والے وجود کو ثابت کرنے کے لیے روح کا مضبوط، ہونا کیا گیا ہے۔ اس بحث کو میں نہیں مانتا ہوں۔ تم جن باتوں کو مانتے ہو...... اگر ہم ایک قدر اور آگے بڑھ جائیں اتنا ہی نہیں مانیں کہ روح صرف انسان کی پیدائش سے قبل ہی تھی...... حالانکہ بہت سارے لوگوں کی روحیں مرنے کے بعد بھی رہتی ہیں اور رہیں گی۔ جسم میں داخل ہوں گی۔ انہیں چھوڑیں گی، اور یہ بھی مان لیں کہ روح میں ایک ایسی قدرتی طاقت ہے جو اس کو ثابت قدم رکھتی ہے...... وہ جنم لے سکتی ہے، لیکن پھر بھی ہم لوگ ایسا سوچ سکتے ہیں کہ کبھی یہ روح اس سلسلے سے تھک کر آخر میں کسی ایک موت میں بدل جائے گی اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کسی کو جسم کی اس موت اور اس کے ختم ہو جانے کا علم نہیں ہو، جو کہ روح کو ختم کرتا ہے، کیوں کہ اس بات کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر میری یہ بحث ٹھیک ہے تو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ موت کے لیے بہادری دکھانے والے کی ہمت بے وقوفی ہے۔ ہاں اگر وہ یہ ثابت کرے کہ روح زندہ جاوید ہے تو بات کچھ اور ہے۔ اگر روح کی ابدیت ثابت نہیں ہو سکتی تو مرنے والے فرد کو ہمیشہ یہ خوف ستائے گا کہ جسم کے ختم ہوتے ہی اس کی روح بھی پرواز کر جائے گی اور اس کو وجود نہیں ہو گا۔

ان کی یہ باتیں سن کر جیسا کے بعد کہ بعد میں ہم نے ایک دوسرے کے سامنے بتایا، ہم لوگوں کے مابین اتفاق رائے نہیں۔ پہلی بحث نے ایک اعتماد پیدا کیا اور اب اسی اعتماد کے ڈگمگانے سے اس پہلی بحث اور مستقبل کے کسی دوسرے بحث کے لیے ایک طرح کا خیال پیدا ہو گیا تھا تو ہم لوگوں کو اس بات کو پرکھنے کی قابلیت نہیں تھی یا ہمارے یقین کے لیے کوئی

بنیاد نہیں تھی۔

انخیکراتیس: میرا خیال بھی تمہارے خیال جیسا ہے۔ خدا کی قسم! بالکل ویسا ہی ......

فیدو، جب تم بول رہے تھے، اس وقت میں خود اپنے آپ سے یہی سوال پوچھنے لگا تھا کہ ایسا دوسری کون سی بحث ہو گی۔ جس پر کہ میں یقین کروں؟ سقراط کی بحث سے زیادہ پراثر اور کیا ہو سکتا تھا اور اب اسی بحث کی اہمیت ختم ہو گئی۔ یہ اصول کہ روح ایک سنگیت کے مانند ہے، مجھے ہمیشہ سے ہی متاثر کرتا آیا ہے، اور جب کبھی اس کا ذکر ہوتا ہے تو یہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایسا کہ یہ میرا ہی خیال ہے۔ اب مجھے پھر سے اس کی تلاش شروع کرنی ہو گی۔ کسی دوسرے بحث کو ڈھونڈ نکالنا ہو گا۔ جو کہ یہ ثابت کر سکے کہ انسان کی موت کے بعد روح کا وجود نہیں مٹتا ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ سقراط نے پھر کیا قدم اٹھایا؟ جس جذبات کی تم نے باتیں کی ...... اس کا ذرا بھی احساس اس میں دکھائی دیا؟ اور اس کا جواب کیسا تھا؟ ...... پراثر یا بے اثر؟ مہربانی کر کے اس واردات کا ذکر باریکی سے کرو؟

فیدو: میں سقراط کو دیکھ کر ہمیشہ حیران رہ گیا ہوں، لیکن اس قدر حیران میں شاید ہی کبھی ہوا تھا جتنا کہ اس موقع پر ہوا۔ وہ ان باتوں کا جواب دے سکتا تھا اور یہ کوئی حیرانگی کی بات نہیں ہے۔ جن باتوں نے مجھے متاثر کیا وہ کچھ اور ہی تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے خندہ پیشانی اور شیریں کلامی سے نوجوانوں کو خوش آمدید کہا۔ اس کا موازنہ ہم اس وزیر سے کر سکتے ہیں جو اپنی ہاری اور بکھری ہوئی فوج کو جمع کر کے، اس کو اپنے ساتھ بحث میں دوبارہ لوٹ کر آنے کو مجبور کر رہا ہو۔

انخیکراتیس: "پھر کیا ہوا؟"

فیدو: سناتا ہوں، میں اس کے داہنی جانب ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ اور وہ ہم لوگوں سے کچھ اونچائی پر چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور میرے گردن پر کے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے (میرے بالوں کے ساتھ کھیلنے کا اس کا اپنا الگ ڈھنگ تھا) وہ کہنے لگا۔

"فیدو! مجھے لگتا ہے کہ کل تمہاری یہ خوبصورت لٹیں کاٹی جائیں گی؟"

"ہاں سقراط! مجھے ایسا ہی لگتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"اگر تم نصیحت مان لو گے تو ایسا نہیں ہو گا۔"

"ہاں تو پھر ان کا کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "اگر تمہاری بحث کا دم نکلتا ہے اور ہم اس میں جان نہیں ڈال

سکیں تو کل نہیں آج ہی ہم دونوں اپنے بالوں کو کٹوالیں گے اور اگر میں تمہاری جگہ ہو تا اور میری محبت صحیح نہیں مانی جاتی، سمیعس اور سیمیس کے سامنے میں اپنے محبت کو ثابت نہیں کر تا، تو میں خود یہ ٹھان لیتا کہ اس محبت میں جب تک جیت نہیں حاصل کروں گا میں اپنے بال نہیں رکھوں گا۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

"ارے میں جو بیٹھا ہوں۔ مجھ سے کہو اور سورج غروب ہونے تک میں تمہارا ایلولائس بنارہوں گا۔

میں نے فوراً جواب دیا کہ ہم تم سے مدد تولیں گے۔ لیکن خود کو ہیر اکلوس اور تم کو ایلولائس مان کر نہیں، بلکہ ہم کو ہیر اکلوس اور خود کو ایلولائس مان کر۔

یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔ سب سے پہلے ایک مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے سوچنا ہو گا۔"

"کون سی مصیبت؟" میں نے پوچھا

"کہیں ہم بحث کرنے والے نہیں بنیں۔ اس نے جواب دیا اس سے ہر انسان کے ساتھ اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ کیوں کہ جس طرح اس دنیا میں بے قصور پائے جاتے ہیں اس طرح خیالات میں بھی مختلف رائے زنی ہوتی ہے۔ مان لو تم ہی ایک شخص پر پورا یقین رکھتے ہو تم اس کو مذہبی، سچا اور با اعتماد سمجھتے ہو لیکن کچھ دنوں بعد وہ جھوٹا، مکار و فریبی انسان ہو تا ہے۔ پھر دوسرے انسان سے بھی تمہارا ایسا ہی رشتہ ہو تا ہے اور تیسرے سے بھی اور جب ایسے ہی تجربے انسان کے ساتھ بار بار ہونے لگتے ہیں تو خاص کر اپنے ان جان پہچان کے دوستوں کے ساتھ جن پر وہ اعتماد کر تا ہے اور ان کے ساتھ اس کے کچھ جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں، تو پھر اسے پورے انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور اسے پکا یقین ہو جا تا ہے کہ کسی بھی فرد میں انسانیت ذرا بھی نہیں ہے۔ کیوں فیدو، تم نے انسان کی اس فطرت کا مطالبہ کیا ہے۔"؟

"ہاں کیا ہے۔"

کیا اس طرح کے جذبات سے بے عزتی نہیں ہوتی؟ کیا یہ صاف نہیں کہا ایسے لوگوں کو دوسروں کے ساتھ سلوک کرنے کے لیے انسانی فطرت کا علم ہونا چاہیے؟ نہیں تو وہ اس تجربے کو حقیقت سمجھے گا کہ برے اور بھلے تو بہت کم لوگ ہیں۔ زیادہ تر لوگ درمیانی ہوتے ہیں۔"

''میں یہ سمجھا نہیں''میں نے کہا۔

''میرے کہنے کا مطلب وہی ہے جو کہ تم بہت بڑی یا بہت چھوٹی چیز کے متعلق سوچ سکتے ہو۔ مثال کے طور پر تم انسان کو لو، کتے یا کسی دوسرے جانور کو لو۔ لفظ کو چھونے والی بہت ہی کم چیزیں ہوں گی جب کہ درمیانی چیزیں بہت ہیں۔ کیا اس بات کے متعلق تم نے کبھی نہیں سوچا؟''

''ہاں کیوں نہیں، سوچا ہے''میں نے جواب دیا۔

''اگر برائیوں کا ایک مقابلہ کیا جائے تو بہت ہی زیادہ خراب کی تعداد بہت کم ہوگی۔ اس بات کو مانتے ہو کہ نہیں؟''

''ہاں ایسا ہی پایا جائے گا۔''میں نے کہا۔

''بلاشبہ ایسا ہی ہوگا۔ حالانکہ اس مقام پر محبت کرنا اور انسان، ایک فقط پر نہیں ہے۔ خیر جتنا کچھ تم نے مجھ سے کہنے کا موقع دیا۔ اس قدر بولنے کا میں حق دار نہیں تھا۔ لیکن موازنہ کی بات تو یہ تھی کہ جب ایک معمولی انسان، جس کو بحث مباحثے کا علم ہو، ایک بحث کو صحیح مان کر بعد میں اس کو ہی بے کار پائے۔ چاہے وہ حقیقت میں بے کار نہ بھی ہو اور اس طرح ایک دو جب ایسے ہی تجربے ہو جائیں تو اس کا یقین واعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ تم جانتے ہو کہ بڑے بڑے مباحثہ کرنے والے لوگوں کو آخر میں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ انسان میں سب سے زیادہ عقل مند ہیں......''

''ٹھیک ہے میں نے کہا۔''

''اور ہاں فیدو، دیکھنا یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر چہ، علم اور حقیقت کی امید کرتے ہوئے کوئی فرد اچانک ہی کسی ایسی محبت میں آٹپکتا ہے جو کہ پہلے ٹھیک لگتی ہے لیکن اور میں کھوکھلا محسوس ہوتی ہے تو وہ شخص غصے میں آکر اپنے آپ کو یا اپنی کم عقلی کو خطاوار ٹھہرانے کے بجائے، آخر میں اس محبت کو غلط قرار دینے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور وہ اس کے بعد ہمیشہ ہی ان بحثوں کو دھتکار کرتے ہوئے سچائی اور حقیقت کے علم کو بھلا دیتا ہے۔''

''بلاشبہ یہ بات بہت ہی دکھ دینے والی ہے، میں نے کہا۔

''اس لیے ہم کو سب سے پہلے اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ کہیں ہم اپنے دماغ میں اس خیال کو نہیں آنے دیں کہ ہر مبحث غیر ضروری اور کھوکھلی ہے۔ اس کے برعکس یہ کہنا چاہیے کہ خود ہم لوگوں کی عقل میں بلوغت نہیں آئی ہے۔ ہم لوگوں کو مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے تاکہ ہماری عقل مضبوط بن جائے۔ ایسا کرنے میں تم یا دوسرے فرد اپنے مستقبل

کا دھیان رکھو گے اور میں اپنے مرنے کا کیوں کہ مجھے پورا دھیان ہے کہ اس وقت میں فلسفی جیسا سلوک نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو ایک عام انسان کی طرح صرف طرفداری کر رہا ہوں۔ کیوں کہ ایسا فرد مبحث و مباحثوں کے وقت کبھی بھی غیر جانبدارانہ رویہ اختیار نہیں کرتا ہے۔ وہ صرف اپنے ہی خیالات کو اپنے سننے والوں پر حاوی کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ہمارے درمیان اس وقت فرق صرف اس بات کا ہے کہ جہاں سننے والے کو اپنی باتوں کی سچائی کا یقین دلانا چاہتا ہے، وہاں میں خود اپنے آپ کو ثبوت کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں۔ سننے والوں کو یقین دلانا میرا خاص مقصد نہیں ہے اور اس بحث سے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں، کیوں کہ اگر میری بات سچ نکلی تو میں خود ان آخری لمحوں میں اپنے دوستوں کو غم زدہ ہو کر دکھ نہیں پہنچاؤں گا۔ میری کم علمی بھی نہیں رہے گی وہ بھی میرے ساتھ مر جائے گی اور اس طرح کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ تو ہاں! سمیعس اور سیبیس اس دماغی حالت کے مطابق تمہارے بحث پر روشنی ڈالوں گا۔ اور ہاں تم سچائی کا دھیان رکھنا، سقراط کی نہیں۔ اگر میری بات تم کو ٹھیک لگے تو میری رائے سے اتفاق کرنا ورنہ نہیں، اور اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کرنا، تاکہ میں جوش میں آکر تم کو یا خود اپنے آپ کو دھوکہ نہ دوں اور شہد کی مکھی کے مانند خود مرنے سے پہلے اپنا ڈنک تم پر نہیں چھوڑوں۔"

"اچھا، اب آگے چلیں، اس نے کہا، لیکن پہلے یہ تو دیکھوں کہ تمہاری بات ٹھیک ٹھاک یاد ہے کہ نہیں! اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو سمیعس نے اپنا شبہ اس طرح ظاہر کیا کہ ہونا ہو 'روح' ایک نغمہ ہونے کی وجہ سے جسم سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اور روحانی ہوتے ہوئے بھی جسم سے پہلے ختم ہوتی ہے۔ اور سیبیس مانتا ہے کہ جسم کے مقابلے میں روح زیادہ گلنے والی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ مختلف جسموں کو چھوڑ کر آخر میں خود ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح آخری جسم سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ اس طرح کے سلسلے کو ہم موت کہتے ہیں کیوں کہ اس کے مطابق 'موت' جسم کو ختم نہ ہونے بلکہ 'روح' کا ختم ہونا ہے۔ کیوں کہ جسم میں برباد ہونے کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کیوں سمیعس اور سیبیس! ان باتوں کو ہی پر کھنا ہے؟"

"دونوں نے مان لیا کہ ان باتوں کو ہی بیان کرنا ہے۔"

"اس پر سقراط نے پوچھا کیا تم میری مبحث کو ماننے سے انکار کرتے ہو...... یا صرف تھوڑا سا شبہ ہے؟"

"صرف شبہ ہے، انہوں نے جواب دیا۔"

"اچھا، میری مبحث کے اس حصے کے بارے میں تمہارا خیال ہے جس میں ہم نے علم

کو "یادداشت" کا عکس مان کر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ جسم میں جانے سے قبل 'روح' کا وجود کہیں نہ کہیں ہوتا ہی ہے؟"

"سیبیس نے جواب دیا کہ اس حصے سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا اور اس بات میں اس کو پورا یقین ہے۔ سمیعس نے مان لیا اور اس نے کہا کہ وہ خود کبھی بھی کسی مختلف خیالات کو اپنانے کی امید ہی کر سکتا۔"

"لیکن ...... اے ایتھینس کے رہنے والے دوستوں، اگر تم اب بھی اس بات کو مانتے ہو کہ سنگیت مختلف دھنوں سے ملا ہوا الگ ہوتا ہے اور 'روح' ایک نغمہ ہے، جو کہ جسم کے ڈھالنے پر تنے ہوئے تاروں سے نکلتا ہے۔ ہاں، اگر تم ان باتوں کو اب بھی مانتے ہو تو تم کو اپنے خیالات بدلنے ہوں گے۔ کیوں کہ تم یہ تو نہیں کہو گے کہ سنگیت ان چیزوں سے پیدا ہوئی تھی جن سے اس کا وجود جنم لیتا ہے۔"

"ہاں سقراط، ایسا تو ہم نہیں کہیں گے۔"

"لیکن کیا تم یہ نہیں سمجھتے ہو کہ تم کچھ ایسا ہی کہتے ہو کہ 'روح' انسان کی شکل میں آنے سے قبل بھی تھی اور ان سے بنی ہے جن کا کہ وجود نہیں تھا جیسا کہ تم مانتے ہو کہ سنگیت اور روح کی فطرت ایک جیسی ہے۔ اگر یہ سنگیت دنیا سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے تو 'روح' روح کے لیے یہ کہنا...... اس یادداشت ...... والی بات کے ساتھ مل سکتی ہے کیا؟

"بالکل نہیں سمیعس نے جواب دیا۔"

"پھر بھی، اس نے کہا، جس مبحث کا موضوع ہی سنگیت ہو اس میں نغمہ سرائی تو ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں! ہونا چاہیے، سمیعس نے کہا۔"

"لیکن ان دونوں باتوں میں علم یادداشت ہے اور روح سنگیت ہے ...... لیکن ان دونوں کے مابین کوئی رشتہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ان میں سے کس کا ساتھ دو گے؟

اس نے جواب دیا، سقراط میرے خیال میں آپ کی دونوں باتوں میں سے پہلی بات ٹھیک لگتی ہے۔ کیوں کہ وہ مجھے پوری طرح سے سمجھایا گیا ہے۔ جب کہ دوسری بات کو ذرا بھی نہیں سمجھایا گیا ہے۔ اور اس کی بنیاد صرف قیاس پر ہے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ صرف قیاس آرائی کی گئی باتیں دکھاوی ہوئی ہیں اور اگر ان کو استعمال کرنے میں ذرا بھی ہوشیاری نہیں برتی گئی تو یہ دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی بات جو میرے پر لاگو ہوتی ہے۔ اس کے برعکس 'علم' یا 'یاد داشت' کے اصول کو میرے مقابل بنیاد بنا کر ثابت کیا گیا

ہے۔اب کیوں کہ اس مبحث سے متاثر ہو چکا ہوں، میں نے اس کو اپنالیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اب مجھے اس دوسری مبحث کو بالکل ہی بھلا دینا چاہیے اور دوسروں کو بھی روح کو سنگیت بنانے سے روکنا چاہیے۔"

اب سمیعس، میں اسی بات کو دوسرے نظریہ سے دیکھوں گا۔ کیوں سمیس، سنگیت یا دوسری چیزوں کی حالت اس کے جیسی ہو سکتی ہے کیا؟"

"بالکل نہیں"

"اور اس کا کام کرنا یا پھل پانا اس کے کرم یا پھل پانے سے مختلف نہیں ہوتا؟"

"وہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔

"چنانچہ سنگیت دراصل سبھی چیزوں کو راستہ نہیں دکھاتی ہے بلکہ اس کی نقل کرتی ہے۔"

"اس نے یہ بھی مان لیا۔

"کیوں کہ سنگیت کی رفتار، اس کی آواز یا کسی دوسری صفت کے برعکس ہونا ممکن نہیں۔"

"ہاں وہ تو ناممکن ہی ہے، اس نے کہا۔"

"اور کیا ہر سنگیت کی بنیاد وہ ڈھنگ نہیں، جس سے کہ ان عناصر کو استعمال میں لایا جائے۔"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ اس نے کہا۔"

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سنگیت کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ ہم لوگ جتنی ہی پاکیزگی اور صاف گوئی سے آوازوں کو ملاتے ہیں، اس قدر مدھر اور سریلا گیت بھی ہوگا۔ چنانچہ لے اور سُر کو ملانے میں جو کمی رہ جائے گی اس گیت میں بھی اتنی ہی کمی رہ جائے گی۔

"ہاں سچ ہے۔"

"کیا روح بھی ان مختلف چیزوں کو دیکھتی ہے۔ یا ایک روح کسی دوسری روح سے کم ڈگری پر یا پوری طرح سے کبھی کم زیادہ ہو سکتی ہے؟"

"بالکل ہی نہیں۔"

"پھر بھی ہم یقینی طور پر کسی دو 'اصولوں' میں سے ایک میں عقل، سلیقہ مندی اور سیدھا پن ہونے کو دیکھتے ہیں اور دوسری میں بے وقوفی، اجڈپن اور شرافت۔ کیا ہمارا ایسا کرنا ٹھیک بھی ہے۔؟"

"ہاں۔"

"لیکن جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ روح ایک سنگیت ہے وہ اس میں بھلائی اور برائی ہونے پر کیا کہیں گے؟ کیا وہ لوگ یہ کہیں گے کہ اس سنگیت میں سنگیت اور دوسری سنگیت میں بے سراپن۔ نیک روح کی سنگیت میں یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ اس میں دوسری صفات سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ایک بدروح بے سری ہے اور اس میں یہ خصوصیات نہیں ہوتی ہیں۔؟"

سمیعس نے کہا، میں کہہ نہیں سکتا، لیکن میرا خیال ہے کہ روح اور سنگیت جو دکھائی نہیں دیتی ہے، اس کو ماننے والے ضرور ایسا ہی کہیں گے۔"

"لیکن ہم پہلے ہی اس بات کا اقرار کر چکے ہیں کہ کوئی بھی روح کسی دوسری روح سے کم یا زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ اس کے مطابق ہم یہ کہہ نہیں سکتے ہیں کہ ایک سنگیت دوسری سنگیت سے کم ہو سکتی ہے یا پوری طرح سے کبھی کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی؟"

"سچائی یہی ہے۔"

"اور وہ جو کم یا زیادہ نغمہ آور نہیں ہو......"

"ٹھیک ہے۔"

"اور جو کم یا زیادہ ملنے والا نہیں ہو اس میں کم یا زیادہ نہیں ہو سکتا......وہ برابر ہوتا ہے۔"

"ہاں برابر ہونا ضروری ہے۔"

"ہاں اگر ایک روح، دوسری روح سے کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی تو اس میں کم یا زیادہ ملاوٹ بھی نہیں ہونی چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"چنانچہ اس میں کم یا زیادہ بے سراپن یا سریلاپن نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں۔"

"اس طرح اگر اس میں کم یا زیادہ بے سراپن یا سریلاپن نہیں ہوتا تو ایک روح میں دوسری روح سے زیادہ خامی یا خوبی بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہم لوگوں نے خامی کو بے سرا اور خوبی کو سریلا مانا ہے۔"

"تھوڑا بھی زیادہ نہیں ہو گا۔"

"سمیعس اس بات کو ہم زیادہ صفائی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح اگر کبھی نہیں دکھائی دینے والا سنگیت ہو تو اس میں کبھی بھی خامیاں نہیں ہوں گی......"

"نہیں۔"
"اس لیے جو روح گندی ہوتی ہے وہ برائیوں سے بھری نہیں ہو سکتی؟"
"کیسے ہو سکتی ہے...... جب کہ پہلی بحث میں یہ ثابت ہو چکی ہے۔"؟
سیبیس نے کہا...... میرے خیال کے مطابق آپ اس کو متاثر کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس ترک کو ہار مونیم کے ساتھ کچھ اس ڈھنگ سے جوڑا ہے، جس کے لیے میں کبھی امید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سمیعس جب ان ابھی ہوئی باتوں کو بتا رہا تھا، تو میں نے یہ سوچا کہ ان کا جواب دینا ممکن نہیں۔ اس لیے میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کی بحث آپ کی باتوں کو بھی روک نہیں سکا اور یہ ممکن نہیں اگر دوسرا ابھی، جس کو آپ نے کادمس کا نام دیا ہے، ویسے ہی رفتار سے آگے بڑھے۔"
"نہیں، میرے اچھے دوست، ہم لوگوں کو فخر نہیں کرنا چاہیے، سقراط نے کہا...... کہیں ایسا نہیں ہو کہ جن لفظوں کو میں کہنے ہی والا ہوں، انہیں نظر ہی لگ جائے۔ خیر اس بات کو خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ بات یہ ہے کہ تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ روح کبھی بھی مرنے والی نہیں ہے۔ وہ امر ہے اور جس فلسفی کی موت کا وقت مقرر ہو، اور اسے یہ یقین ہو کہ خدا تعالیٰ کے یہاں زندگی گزرانے کے طریقے اچھے ہوں گے۔ اور تمہارا یہ کہنا کہ روح کی طاقت، جسم کی شکل میں آنے سے قبل اپنا وجود رکھتی ہے اور وہ امر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا انسان کے جسم میں داخل ہونا ایک طرح کی بیماری ہو...... جو کہ حقیقت میں برباد ہونے کی شروعات ہو اور آخر میں زندگی ختم ہوتے ہی اپنی رفتار یعنی موت کو حاصل کرلے اور جیسا کہ تم کہتے ہو کہ روح کا جسم میں صرف ایک یا اس سے زیادہ رہنے کے متعلق مختلف خیالات ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر انسان کو، جس میں ذرا بھی عقل ہو اور جس کو روح کی ابدیت کا علم نہیں ہو، وہ اس کو بیان نہیں کر سکتا...... میرا خیال ہے سیبیس! تم بھی ایسا ہی سوچ رہے ہو گے اور میں نے جان بوجھ کر ان کو دہرایا تاکہ ہم سے کوئی بات نہیں چھوٹے۔ اور اگر تم چاہو تو ان میں اور کچھ جوڑ دو یا گھٹا لو۔"
"لیکن سیبیس نے جواب دیا...... "مجھے موجودہ حالت میں نہ کچھ جوڑنا ہے اور نہ گھٹانا ہے۔ میرا مطلب بس وہی ہے جو کہ آپ نے بتایا۔"
"سقراط کچھ دیر چپ رہا او ایسا لگا کہ وہ مراقبے میں چلا گیا۔ آخر میں اس نے کہا سیبیس! تم ایک بہت بڑا سوال اٹھا رہے ہو۔ اس کے دائرے میں انسان کی زندگی سے لے کر موت تک کا سفر ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس کے بارے میں اپنے ذاتی تجربے بیان کروں گا اور

میں جو کچھ کہوں، اس میں سے کچھ تمہارے مسائل کا حل ہو، تو تم اس کو اپنانا۔"

"سیبیس نے کہا جو کچھ بھی آپ کو کہنا ہے، میں بڑی ہوشیاری سے سنوں گا۔"

"ہاں تو پھر کہتا ہوں، سقراط نے کہا، سیبیس جب میں چھوٹا تھا، مجھے فلسفے کے اس حصے کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی شدید خواہش تھی جس کو 'فطرت' کا علم کہتے ہیں اس کی پیدائش کیوں ہوتی ہے؟ اس بات کی تلاش کرنا مجھے ایک تجارت لگی اور میں ہمیشہ میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں سقراط، اس نے کہا۔"

"اب بولو! تمہارے خیال سے یہ سب کچھ سچ ہوگا کیا؟"

"یہ سچ نہیں ہو سکتا۔"

"ایک اور بات ہے۔ روح خاص کر ایک عالم روح کے علاوہ اس انسانی فطرت پر قابض ہونے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ تم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہو؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"اور کیا روح کا جسم سے کوئی تال میل ہے یا یہ کہ وہ اس کی مخالفت کرتی ہے؟ مثال کے طور پر جسم گرم اور پیاسا ہوتا ہے تو کیا روح ہم کو پانی پینے کے لیے نہیں کہتی؟ اور جسم کو بھوک لگنے پر اس کو نہیں روکتا۔ جسم سے زیادہ روح کو ابدیت حاصل ہے اس کے لیے ہزاروں مثالیں ہیں، ان میں سے صرف ایک مثال کو بیان کر رہا ہوں۔"

"یہ سچ ہے۔"

"لیکن ہم پہلے ہی مان چکے ہیں کہ سنگیت ہونے کی وجہ سے روح یعنی تاروں کے تناؤ، ان کی ڈھیلائی، کانپنا اور دوسری چیزوں کے خلاف کبھی ایک سر نہیں نکال سکتی، وہ صرف ان کو دہراتی ہے راستہ دکھانے کے لیے۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے...... اس نے جواب دیا۔"

"اور پھر بھی ہم نے اب روح کو اس کے بالکل برعکس کرتے پایا ہے۔ یعنی وہ ان چیزوں کو آگے بڑھاتی ہے جس کی وہ بنی ہوئی ہے۔ ساری زندگی وہ ان چیزوں کی مخالفت کرتی ہے، ان کو دباتی ہے۔ کبھی لڑائی جھگڑا کر کے، کبھی دوا کی شکل میں، کسرت کر کے، تو کبھی نرمیت سے، کبھی ڈرا دھمکا کر، تو کبھی خواہشات کو نظر انداز کر کے۔"

"کیا تمہارے خیال میں ہومر نے یہ سوچ کر لکھا کہ روح ایک ایسا سنگیت ہے جس کی واہ واہی جسم کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے اور اس کی فطرت کو قبضے میں کر کے اس کو اپنایا جا سکتا ہے۔ جب کہ وہ دوسری چیزوں سے زیادہ خدا کے قریب ہے۔"

"پھر تو اے دوستو! یہ کہنا کہ روح ایک سنگیت ہے، کبھی تو ٹھیک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایسا کہنے سے ہومر کے خیالات کی عکاسی نہیں ہو گی۔"

"یہ بھی سچ ہے" اس نے کہا۔

سقراط نے کہا۔ یہ رہی ہار مونیا، تمہارے تھیبیس کی دیوی، جنہوں نے دریا دلی سے ہماری باتوں کو مان لیا ہے۔ لیکن سیبیس ان کے خاوند کادمس کے ساتھ کیا کیا جائے؟ اس کے ساتھ میں کیسے سمجھوتہ کرلوں؟"

خود کو اس طرح کے سوالات میں الجھا کر پریشان ہوتا ہوں۔ کیا جانوروں کا بتدریج ارتقاء جیسا کہ کئی کہتے ہیں، اس بات کا نتیجہ ہے جس چیز کی وجہ سے ہم سوچتے ہیں، وہ خون ہے، ہوا ہے، یا آگ ہے؟ یا کہ ان میں سے کوئی نہیں ہو کر صرف دماغ ہے جو سننے، دیکھنے اور سونگھنے کے ذریعے چیزوں کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ ممکن ہے کہ یادداشت یا خیالات ان اعضاء سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر یادداشت و خیالات کی بنیاد پر ہی سائنس کا علم ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے آسمان و زمین کا مطالعہ کیا اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ میں اس طرح کی تلاش کے لیے بالکل ہی لائق نہیں ہوں۔ مجھے ان باتوں نے اس قدر متاثر کیا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ خود دیکھی ہوئی اور دوسروں کی دکھائی ہوئی چیزیں اب نظر آنی بند ہو گئی ہیں۔ اب ان کو اچھی طرح پہچان بھی نہیں سکتا ہوں۔ میں ان سچائیوں کو بھول گیا، جن کو کبھی اصول جان کر اپنایا تھا۔ مثال کے طور پر وہ سچائی جیسے انسان کا جسمانی ارتقاء اس کی غذائیت پر منحصر کرتا ہے کیونکہ کھانا ہضم ہونے کے بعد ہی گوشت و ہڈیاں بڑھتی ہیں۔ کیا یہ خیال صحیح نہیں تھا؟

"ہاں میرا تو یہی خیال ہے، سیبیس نے کہا"

اچھا، اب تم کو کچھ اور بھی سناؤں گا۔ ایک دن ایسا بھی تھا جب کہ یہ مجھے یقین تھا کہ میں چھوٹی و بڑی چیز کا مطلب اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور جب میں ایک چھوٹے قد والے آدمی کے نزدیک کسی دراز قد کے آدمی کو دیکھتا ہوں تو میں یہی سوچتا کہ ایک دوسرے میں صرف سر کی لمبائی کا فرق ہے۔ اس طرح ایک گھوڑا، دوسرے سے بڑا دکھائی دیتا یا اور بھی صاف طور سے مجھے یہ بات سلجھی ہوئی محسوس ہوئی کہ دس کا عدد آٹھ سے دو زیادہ ہے اور دو ہاتھ کی لمبائی ایک سے زیادہ ہے۔ کیونکہ دو ایک کا دوگنا ہوتا ہے۔"

"سیبیس نے پوچھا۔ اچھا اب ان کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟

"اس نے جواب دیا۔ میں ذرا بھی یہ سوچ نہیں سکتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں

ان سے کسی کی وجہ جانتا ہوں۔ کیونکہ میں خود کو اس بات پر تسلی نہیں دے سکتا ہوں کہ جب ایک کے ساتھ ایک جوڑا جاتا ہے، تو جس ایک کے ساتھ اس کا جوڑا ہوا ہے وہ دو بنتا ہے، میں یہ نہیں سمجھا کہ جب وہ اور دو اکائی جوڑے جانے کی وجہ سے دو بنتی ہیں ایک دوسرے سے الگ تھے تو ہر 'ایک' کیسا تھا اور دو نہیں اور پھر جب انہیں ساتھ ساتھ رکھا گیا تو ان لوگوں کا ملنا ہی دو بن گیا۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ایک کو دو بنانے کا طریقہ تو کس طرح توڑا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے دماغ میں ایک نئے طریقے کا کچھ الجھا ہوا خیال ہے اور کسی دوسرے خیال کو میں مان نہیں سکتا ہوں۔"

"تب میں نے کسی کو، جیسا کہ اس نے کہا، انکسگورس کی ایک کتاب میں سے پڑھتے ہوئے سنا کہ سوچنا ہی سب کچھ ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر کسی چیز کے پیدا ہونے اور اس کے وجود کی وجہ ہم لوگ جاننا چاہتے ہیں تو اسے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس چیز کے لیے دکھ اٹھانے کی کون سی حالت سب سے اچھی ہوگی۔ اس طرح ایک شخص کو خود یا دوسروں کے لیے صرف سب سے اچھی حالت سے متعلق ہی خیال کرنا ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھے از حد خوشی ہوئی کہ میں نے اس استاد کو انکسگورس کے شکل میں ہی پایا، جو مجھے پوری کائنات کی حقیقت بتائے گا اور میں نے سوچا کہ وہ مجھے پہلے یہ بتائے گا کہ زمین گول ہے نہیں کہ چپٹی اور پھر یہ جیسی بھی ہی آگے چل کر مجھے اس کی اس حالت کو بیان کر کے سنائے گا۔ اس کے بعد وہ مجھے 'سب سے اچھا' کی فطرت اور فلسفے کو بیان کرائے گا۔ اگر وہ زمین کو مرکز مانتا ہے، تو وہ یہ بھی سمجھائے گا کہ اس کی وہی حالت سب سے اچھی ہے۔ میں اس بیان سے اس قدر مطمئن ہوا کہ میں کسی اور دوسری چیز کے متعلق بھی نہیں سوچتا۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ پھر میں اس سے سورج، چاند اور تاروں کے بارے میں پوچھوں گا اور وہ مجھ کو ان کے تقابلی مطالعہ کر کے مختلف سمتوں کے متعلق بتائے گا۔ میں نے سوچا کہ مجھے ہر کسی کو اس کے متعلق تفصیلات کے ساتھ سمجھانا ہوگا کہ ہر انسان کے لیے سب سے اچھا اور سب سے اعلیٰ اور کیا ہوگا؟ ان امیدوں کو میں کسی بھی قیمت پر پیش نہیں کروں گا۔ اس لیے ان کتابوں کو حاصل کر کے، بھلے اور برے کو جاننے کے لیے میں نے ان کو جتنا جلدی ہو سکتا تھا پڑھ لیا۔"

"کیا امیدیں رکھی تھیں اور کس طرح دکھی اور ناامید ہونا پڑا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس فلسفے کو جاننے کے لیے ہوا، آسمان، پانی اور دوسری طاقتوں کو دیکھا۔ میں ان کا موازنہ ایک ایسے آدمی سے کر سکتا ہوں، جس کا پہلا خیال ہے کہ سقراط کی عقل مندی اس کے ذہن سے ہی ہے۔ لیکن جب وہ میرے مختلف کاموں کی تفصیلات کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے تو

وہ میری یہاں پر موجودگی کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ میرا جسم شریانوں اور ہڈیوں سے بنا ہے۔ آگے وہ کہتا ہے کہ میری ہڈیاں سخت ہیں۔ اس کے جوڑ ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ شریان ہڈیوں کو ڈھانپتے ہیں اور وہ گوشت و چمڑے میں سما جاتی ہے اور جیسے ہی شریانوں میں سکڑن ہوتی ہے ہڈیاں اپنی جوڑوں سے ہلتی ہیں تو ہم لوگ اپنے جسم کو موڑ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں پر اس طرح تن کر بیٹھتا ہوں۔ وہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے وہ تمہارے ساتھ، میرے اس بحث کی تشریح بھی اس طرح کرتا ہے۔ اس کی وجہ وہ آزاد، ہوا اور سننے کی طاقت کو بتاتا اور دوسرے ایسے ہی ہزاروں وجہ بتاتا اور حقیقی وجہ کو بھول جاتا کہ ایتھنس کے باشندوں نے مجھے سزا کے لائق پایا۔ میں نے زیادہ اچھا یہ سمجھا کہ میں یہاں رہ کر سزا کو پالوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ 'سب سے اچھا کیا ہے اور کیا نہیں' کے بارے میں صرف اپنے ہی خیالوں سے متاثر ہوتی اور ساتھ ہی اگر میں نے بھی بغیر حکم جانے یا بھاگنے کے بجائے، سزا کو بھگتنا ہی صحیح سمجھا۔ ان سبھی باتوں میں یقینی طور پر مختلف سمتوں کی گڑبڑی ہے۔ اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ میں اپنے کاموں کو شریانوں، ہڈیوں اور جسم کے دوسرے حصوں کے بغیر مدد پورا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں صرف ان کے لیے کرتا ہوں۔

"میں تو سننے کو تیار ہوں" اس نے جواب دیا۔

"سقراط آگے بولا، میں نے سوچا کہ حقیقی حکومت کو حاصل کرنے میں مجھے ناکامیابی ملی ہے۔ اس لیے مجھے ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں 'روح' کی طاقت کو کھونہ دوں جیسے کہ گرہن کے دنوں میں سورج کے عکس کو صرف پانی یا کسی دوسری چیزوں میں نہ دیکھ کر سیدھے بھی سورج کو یک ٹک گھورنے سے آنکھ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے مجھے یہ خوف تھا کہ ان باتوں کو سیدھے ہی بیان کرنے سے یا اعضاء سے ان کو سمجھنے کی کوشش کرنے سے کہیں میرے روح ہمیشہ کے لیے اندھی نہیں ہو جائے۔ پھر میں نے سوچا کہ اس دنیا میں جاکر اپنی حقیقی طاقت کی کھوج کرنا ہی اچھا ہوگا۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ بات ٹھیک نہیں ہے، میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ جو لوگ ان طاقتوں کو غور و فکر کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ اس کو سمجھنا فرض اور کام کرنے والوں کے ذریعے دھندلا ہو سکتا ہے۔ خیر میں نے یہ طریقہ اپنایا۔ لیکن میں اپنے فرائض کو ذرا اور اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں، کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تم نے ابھی میری بات سمجھی نہیں۔

"نہیں، سچ مچ نہیں سمجھی، سیبیس نے کہا۔

"جو کچھ میں کہنے والا ہوں، اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں وہی کہوں گا جو میں

گزشتہ بحث ومباحثوں تک کے دوران کہتا آیا ہوں۔ مجھے پھر سے ان لفظوں کا سہارا لینا ہوگا جو ہر موڑ پر سنائی دیتے ہیں۔ اگر تم لوگ خوبصورتی، سلیقہ مندی اور ابدیت کو مان لو تو میں روح کی ابدیت کو ثابت کر سکوں گا۔"

سیبیس نے کہا، ہم لوگوں کو تو آپ کی باتیں منظور ہیں۔ اب آپ جلدی سے باتیں کیجئے۔"

"ہاں تو اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ میرے دوسرے قدم پر بھی راضی ہو یا نہیں میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر سب سے خوبصورت چیز سے اور کوئی چیز خوبصورت نہیں، اگر ایسا ہو تو وہ صرف تبھی خوبصورت ہوگی جب کہ وہ اس کی حصے دار ہو۔ ہر چیز کے متعلق میرا ایسا ہی خیال ہے۔ کیا تم لوگوں کا بھی ایسا خیال ہے۔"

"ہاں میں راضی ہوں۔"

"وہ آگے بولا...... اگر مجھے کوئی کہے کہ رنگوں کا نکھار، بناوٹ یا کوئی دوسری چیز جو خوبصورتی کا ذریعہ ہے، تو میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے یہ بالکل اٹ پٹا سا لگا ہے۔ اس کے برعکس میں اس کے ہی عام طور سے بے وقوفی سے بھی اس حقیقت کو مانتا ہوں اور مجھے اس پر یقین بھی ہے کہ کوئی بھی چیز کسی چیز کو خوبصورت بنا سکتی ہے۔ یہ یقین ہے کہ خوبصورتی کی وجہ سے ہی سبھی چیز خوبصورت بنتی ہے۔ چنانچہ جب مجھ سے کوئی پوچھتا ہے تو میں بھرپور اعتماد سے یہ جواب دیتا ہوں کہ خوبصورتی سے ہی خوبصورت چیزیں حسین بنتی ہیں۔ کیوں میرے ساتھ راضی ہو کہ نہیں؟"

"ہاں ہوں۔"

"صرف عظیم ہونا ہی عظمت نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا پن ہوتا ہے اور چھوٹائی سے چھوٹی چیزیں چھوٹی بنتی ہیں۔ یہ مانتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔"

"اس طرح اگر کوئی کہیئے کہ 'الف' کا 'ب' سے سر لمبا ہے اور 'ب'، 'الف' سے چھوٹا ہے، تو تم اس بات کو قبول نہیں کرو گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑا اپنی بڑائی سے ہی عظیم بنتا ہے اور چھوٹا، چھوٹائی کی وجہ سے چھوٹا ہے۔ اس طرح تم غلط بات بھی کر سکتے ہو۔ تم کبھی غلط نتیجہ نکالنے کی ہمت تو نہیں کرو گے، نہیں نہ کرو گے؟"

"نہیں کبھی نہیں" سیبیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس طرح تم ایسا کہنے سے بھی ڈرو گے کہ دس۔ آٹھ سے دو کی وجہ سے بڑا ہے۔

بلکہ تم کہو گے کہ وہ دو کی وجہ سے بڑا ہے یا یوں کہو گے کہ دو ہاتھ ایک ہاتھ سے، اپنے آدھے سے نہیں بلکہ اپنی لمبائی کی وجہ سے بڑا ہے، اس طرح ہر معاملے میں غلطی کرنے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

"یہ سچ ہے" اس نے کہا۔

"اچھا، ایک کے ساتھ ایک کا مل جانا یا ایک کو بانٹ دینا ہی دو بننے کی وجہ ہے۔ اس بات کو مان کر تم ہوشیار نہیں بنو گے کیا؟ اور تم زور دے کر کہو گے کہ مجھے کس چیز کے وجود میں آنے کا مجھے اور کوئی طریقہ نہیں معلوم ہے۔ مجھ سے زیادہ عقل مند لوگ ہی اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ میں اناڑی ہوں اور جیسی کہ کہاوت ہے۔ میں اپنے ہی سایہ سے چونکتا ہوں۔ اگر ایسی حالت میں کوئی تم کو سوالات کے ذریعے حملہ کرے تو تم اس سے چڑو گے نہیں اور تب تک اس کو جواب نہیں دو گے، جب تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ اس بحث و مباحثے سے نکلنے والے نتیجے ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا نہیں۔

"جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، یہ بالکل سچ ہے" سمیس اور سیبیس نے ایک ساتھ کہا۔

انخیکراتیس: ٹھیک ہے فیدو! ان لوگوں نے میری باتوں کو قبول کیا...... میں بالکل حیران نہیں ہوں۔ کم عقل رکھنے والے لوگ بھی سقراط کی عقل سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

فیدو: ضرور انخیکراتیس اور جو لوگ بھی یہاں پر موجود ہیں، ان کا بھی یہی خیال ہے۔

انخیکراتیس: ہاں! اور ویسا ہی سوچنا ہم لوگوں کا بھی ہے...... ہاں تو پھر کیا ہوا؟

فیدو: یہ سب کچھ قبول کر کے اور ان کے سوچنے کے بعد ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں ایک دوسرے کا حصہ بن کر نام پاتی ہیں۔"

یہ رہا تمہاری بات کرنے کا انداز، پھر بھی جب تم یہ کہتے ہو کہ سمیس سقراط سے بڑا ہے اور فیدو سے چھوٹا، کیا تم نے بڑائی اور چھوٹائی دونوں کو سمیس کی خصوصیت نہیں بتائی؟

"ہاں بتاتا ہوں!"

لیکن پھر بھی تم یہ مانتے ہو کہ سمیس، جیسا کہ لفظوں سے ظاہر ہو رہا ہے، دراصل سمیس ہونے کی وجہ سے سقراط سے بڑا نہیں، بلکہ اپنی بناوٹ کی وجہ سے ہے، سمیس، سقراط سے بڑا نہیں ویسے ہی سقراط، سقراط ہونے کی وجہ سے چھوٹا نہیں، بلکہ سمیس کی بڑائی کے مقابلے میں اپنی چھوٹائی کی وجہ سے ہے۔؟

"سچ ہے۔"

"اور اگر فیدو جسمانیت میں اس سے بڑا ہے، اس کی وجہ فیدو کا فیدو ہونا نہیں، بلکہ

فیدو کا سمیعس سے بڑا ہونا ہے، جب کہ اس نظر سے سمیعس چھوٹا پڑتا ہے؟"
"یہ بھی ٹھیک ہے۔"
"اور اس لیے سمیعس بڑا کہلاتا ہے اور چھوٹا بھی، کیوں کہ وہ ان کے بیچ نقطے پر ہے۔ چنانچہ وہ اپنی بڑائی کی وجہ سے ایک کی چھوٹائی سے بڑا ہے اور دوسرا اپنی بڑائی کی وجہ سے چھوٹائی سے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ ہنستے ہوئے آگے کہتا ہے، میں ایک کتاب کے مانند بولتا چلا جارہا ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سچ ہی ہے۔"
"سمیعس نے اس بات کو قبول کیا۔"
"میں اس انداز سے صرف اس لیے بولتا ہوں کہ تم میرے ساتھ ان خیالوں سے رضامند ہو جاؤ۔ کسی بھی چیز کی عظمت ہی نہ کبھی بڑی اور نہ کبھی چھوٹی ہوگی، بلکہ ہم میں اور کسی بھی چیز میں پوشیدہ اس کی عظمت بھی کہیں اپنی چھوٹائی یا خود سے زیادہ کسی کی بڑائی کو قبول نہیں کرے گی۔ اس کی وجہ دو باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو بڑا اپنے برعکس چھوٹے کے سامنے آتے ہی پیچھے ہٹے گا، بھاگ نکلے گا یا چھوٹے کے نزدیک آنے پر پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ چھوٹائی کو قبول کر بھی لے تو خود اس سے تبدیل نہیں ہوگا، کیسے؟ ٹھیک ویسے ہی جیسے میں نے سمیعس کے مقابلے میں چھوٹائی کو قبول کر لیا، لیکن پھر بھی میں ویسا کا ویسا ہی ہوں۔ وہی چھوٹا سا آدمی اور عظیم خیالات کبھی بھی کم نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کوئی بھی جامد چیز دوسری چیز میں، تبدیل نہیں ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ سامنے سے ہٹتی ہے یا تبدیل ہونے میں ختم ہو جاتی ہے۔"
"میرا بھی بالکل یہی خیال ہے۔" سیبیس نے جواب دیا۔
"اس پر ان لوگوں میں سے کسی نے کہا (مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ وہ کون تھا) اے خدا کیا یہ اس بات کی مخالفت نہیں کرتا، جو کہ ہم نے پہلے قبول کی تھی۔ یعنی چھوٹے میں سے بڑا پیدا ہوتا ہے اور بڑے میں سے چھوٹا...... لیکن اب اسی اصول کی مخالفت کی جارہی ہے۔"
سقراط نے بولنے والے کی جانب سر جھکایا اور سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا، ہم کو یہ بات یاد دلانے کی تم کو ہمت ہوئی، جس کی میں تعریف کرتا ہوں۔ لیکن تم یہ نہیں دیکھتے ہو کہ ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔ کیوں کہ تب ہم لوگ چیزوں میں موجود خصوصیت کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ لیکن اب ہم نتیجہ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ یہ جیسا کہ ہم مان چکے ہیں کہ کائنات یا انسان ایک دوسرے کے خلاف کبھی نہیں جاتا ہے۔ اے دوست! تب ہم لوگ ان چیزوں کی باتیں کر رہے تھے جس میں پیدائشی خصوصیت ہوتی ہے اور جن کا نام

اس بنیاد پر دیا جاتا ہے۔
لیکن اب ان خصوصیات کی بات ہو رہی ہے جو کہ ان میں پیدائشی ہیں اور اپنا نام انکو دیتے ہیں اور ان نتائج کو کبھی بھی ایک دوسرے سے ملا کر یا گھٹا کر اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔
اس دوران سیبیس کی جانب مڑ کر اس نے پوچھا، کیوں سیبیس! کیا تم اس دوست کی مخالفت سے پریشان ہوں۔؟
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، سیبیس نے کہا، پھر بھی میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ مخالفت سے میں گھبراتا ہوں۔"
"خیر اب ہم آخر میں رضامند ہوئے ہیں کہ یہ خصوصیت کبھی کسی بھی طرح خود مخالفت نہیں کرتی۔"
"میں ہمیشہ رضامند ہوں، اس نے جواب دیا۔"
"پھر بھی میں اس سوال کے متعلق ایک بار تم کو دوسرے نظریے سے سوچنے کو کہتا ہوں، تاکہ میں دیکھ لوں کہ تم میری باتوں سے راضی ہو یا نہیں۔ ایک ایسی چیز ہے، جس کو تم گرمی کہتے ہو اور دوسری جس کو تم سردی کہتے ہو۔"
"ضرور۔"
"لیکن کیا وہ آگ یا برف ہی ہیں؟"
"بالکل نہیں۔"
"یہی نا کہ گرمی آگ سے مختلف ہے اور سردی برف ہے۔"
"ہاں۔"
"اور پھر بھی تم یقین سے یہ بات مان لوگے کہ جب برف جیسا کہ پہلے کہا ہے، گرمی کے اثر میں آئے گی، تو برف برف نہیں اور گرمی گرمی نہیں رہے گی، بلکہ بڑھتی ہوئی گرمی کے مقابل برف یا تو بھاگ نکلے گا یا ختم ہو جائے گی؟"
"یہ ہمیشہ سے سچ ہے، اس نے جواب دیا۔"
"اور سردی کے آنے پر آگ بھی یا تو پیچھے ہٹے گی یا ختم ہو جائے گی۔ جب آگ سردی کے اثر میں آتی ہے تو یہ دونوں پہلے کی طرح آگ یا سردی نہیں رہ جاتے۔"
"ٹھیک ہے اس نے کہا۔"
"اور کئی باتوں میں غور و فکر کا نام صرف کسی ایک چیز کے غور کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا رشتہ دوسری چیزوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ جو خود غور و فکر نہ ہو کر، فکر انگیز

ہو جاتا ہے۔ اس بات کو میں ایک مثال دے کر صاف لفظوں میں سمجھاؤں گا۔ ایک متفرق عدد کو ہمیشہ متفرق کے نام سے پکارتے ہیں۔''

''ہمیشہ سچ ہے۔''

'لیکن کیا ویسی ایک چیز متفرق کہلاتی ہے؟ کیا اور دوسری چیزیں ایسی نہیں جن کو اپنا اپنا نام ہوتے ہوئے بھی متفرق کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ کبھی بھی متفرق سے الگ نہیں ہوتی۔

پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا عدد تین، جیسے عدد متفرق درجے میں نہیں آتے؟ اور بھی مثالیں ہیں جسے ہم تین کو ذاتی نام سے مخاطب کر سکتے ہیں اور متفرق سے بھی، جب کہ متفرق اور اور تین ایک ہی نہیں؟ یہ بات صرف تین، کے لیے ہی نہیں، بلکہ پانچ اور اس طرح کے دوسرے عدد کے لیے بھی ہے۔ ان میں سے ہر خود متفرق نہ ہونے پر بھی متفرق ہے۔ اور اسی طرح دو چار اور ایک عدد کی اس دوسری درجے میں ہر عدد برابر ہے لیکن وہ برابر نہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔؟

''بلاشبہ۔''

''اچھا اب اس نقطے کو بھی دیکھو، جو کہ میرا مطلب ہے۔'' سیبیس نے کہا۔

''لیکن پھر بھی عدد دو ضرور ہی عدد تین کے برابر نہیں۔''

''ہاں نہیں ہے۔''

''چنانچہ صرف مخالف خیالات ہی ایک دوسرے کی نزدیکی کے خلاف ہوتے نہیں ہیں بلکہ اور بھی ایسی طاقت ہے جو برابری کرنے والوں کی مخالفت کرتی ہیں۔''

'یہ بالکل سچ ہے۔''

''اگر ایسا ممکن ہے تو کیوں نہ ہم ان چیزوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔''

''ضرور۔''

''سیبیس، ان کی فطرت اس طرح کی ہے کہ وہ اپنے قبضے کی چیزوں کو نہ صرف اپنی ہی شکل اختیار کرنے کے لیے مجبور کرتی ہیں بلکہ اپنے برابر کا بھی؟''

''آپ کا مطلب۔''

''یہی، جیسا کہ ابھی میں کہہ رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ تم خود جانتے ہو کہ وہ چیزیں جو عدد 'تین' کے قبضے میں ہیں، صرف عدد میں ہی تین نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کے برعکس بھی ہونی چاہیے

''بالکل، سچ ہے۔''

"اور اس تفریق کے ساتھ جس کی چھاپ عدد 'تین' پر لگی ہے، ایک مخالف خیال کبھی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔؟

"نہیں۔"

"اور یہ چھاپ تفریق نے نہ ڈالی؟"

"ہاں۔"

"اور متفرق کا برعکس برابر ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو کیا برابر عدد ایسے خیال کبھی بھی تین کو حاصل کرے گا؟"

"نہیں۔"

"اس طرح تین کا تفریق سے کوئی رشتہ نہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

"تو عدد تین متفرق ہے؟"

"یہ بالکل سچ ہے۔"

"اب ذرا ان کی خصوصیات پر پھر سے سوچیں جو ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہونے پر بھی ان پر توجہ نہیں دیتی جیسے ہم لوگوں نے اس مثال میں دیکھا کہ تین، برابر عدد کو ذرا بھی اپنے دائرے میں نہیں لیتا۔ حالانکہ یہ برابر عدد کا برعکس نہیں ہے، بلکہ برعکس کو ہمیشہ دوسری سمت میں موڑ دیتا ہے جیسے دو متفرق کو اپنے دائرے میں نہیں لیتا ہے اور آگ ٹھنڈی کو نہیں۔ ان باتوں سے تم خاطر خواہ نتیجہ نکال سکتے ہو۔ اب میں ذرا مختصراً اس کو بیان کرتا ہوں۔ اس کو دہرانے میں کیا مضائقہ ہے؟ عدد پانچ کی خصوصیت کو نہیں اپناتا، ٹھیک ویسے ہی جیسے دس، جو کہ پانچ کا دوگنا ہے تفریق کی خصوصیت کو نہیں اپناتا ہے۔

"اس نے کہا، ہاں! اس بات پر میں پوری طرح آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور آپ کی باتوں کو مانتا ہوں۔"

"اچھا اب ذرا پھر سے شروع کرتے ہیں اور دیکھو، انہیں نقطوں میں جواب نہیں دینا، جن میں کہ میں سوال کروں اور نہ ہی وہ پرانا ہمیشہ کی طرح جواب دینا، جس کا چرچا میں نے پہلے کیا ہے۔ بلکہ ایک نئے انداز میں جواب دینا۔ جس کا کھرا پن تم ابھی اس مباحثے کی کسوٹی پر پرکھو گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سے کوئی پوچھے۔ "وہ کیا ہے، جس کے ساتھ لگے رہنے سے جسم گرم ہوتا ہے؟" تو تمہارا جواب "گرمی" (جس کو میں سیدھا جواب مانتا

ہوں) نہ ہو کر آگ ہو گا۔ یہ جواب ٹھیک ہے اور اب ہم ایسا جواب دینے کے لائق بھی ہیں۔ اس طرح اگر تم سے پوچھا جائے۔ جسم میں بیماریاں کیوں ہیں؟ تمہارا جواب بیماری کی وجہ، نہیں ہو گا، بلکہ بخار سے ہو گا۔ چنانچہ تفریق کو متفرق عدد کے مطابق کہنے کے بجائے، اب تم کہو گے کہ اکائی ہی ان کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اور زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ان باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ جاؤ گے۔"

"اس نے کہا، ہاں، میں آپ کی باتیں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

"پھر یہ بتاؤ وہ کون سی چیز ہے۔ جس کا ساتھ رکھنے سے جسم زندہ رہتا ہے؟

"روح" اس نے جواب دیا۔

"اور کیا یہ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں! بلاشبہ اس نے کہا۔"

"یہی کہ روح جس چیز کو حاصل کرتی ہے، وہ اس کے ساتھ ہی زندگی بھی لاتی ہے۔"

"ہاں! ضروری۔"

"اور کیا زندگی کا دوسرا رخ ہے۔"

"ہاں ہے، اس نے کہا۔"

"اور وہ کیا ہے؟"

"موت۔"

"تو روح، جیسا کہ ہم مان چکے ہیں کبھی بھی اپنے ساتھ لائی گئی خصوصیات کو قبول نہیں کرے گی"

"ناممکن! سیبیس نے جواب دیا۔"

"اچھا ابھی ابھی میں نے اس کا نام کیا بتایا تھا۔ جو کہ برابر کا مخالف ہوتا ہے؟"

"متفرق۔"

"اور وہ جو سنگیت اور انصاف کی مخالفت کرتا ہے۔"

"بے سرا پن اور ناانصافی، اس نے جواب دیا۔"

"اور ہم اس کو کیا کہتے ہیں، جو موت کو قبول نہیں کرتا؟"

"ابدیت، اس نے کہا۔"

"اور کیا روح موت کو قبول کرتی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو روح امر ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ باتیں ثابت ہو چکی ہیں؟"

"ہاں سقراط! پورے طریقے سے۔"

"اگر ہم متفرق کو فانی مانیں تو کیا 'تین' ختم نہیں ہوگا۔"

"بلاشبہ۔"

"اور اگر وہ، جس کو ہم نے ٹھنڈک کا نام دیا، ختم ہو جانے والا ہو تو کیا برف، گرمی سے پگھل کر پیچھے نہیں ہٹے گی، کیوں کہ وہ کبھی بھی ختم نہیں ہوگی اور نہ اس جگہ پر رہ کر گرمی کو ختم کر سکے گی؟"

"ٹھیک ہے اس نے کہا۔"

"پھر دیکھو! اگر گرمی ختم ہونے والی ہو تو آگ سردی سے ختم نہیں ہوتی، بجھ ہی جاتی بلکہ ہمیشہ کے لیے چلی جاتی؟"

"ضروری، اس نے کہا۔"

"ابدیت' کے متعلق بھی ایسا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اگر ابدیت، ختم ہونے والا ہو تو روح، موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی، کیوں کہ گزشتہ بحث میں یہ بات بیان کر دی گئی تھی کہ روح موت کو اپنے دائرے میں نہیں لے گی اور نہ مر ہی جائے گی۔ پھر بھی کوئی یہ بات پوچھے کہ "مان لیا کہ برابر کے نزدیک آنے پر متفرق، برابر نہیں بنے گا، لیکن تفریق کے ختم ہونے پر برابر عدد اس کی جگہ کیوں نہیں لے سکتا؟ جو آدمی یہ سوال اٹھاتا ہے، اس کو ہم لوگ یہ جواب تو دے نہیں سکتے کہ متفرق ابدی ہے کیوں کہ اس بات کو ابھی قبول نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ بات قبول ہو چکی ہوتی تو مجھے یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا کہ برابر کے آنے پر متفرق اور عدد تین چلے گئے اور یہی بحث آگ، نفرت اور کسی دوسری چیز کے لیے بھی ٹھیک رہے گی۔"

"یہ بالکل سچ ہے۔"

"ابدیت کے متعلق بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو امر ہے وہ ابدی بھی ہوتا ہے۔ تو 'روح' امر ثابت ہوتی ہے اور اگر نہیں تو اس کو ابدی ہونے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔"

''کسی دوسرے ثبوت کی تو ضرورت ہی نہیں، سیبیس نے کہا، کیوں کہ 'ابدیت' بھی فانی ہو سکتا ہے تو کوئی بھی چیز ہمیشہ زندہ رہنے والی نہیں ہو سکتی۔''

''سقراط نے جواب دیا، ہاں! پھر بھی لوگ مانتے ہیں کہ خدا، زندگی کے گزرے مواقع اور عام طور سے دوسری 'ابدیت' کی چیزیں کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔''

''ہاں سبھی لوگ مانتے ہیں، سچ ہے، اس نے کہا اور اگر میں غلط نہیں ہوں تو اتنا ہی نہیں، لوگوں کے علاوہ دیوتا بھی مانتے ہیں۔''

''اچھا اب یہ جان کر کہ 'ابدیت' ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، کیا ہم نہیں کہہ سکتے کہ 'روح' اگر وہ امر ہے تو فانی بھی ہوگی؟''

''ضرور۔''

''یہی نا کہ جب موت انسان پر حملہ کرتی ہے تو مٹ جانے والا عضو مر جاتا ہے لیکن جو 'امر' رہنے والا حصہ ہے، وہ موت آنے پر روانہ ہوتا ہے اور اس کو اچھی طرح محفوظ رکھا جاتا ہے؟''

''سچ ہے۔''

''ہاں تو پھر سیبیس 'روح' بلاشبہ امر اور ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔ اور ہم لوگوں کی روحیں ہمیشہ جنت میں رہیں گی۔''

''اب مجھے سمجھ میں آیا سقراط، سیبیس نے کہا اور اب مجھے کوئی بھی سوال نہیں کرنا لیکن اگر میرے دوست سمیعس یا دوسرے کسی آدمی کو کوئی سوال کرنا ہو تو اچھا یہی ہوگا کہ چپ نہ رہ کر اپنا سوال پوچھے، کیوں کہ اگر کسی کو کچھ کہنے یا کہلوانے کی ضرورت ہے تو میں نہیں سوچ سکتا ہوں کہ وہ کسی دوسرے موقع کے لیے اس بات کو ٹالنا چاہے گا۔''

''لیکن مجھے بھی اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ سمیعس نے جواب دیا۔ اور اتنا کچھ کہے جانے کے بعد، اب مجھے شبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب میں اس موضوع کی خصوصیت اور انسانی کمزوریوں کے متعلق پوچھتا ہوں تو میرے دل ہی دل میں اس کے متعلق کچھ خیال ہوتا ہے اور اس کی میں ٹال بھی نہیں سکتا ہوں۔''

''ہاں سمیعس، یہ خوب کہا۔ میں تو اتنا بھی کہوں گا کہ اگر وہ صحیح دکھائی دیں تو بھی ان پر ہوشیاری سے غور کیا جانا چاہیے اور جب ان کی جانچ تسکین آمیز ڈھنگ سے ہو جائے تو پھر انسان کو اپنی عقل پر پورا بھروسہ کرنے میں ہچکتے ہوئے محبت کا راستہ اپنانا چاہیے اور اگر وہ صاف رشتہ ہو تو آگے پوچھ تاچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

"بالکل سچ ہے۔"

"پھر سقراط نے کہا، لیکن اے میرے دوستو! اگر روح سچ مچ ہی امر ہے تو اس کی کتنی فکر کرنی چاہیے زندگی میں ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ...... اور اس نظریے سے بھلانے کی کوشش تو سچ پوچھو کہ بھیانک ہی لگتا ہے۔ اگر ان ساری چیزوں کا خاتمہ موت ہی ہے تو برے لوگوں کا مر جانا فائدہ مند ہوتا، کیوں کہ مر جانے کے بعد بخوشی انہیں اپنے جسم سے ہی چھٹکارا مل جاتا، بلکہ اپنی برائیوں اور روح سے بھی لیکن اب جہاں تک روح امر ہے۔"

"کیوں کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر کسی کی روح کو ایسی جگہ پر لے جایا جاتا ہے جہاں پر مرے ہوئے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔ وہاں پر سزا پانے کے بعد جنت میں چلے جاتے ہیں۔ اس راستے پر ان کو وہی لوگ راستہ بتاتے ہیں جو اس کام کے لیے معمور کے گئے ہیں۔ اچھا جنت کا یہ راستہ، جیسا کہ ایخیولس نے تیلیفس س میں کہا ہے۔ یہ راستہ سیدھا نہیں ہوتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو راستہ دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ کوئی اپنے راستے سے بھٹکتا۔ لیکن اس راستے میں بہت ساری پگڈنڈیاں ہیں اور بہت سے موڑ ہیں۔ جیسا کہ مجھے محسوس ہوتا ہے، جو کہ نیچے سرزمین پر تین راستے ملتے ہیں، وہ دیوتاؤں کو دیا جاتا ہے۔ عالم اور مقدس روح سیدھا راستہ اپناتی ہے اور اس کو اپنے چاروں سمت کے ماحول کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ لیکن جو روح، جسم سے وابستہ ہوتی ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے وہ بہت زمانے تک جان جسم اور اس دنیا کے آس پاس پھڑ پھڑاتی رہے۔ جس کو بڑی مشکل سے اپنے ساتھ خدائی طاقت لے جاتی ہے۔ اگر وہ گندی ہے، اس نے برا کام کیا ہو، قتل کیا ہو یا اس طرح کے دوسرے برے کام کیا ہو، تو روحوں کے اکٹھے ہونے والی جگہ پر، وہاں پر سبھی اس سے منہ موڑ لیتے ہیں، کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا، اس کو راستہ نہیں دیکھاتا، اکیلے ہی وہ مصیبت زدہ بن کر بھٹکتی رہتی ہے۔ اور جب اس کا مقررہ وقت آتا ہے تو اس کی جگہ پر پہنچایا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح پاکیزہ اور انصاف پسند روح کو جگہ ملتی ہے۔ جس نے اپنی زندگی دیوتاؤں کی صحبت اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر گزارا ہے۔"

"دیکھیے! دنیا کے بہت سارے عجیب و غریب حصے ہیں اور ضروری ہی اس کا پھیلاؤ اور ان کی فطرت جغرافیائی نظر سے مختلف ہوتی ہے۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب؟" سمیعس نے پوچھا۔ میں نے خود دنیا کے بارے میں بہت سارے بیانات سنے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ ان میں سے کس کو قبول کرتے ہیں؟"

"سقراط نے جواب دیا۔" سمیعس اگر میں گلاؤ کس کی افق جانتا ہوتا، تو میں ضرور کہتا، حالانکہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ گلاؤ کس کا فن مجھ کو ثابت کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟اس بات کو میں خود کبھی بھی ثابت نہیں کر سکوں گا اور سمیعس اگر میں کر بھی سکوں، تو مجھے ڈر ہے کہ بحث پورا ہونے سے پہلے ہی میری آخری گھڑی آجائے گی۔ خیر میں اپنے خیالات کے مطابق، تمہارے سامنے دنیا کی شکل اور اسکے حصوں کو بیان کروں گا۔"

"انتہائی ٹھیک ہوگا" سمیعس نے کہا۔

"تو ہاں میرا یقین ہے کہ دنیا گول ہے جو کہ آسمان کے مرکز پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس لیے اس کو ہوا یا ایسے ہی کسی دوسری طاقتوں کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ آسمان کے ذریعے اپنی جگہ پر ہے وہ گرتی نہیں ہے اور کسی طرح جھکتی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ جس چیز میں خود ہی ٹکے رہنے کی طاقت ہو اور اس چیز کے مرکز پر ہو جس کا بکھراؤ ٹکاؤ نہیں ہو، وہ کسی بھی حالت میں نہیں جھکے گی بلکہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہے گی اور اپنی جگہ سے ہٹے گی نہیں ...... یہ میرا پہلا خیال ہے"

"جو کہ بالکل ٹھیک ہے" سمیعس نے کہا"

"میرا یہ خیال ہے کہ دنیا کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے اور ہم فاسس ندی سے ہر کلوس کے ستونوں تک پھیلے ہوئے اس جگہ میں رہنے والے، سمندر کے ارد گرد صرف ایک چھوٹے سے حصے میں بسے ہوئے ہیں، مانا کہ ایک دلدل کے آس پاس چینٹیاں اور مینڈک رہ رہے ہوں اور اسی طرح بہت ساری دوسری جگہوں پر دوسرے باشندے ہوں، کیوں کہ دنیا کی سرزمین پر، ہر جگہ پر مختلف شکل و شبہات کی مرکزیں ہیں، جن میں پانی، دھند اور ہوائیں اکٹھی رہتی ہیں لیکن حقیقی دنیا ہمیشہ مقدس ہے اور وہ آسمان پر ہے۔ وہاں پر تارے بھی ہیں اور یہی وہ فلک ہے جس کو ہم لوگ جانتے ہیں اور ہماری زمین اس کی میل ہے جو اس کے نچلے مرکز میں اکٹھا ہوا ہے۔ لیکن اس سرزمین والے اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم لوگ دنیا کی اوپر سطح پر رہتے ہیں۔ اس پہلو پر ہم لوگوں کی حالت سمندر کی نچلی سطح میں رہنے والے ان جاندار چیزوں کی طرح ہے جو اپنے آپ کو پانی کی سطح پر سمجھتا ہے اور سمندر کے پانی کو وہ آسمان جانتا ہے۔ جس کے درمیان سے وہ سورج اور دوسرے ستاروں کو دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی کمزوریوں کے سبب کبھی بھی سطح پر نہیں آتا ہے اور نہ کبھی سر کو اوپر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اور نہ کبھی کسی جانکاری رکھنے والے جانداروں سے ہی کچھ سنتا ہے۔ چنانچہ اس کو یہ بات نہیں معلوم ہے کہ اس کی دنیا سے اوپر کی دنیا کس قدر صاف ستھری

ہے۔ ہماری حالت بھی ایسی ہے، کیوں کہ ہم لوگ دنیا کے نچلی سطح پر رہتے ہیں لیکن خود کو اوپری سطح پر سمجھتے ہیں اور اپنے چاروں طرف کی ہواؤں کو آسمان سمجھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ چمکیلے ستارے اس میں ہی گھوم رہے ہیں، لیکن حقیقت میں ہم لوگ اپنی کمزوریوں اور کاہلی کے سبب اس ہوا کی اوپری سطح پر نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر انسان کے اندر کائنات کے اس منظر کو دیکھنے کی طاقت ہو تو وہ فرد اس بات کو قبول کرتا کہ وہی دوسری دنیا ہے...... حقیقی آسمان، حقیقی روشنی اور دنیا ہے۔ کیوں کہ ہماری زمین، پتھر اور ہمارے چاروں طرف کی دنیا میں جکڑا ہوا ہے۔ گھلا ہوا ہے جیسا کہ سمندر میں ہر چیز نمکین پانی میں گھلتی ہے اور وہاں پر کوئی اعلیٰ قسم کی پیداوار بھی نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اس کے نیچے کی آبی سطح کا مقابلہ اس دنیا کے خوبصورت مناظر سے نہیں کر سکتے ہیں۔ سمیعس! میں تم کو آسمان کے نیچے قیام پذیر اس اوپری دنیا کی ایک مزیدار کہانی سنا سکتا ہوں۔ وہ سننے کے لائق ہے۔"

"اور ہم، سمیعس نے جواب دیا......اس کو سننے میں مشغول ہو جائیں۔"

"ارے میرے دوست! اس نے کہا۔ وہ کہانی اس طرح ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب اس دنیا کو اوپر سے دیکھا جائے تو وہ گیند کی طرح دھاردار لگتی ہے۔ جن کے اوپر چمڑے کے بارہ ٹکڑوں کا خول چڑھا رہتا ہے اور وہ مختلف رنگوں سے اس طرح سجی ہوئی ہے، جیسے اس سرزمین کو رنگ دیا ہو۔ لیکن وہاں کی دنیا ان ہی رنگوں سے بنی ہوئی ہے اور وہ ہمارے یہاں کے رنگوں سے صاف اور چمکیلے ہیں اور ان کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ہوا اور پانی کا بھی اپنا رنگ ہے اور یہ دوسرے رنگوں سے مل کر چمکیلی روشنی پھیلاتے ہیں۔ چنانچہ یہ سارے منظر ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور اس خوبصورت دنیا میں پیدا ہونے والی ہر چیز۔ پیڑ، پھل اور پھول یہاں کے پھل و پھول سے اتنے ہی خوبصورت ہیں۔ وہاں پر جو پہاڑ ہیں، ان کے پتھر ہمارے یہاں بیش قیمتی جواہرات، لعل اور دوسری سچے موتیوں سے کہیں زیادہ چمکیلے، صاف و شفاف ہیں۔ اس کی وجہ؟ وہ پاکیزہ ہیں اور ہمارے یہاں کی موتیوں کی طرح وہ گندے نمکین چیزوں سے نقصان زدہ نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اس اوپر والی دنیا کے بیش قیمت موتی ہیں، جو خود سنہرے ہے، چاند کی طرح سفید اور دوسرے ایسے ہی رنگوں سے چمکتا ہے۔ وہ ہمیشہ دن کی طرح اجلا، بڑا، پورا ہونے کی وجہ سے اس دنیا کے دیکھنے والے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہاں جانور اور انسان بھی ہیں۔ کچھ اندرونی حصے میں رہتے ہیں اور کچھ ہواؤں میں جیسا کہ ہم لوگ سمندر کے نزدیک رہتے ہیں۔ اور دوسرے جزیروں میں جن کے چاروں طرف ہوائیں ہی ہوائیں ہیں۔ مختصراً ہم یہ کہیں کہ جس طرح ہم لوگ پانی اور

سمندر کا استعمال کرتے ہیں، ویسے ہی وہ ہواؤں کا استعمال کرتے ہیں اور ہمارے لیے جو اہمیت ہوا کی ہے وہ ان کے لیے تیز ہواؤں کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں کے موسم کی حالت کچھ ایسے ہیں کہ وہ لوگ کبھی بیمار نہیں ہوتے۔ ان کے دیکھنے، سننے اور سونگھنے کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ وہاں پر ان کے مندر اور دوسرے زیارت کرنے کی جگہیں بھی ہیں جہاں دراصل دیوتا رہتے ہیں۔ وہ ان کی آواز سنتے ہیں اور ان سے لاعلم ہوتے ہیں اور ان سے گفتگو بھی کرتے ہیں۔ وہ سورج، چاند اور تاروں کو ان کی حقیقی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان کی دوسری خوشیاں بھی اسی طرح کی ہوتی ہیں۔"

"یہ رہی پوری دنیا اور ہماری سرزمین کے اردگرد کے چیزوں کا فطرت۔ اس دنیا کے بہت سارے حصے ہیں۔ کچھ تو ہمارے حصے یعنی جس میں رہتے ہیں اس سے زیادہ گہرے اور وسیع ہیں۔ لیکن ان کے راستے ہمارے جانے کے راستے سے زیادہ تنگ ہیں۔ ان سب میں بے شمار چھید ہیں، جو کہ زمین کے اندر پھیلے ہوئے تنگ و طویل راستوں سے ملے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر اور باہر سمندر کے مانند پانی کی دھاریاں بہتی ہیں، ندیاں ہیں، گرم اور ٹھنڈے پانی کے جھرنے، اور ایک بھیانک آگ، آگ کی ندیاں، کیچڑ کی پتلی دھارائیں (تسلسل میں بہنے والی کیچڑ کی ندیاں جیسی، جن کے پیچھے لاوے کی دھارائیں بہتی ہیں) بہتی رہتی ہیں اور جن حصوں سے ہو کر یہ نہیں ہیں، وہ حصے ان سے بھر جاتے ہیں۔ زمین کے اندر ایک طرح کی کپکپاہٹ ہوتی ہے جو کہ ان سبھی چیزوں کو اوپر نیچے ہلاتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ؟ ایک دڑار ہے، یہی دڑار جس کا بیان میں نے ان لفظوں میں کیا ہے۔"

"بہت دور زمین سے نیچے جہاں بے پناہ گہرائی ہے۔" اس دڑار کے اندر رہنے والی دھاراؤں سے کپکپاہٹ ہوتی ہے اور ان کی خصوصیت اس مٹی کی سی ہوتی ہے جس میں کہ یہ بہہ کر آئی ہے۔ یہ دھارائیں ہمیشہ اندر باہر کیوں بہتی رہتی ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ اوپر نیچے جھولتا رہتا ہے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوائیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔؟ ٹھیک اسی طرح سے جیسے کہ سانس لیتے ہوئے انسان ہوا کو اندر اور باہر کرتا رہتا ہے اور اس پانی کے ساتھ اندر اور پھر باہر جاتے ہوئے وہ تیز ہوا بھیانک طوفان پیدا کرتی ہے۔ جب یہ پانی زمین کے نچلے حصے سے ہو کر ان حصوں میں بہتا ہے۔ اور پھر جب یہ ان حصوں کو چھوڑ کر دوبارہ واپس ویسے ہی دھکے سے یہاں آتا ہے تو سطح پانی سے بھر جاتی ہے، اور پھر مختلف نالوں سے بہتا ہوا گزرتا ہے۔ جہاں پر کے سمندر، جھیل، ندیاں ہوتی ہیں، وہاں سے یہ نالے پھر زمین میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ تو دور دور جگہوں میں لمبے لمبے چکر کاٹتے

ہوئے اور کچھ تھوڑی دور تھوڑے ہی جگہوں میں سے گزرتے ہوئے گرتے ہیں۔ کچھ تو اسی سمت میں اور کچھ زمین کے گرد ایک یا بہت بار سانپ کی کنڈی کے مانند لپٹ کر جتنا بھی نیچے ان سے ہو سکے چلے جاتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ دوبارہ اسی میں گرتے ہیں۔ دونوں سمتوں میں بہنے والے نالے صرف مرکز تک ہی نیچے جا آسکتے ہیں۔ کیوں کہ پھر ان کے سامنے ایک چٹان ہے۔

"اچھا یہ نالے، یہ ندیاں مختلف طرح کی بڑی اور چھوٹی ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف چار ہی ہیں جن کو سب سے اچھی 'اوسینس' کہتے ہیں۔ اور یہ زمین کے چاروں طرف ایک دائرے میں بہتی ہیں۔ اس کے مخالف سمت میں اوخیرون، بہتی ہے۔ جو کہ زمین کے نیچے، بے جان جگہوں سے ہو کر، اخیروسین، نامی جھیل میں گرتی ہے۔ یہ وہ جھیل ہے جس کے کنارے پر مرنے کے بعد ہزاروں روحیں چلی جاتی ہیں اور وہاں پر مقررہ وقت (جو کچھ کے لیے لمبا اور کچھ کے لیے کم ہوتا ہے) پر ٹھہر کر انہیں جانوروں میں جنم لینے کے لیے دوبارہ بھیجا جاتا ہے۔ ان دونوں ندیوں کے درمیان سے تیسری ندی نکلتی ہے اور وہ ایک آگ کے دریا میں گرتی ہے۔ جہاں پر روم ساگر سے بھی بڑی، ابلتے ہوئے کیچڑ اور پانی کی ایک جھیل بن جاتی ہے۔ جہاں سے وہ میلا اور گدلا پانی آگے نکل کر زمین کے چاروں طرف چکر کاٹتا ہوا بہت سی جگہوں سے ہوتا ہوا، اخیروسین، جھیل کے کنارے تک آپہنچتا ہے۔ لیکن اس کے پانی کے ساتھ نہیں ملتا ہے اور پھر زمین کے گرد کنڈلیاں بنا کر بہت ہی گہری سطح میں گرتا ہے۔ یہی وہ 'پیوری فلیگ تھون' ندی ہے جو زمین کے مختلف جگہوں پر آگ کے فوارے پھینکتی ہے۔ چوتھی ندی دوسرے سمت سے باہر جاتی ہے۔ اور سب سے پہلے ایک سنسان اور بھیانک جگہ میں گرتی ہے، جو کہ سارے کا سارا نیلے پتھر کے مانند گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ اس طرح بنی ہوئی جھیل کو 'سدیکس' اور اس ندی کو "سدیوگین" کہتے ہیں۔ اس جھیل میں آکر پانی کو بے پناہ طاقت حاصل ہوتی ہے اور پھر یہ ندی زمین کے نیچے سے گزر کر، مخالف سمت سے چکر کاٹ کر 'پیوری فلیگ تھون' کی دوسری جانب اخیروسین، جھیل کے نزدیک آتی ہے۔ اس ندی کا پانی بھی کسی دوسری ندی کے پانی کے ساتھ نہیں ملتا۔ یہ چاروں طرف ایک گول چکر کاٹ کر 'پیوری فلیگ تھون' کے آمنے سامنے، ٹارٹاروس، میں گرتی ہے۔ شاعروں نے اس کا نام 'کوکیوتمیس' رکھا ہے۔"

یہ اس دوسری دنیا کی کائنات ہے جہاں مرنے کے بعد روحیں پہنچتی ہیں اور اس بات کا فیصلہ سب سے پہلے کراتی ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی سچائی و پاکیزگی سے گزاری یا

نہیں۔ جن لوگوں نے بھلے و برے سے ہٹ کر زندگی گزاری، وہ اخیرون، ندی میں جاتے ہیں۔ وہاں پر موجود کسی بھی جہاز میں بیٹھ کر اس جھیل میں پہنچائے جاتے ہیں۔ جہاں پر ان کو قیام کرنا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی گناہوں کو بخشا بھی جاتا ہے۔ اس طرح دوسروں کے لیے کی گئی برائیوں کی وجہ سے انہیں سزا ملتی ہے اور پھر انہیں معاف کیا جاتا ہے۔ لیکن جن روحوں نے بھیانک برائیاں کی ہیں یعنی قتل و غارت وغیرہ تو ان کو 'ٹارٹاروس' میں پھینکا جاتا ہے۔ ان کے لیے مناسب جگہ بھی وہی ہے اور وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آتے ہیں۔ جنہوں نے ایسے گناہ کیے ہوں جو بشرطیکہ گمبھیر ہیں یعنی غصے میں آکر اپنے والدین پر تشدد کیا ہو اور بعد میں ساری زندگی پچھتاوا کی آگ میں جلتے رہے یا جنہوں نے اس طرح کے نازک حالات میں دوسروں کو مجبور کیا ہو، ان کو بھی 'ٹارٹاروس' میں پھینکا جاتا ہے۔ اور ایک سال تک انہیں وہاں پر تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور پھر لہریں انہیں باہر پھینک دیتی ہیں۔ مرد قاتل کو 'کوکیوتیں' کے راستے سے اور دوسروں کو 'پیوری فلیگ تھون' کے راستے سے اخیروسین، جھیل میں پہنچایا جاتا ہے، وہاں وہ لوگ زور زور سے ان کو پکارتے ہیں جنہیں انہوں نے مار یا تکلیف دیا ہو۔ وہ ان سے معافی مانگتے ہیں، رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔ اور جھیل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی فریاد کرتے ہیں۔ اور ان کی تکالیف کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کی دعاؤں میں اثر نہیں ہو تو دوبارہ 'ٹارٹاروس' میں پہنچائے جاتے ہیں اور وہاں سے دوبارہ ان ندیوں میں۔ اس طرح یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ ان کی نظر عنایت ان پر نہیں ہو، جن کو انہوں نے دکھ دیا ہے۔ ایسے لوگ جو نیک ہوتے ہیں وہ دنیا کے ان بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ اوپر اپنے گھر میں چلے جاتے ہیں اور پاکیزگی سے بھری دنیا میں رہتے ہیں۔ میرے پاس اس سے زیادہ وقت نہیں ہے کہ اور کچھ بول سکوں۔"

"یہی وجہ ہے سمیعس، ان باتوں پر غور کر کے اس دنیا میں مذہبی، عالم اور پرہیز گار بننا چاہیے اور اس کے لیے کیا نہیں کرنا چاہیے؟ آگے دیکھو پھل کس قدر شیریں ہے اور امیدیں کتنی عظیم ہیں۔"

"حالانکہ ایک عقل مند فرد کو میرے اس بیان سے جو میں نے روح اور اس کے رہنے والے گھر، پر دیا ہے اتفاق نہیں کرنا چاہیے، لیکن میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جہاں تک روح کی ابدیت ہم کو سچ لگتی ہے، اگر کوئی اس بیان کے متعلق تھوڑا بہت سچ مانے تو برا نہیں ہے۔ ایسا کرنا فخر کی بات ہوگی، اس لیے میں اپنے بیان کو طویل کیے جا رہا ہوں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اس آدمی کو اپنی روح کے لیے خوش رہنا چاہیے، جو دنیا کے عیش و آرام کو اپنا

نہیں مانتے، برے کاموں سے پرہیز کر کے علم حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنی روح کو کسی پرائی پوشاک سے سجا کر نہیں بلکہ اپنے ذاتی زیورات یعنی صبر، انصاف بہادری اور سچ سے سجا کر ہمیشہ اوپر کے سفر کے لیے تیار رہتے ہیں۔ سمیعس اور سیبیس! تم لوگ کبھی نہ کبھی اس دنیا کو چھوڑ دو گے۔ مجھے تو، جیسا کہ کوئی شاعر کہے گا کہ میری قسمت مجھے پہلے ہی بلا رہی ہے۔ اب تو مجھ کو فوراً ہی زہر پینا ہے۔ میرے خیال میں اچھا یہی رہے گا کہ میں غسل خانہ میں چلا جاؤں تاکہ مرنے کے بعد عورتوں کو میرا جسم دھونے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑے۔"

"سقراط نے بولنا بند کیا تو کراتیو نے پوچھا۔ سقراط! ہمارے لیے کوئی حکم تو نہیں، تمہارے اولاد کے لیے کوئی بات یا کوئی دوسری بات، جس میں ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں؟"

اس نے جواب دیا، کوئی خاص بات کہنے کو نہیں ہے۔ ہاں، صرف ایک بات ضرور ہے، جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا آیا ہوں۔ اپنا دھیان رکھنا چاہیے۔ تم بھلے ہی مجھ سے ایسا کرنے کا وعدہ کرو یا نہیں، لیکن ایسا کرنا یوں سمجھو، ہمیشہ میری، میرے دوستوں اور ہم سبھی کی خدمت کرنے کے برابر ہوگا۔ اگر تم لوگوں کو خود اپنی پرواہ نہیں ہے، تم ابھی بھلے ہی مجھ سے لمبے چوڑے وعدہ کرو لیکن وہ سب بے کار ہوں گے۔"

"ہم اپنی جانب سے پوری کوشش کریں گے، کراتیو نے کہا۔ ہاں! ہم لوگ تم کو کس طریقے سے دفن کریں؟"

"تم لوگوں کو جو بھی اچھا لگے، اپنے ڈھنگ سے کرنا، لیکن مجھے پکڑے رہنا، ہاں کہیں ایسا نہیں ہو کہ میں تمہارے ہاتھوں سے چھوٹ جاؤں۔ ایسا کہنے کے بعد وہ مڑے اور مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ میں کراتیو کو یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ میں وہی سقراط ہوں، جس کو وہ فوراً ہی دیکھے گا یعنی میرا مردہ جسم، تبھی تو اس نے پوچھا کہ وہ مجھے کس طریقے سے دفن کرے گا؟ حالانکہ میں نے بہت بار، یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ زہر پینے کے بعد مجھے خوشی ملے گی، پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ میرے ان لفظوں کا، جن سے میں نے تم کو اور اپنے آپ کو تسکین دے دیا تھا، کراتیو پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اس کے سامنے میری طمانیت ہو جیسا کہ مقدمے کے دوران منصفوں کے سامنے یہ میرا بنا تھا۔ لیکن ضمانت کی شکل مختلف ہوگی کیوں کہ اس نے جج کے سامنے کہا تھا کہ میں بھاگوں گا نہیں اور اب تم لوگوں کو اس بات کی ضمانت دینی ہوگی کہ میں رہوں گا نہیں۔ میں ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ تب ہی اس کو میری موت پر دکھ ہوگا۔ اور یہ میرے جسم کو آگ

میں جلاتے ہوئے یا دفن کرتے ہوئے زیادہ غم زدہ نہیں ہو گا۔ میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ یہ میری حالت کو دیکھ کر دکھی ہو میں یہ بھی نہیں چاہتا ہوں کہ وہ مرگھٹ میں کہے کہ ہم سقراط کو اس طرح ہٹاتے ہیں یا ہم اس کے پیچھے پیچھے اس کی قبر تک جاتے ہیں یا ہم اس کو دفن کرتے ہیں۔ کیوں کہ غلط لفظ خود میں ہی برے نہیں بلکہ روح میں بھی برائی پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کراتیو خوش رہو اور ایسے کہو کہ تم سقراط کو نہیں بلکہ صرف اس کے جسم کو دفن کر رہے ہو۔ اور اس جسم کو رسم و رواج کے مطابق یا تم جو بہتر سمجھو کر لینا۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ غسل خانے میں چلے گئے۔ کراتیو نے ہم لوگوں کو ٹھہرنے کے لیے کہا اور ان کے پیچھے چلا گیا۔ ہم لوگ وہاں پر بحث و مباحثہ پر گفتگو اور اپنے غم کا اظہار کرتے رہے۔ وہ ایک والد کی طرح تھے اور ان کی عنایت نظر سے ہم لوگ محروم کیے جا رہے تھے اور اب ہم لوگ اپنی باقی زندگی یتیموں کی طرح بسر کریں گے۔ ان کے غسل کرنے کے بعد ان کے بچوں کو سامنے لایا گیا۔ ان کے دو چھوٹے اور ایک بڑا لڑکا تھا۔ ان کے خاندان کی عورتیں بھی آ گئیں۔ انہوں نے کراتیو کی موجودگی میں ان سے کچھ بات چیت کی اور ان کو کچھ حکم بھی دیا، پھر وہ انہیں رخصت کر کے ہمارے پاس آ گئے۔"

اب سورج غروب ہونے والا تھا، انہوں نے غسل کرنے کے بعد پھر سے دوبارہ ہم لوگوں کے پاس محفل جمائی، لیکن کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔ فوراً ہی جیلر اس کمرے میں آیا اور سقراط کے نزدیک آ کر بولا...... "سقراط! میں تمہارے ساتھ دوسرے لوگوں کی طرح کوئی بدسلوکی نہیں کر سکتا ہوں، کیونکہ یہاں آنے والے قیدیوں میں تم سب سے زیادہ مہذب، عالم اور قابل فخر انسان ہو۔ حالانکہ میں خود تو نہیں لیکن اعلیٰ عہدے دار کے حکم سے زہر پینے کو کہتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم مجھ پر ذرا بھی ناراض نہیں ہو گے، کیونکہ تم جانتے ہو کہ زہر میرا نہیں دوسروں کا ہے۔ الوداع! تم اس 'ہونی' کو قبول کرو...... یہ سزا دینے والا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور وہ باہر چلا گیا۔

سقراط اس کی جانب دیکھ کر کہنے لگا...... "تم بھی میری دعائیں قبول کرو اور ہاں! میں تمہارا حکم بخوشی بجا لاؤں گا، اور پھر ہم لوگوں کی طرف مڑ کر کہنے لگے کہ کتنا مہذب انسان ہے، جب سے میں جیل میں آیا ہوں وہ ہمیشہ ہی مجھ سے ملنے آتا ہے اور گفتگو کرتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ میری وجہ سے اس کو کتنا دکھ ہو رہا ہے۔ کراتیو ہم کو ان کے حکم ماننا چاہیے۔ اس لیے اگر زہر کا پیالہ تیار ہے تو اس کو لایا جائے اور اگر نہیں تو خادم کو کہہ دو کہ بنائے۔"

اس پر کراتیو نے کہا..... سورج ابھی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہے۔ مجھے بہت سارے لوگوں کے بارے میں پتہ ہے جنہوں نے زہر دیر سے پیا ہے۔ زہر پینے کے حکم کے بعد بھی انہوں نے کھانا کھایا اور اپنی محبوبہ سے گفتگو کی۔ جلدی مت کرو، بہت وقت ہے"

سقراط نے جواب دیا..... ہاں کراتیو! جن کے بارے میں تم چرچا کر رہے ہو، ان لوگوں کو ایسا کرنا ٹھیک ہی ہے، کیونکہ ان لوگوں کے مطابق دیر کرنا ہی فائدہ مند ہے، لیکن میں ان لوگوں کے مانند حرکت نہیں کروں گا، کیونکہ میرے مطابق زہر کو دیر سے پی کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جس زندگی کا پہلے ہی اغوا کر لیا گیا ہے، اس زندگی کو روکنے یا بچانے کی کوشش کر کے میں خود اپنی نظر میں گروں گا۔ چنانچہ مجھے مہربانی کر کے اجازت دو..... اس بات کو ٹھکراؤ نہیں۔"

کراتیو نے نزدیک کھڑے خادم کو اشارہ کیا اور وہ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ جیلر کے ساتھ واپس آیا۔ جیلر کے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ تھا۔ اب سقراط نے اس سے کہا..... اے میرے اچھے دوست! تم کو ان باتوں کا تجربہ ہے۔ مہربانی کر کے مجھے یہ سمجھاؤ کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ اس نے جواب دیا..... پہلے تم کو ادھر ادھر گھومنا ہے اور جیسے ہی ٹانگیں بھاری بھاری سی لگنے لگے تو نیچے لیٹ جانا ہے۔ زہر اپنا کام کرنے لگے گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے سقراط کو پیالہ پکڑایا اور اس نے ایک بھرپور نظر ڈالی۔ سقراط نے بغیر کسی خوف کے، سلیقے سے زہر کا پیالہ لیا اور اس نے کہاں اگر اس پیالے میں سے کسی دیوتا پر پوجا چڑھاؤں تو تمہارا کیا خیال ہے؟ دوں کہ نہیں؟ جیلر نے جواب دیا..... سقراط! ہم لوگ صرف اتنا ہی بتاتے ہیں، جتنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سمجھ گیا۔ سقراط نے کہا۔ لیکن پھر بھی میں ایسے ہی دیوتا سے دعاء کیوں نہیں کروں۔ تاکہ میرا یہ سفر اچھا ہو۔ خدا نے میری دعائیں قبول کر لیں۔ پھر اس پیالے کو ہونٹ سے لگایا اور خوشی سے زہر پی لیا۔ ابھی تک ہم لوگوں نے اپنے دکھ کو ضبط کیا تھا، لیکن زہر پینے کے بعد، ہم لوگوں سے رہا نہیں گیا۔ اور لاکھ نہیں چاہنے پر بھی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ یہاں تک کہ میں اپنا منہ ڈھک کر روتا رہا۔ سقراط کے لیے نہیں، بلکہ ایک دوست سے بچھڑنے کی قیمت پر۔ ایسی بات نہیں کہ میں پہلا فرد تھا، کیونکہ کراتیو جب آنسوؤں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اور میں نے بھی وہی کیا اور اسی لمحے اپولو دورس جو پہلے سے ہی رو رہا تھا، میری طرح چیخنے لگا۔ صرف ایک سقراط نے امن و سکون بنائے رکھا تھا۔ یہ کیسی چیخ ہے؟ اس نے پوچھا۔ میں نے عورتوں کو خاص کر یہاں سے اس لیے بھیج دیا کہ وہ اس طرح کا کوئی کام نہیں کریں، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ انسان کو

سکون سے مرنا چاہئے۔ مہربانی کر کے چپ ہو جاؤ اور صبر کرو۔ جب ہم لوگوں نے اس کی باتیں سنیں، تو ہم لوگوں کو شرم محسوس ہوئی اور ہم لوگوں نے اپنے آنسوؤں کو قابو میں کیا۔ وہ تب تک ادھر ادھر گھومتا رہا جب تک کہ اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے نہیں لگیں۔ اس کے بعد وہ حکم کے مطابق پیٹھ کے بل لیٹ گیا۔ جس نے اس کو زہر دیا تھا وہ کبھی کبھی اس کی ٹانگوں اور پنجوں کو ٹٹول کر دیکھ لیتا تھا۔ کچھ وقت کے بعد اس نے اس کے پنجے کو دبا کر پوچھا کہ وہ محسوس کر رہا ہے؟ نہیں! سقراط نے کہا۔ اس نے سقراط کی ٹانگوں کو ذرا اوپر اور پھر زیادہ اوپر دبا کر دیکھا اور پھر اس نے ہم لوگوں کو دکھایا ہے کہ اس کا نچلا حصہ ٹھنڈا پڑا ہے۔ اس نے دوبارہ اس کے عضو کو چھو کر دیکھا اور کہا کہ زہر کا دل تک پہنچتے ہی اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جانگھوں کے ارد گرد ٹھنڈا پڑ ہی رہا تھا کہ اس نے منہ پر سے کپڑا ہٹایا، کیونکہ اس نے خود کو ڈھانپ رکھا تھا اور کہا...... یہی اس کے آخری الفاظ تھے اس نے کہا...... "کراتیو! مجھے اسکلے پیئس کے نام ایک مرغا چڑھانا ہے۔ اس قرض کو چکانا تو نہیں بھولو گے؟ کراتیو نے کہا...... قرض چکایا جائے گا اور کوئی بات؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک دو لمحے کے بعد کچھ ہلنے کی آواز آئی اور خادموں نے اس پر پڑا ہوا کپڑا ہٹایا۔ اس کی آنکھیں جامد ہو چکی تھیں۔ کراتیو نے ان کو اور اس کے منہ کو بند کیا۔"

اخیر کراتیں! میرے دوست کا آخری لمحہ ایسا تھا۔ میں اس کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میرے ہم عصروں میں یہ فرد سب سے اچھا عالم، انصاف پسند اور پرہیزگار تھا۔

○○

# تنہائی کے سو سال

(ترجمہ: زینت حسام)

**بہت** برسوں بعد، فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرتے ہوئے، کرنل اوریلیانو بوئندیا ماضی کی اس دور دراز سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ زندگی میں پہلی بار اسے برف دکھانے لے گیا تھا۔ اس وقت ماکوندو مٹی کے بیس گھروں پر مشتمل گاؤں تھا، جو ایک ایسے دریا کے کنارے بنائے گئے تھے جس کا شفاف پانی چکنے پتھروں کے پاٹ پر بہتا تھا۔ یہ پتھر ماقبل تاریخ کے انڈوں کی مانند سفید اور عظیم الجثہ تھے۔ دنیا اتنی تازہ تھی کہ بہت سی چیزوں کے کوئی نام نہ تھے، اور ان کا ذکر کرتے وقت ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں مفلوک الحال خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ گاؤں کے قریب اپنے خیمے لگاتا، اور نقاروں اور بانسریوں کے شور و غل کے ساتھ نت نئی ایجادات کا مظاہرہ کرتا۔ پہلے وہ مقناطیس لائے۔ غیر مانوس داڑھی اور چڑیا کے سے ہاتھوں والے ایک بھاری بھرکم خانہ بدوش نے، جس نے اپنا تعارف ملکیادیس کے نام سے کرایا، لوگوں کے سامنے، بقول اس کے، مقدونیہ کے عالم کیمیا گروں کے آٹھویں عجوبے کا ایک جید مظاہرہ پیش کیا، اور لوگ ششدر ہو کر، اپنی اپنی جگہوں سے گر کر دھات کے پیچھے لڑھکتی دیگچیوں، کڑھائیوں، چمٹوں اور انگیٹھیوں کو، کیلوں اور پیچوں کی بے قراری سے تڑختے شہتیروں کو، اور ان اشیاء کو جنہیں گم ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں، انہیں کونوں کھدروں سے، جہاں انہیں سب سے زیادہ تلاش کیا گیا تھا، نمودار ہوتے دیکھتے رہ گئے، جو ایک ہنگامہ خیز افراتفری میں ملکیادیس کے طلسمی ڈلوں کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی تھیں۔ ''اشیا کی اپنی زندگی ہوتی ہے'' خانہ بدوش نے کرخت لہجے میں اعلان کیا، ''صرف ان کی روحوں کو بیدار کرنے کی بات ہے۔'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے، جس کا تخیل ہمیشہ فطرت کی قوتوں سے، بلکہ معجزوں اور طلسمات سے بھی پرے جاتا تھا، سوچا کہ اس بے مقصد ایجاد کے ذریعے زمین کے پیٹ سے سونا نکالا جا سکتا ہے۔ ملکیادیس نے، جو ایک دیانت دار انسان تھا، اس کو خبردار کیا: ''اس سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا۔'' لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا ان دنوں خانہ بدوشوں کی دیانت پر ایمان نہ رکھتا تھا،

لہٰذا اس نے اپنے خچر اور دو بکریوں کے عوض مقناطیسی ڈلے خرید لیے۔ اس کی بیوی ارسلا اگواران، جو اپنے مختصر گھریلو مال واسباب میں اضافے کے لیے ان جانوروں پر انحصار کرتی تھی، حوزے آرکادیو کو اس حرکت سے باز نہ رکھ سکی۔ "بہت جلد ہمارے پاس کافی سونا ہوگا اور ہم گھر کا فرش پکا کرا سکیں گے،" اس کے شوہر نے کہا۔ وہ کئی مہینوں تک اس خیال کو سچ ثابت کرنے میں لگا رہا۔ مقناطیسی ڈلوں کو گھسیٹتے ہوئے اور ملکیادیس کے منتر بہ آواز بلند پڑھتے ہوئے، حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس خطے کا ایک ایک انچ کھوج لیا، یہاں تک کہ دریا کی تہہ بھی کھنگال ڈالی۔ جو کچھ وہ کھود نکالنے میں کامیاب ہوا وہ پندرھویں صدی کا ایک زرہ بکتر تھا، جو زنگ خوردگی سے جڑا ہوا تھا، اور جس کے اندر پتھروں سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے توبنے کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جب حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کی مہم کے چار آدمی زرہ بکتر کو کھولنے میں کامیاب ہوئے تو اس کے اندر سے ایک بھر بھرایا ہوا انسانی ڈھانچہ برآمد ہوا، جس کے گلے میں تانبے کا ایک لاکٹ جھول رہا تھا۔ لاکٹ کے اندر کسی عورت کے بالوں کی ایک لٹ تھی۔

مارچ میں خانہ بدوش واپس آئے۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ دوربین، اور طبل برابر محدب عدسہ لائے، جسے انہوں نے ایمسٹرڈیم کے یہودیوں کی ایجاد کہہ کر متعارف کرایا۔ انہوں نے ایک خانہ بدوش عورت کو گاؤں کے ایک سرے پر بٹھا دیا اور خیمے کے سامنے دوربین لگا کر بیٹھ گئے۔ پانچ سکوں کے عوض لوگ دوربین میں جھانک کر عورت کو ہاتھ بھر کے فاصلے پر بیٹھا دیکھ سکتے تھے۔ "سائنس نے فاصلے مٹا دیے ہیں،" ملکیادیس نے اعلان کیا۔ "بہت جلد کوئی بھی شخص گھر بیٹھے دیکھ سکے گا کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کیا ہو رہا ہے۔" دوپہر کے جلتے سورج نے محدب عدسے کے ساتھ ایک حیرت انگیز تماشا کیا: انہوں نے گلی کے بیچ خشک بھوسے کی ایک ڈھیری لگائی، اور شعاعوں کو مرتکز کر کے اس میں آگ بھڑکا دی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو، جس کی اپنے مقناطیسوں کی ناکامی کے بعد سے اب تک دل جوئی نہ ہو سکی تھی، عدسے کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ملکیادیس نے ایک بار پھر اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آخرکار دو مقناطیسی ڈلوں اور نوآبادیاتی زمانے کے تین سکوں کے عوض حوزے آرکادیو بوئندیا کو محدب عدسہ دے دیا۔ ارسلا پریشانی سے رو دی۔ وہ پیسے سونے کے سکوں سے بھرے صندوق سے نکالے گئے تھے جو اس کے باپ نے عمر بھر روکھی سوکھی کھا کر جوڑے تھے، اور جو ارسلا نے کسی مناسب وقت پر استعمال میں لانے کے لیے پلنگ کے نیچے زمین میں دبا رکھے تھے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے ارسلا کو تسلی دینے کی

کوئی کوشش نہ کی، اور کسی سائنسداں کی سی نفس کشی کے ساتھ، خود اپنی سلامتی کی بھی پرواہ کئے بغیر، حربی تجربات میں محو ہو گیا۔ دشمنوں کی فوج پر عدسے کے اثرات کے مظاہرے کی ایک کوشش میں، وہ سورج کی شعاعوں کے ارتکاز کا خود شکار ہو کر اپنا جسم کئی جگہ سے جلا بیٹھا، اور ان زخموں کے بھرنے میں طویل عرصہ لگا۔ بیوی کے احتجاج پر، جس کو اس خطرناک ایجاد پر بے حد تشویش تھی، ایک موقعے پر حوزے آرکادیو بوئندیا جھنجھلا کر گھر کو آگ دکھانے لگا تھا۔ وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے میں بند، اس انوکھے ہتھیار کے حربی امکانات کا جائزہ لیتا رہتا، یہاں تک کہ وہ ایک ایسا ہدایت نامہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جو حیرت انگیز طور پر اطلاقی صراحت، اور ایک ناقابل تعرض یقین کامل کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ یہ کتابچہ اس نے اپنے لاتعداد تجربوں کی تفصیلات اور خاکوں کے ساتھ نتھی کر کے، ایک قاصد کے ہاتھ حکومت کو روانہ کیا، جو پہاڑوں کو عبور کرتا، لامتناہی دلدلوں میں گم ہوتا، سرکش دریاؤں کو پار کرتا، وباؤں، خونخوار جانوروں اور ناامیدیوں سے قریب المرگ تھا کہ اس نے ایک ایسا راستہ پالیا جسے ڈاک لے جانے والے خچر استعمال کیا کرتے تھے۔

اس حقیقت کے باجود کہ دارالخلافے تک پہنچنا ناممکن حد تک مشکل تھا، حوزے آرکادیو بوئندیا نے ٹھان لی کہ جیسے ہی حکومت اسے فوج کے سامنے اس ایجاد کا عملی ثبوت دینے اور فوجیوں کو پیچیدہ شعاعی جنگ کے رموز سکھانے کا حکم دے گی، وہ اس مہم پر نکل کھڑا ہوگا۔ کئی سال تک اس نے جواب کا انتظار کیا۔ آخر کار انتظار سے تھک کر اس نے ملکیادیس کے سامنے اپنے تجربوں کی ناکامی کا رونا رویا۔ خانہ بدوش نے دیانت داری کا تسلی بخش ثبوت دیتے ہوئے محدب عدسہ واپس لے کر حوزے آرکادیو بوئندیا کو مقناطیسی ڈلے لوٹا دیئے، اور اس کے ساتھ کچھ پرتگالی نقشے اور جہاز رانی کے چند آلات بھی اس کے پاس چھوڑ دیئے۔ اس نے راہب ہیر من کی تحقیقات کا مختصر خلاصہ خود تحریر کر کے حوزے آرکادیو کو دیا تاکہ وہ اسطر لاب، قطب نما اور زاویہ پیما کو کام میں لا سکے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے برسات کے طویل ماہ اس چھوٹے سے کمرے میں بند ہو کر تجربات کرنے میں گزارے جسے اس نے مکان کے عقب میں تعمیر کیا تھا۔ تاکہ کوئی اس کے تجربات میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ اپنی خانگی ذمے داریوں سے یکسر بے نیاز ہو کر، وہ تمام رات اس صحن میں بیٹھا ستاروں کی چالیں دیکھا کرتا، اور دوپہر کے درست وقت کا تعین کرنے کے چکر میں اسے لو لگتے لگتے بچی۔ جب وہ اپنے آلات کے استعمال میں طاق ہو گیا تو اس کے ذہن میں خلا کا ایسا نظریہ آیا جس کی مدد سے وہ اپنے کتب خانے سے نکلے بغیر انجانے سمندروں کا سفر، غیر آباد خطوں کی سیر

اور شاندار ہستیوں سے تعلق قائم کر سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب اس نے خود سے باتیں کرنے اور گھر میں کسی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر چلنے کی عادتیں اپنالی تھیں۔ اس دوران ارسلا اور بچوں کی، باغ میں کیلے، کلادیئم، شکر قند، آبھویاما اور بیگن اگا اگا کر، کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ پھر اچانک، کسی اطلاع کے بغیر، حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہذیانی سرگرمی کی جگہ ایک فسوں کی سی کیفیت نے لے لی۔ اس نے کئی دن یوں گزارے جیسے کسی سحر میں ہو، اپنی سمجھ پر اعتبار کئے بغیر وہ سرگوشیوں میں خوفناک قیاسات بڑبڑاتا رہتا۔ آخر دسمبر کے مہینے میں، منگل کے روز، دوپہر کے کھانے کے وقت، اس نے اپنی اذیت کا تمام بوجھ اچانک اتار پھینکا۔ بچے اپنے باپ کی، جو طویل بے خوابی اور اپنے تخیل کے قہر سے تباہ ہو چکا تھا، اس جلیل القدر متانت کو عمر بھر یاد رکھنے والے تھے جس کے ساتھ اس نے اپنی دریافت ان پر منکشف کی:

"دنیا گول ہے، نارنگی کی طرح۔"

ارسلا سے ضبط نہ ہو سکا۔ "اگر تم کو پاگل ہونا ہی ہے تو براہ کرم صرف خود پاگل ہو،" وہ چلائی، "اپنے خانہ بدوشوں کے سے خیالات بچوں کے سروں میں نہ گھساؤ۔" بے حس حوزے آرکادیو بوئندیا اپنی بیوی کی مایوسی سے خوفزدہ نہ ہوا، جس نے طیش میں آکر اسطرلاب فرش پر دے مارا۔ اس نے اسطرلاب دوبارہ بنالیا، گاؤں کے مردوں کو تنگ کمرے میں جمع کیا اور اپنے نظریات کی مدد سے، جنہیں کوئی نہ سمجھ سکا، اس امکان کو ثابت کرنے میں لگ گیا کہ مسلسل مشرق کی سمت سفر کرنے پر کوئی بھی شخص اسی جگہ واپس پہنچ سکتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا ہو۔ گاؤں بھر کو یقین ہو چلا تھا کہ حوزے آرکادیو بوئندیا کا دماغ چل گیا ہے۔ تب ملکیادیس نے آکر معاملہ سلجھایا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اس شخص کی ذہانت کو سراہا جس نے خالصتاً علم ہیئت کے قیاس پر مبنی ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو پہلے ہی عملی طور پر ثابت کیا جا چکا تھا، گو کہ ماکوندو میں اب تک کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ تحسین کے ثبوت کے طور پر اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک ایسا تحفہ دیا جو گاؤں کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والا تھا: ایک کیمیاگر کی تجربہ گاہ۔

تب تک ملکیادیس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ابتدائی پھیروں میں وہ حوزے آرکادیو بوئندیا کا ہم عمر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کہ موخرالذکر نے اپنی غیر معمولی قوت کو برقرار رکھا تھا، جس کے ذریعے وہ گھوڑے کو کانوں سے پکڑ کر روک سکتا تھا، خانہ بدوش لگتا تھا کسی بیماری سے اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ در حقیقت اس کا یہ حال ان متعدد اور غیر معمولی بیماریوں کی وجہ سے ہوا جن کا دنیا کے گرد بے شمار چکر لگاتے ہوئے شکار ہوا

تھا۔ جیسا کہ تجربہ گاہ میں آلات ترتیب سے رکھنے میں حوزے آرکادیو بوئندیا کی مدد کرتے وقت بات چیت کے دوران خود اس نے کہا، موت اس کے تعاقب میں تھی، اس کے پائنچوں کو سونگھتی پھرتی، لیکن اپنے پنجے اس پر گاڑنے کا فیصلہ نہ کر پاتی۔ ملکیادیس ان تمام طاعونوں اور ناگہانی آفتوں سے بچ کر آیا تھا جو نوعِ انسان پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ وہ فارس میں پیلاگرا، ملایا کے جزائر میں اسقربوط، اسکندریہ میں کوڑھ، جاپان میں بیری بیری، مدغاسکر میں کالے طاعون، سسلی میں زلزلے اور آبنائے ماگیلان میں سمندری طوفان سے بچ نکلا تھا۔ ملکیادیس ایک دل گیر شخص تھا، اداسی کے ہالے میں گھرا ہوا ایک ایسا انوکھا بشر جس کے پاس کہا جاتا تھا ناستراداِمس کی پیش گوئیوں کی شرحیں تھیں: ایک ایسی نگاہ کا حامل جو اشیا کے پار دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک بڑا سا کالا ہیٹ پہنے رہتا، جو بڑے بڑے پر پھیلائے پہاڑی کوّے کی مانند لگتا، اور ایک مخملی واسکٹ جس پر صدیوں کی چکنی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے علم و فراست، اور اس کی پراسرار وسعت نگاہ کے باوجود، اس کا ایک انسانی وجود تھا، ایک بوجھ، ایک دنیاوی کیفیت، جو اس کو روزمرہ کے مسائل میں الجھائے رکھتی۔ وہ ضعیفی میں لاگو ہونے والی بیماریوں کا رونا روتا، اور معمولی پریشانیوں سے دوچار رہتا۔ ہنسنا وہ ایک عرصہ ہوا ترک کر چکا تھا، کیوں کہ اس کے دانت اسقربوط کی بیماری میں گر گئے تھے۔ اس حبس زدہ دوپہر کو، جب خانہ بدوش اپنے راز اس پر آشکار کر رہا تھا، حوزے آرکادیو بوئندیا کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان دونوں کے درمیان ایک عظیم دوستی کا آغاز ہو رہا ہے۔ بچے اس کی عجیب و غریب داستانیں حیرت زدہ ہو کر سن رہے تھے۔ اور ریلیانو، جو اس وقت پانچ سال سے زیادہ کا نہ ہو گا، زندگی بھر ملکیادیس کو اسی طرح یاد رکھنے والا تھا جیسا اس نے اس دوپہر کو دیکھا تھا: دھات کی سی چمکیلی اور مرتعش روشنی میں بیٹھا، تخیل کی تاریک ترین گپھاؤں کو اپنی بھاری گونج دار آواز سے روشن کرتا ہوا، جبکہ گرمی کی حدت سے اس کی کنپٹیوں پر چکنائی پگھل کر بہہ رہی تھی۔ حوزے آرکادیو، اس کا بڑا بھائی، اس زبردست لمحے کا نقش موروثی یاد کا حصہ بنا کر اپنی آل اولاد کے لیے چھوڑ جانے والا تھا۔ البتہ ارسلا کے لیے ملکیادیس کی اس ملاقات کی ناخوشگوار یاد باقی رہی، کیوں کہ جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، ملکیادیس نے بے احتیاطی سے پارے کا فلاسک توڑا تھا۔

"اس میں سے شیطانی بو آ رہی ہے،" ارسلا نے کہا۔

"ہرگز نہیں،" ملکیادیس نے اس کی اصلاح کی۔ "یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ شیطان میں گندھک کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پارہ تو محرق جوہر ہے۔"

ہمیشہ کی طرح پند آمیز ملکیادیس ارسلا کو شنگرف کی شیطانی خصوصیات پر لیکچر دینے لگا۔ مر ارسلا نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی، اور بچوں کو لے کر عبادت کے لیے چلی گئی۔ اس کاٹنے والی تیز بو کو اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ملکیادیس کی یاد سے وابستہ ہو جانا تھا۔

وہ ابتدائی تجربہ گاہ، طرح طرح کے برتنوں، قیفوں، مقاطیر اور چھلنیوں کے علاوہ، پانی کی ایک بھدی سی نلکی، پتلی لمبی گردن والے کانچ کے پیالے، پارس پتھر کی ایک نقل، اور مریم یہودی کے تین بازوؤں والے انبیق پر مشتمل تھی جسے خانہ بدوشوں نے جدید تفصیلات کی روشنی میں بنایا تھا۔ ان اشیا کے ساتھ، ملکیادیس سات سیاروں سے مطابقت رکھنے والی سات دھاتوں کے نمونے، سونے کی مقدار دوگنی کرنے والے موسیٰ اور زوزیمس کے نسخہ جات، تشریحات اور خاکوں سے مرصع ان عظیم تعلیمات پر مبنی ایک جامع کلیات، ان لوگوں کے لیے چھوڑ گیا تھا جو ان کی تفسیر کی صلاحیت رکھتے ہوں اور پارس پتھر تیار کرنے کا بیڑا اٹھا سکیں۔ سونے کی مقدار دگنی کرنے کے آسان نسخے کے جھانسے میں آکر حوزے آرکادیو بوئندیا ہفتوں ارسلا کی طرف ملتفت رہا، تاکہ وہ زمین میں دبائے ہوئے سونے کے سکے نکالنے دے، اور وہ ان کو اتنی دفعہ دگنا کر سکے جتنا کے پارے کو تقسیم در تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ارسلا ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اپنے شوہر کی اٹل ضد کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ اور پھر حوزے آرکادیو بوئندیا نے تین سکوں کو ایک کڑھائی میں ڈالا، ان کو تانبے کے ذرات، زرنیخ، گندھک اور جست کے ساتھ پگھلایا، اور پھر اس آمیزے کو ارنڈی کے تیل میں ابلنے کو رکھ دیا، یہاں تک کہ وہ ایک گاڑھے، طاعونی سیال میں بدل گیا، جو سونے سے زیادہ عام سا شکر کا شیرہ معلوم ہوتا تھا۔ ارسلا کو ورثے میں ملا ہوا قیمتی اثاثہ ان پرخطر اور سخت مراحل سے گزرنے، سات سیاروں کی دھاتوں کے ساتھ پگھلنے، ہوا بند پارے اور جوہر نمک کے ساتھ ملائے جانے اور خنزیر کے تیل میں پکنے کے بعد (کہ مولی کا تیل اس وقت دستیاب نہ تھا) سؤر کی بھنی ہوئی خستہ کھال کے ایک بڑے سے ٹکڑے میں تبدیل ہو گیا جو کڑھائی کے پیندے سے مضبوطی کے ساتھ چپک گیا تھا۔

جب خانہ بدوش واپس آئے تو ارسلا پورے گاؤں کو ان کے خلاف کر چکی تھی۔ لیکن تجسس خوف پر غالب آیا، کیوں کہ اس دفعہ خانہ بدوش طرح طرح کے ساز بجاتے گاؤں میں گھوم رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اور ایک نقارچی ناسیان سینیز کی سب سے حیران کن ایجاد کے مظاہرے کا اعلان کر رہا تھا۔ لہٰذا ہر شخص خیمے کی طرف چل پڑا، اور ایک ایک سکہ دے کر جواں سال ملکیادیس کا دیدار کرنے لگا، جس کی جھریاں غائب ہو چکی تھیں

اور نئے سفید دانت چمچمارہے تھے۔ جن لوگوں کو ملکیادیس کے اسقر بوط سے گلے ہوئے مسوڑھے، اندر کو پچکے ہوئے گال اور پھٹے ہوئے ہونٹ یاد تھے، خانہ بدوش کی مافوق الفطرت قوت کا مظاہرہ دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے، اور وہ خوف اس وقت شدید ہراس میں بدل گیا جب ملکیادیس نے اپنی بتیسی ایک لمحے کے لیے نکال کر دکھائی ...... وہ لمحہ جس میں ملکیادیس دوبارہ وہی پیر فرتوت بن گیا...... اور منھ کھول کر اسے پھر سے جمایا، اور اعادۂ شباب کے پورے اعتماد کے ساتھ مسکرایا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا تک نے یہ سوچا کہ ملکیادیس کا علم اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے، لیکن جب ملکیادیس نے اسے نقلی دانتوں کے بارے میں سمجھایا تو حوزے آرکادیو بوئندیا پر ایک مثبت جوش کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ بات اس کو اتنی معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی انوکھی لگی کہ راتوں رات وہ کیمیاگری سے اپنی تمام تر دلچسپی کھو بیٹھا۔ وہ بدمزاجی کے ایک نئے بحران سے گزرا۔ اس نے وقت پر کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تمام دن وہ گھر میں ٹہلا کرتا۔ "دنیا میں ناقابل یقین چیزیں ہو رہی ہیں،" اس نے ارسلا سے کہا، "دریا کے اس پار ہر طرح کے طلسمی آلات موجود ہیں، اور ہم یہاں گدھوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔" جو لوگ حوزے آرکادیو بوئندیا کو ماکوندو کی بنیاد پڑنے کے وقت سے دیکھتے چلے آئے تھے، وہ حیران رہ گئے کہ وہ ملکیادیس کے اثر میں آکر کتنا بدل گیا ہے۔

ابتدا میں حوزے آرکادیو بوئندیا گھر کا پرشباب سربراہ تھا، جو کاشت کاری کی ہدایتیں جاری کرتا، بچوں کی پرورش اور جانوروں کی افزائش نسل کے بارے میں مشورے دیتا، اور سب کے ساتھ مل کر ہر طرح کے کام کرتا، یہاں تک کہ گاؤں کی بہبود کے لیے جسمانی مشقت میں بھی لوگوں کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کا گھر شروع ہی سے گاؤں کا بہترین گھر تھا، لہٰذا دوسرے گھر اسی طرز پر بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں ایک چھوٹی سی روشن بیٹھک تھی، چبوترے پر کھانے کا کمرہ بنایا گیا تھا جس میں خوش رنگ پھول تھے، دو خواب گاہیں تھیں، ایک آنگن جس میں شاہ بلوط کا ایک دیو قامت درخت تھا، ایک صاف ستھرا باغیچہ، اور ایک باڑا جہاں بکریاں، سؤر اور مرغیاں پرسکون سنگت میں رہتی تھیں۔ صرف لڑاکا مرغ ہی ایک ایسا حیوان تھا جس کا نہ صرف اس گھر میں، بلکہ پوری آبادی میں داخلہ ممنوع تھا۔

ارسلا کام کرنے کی اتنی ہی استعداد رکھتی تھی جتنی اس کا شوہر۔ وہ پھرتیلی، چھوٹی سی، سخت گیر، مضبوط اعصاب والی عورت، جس کو آج تک کسی نے گنگناتے نہ سنا تھا، پو پھٹے سے رات گئے تک اپنے سخت، کلف دار پیٹی کوٹ کی نرم سرگوشیوں کے ساتھ ہر جگہ دکھائی دیتی۔ اسی کی بدولت کٹا ہوا کچا فرش، مٹی کی دیواریں، لکڑی کا پرانا فرنیچر، جو انہوں نے خود

بنایا تھا، ہمیشہ صاف ستھرا رہتا، اور پرانی الماریوں کے خانوں سے، جہاں وہ اپنے کپڑے رکھتے تھے، کالی تلسی کی گرم مہک اٹھا کرتی۔

حوزے آرکادیو بوئندیا نے، جو گاؤں کا سب سے زیادہ پر عزم مرد تھا، بستی کے تمام گھر ایسے وقوع پر بنائے تھے کہ ہر گھر سے یکساں محنت کے ساتھ دریا پر جا کر پانی لایا جا سکتا تھا، اور گلیوں کی ترتیب ایسی سوجھ بوجھ سے رکھی تھی کہ کسی گھر کو دوسرے گھر سے زیادہ دھوپ کی حدت نہ پہنچتی۔ چند ہی برسوں میں ماکوندو جیسا باترتیب اور محنتی گاؤں اس کی تین سو کی آبادی میں سے کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ حقیقتاً ایک ایسا خوش و خرم گاؤں تھا جہاں کوئی تیس سال سے زیادہ کا نہ تھا، اور جہاں کوئی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔

گاؤں کی بنیاد پڑنے کے زمانے ہی سے حوزے آرکادیو بوئندیا نے پنجرے اور دام بنائے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں نہ صرف اس نے اپنے گھر کو، بلکہ گاؤں کے ہر گھر کو طوطوں، میناؤں، بلبلوں اور خوش رنگ کلغی دار پرندوں سے بھر دیا۔ انواع و اقسام کے پرندوں کی چہچہاہٹیں اور نغمے ارسلا کو اتنا پریشان کرتے کہ وہ اپنے کانوں میں موم ڈال لیتی کہ کہیں شور سے پاگل نہ ہو جائے۔ جب ملکیادیس کا قبیلہ پہلی دفعہ سر درد کے علاج کے لیے شیشے کی گولیاں بیچتا گاؤں پہنچا تھا، تو سب کو حیرت ہوئی تھی کہ انہیں خوابیدہ دلدلوں میں گم یہ گاؤں کیوں کر ملا، اور خانہ بدوشوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ پرندوں کے نغموں کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے ہیں۔

اجتماعی پیش قدمی کا یہ جذبہ جلد ہی غائب ہو گیا، مقناطیس کی دھن، علم نجوم کے حساب کتاب، کیمیاگری کے خوابوں، اور دنیا کے نوادرات دریافت کرنے کی تمنا نے اس ولولے کو پس پشت ڈال دیا۔ ایک صاف ستھرے، چاق و چوبند انسان سے، حوزے آرکادیو بوئندیا ایک کاہل الوجود، لباس کے معاملے میں بے پروا شخص میں تبدیل ہو گیا۔ جس کی وحشیانہ ڈاڑھی ارسلا بڑی کوششوں اور باورچی خانے کی چھری کی مدد سے تراشتی۔ کئی لوگ اسے آسیب کا شکار سمجھتے۔ لیکن وہ لوگ بھی، جنہیں اس کے پاگل پن کا یقین ہو چکا تھا۔ اپنے اپنے کام کاج اور گھر بار چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے، جب وہ اوزار سنبھالتا ہوا نکلا، اور لوگوں سے ایک ایسی راہ کھولنے کے لیے کہا جس کے ذریعے ماکوندو کی رسائی دنیا کی عظیم ایجادات تک ہو سکے۔

حوزے آرکادیو بوئندیا خطے کے جغرافیے سے قطعی نابلد تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ مشرق میں سنگلاخ پہاڑی سلسلہ ہے، اور پہاڑوں کے دوسری طرف ریوہاچا کا قدیم شہر،

جہاں، اس کے دادا اور ریلیانو بوئندیا اول کے بقول، سر فرانسس ڈریک نے توپوں سے مگرمچھوں کا شکار کیا تھا، اور پھر ان کے ٹکڑے اکٹھا کر کے، اور ان میں بھس بھروا کے، ملکہ الزبتھ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ جوانی میں حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے آدمیوں نے بیوی بچوں، مویشیوں اور ساز و سامان کے ساتھ ان پہاڑوں کو عبور کیا تھا تاکہ سمندر تک نکلنے والی راہ کا پتا لگا سکیں، اور چھبیس ماہ کے بعد اس مہم کو خیر باد کہہ کر ماکوندو کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ انہیں واپس نہ جانا پڑے۔ لہٰذا وہ ایک ایسا راستہ تھا جس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، جو صرف ماضی کو جاتا تھا۔ جنوب میں دلدل تھی، جو دائمی خودرو نباتاتی کیچڑ سے ڈھکی ہوئی تھی، اور دلدلی سلسلے کی وسیع کائنات تھی، جس کی، خانہ بدوشوں کے بقول، کوئی حد ہی نہ تھیں۔ مغرب کی سمت وہ وسیع دلدل ایک لامتناہی آبی سلسلے سے جا ملتی تھی جہاں نرم جلد والی، دودھ پلانے والی مچھلیاں تھیں، جن کے سر اور دھڑ عورتوں کے سے تھے، اور جن کے غیر معمولی پستانوں کی کشش ملاحوں کو برباد کر دیتی تھی۔ خانہ بدوش زمین کے اس ٹکڑے تک پہنچنے سے پہلے جہاں سے ڈاک لے جانے والے خچر گزرا کرتے تھے۔ اس دلدلی راستے پر چھ ماہ تک کشتیوں میں رواں رہے تھے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کے حساب کے مطابق، تہذیب سے اتصال کا راستہ شمال کی سمت سے نکل سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے زمین صاف کرنے کے اوزار اور شکار کرنے کے ہتھیار ان لوگوں کو تھمائے جو ماکوندو بساتے وقت اس کے ساتھ تھے، قطب نما اور نقشے اپنے تھیلے میں ڈالے اور اس پر خطر مہم پر نکل پڑا۔

پہلے چند روز انہیں کوئی مشکل نہ پیش آئی۔ وہ دریا کے پتھریلے کنارے کے ساتھ ساتھ اس جگہ تک اترتے چلے گئے جہاں انہیں برسوں پہلے سپاہی کا زرہ بکتر ملا تھا۔ اور وہاں سے جنگلی نارنگی کے درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سے گزر کر بن میں داخل ہو گئے۔ پہلے ہفتے کے اختتام پر انہوں نے ایک ہرن شکار کر کے بھونا۔ لیکن وہ اس بات پر متفق ہوئے کہ آدھا ہرن کھایا جائے، اور باقی نمک لگا کر آئندہ کے لیے رکھ لیا جائے۔ اس تیاری کے ذریعے انہوں نے کوشش کی کہ توتوں کو پکڑ کر نہ کھانا پڑے۔ جن کا نیلا گوشت سخت اور بدمزہ ہوتا تھا۔ پھر دس دن سے زیادہ عرصے تک انہوں نے سورج نہ دیکھا۔ زمین آتش فشاں کے لاوے کی طرح نرم اور گیلی ہوتی گئی، نباتات دبیز تر، اور پرندوں کی چیخیں اور بندروں کا شور دور تر ہوتا گیا، اور کائنات پر دائمی اداسی چھا گئی۔ اپنے جوتے کھولتے ہوئے تیل کے جوہڑوں میں دھنساتے، کلہاڑیوں سے خون رنگ سوسن کے پھولوں کو کاٹتے اور سنہرے سلامندر مارتے ہوئے، مہم کے لوگ اس پرنم اور ساکت جنت کے اندر قدیم یادوں

میں ڈوبتے چلے گئے، وہ یادیں جو گناہ آدم کے وقت سے بھی پرے کی تھیں۔ ایک ہفتے تک، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر، خواب ناک کیفیت میں سرشار، نیند میں چلنے والوں کی مانند، وہ اس غمگین کائنات میں اترتے چلے گئے۔ وہ کائنات جو صرف جگمگاتے ہوئے کیڑوں کی لطیف پرچھائیوں سے روشن تھی اور ان کے پھیپھڑے خون کی دم گھونٹنے والی بو سے پھٹنے لگے۔ وہ واپس نہ جاسکتے تھے۔ کیوں کہ وہ جو بھی راستہ کھولتے، جلد ہی نباتات دوبارہ اگنے سے بند ہونے لگتا، وہ نباتات جو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اگ آتی تھیں۔ "ٹھیک ہے،" حوزے آرکادیو بوئندیا کہتا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہم سمت نہ بھول جائیں۔" قطب نما کی مدد سے وہ اپنے آدمیوں کو ان دیکھے شمال کی جانب راستہ دکھاتا رہا تاکہ وہ اس پر طلسم خطے سے نکل سکیں۔ وہ ایک گہری رات تھی، بے ستارہ، لیکن اندھیرا تازہ اور صاف ہوا سے بارور ہوتا جارہا تھا۔ طویل مسافت کی تھکن سے چور، انہوں نے اپنی اپنی جھولنیاں درختوں کے تنوں سے تانیں اور دو ہفتوں کے مسلسل سفر کے بعد گہری نیند سوئے۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔ منظر کے فسوں نے انہیں گنگ کردیا۔ ان کے سامنے، فرن اور کھجور کے درختوں میں گھرا، صبح کی روشنی میں سفید، اور سفوف کی طرح بھر بھرایا ہوا ایک بڑا سا قدیم ہسپانوی جہاز، داہنے رخ پر ہلکا سا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے مستول پر بادبان کے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ جہاز کے رسے گیاہ سے مزین تھے، اور اس کا پیٹا، نرم کائی اور پتھرائی ہوئی سیپ مچھلیوں سے پٹا ہوا، مضبوطی سے پتھریلی زمین پر جما کھڑا تھا۔ تمام ڈھانچا یوں لگتا تھا جیسے اپنی مخصوص جگہ گھیرے ہوئے ہو، جو تنہائی اور گمنامی کی دنیا تھی، وقت کی تباہ کاری اور پرندوں کی دست برد سے محفوظ۔ جہاز کے اندرونی حصے میں جس کا مہم کے ارکان نے احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا، پھولوں کے ایک گھنے جنگل کے سوا کچھ نہ نکلا۔

جہاز کی دریافت سے، جو سمندر کے نزدیک ہونے کی نشاندہی کرتی تھی، حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہمت ٹوٹ گئی۔ وہ اسے اپنی متلون مزاج قسمت کی ایک چال سمجھا کہ وہ سمندر جس کو وہ ہزارہا قربانیوں اور دشواریوں کے باوجود تلاش نہ کرپایا تھا، اب اچانک، کسی تلاش کے بغیر، ایک ناقابل تسخیر شے کی طرح اس کے راستے میں حائل تھا۔ بہت برسوں بعد، جب وہ خطہ ڈاک کی باقاعدہ ترسیل کے راستے کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا، اسے ایک بار پھر کرنل اوریلیانو بوئندیا نے عبور کیا، اور اسے جہاز کا صرف جلا ہوا ڈھانچہ افیون کی کھیت میں نظر آیا۔ اس وقت جب اسے یقین ہوگیا کہ باپ کی سنائی ہوئی کہانی اس کے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھی، اس کو تعجب ہوا کہ جہاز خشکی کے اس حصے میں کس طرح آکر

پھنسا ہوگا۔ لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاز کو پیچھے چھوڑ کر، مزید چار دن کے سفر کے بعد، جب اس نے راکھ کے رنگ کا گندا، جھاگ اڑاتا سمندر دیکھا تو اس کے سارے خواب ڈھ گئے۔ وہ سمندر اتنی قربانیوں اور مہم جوئیوں کے قابل نہ تھا۔

"خدا غارت کرے،" وہ چلایا، "ماکوندو چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔"

جزیرہ نما ماکوندو کا خیال، جو حوزے آرکادیو بوئندیا کے بنائے ہوئے بے طور، بے ڈھنگے نقشے کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ طویل عرصے تک قائم رہا۔ وہ نقشہ اس نے مہم سے واپسی پر طیش میں آکر بنایا تھا۔ بدنیتی سے، راستے کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر گویا خود کو اس بات کی سزا دے رہا ہو کہ اس نے عقل سے کس قدر بالاتر ہو کر وہ جگہ چنی تھی۔ "ہم کہیں نہیں پہنچ سکتے۔" اس نے ارسلا سے واویلا کیا۔ "ہم یہیں سڑ کر مر جائیں گے، سائنس کے فائدے اٹھائے بغیر۔" یہ یقین، جس پر تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیے جانے والے تنگ کمرے میں بند حوزے آرکادیو بوئندیا بہت دنوں تک سوچ بچار کرتا رہا، ماکوندو کو کسی بہتر مقام پر منتقل کرنے کے منصوبے کا سبب بنا۔ اس وقت تک ارسلا کو اس ہذیانی منصوبے کی ہوا لگ چکی تھی۔ ایک چیونٹی کی سی رازداری اور مشقت کے ساتھ اس نے گاؤں کی عورتوں کو اپنے شوہروں کی متلون مزاجی کی مخالفت پر مائل کر لیا تھا، جو منتقلی کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو معلوم نہ ہوا کہ کس لمحے، یا کن مخالف قوتوں کے سبب، اس کا منصوبہ عذر، ٹال مٹول، ناامیدیوں اور حیلہ سازیوں کے جالوں میں لپٹ کر ایک فریب میں بدل گیا۔ ارسلا نے ایک معصوم توجہ کے ساتھ اس پر نظر رکھی، بلکہ اس صبح جب وہ نقل مکانی کے بارے میں بڑبڑاتا ہوا عقبی کمرے میں تجربہ گاہ کا سامان ڈبوں میں رکھ رہا تھا، ارسلا کو اس پر ترس بھی آیا۔ لیکن اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو یہ کام نمٹانے دیا۔ اور کچھ کہے بغیر اسے ڈبے بند کر کے ان میں کیلیں ٹھونکتے، اور سیاہی میں برش ڈبو کر اپنا نام لکھتے ہوئے دیکھتی رہی، لیکن اسے معلوم تھا کہ حوزے آرکادیو بوئندیا کو معلوم ہے (کیوں کہ ارسلا نے اسے خود دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرتے سن لیا تھا) کہ گاؤں کے لوگ اس مہم میں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ البتہ جب حوزے آرکادیو بوئندیا کمرے کا دروازہ اکھاڑنے لگا، تو ارسلا نے ہمت کر کے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور اس نے کسی قدر تلخی کے ساتھ جواب دیا: "چوں کہ کوئی ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں، لہٰذا ہم لوگ اکیلے ہی جائیں گے۔" ارسلا پریشان نہ ہوئی۔

"ہم نہیں جائیں گے" اس نے کہا، "کیوں کہ ہمارا بیٹا یہاں پیدا ہوا تھا۔"

”یہاں ابھی تک ہم میں سے کوئی نہیں مرا ہے۔ جب تک کسی جگہ کوئی اپنا دفن نہ ہو، وہ جگہ اپنی نہیں ہوتی۔“

ارسلا نے ایک نرم استقامت سے جواب دیا: ”اگر تم سب لوگوں کے یہاں ٹھہرنے کے لیے مجھے مرنا پڑا تو میں مر جاؤں گی۔“

حوزے آرکادیو بوئندیا نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اس کی بیوی عزم کی اتنی پکی ہے۔ اس نے ارسلا کو اپنے پرکشش تخیلات سے لبھانے کی کوشش کی، ایک انوکھی دنیا کا وعدہ کیا جہاں انسان کی جب خواہش ہوتی، اسے صرف زمین پر آب طلسم چھڑکنا ہوتا اور درخت پھل دینے لگتے، جہاں دود رفع کرنے کے لیے انواع واقسام کے آلات سستی قیمت پر ملتے۔ لیکن ارسلا اس کی بصیرت سے قطعی متاثر نہ ہوئی۔

”بجائے اس کے کہ تم اپنی احمقانہ ایجادات کے بارے میں سوچتے رہو، تمہیں اپنے لڑکوں کی فکر کرنی چاہیے،“ ارسلا نے کہا، ”دیکھو، وہ کس حالت میں ہیں۔ گدھوں کی طرح وحشی ہوتے جا رہے ہیں۔“

حوزے آرکادیو بوئندیا نے اپنی بیوی کی بات کو لفظا لیا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بچے دھوپ میں ننگے پاؤں باغ میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے بچے اسی لمحے، اچانک، ارسلا کے جادو پھونکنے سے وجود میں آئے ہوں۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو اندر ہی اندر کچھ ہوا، کوئی قطعی اور پراسرار کیفیت، جو اسے اس کے اپنے زمانے سے اکھاڑ کر یادوں کے نامعلوم گوشوں میں لے گئی۔ ارسلا نے جھاڑو دینا جاری رکھا، اس گھر میں جواب خالی چھوڑ دیے جانے کے خطرے کی زد سے باہر آچکا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا خیالوں میں گم کھڑا بچوں کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کی نمی صاف کی اور تسلیم و رضا کا ایک گہرا سانس کھینچا۔

”ٹھیک ہے،“ حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا، ”لڑکوں سے کہو ڈبوں سے سامان نکلوانے میں میری مدد کریں۔“

سب سے بڑا لڑکا، حوزے آرکادیو، چودہ سال کا تھا۔ اس کا سر چوکور، بال گھنے اور فطرت باپ کی سی تھی۔ گو کہ اس کی قوت اور جسمانی نشو و نما کی رفتار باپ پر گئی تھی۔ یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ اس میں تخیل کی کمی ہے۔ وہ ماکوندو بسانے سے پہلے دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرنے کے دوران پیٹ میں آیا اور پیدا ہوا تھا۔ اور اس کے والدین نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کے خدوخال جانوروں جیسے نہ تھے۔ اور ایلیانو، جو ماکوندو میں پیدا ہونے

والا پہلا انسان تھا۔ مارچ میں چھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم بچہ تھا۔ وہ ماں کے پیٹ میں رویا تھا، اور پیدائش کے وقت اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جب نال کاٹی جارہی تھی تو اس نے اپنا سر ادھر ادھر گھما کر گردو پیش کا جائزہ لیا تھا۔ اور کمرے میں موجود چیزوں اور چہروں کا بے خوف تجسس کے ساتھ معائنہ کیا تھا اور پھر ان لوگوں سے لاتعلق، جو اسے قریب سے دیکھنے آئے، کھجور کی چھال کی بنی چھت کو تکتا رہا تھا۔ جو لگتا تھا مسلسل بارش کے دباؤ سے کسی وقت بھی ڈھے سکتی ہے۔ ارسلا کو بچے کی نگاہ کی شدت اس لمحے تک یاد نہ آئی جب تین سالہ اویلیانو باورچی خانے میں داخل ہوا، جس وقت وہ ابلتے ہوئے سوپ کو چولہے سے اتار کر میز پر رکھ رہی تھی۔ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑے بچے نے متحیر ہو کر کہا تھا، "سوپ بہنے والا ہے!" سوپ کا برتن، حفاظت سے میز کے بیچوں بیچ رکھا تھا، لیکن بچے کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہی میز کے کنارے کی جانب حرکت کرنے لگا، گویا کسی اندرونی قوت سے کھنچا چلا جارہا ہو، اور زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ گھبرائی ہوئی ارسلا نے اپنے شوہر سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے فطری عمل سے تعبیر کیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کا ہمیشہ سے یہی حال تھا۔ وہ اپنے لڑکوں کے وجود سے یکسر بیگانہ تھا، کچھ اس وجہ سے کہ وہ بچپن کو ذہنی کم مائیگی کا دور سمجھتا تھا۔ اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تخیلاتی مفروضوں میں کھویا رہتا۔

لیکن اس دوپہر کے بعد سے، جب اس نے لڑکوں کو بلا کر ڈبوں سے تجربہ گاہ کی چیزیں نکلوانے میں مدد لی تھی، اس نے انہیں اپنا بہترین وقت دیا۔ اس چھوٹے سے الگ تھلگ کمرے میں، جس کی دیواریں رفتہ رفتہ عجیب و غریب نقشوں اور حیران کن خاکوں سے بھر گئی تھیں۔ اس نے ان کو پڑھنا لکھنا اور حساب کرنا سکھایا، اور دنیا کے عجوبوں کے بارے میں بتایا۔ اس عمل میں وہ نہ صرف اپنا حاصل کردہ علم استعمال میں لاتا، بلکہ اپنے تخیل کو اس کی انتہائی حدود تک کھینچ لے جاتا۔ اس طرح لڑکوں کو معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ کی آخری حدوں پر بسنے والے لوگ اتنے ذہین اور شانت ہوتے ہیں کہ فرصت کے لمحات میں ان کی ایک ہی سرگرمی ہوتی ہے: بیٹھ کر سوچنا، اور یہ کہ بحرایجیئن کو پیدل ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر چھلانگ لگاتے ہوئے عبور کر کے سالونیکا کی بندرگاہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ سحر انگیز نشستیں لڑکوں کے ذہنوں پر اس طرح نقش ہوئیں کہ، بہت برسوں بعد فوجی افسر کے فائرنگ اسکواڈ کو گولی چلانے کا حکم دینے سے ایک سیکنڈ پہلے، کرنل اوریلیانو بوئندیا کو مارچ کی وہ گرم سہ پہر دوبارہ دکھائی دی جب اس کا باپ، دور سے آتی ہوئی نقاروں، نفیریوں اور خانہ

بدوشوں کے گیتوں کی آوازیں سن کر، جو میمفس کے سیانوں کی تازہ ترین اور سب سے حیران کن ایجاد کی منادی کرتے ہوئے گاؤں میں ایک بار پھر داخل ہو رہے تھے، طبعیات کا سبق ادھورا چھوڑ کر، ساکت آنکھوں اور ہوا میں بلند ہاتھوں کے ساتھ سحر زدہ کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ نئے خانہ بدوش تھے، جوان مرد اور عورتیں، جو صرف اپنی زبان جانتے تھے، چکنی جلدوں اور ذہین ہاتھوں والے خوب صورت لوگ، جن کے رقص اور موسیقی نے ماکوندو کی گلیوں میں مسرت آمیز ہنگامہ برپا کر دیا۔ رنگا رنگ طوطے لیے، جو اطالوی گیت گاتے، اور ایک مرغی جو طنبورے کی آواز پر سونے کے سو انڈے دیتی، اور ایک سدھا ہوا بندر جو لوگوں کے خیالات پڑھ لیتا، اور ایک ایسی مشین جس کے کئی استعمال تھے، جو بٹن ٹانکنے اور بخار کم کرنے کا کام ساتھ ساتھ انجام دیتی، اور ایک ایسا آلہ جس سے انسان اپنی ناخوشگوار یادیں فراموش کر سکتا تھا۔ اور ایک پلاسٹر جس سے وقت زائل ہو جاتا، اور مزید ایک ہزار ایجادات جو اتنی عجیب و غریب اور انوکھی تھیں کہ حوزے آرکادیو بوئندیا کا یقیناً دل چاہا ہو گا کہ وہ ایک ایسی مشین ایجاد کرے جس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو یاد رکھا جا سکے۔ ایک لمحے میں خانہ بدوشوں نے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ ماکوندو کے باشندوں نے خود کو اپنی ہی گلیوں میں گم، میلے کی بھیڑ میں حیران و سرگرداں پایا۔

دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے تاکہ وہ اس ہنگامے، میں گم نہ ہو جائیں، سونے کے دانتوں والے مسخروں سے ٹکراتا، چھ بازوؤں والے جادوگروں سے الجھتا، ہجوم سے اٹھتی ہوئی صندل اور کھاد کی ملی جلی بو سے گھٹتے ہوئے دم کے ساتھ حوزے آرکادیو بوئندیا کسی جنونی کی طرح میلے میں ملکیادیس کو ڈھونڈتا پھرا، تاکہ وہ اس کے عجیب و غریب، داستان انگیز، ڈراونے خواب کے بے پایاں رموز اس پر کھول سکے۔ اس نے کئی خانہ بدوشوں سے دریافت کیا جو اس کی زبان نہ جانتے تھے۔ آخر کار وہ اس جگہ جا پہنچا جہاں ملکیادیس اپنا خیمہ لگایا کرتا تھا، اور وہاں اس کو ایک کم گو آرمینی نظر آیا، جو ہسپانوی زبان میں ایک ایسا شربت بیچ رہا تھا، جس کو پی کر انسان نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ جب حوزے آرکادیو بوئندیا کہنیاں مارتا، مجمعے کو چیرتا اس سے سوال کرنے پہنچا، آرمینی گلاس بھر عنبریں مائع ایک گھونٹ میں چڑھا چکا تھا۔ خوفناک طاغوتی دھویں کے بادل میں غائب ہونے سے پیشتر، خانہ بدوش نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو اپنی نگاہ کی مہیب فضا میں لپیٹ لیا۔ دھوئیں کے اوپر اس کے جواب کی گونج سنائی دی "ملکیادیس مر چکا ہے۔" یہ خبر سن کر حوزے آرکادیو بوئندیا سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اور اس بپتا سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا، یہاں تک کہ مجمع دوسرے

کرشموں کی طرف متوجہ ہو کر چھٹنے لگا، اور کم گو آرمینی کا گدلا کیچڑ بخارات بن کر اڑ گیا۔ دوسرے خانہ بدوشوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ملکیادیس سنگاپور کے ساحل پر بخار کا شکار ہو کر مر چکا ہے، اور یہ کہ اس کی لاش کو جاوا کے سمندر کے سب سے گہرے حصے میں پھینکا جا چکا ہے۔ لڑکوں کو اس خبر سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ سے ضد کرنے لگے کہ میمفس کے سیانوں کی انوکھی شے دکھانے لے چلے، جس کی خیمے کے باہر منادی کی جا رہی تھی اور جو بقول مشتہر کے، سلیمان بادشاہ کی ملکیت تھی۔ بچوں نے اتنی ضد کی کہ حوزے آرکادیو بوئندیا تیس سکے دے کر بچوں کو خیمے کے وسط میں لے گیا، جہاں بالوں سے ڈھکے جسم اور گنجے سر والا ایک عظیم الجثہ آدمی ناک میں تانبے کی بالی لٹکائے اور ٹخنے پر لوہے کی زنجیر پہنے، ایک صندوق کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اس دیو نے صندوق کھولا تو اس میں سے ایک سرد بھبکا اٹھا۔ صندوق کے اندر ایک بے حد بڑی شفاف سل دھری تھی جس کے اندر لاتعداد سوئیاں بنی ہوئی تھیں، جن سے ٹکرا کر سورج کی شعاعیں دھنک کے رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ مضطرب حوزے آرکادیو بوئندیا، جو جانتا تھا کہ بچے اس شے کی وضاحت سننے کے لیے بیتاب ہیں، آہستہ سے بڑبڑایا:

"یہ دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے۔"

"نہیں" خانہ بدوش نے اس کی تصحیح کی "یہ برف ہے۔"

حوزے آرکادیو بوئندیا نے کچھ سمجھے بغیر سل کی جانب ہاتھ بڑھایا، لیکن دیو ہیکل شخص نے اسے روک دیا۔ "پانچ سکے اور، اسے چھونے کے۔" حوزے آرکادیو بوئندیا نے سکے دیے اور اپنا ہاتھ برف پر رکھ دیا، اور کئی منٹ تک رکھے رہا، یہاں تک کہ اس کا دل اسرار سے اتصال پر خوف اور مسرت سے پھٹنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس نے دس سکے اور دیے، تاکہ اس کے بیٹے بھی اس عظیم تجربے سے گزر سکیں، ننھے حوزے آرکادیو نے برف کو چھونے سے انکار کر دیا۔ جب کہ اوریلیانو نے قدم آگے بڑھا کر اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور فوراً کھینچ لیا۔ "یہ تو ابل رہا ہے،" اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ لیکن اس کے باپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ معجزے کی شہادت سے سرشار، وہ اس لمحے اپنی مایوسیوں کو بھول گیا جو اس کی ہذیانی مہمات، اور ملکیادیس کی لاش کے سمندری ہشت پایوں کی بھوک کے حوالے کر دیے جانے سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نے پانچ سکے اور بڑھائے، اور اپنا ہاتھ سل پر رکھ کر، گویا کسی مقدس صحیفے پر شہادت دے رہا ہو، بولا:

"یہ ہمارے وقتوں کی عظیم ایجاد ہے۔"

جب قزاق سر فرانسس ڈریک نے سولہویں صدی میں ریوہاچا پر حملہ کیا، تو ارسلا کی سگونانی خطرے کی گھنٹیوں اور توپوں کی گھن گرج سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اس کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ سراسیمگی کے عالم میں جلتے ہوئے چولہے پر جا بیٹھی۔ جلنے کے سبب وہ تمام عمر کے لیے ایک ناکارہ بیوی بن کر رہ گئی۔ وہ تکیے کے سہارے صرف ایک پہلو پر بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی چال میں کوئی عجیب وغریب چیز واقع ہوئی تھی، کیوں کہ اس حادثے کے بعد وہ کبھی لوگوں کے سامنے نہ چلی۔ اس نے تمام معاشرتی سرگرمیاں ترک کر دیں، کیوں کہ اس کے ذہن میں یہ وسوسہ سما گیا تھا کہ اس کے جسم سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔ پو پھٹے وہ آنگن میں بیٹھی پائی جاتی، اس خوف سے سو نہ پاتی کہ کہیں خواب میں اسے انگریز اور ان کے خوں خوار حملہ آور کتے نظر نہ آجائیں۔ جو اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر اندر آئے تھے اور اسے جلتے ہوئے لوہے کی شرمناک اذیت سے دوچار کیا تھا۔ اس کا شوہر، ایک آراگونیز تاجر، جس سے اس کے دو بچے تھے، اپنی دکان کی نصف مالیت اس کی دوائیوں اور دلجوئیوں میں لگا بیٹھا تھا۔ اس کوشش میں کہ اس کی دہشت کسی صورت جاتی رہے۔ آخرکار اس نے اپنا کاروبار بیچ کر سمندر سے دور پہاڑیوں کے دامن میں مقامی انڈین لوگوں کی ایک پرسکون بستی میں اپنی بیوی کے لیے ایک ایسا گھر بنایا جس کی خواب گاہ میں کوئی کھڑکی نہ تھی، تاکہ اس کے خوابوں کے قزاقوں کو اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ملے۔

اس پوشیدہ گاؤں میں تمباکو کا ایک مقامی کاشت کار حوزے آرکادیو بوئندیا کچھ عرصے سے مقیم تھا۔ ارسلا کے سگونانا نے اس کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ کاروبار شروع کیا، جو اتنا منافع بخش ثابت ہوا کہ ان کی قسمت بدل گئی۔ چند صدیوں بعد تمباکو کے مقامی کاشتکار کے پڑپوتے نے آراگونیز تاجر کی پرنواسی سے شادی کرلی۔ لہٰذا ہر دفعہ جب ارسلا کو اپنے شوہر کے پاگل پن کے خیالات پر طیش آتا، تو وہ ایک ہی جست میں قسمت کے تین سو سال طے کرتی اور اس دن کو کوستی جب سر فرانسس ڈریک نے ریوہاچا پر حملہ کیا تھا۔ یہ صرف اپنے آپ کو تسلی دینے کا ایک بہانہ تھا۔ کیوں کہ وہ دونوں درحقیقت ایک ایسے بندھن میں بندھے ہوئے تھے جو محبت سے زیادہ مستحکم تھا اور وہ بندھن تھا: ضمیر کی مشترکہ چبھن۔ وہ عم زاد تھے۔ دونوں اس پرانے گاؤں میں اکٹھے پلے بڑھے تھے جس کو ان کے آباء و اجداد کی محنت اور اچھی عادتوں نے تمام صوبے کا ایک عمدہ ترین قصبہ بنا دیا تھا۔ گو کہ ان دونوں کی شادی کی پیش گوئی ان کے دنیا میں آتے ہی کر دی گئی تھی، جب انہوں نے آپس میں شادی کرنے کی خواہش کا خود اظہار کیا تو ان کے رشتے داروں نے ان کو روکنے کی کوشش

کی۔ انہیں خوف تھا کہ دو صحت مند جوانوں کو، جو دو نسلوں کے صدیوں تک اختلاط سے پیدا ہوئے تھے، اگوانا جننے کی ذلت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ان کے سامنے اس سے پہلے کی ایک ہولناک مثال موجود تھی۔ ارسلا کی ایک خالہ کا، جس کی حوزے آرکادیو بوئندیا کے چچا سے شادی ہوئی تھی۔ ایک ایسا بیٹا تھا جو زندگی بھر ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنتا رہا، اور جو بیالیس برس کنوارا رہنے کے بعد، زیادہ مقدار میں خون بہہ جانے کے سبب جاں بحق ہوا۔ کیوں کہ اس کی بوتل کا کارک نکالنے والے اوزار کی مانند، ایک کرکری ہڈی دار دم تھی، جس کے سرے پر بالوں کا گچھا تھا۔ سؤر کی دم، جسے دیکھنے کی کسی عورت کو اجازت نہ تھی، اور جس کی وجہ سے اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے جب اس کے ایک قصاب دوست نے بغدے سے وہ دم اڑا دی۔ انیس سالہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس مسئلے کو جوانی کے جوش میں صرف ایک جملے سے حل کر ڈالا تھا: ”مجھے پروا نہیں اگر میرے ہاں سؤر پیدا ہوں، بشرطیکہ وہ بول سکتے ہوں۔“ لہٰذا ان کی، دھوم دھام سے، آتش بازی اور بینڈ باجے کے ساتھ، شادی ہو گئی۔ وہ اس کے بعد ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے تھے۔ اگر ارسلا کی ماں نے ان کی اولاد کے بارے میں منحوس پیش گوئیاں کر کے انہیں ڈرا نہ دیا ہوتا، یہاں تک کہ اس نے ارسلا کو مشورہ دیا کہ شادی کے باوجود مباشرت سے احتراز کرے۔ اس خوف سے کہ اس کا تنومند اور پرعزم شوہر کہیں سوتے میں اس کے ساتھ زبردستی اختلاط نہ کر بیٹھے، وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے ایک بھدا سا زیر جامہ پہن لیتی جو اس کی ماں نے مضبوط بادبانی کپڑے کا سیا تھا، جس پر چمڑے کی پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور جو سامنے سے لوہے کے بکسوئے سے کھلتا تھا۔ اس طرح انہوں نے چند ماہ گزارے۔ دن کے وقت حوزے آرکادیو بوئندیا اپنے لڑاکا مرغوں کی دیکھ بھال کرتا، اور ارسلا ماں کے ساتھ بیٹھی کشیدہ کاری کیا کرتی۔ رات وہ گھنٹوں ایک دکھ بھری دھینگا مشتی میں گزارتے جو اختلاط کا بدل معلوم ہوتی، یہاں تک کہ لوگوں کو کوئی غیر معمولی بات محسوس ہونے لگی، اور افواہ اڑ گئی کہ ارسلا شادی کا ایک سال پورا ہو جانے پر بھی کنواری کی کنواری ہے، کیوں کہ اس کا شوہر نامرد ہے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو سب سے آخر میں اس بات کا علم ہوا۔

”دیکھو، لوگ کس قسم کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں ارسلا،“ اس نے اپنی بیوی سے پرسکون لہجے میں کہا۔

”انہیں بکنے دو“ ارسلا نے جواب دیا۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔“

سو یہ صورتحال چھ ماہ مزید، اس دردناک اتوار تک برقرار رہی جب حوزے آرکادیو بوئندیا نے پرودانسیو اگویلار سے مرغوں کی لڑائی جیتی۔ پرودانسیو اگویلار خون میں لتھڑے

اپنے مرغ کو دیکھ کر طیش میں آ گیا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا سے دور ہٹ کر تاکہ پالی کے گرد موجود لوگ سن لیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، چیخ کر بولا، مبارک ہو! شاید تمہارا مرغ تمہاری بیوی کا بھی کچھ بھلا کر سکے۔"

حوزے آرکادیو بوئندیا نے تحمل کے ساتھ اپنے مرغ کو اٹھایا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں۔" اس نے مجمعے سے کہا اور پھر پرودانسیو گویلار سے مخاطب ہوا:

"تم گھر جاؤ اور ایک ہتھیار لے آؤ، کیوں کہ میں تمہیں قتل کرنے جا رہا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ ہاتھ میں اپنے دادا کا دندانے دار بھالا لیے لوٹا۔ میدان میں، جہاں آدھے سے زیادہ گاؤں جمع ہو چکا تھا۔ پرودانسیو گویلار اس کا منتظر تھا۔ اسے اپنا دفاع کرنے کا موقع نہ ملا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بیل کی سی طاقت سے اس صحیح نشانے کے ساتھ جس سے اوریلیانو بوئندیا اول نے علاقے کے چیتوں کا خاتمہ کیا تھا۔ بھالے سے اس کا گلا چیر ڈالا۔ اس رات جو گاؤں کے لوگوں نے میدان میں پڑی لاش کے ساتھ جاگ کر گزاری، حوزے آرکادیو بوئندیا اپنی خواب گاہ میں گیا، جہاں اس کی بیوی اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے زیر جامہ چڑھا رہی تھی۔ بھالے کی نوک اس کی جانب کر کے حوزے آرکادیو بوئندیا نے حکم دیا: "اتار دو اسے!" ارسلا کو اپنے شوہر کے فیصلے کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ "جو کچھ ہو گا اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بھالا کچی زمین میں گاڑ دیا۔

"اگر تم نے اگوانوں کو جنم دیا تو ہم اگوانے پالیں گے۔" وہ بولا: "لیکن اس گاؤں میں تمہاری وجہ سے مزید کوئی قتل نہیں ہو گا۔"

وہ جون کی ایک خوش گوار رات تھی، خنک اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی، اور وہ صبح تک بستر میں پڑے خرمستیاں کرتے رہے، پرودانسیو اگویلار کے اقربا کے بین سے بوجھل ہوا کے ان جھونکوں سے لاتعلق، جو ان کی خواب گاہ میں آتے جاتے رہے۔

اس معاملے کو عزت کی خاطر ڈوئل کہہ کر دبا دیا گیا، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا اور ارسلا دونوں کے ضمیر میں پھانس لگ چکی تھی۔ ایک رات نیند نہ آنے پر ارسلا بستر سے اٹھ کر آنگن میں رکھے مٹکے سے پانی لینے گئی تو اس نے پرودانسیو اگویلار کو مٹکے کے قریب کھڑا دیکھا۔ وہ نیلا ہو رہا تھا، اس کے چہرے پر اداسی تھی اور وہ اپنی گردن کے سوراخ کو ایسپار تو گھاس سے بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ارسلا کو بجائے خوف کے اس پر رحم آیا۔ وہ الٹے پاؤں کمرے میں واپس گئی اور اپنے شوہر کو بتایا کہ اس نے کیا دیکھا ہے، لیکن حوزے

آرکادیو بوئندیا نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ "اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے ضمیر کا بوجھ ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

دو راتوں بعد ارسلا نے پرودانسیو اگویلار کو پھر دیکھا۔ اس دفعہ وہ غسل خانے میں، ایسپارتو گھاس کی مدد سے گردن پر جما خون صاف کر رہا تھا۔ ایک اور رات وہ بارش میں ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا، جو اپنی بیوی کے فریب نظر سے تنگ آچکا تھا، بھالے سے لیس ہو کر آنگن میں گیا۔ مقتول اپنے چہرے پر اداسی کے تاثرات لیے کھڑا تھا۔

"جہنم میں جاؤ" حوزے آرکادیو بوئندیا چلایا۔ جتنی مرتبہ تم آؤ گے میں اتنی دفعہ تمہاری جان لوں گا۔" پرودانسیو اگویلار وہیں کھڑا رہا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہمت نہ ہوئی کہ اس پر بھالا پھینکے۔ اس رات کے بعد وہ کبھی چین سے نہ سو سکا۔ جس ویرانی کے ساتھ بارش میں کھڑے پرودانسیو اگویلار نے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کی زندوں میں لوٹنے کی وہ اتھاہ آرزو، اور وہ تفکر جس کے ساتھ وہ پانی کی تلاش میں پورے گھر میں بھٹکتا پھرتا تاکہ گھاس کو گیلا کر کے زخم پر پھاہا رکھ سکے، اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو عذاب میں ڈال دیا۔ "وہ سنگین اذیت سے دوچار ہے" اس نے ارسلا سے کہا۔ "تم دیکھ سکتی ہو وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہا ہے۔" ارسلا نے جب اگلی دفعہ اس کو چولہے پر رکھی پتیلیوں کے ڈھکن کھولتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ پانی تلاش کر رہا ہے: اسے پرودانسیو اگویلار پر اتنا ترس آیا کہ اس نے گھر میں جگہ جگہ پانی سے بھرے جگ رکھ دیے۔ ایک رات جب حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے اپنے کمرے میں زخم دھوتے دیکھا تو اس سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔

"ٹھیک ہے، پرودانسیو۔" حوزے آرکادیو بوئندیا اس سے مخاطب ہوا، "ہم یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں، اتنی دور جتنا کہ ہم جا سکتے ہیں۔ اور اب ہم کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ اب تم سکون سے واپس جا سکتے ہو۔"

تو اس طرح انہوں نے پہاڑ عبور کرنے کی ٹھانی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کے چند دوستوں نے جن کو اس مہم نے اکسایا، اپنے اپنے گھروں کا ساز و سامان لپیٹا، بیوی بچوں کو ساتھ لیا، اور انجانی سرزمین کی طرف چل پڑے۔

روانگی سے پیشتر حوزے آرکادیو بوئندیا نے بھالا آنگن میں دفن کیا اور اپنے شاندار مرغوں کی ایک ایک کر کے گردن کاٹی، اس یقین کے ساتھ کہ اس عمل سے پرودانسیو اگویلار کو سکون پہنچے گا۔ جو کچھ ارسلا نے ساتھ لیا وہ اس کی شادی کے چند جوڑے، کچھ برتن اور ایک چھوٹا سا صندوق تھا، جس میں سونے کے سکے تھے جو اس کے باپ نے اس کے لیے

چھوڑے تھے۔ انہوں نے سفر کا کوئی قطعی منصوبہ نہیں بنایا۔ صرف اتنا کیا کہ ریوہاچا کی مخالف سمت راہ پکڑنے کی کوشش کی، تاکہ انہیں راستے میں کوئی شناسا نہ نظر آئے، اور وہ اپنا کوئی نام و نشاں نہ چھوڑیں۔ وہ ایک مضحکہ خیز سفر تھا۔ چودہ ماہ بعد ارسلا نے، جس کا پیٹ بندر اور سانپ کا گوشت کھا کھا کر بگڑ چکا تھا، ایک لڑکے کو جنم دیا جس کے تمام خدوخال انسانوں جیسے تھے۔ ارسلا نے نصف سفر جھولے میں لیٹے لیٹے طے کیا جسے دو مرد اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلتے تھے، کیوں کہ ورم سے اس کی ٹانگیں بدہیئت ہو گئی تھیں اور ان میں بلبلوں کی مانند نیلی رگیں ابھر آتی تھیں۔ گو کہ ان کے دھنسے ہوئے پیٹ اور ویران آنکھیں دیکھ کر ترس آتا تھا۔ بچوں نے والدین کی بہ نسبت سفر کو بہتر طور پر سہا تھا۔ زیادہ تر وقت انہوں نے سفر سے مزہ ہی اٹھایا تھا۔ ایک صبح تقریباً دو سال کے طویل سفر کے بعد، پہاڑی سلسلے کے مغربی دامن کو دیکھنے والے وہ پہلے انسان تھے۔ بادلوں میں ڈھکی چوٹی سے انہیں دنیا کے دوسری طرف، عظیم دلدل کی آبی وسعت پھیلی نظر آئی۔ لیکن انہیں سمندر کبھی نہ ملا۔ اس دلدلی علاقے میں کئی ماہ بھٹکنے کے بعد ان آخری مقامی انڈین لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر جو انہیں راستے میں نظر آئے تھے۔ ایک رات انہوں نے ایک پتھریلے دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالا جس کا پانی شیشے کے جمے ہوئے دھارے کی طرح تھا۔ برسوں بعد دوسری خانہ جنگی کے دوران کرنل اورلیلیانو بوئندیا نے اسی راستے سے گزرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ریوہاچا پر اچانک حملہ کر کے قبضہ جما سکے اور چھ دن بعد وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ پاگل پن ہے۔ بہر حال، اس رات جب انہوں نے دریا کے کنارے خیمے گاڑے، اس کے باپ کے ساتھیوں کے چہروں پر ایسے تاثرات تھے گویا ان کا جہاز تباہ ہو چکا ہو اور اب واپسی کی کوئی راہ نہ ہو، لیکن ان کی تعداد میں سفر کے آغاز سے اب تک اضافہ ہو چکا تھا اور وہ طویل عمر پا کر مرنے کے لیے تیار تھے۔ اس رات حوزے آرکادیو بوئندیا نے خواب میں دیکھا کہ اس جگہ ایک آباد اور پر صدا شہر کھڑا ہے جس کے گھروں کی دیواریں آئینے کی ہیں۔ اس نے لوگوں سے پوچھا یہ کون سا شہر ہے، اور انہوں نے جواب میں ایک ایسا نام لیا جو اس نے پہلے کبھی نہ سنا تھا، جس کے کوئی معنی نہ تھے، لیکن اس نام نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے خواب میں ایک ماورائے طبعی بازگشت پیدا کر دی۔ ماکوندو۔ دوسرے دن اس نے اپنے ساتھیوں کو قائل کر لیا کہ وہ سمندر کبھی نہ تلاش کر پائیں گے، اور ان سے دریا کے کنارے سب سے ٹھنڈے مقام پر زمین کو درختوں سے صاف کرنے کو کہا، اور وہاں انہوں نے گاؤں کی بنیاد ڈالی۔

حوزے آرکادیو بوئندیا کو خواب میں آئینے کی دیواروں والے گھروں کا مطلب اس

وقت تک سمجھ میں نہ آیا جب تک اس نے زندگی میں برف نہ دیکھی۔ برف دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ خواب کے عمیق معنی کو پا گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ مستقبل قریب میں وہ پانی جیسی معمولی چیز سے برف کی سلیں بنا سکیں گے، اور پھر گاؤں میں ان سلوں سے نئے گھر تعمیر کریں گے۔ پھر ماکوندو جھلستی ہوئی جگہ نہ رہے گا، جہاں دروازوں کے قبضے اور کنڈیاں تپش سے بل کھا جاتی تھیں، بلکہ ایک سرد، پر فضا مقام میں بدل جائے گا۔ اگر وہ برف کا کارخانہ بنانے میں ثابت قدم نہ رہ سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان دنوں اپنے بیٹوں کی تعلیم کے سلسلے میں بے حد پر جوش تھا، خاص طور پر اوریلیانو کی تعلیم کے سلسلے میں، جس نے شروع ہی سے کیمیاگری کی طرف وجدان ظاہر کیا تھا۔ تجربہ گاہ پر جمی گرد صاف کی گئی۔ ملکیادیس کی دستاویزات کو سنجیدگی کے ساتھ، اس کے انوکھے پن کی تعریف و توصیف کیے بغیر، از سر نو پڑھا گیا، اور کئی پر تحمل اور طویل نشستوں میں انہوں نے ارسلا کے سونے کو اس ملغوبے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جو کڑھائی کے پیندے سے چپک گیا تھا۔ چھوٹے حوزے آرکادیو نے اس عمل میں برائے نام ہی حصہ لیا۔ جس عرصے میں اس کا باپ دل و جان کے ساتھ پانی کی نلکیوں میں الجھا رہا، وہ سرکش پہلوٹا، جو ہمیشہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا، ایک کیم شحیم نوبالغ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آواز بدل گئی تھی۔ اس کے بالائی لب کے اوپر ابتدائی روئیدگی نمودار ہو چلی تھی۔ ایک رات جب ارسلا اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے کپڑے اتار رہا تھا۔ ارسلا کو شرم اور رحم کا ملا جلا احساس ہوا۔ شوہر کے بعد وہ پہلا مرد تھا جس کو اس نے عریاں دیکھا۔ وہ زندگی کے لیے اتنے بھرپور طریقے سے لیس تھا کہ غیر معمولی نظر آتا تھا۔ ارسلا کو، جو تیسری دفعہ حمل سے تھی، شادی کے ابتدائی دنوں کی دہشت یاد آ گئی۔

ان دنوں ایک چنچل، منہ پھٹ اور اشتعال انگیز عورت گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے آئی۔ وہ تاش کے پتے دیکھ کر مستقبل بتانا جانتی تھی۔ ارسلا نے اپنے بیٹے کے بارے میں اس سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے کا عضو غیر معمولی طور پر بڑا ہے، اور اتنا ہی غیر فطری جتنا کہ اس کے عم زاد کی دم تھی۔ عورت نے ایک انبساط پذیر قہقہہ لگایا جو پورے گھر میں ٹوٹتے ہوئے شیشے کے چھناکے کی طرح گونجتا رہا۔ "تمہارے اندیشے کے برعکس، وہ بے حد خوش قسمت ثابت ہوگا۔" اپنی پیش گوئی ثابت کرنے کے لیے وہ تاش کے پتے ان کے گھر لے کر آئی، اور حوزے آرکادیو کے ساتھ باورچی خانے سے پرے گودام میں بند ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے تاش کے پتے ایک پرانے بڑھئی کے تختے پر رکھے، اور جو کچھ اس کے دماغ میں آیا، منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ لڑکا اس کے قریب منتظر کھڑا

رہا۔ وہ تجسس کے بجائے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اچانک عورت نے ہاتھ بڑھا کر اس کو چھولیا۔ ''اوہ خدایا!'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی: وہ حقیقتاً تعجب میں آگئی تھی۔ حوزے آرکادیو کو اپنی ہڈیوں میں جھاگ سا بھرتا محسوس ہوا۔ ایک مضمحل خوف اور رونے کی شدید خواہش نے اسے آلیا۔ عورت نے کوئی اشارہ نہ کیا تھا، لیکن حوزے آرکادیو تمام رات اس کے لیے بے چین رہا، اس کی بغلوں سے اٹھنے والی دھویں کی بو حوزے آرکادیو کی کھال میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا تمام وقت اس عورت کے ساتھ رہے، وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی ماں ہوتی، اور وہ دونوں گودام سے کبھی نہ نکلتے، اور وہ کہتی، ''اوہ خدایا!'' ایک دن حوزے آرکادیو سے برداشت نہ ہو سکا، اور اس کو تلاش کرتا ہوا اس کے گھر تک جا پہنچا۔ وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا اور بیٹھک میں بے خود سا، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بیٹھا رہا۔ اس لمحے حوزے آرکادیو کو اس عورت کی کوئی طلب نہ تھی۔ اس کو وہ مختلف لگی، اس تصور سے یکسر مختلف جو اس کی خوشبو نے جگایا تھا، گویا وہ کوئی اور ہو۔ اس نے کافی پی، اور پژمردگی کے عالم میں باہر نکل آیا۔ اس رات نیند نہ آنے کے مہیب لمحے میں، حوزے آرکادیو نے ایک وحشیانہ اضطراب کے ساتھ اس کی آرزو کی۔ لیکن اس دفعہ اسے اس عورت کی طلب نہ ہوئی جیسی وہ اس دن گودام میں تھی، بلکہ اس عورت کی جیسا اسے حوزے آرکادیو نے اس سہ پہر پایا تھا۔

کئی دنوں بعد اس نے اچانک حوزے آرکادیو کو اپنے گھر بلوایا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ تنہا تھی، اور اسے تاش کے پتے دکھانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے گئی، اور پھر اس نے حوزے آرکادیو کو اتنی آزادی سے چھوا کہ اسے ابتدائی جھرجھری کے بعد مغالطہ ہونے لگا، اور اس نے لذت سے زیادہ خوف محسوس کیا۔ عورت نے اسے رات کے وقت آنے کی دعوت دی۔ حوزے آرکادیو نے حامی بھر لی تاکہ وہاں سے نکل سکے، گو کہ وہ جانتا تھا کہ وہ جانے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اس رات حوزے آرکادیو نے جان لیا کہ اسے اس عورت کے پاس بہر صورت جانا ہے، اگر وہ اس قابل نہ ہو تب بھی۔ اس اندھیرے میں ٹٹول کر کپڑے پہنے، اور اپنے بھائی کی پرسکون سانسوں کی آواز، دوسرے کمرے میں اپنے باپ کی اٹھنے والی خشک کھانسی، آنگن میں مرغیوں کا دمہ، مچھروں کی بھنبھناہٹ، تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن، اور دنیا کی بے ترتیب ہلچل، جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، سنتے ہوئے وہ خوابیدہ گلی میں نکل گیا۔ دل ہی دل میں اس نے تمنا کی کہ دروازے کے نہ صرف پٹ بند ہوں، بلکہ اس میں اندر سے چٹخنی بھی چڑھی ہو۔ لیکن دروازہ کھلا تھا۔ اس نے انگلیوں کے سروں سے جیسے ہی دھکیلا، پٹ کھل گیا، ایک درد بھری لیکن واضح سسکی کے

ساتھ، جس کی گونج اس کی روح میں منجمد ہو کے رہ گئی۔ جس لمحے وہ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا ہوا اندر داخل ہوا، اسے وہی خوشبو آئی۔ وہ ابھی تک دالان میں تھا، جہاں عورت کے تینوں بھائیوں نے اپنی جھولنیاں تان رکھی تھیں، جو نہ اس کو دکھائی دے رہی تھیں اور نہ جن کے وقوع کا وہ اندھیرے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا دالان سے گزر کر عورت کے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا، تاکہ اسے اندازہ ہو سکے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ جھولنیوں کی رسیوں سے، جو اس کے اندازے سے نیچی تھیں، ایک خراٹے لیتے ہوئے مرد سے ٹکرایا، جس نے سوتے میں کروٹ بدلی اور خواب میں بڑبڑایا "وہ بدھ کا دن تھا" کمرے کے دروازے کا پٹ کھولتے وقت وہ ناہموار فرش پر گرتے گرتے بچا۔ اس گمبھیر اندھیرے میں، گزرے ہوئے لمحے کی نراس آرزو میں، اس کو اچانک احساس ہوا کہ وہ قطعی طور پر ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔ اس تنگ سے کمرے میں اس کی ماں، اس کی دوسری بیٹی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ ساتھ، اور وہ عورت، جو شاید وہاں تھی ہی نہیں، سو رہی تھی۔ وہ اس کی خوشبو کے ذریعے اس تک جا پہنچتا اگر وہ خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی نہ ہوتی۔ وہ خوشبو اتنی بھرپور اور اتنی گمراہ کن تھی کہ گویا اس کی اپنی جلد سے ہمیشہ سے لپٹی ہوئی ہو۔ وہ کافی دیر تک ساکت کھڑا رہا، اس تعجب میں کہ وہ بے خودی کے اس پاتال میں کیوں کر جا گرا۔ اس دوران ایک ہاتھ پوری انگلیوں کے ساتھ آگے بڑھا، اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اس کے چہرے کو چھوا۔ اسے تعجب نہ ہوا۔ انجانے میں وہ اس کی توقع کر رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو اس ہاتھ کے سپرد کر دیا۔ اور ایک مہیب تھکان کی کیفیت میں، خود کو ایک بے ہیئت جگہ پر لے جانے دیا، جہاں اس کے کپڑے اتارے گئے اور اسے آلوؤں کی بوری کی طرح الٹا پلٹا گیا اور ایک طرف سے دوسری طرف لڑھکایا گیا، ایک اتھاہ اندھیرے میں جہاں بازو کسی کام کے نہ تھے، اور جہاں عورت کی خوشبو کے بجائے امونیا کی مہک تھی، اور جہاں اس نے عورت کے چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی اور نظروں کے سامنے ارسلا کا چہرہ پایا، سراسیمہ آگہی میں، کہ وہ وہی کر رہا ہے جس کے کرنے کی اسے طویل مدت سے آرزو تھی اور جو اس کا خیال تھا وہ کبھی نہ کر سکے گا، یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے کیوں کہ اسے ہوش نہ تھا کہ اس کے پیر کہاں ہیں اور سر کس طرف ہے، یا کس کا سر اور کس کے پیر، اور اس احساس کے ساتھ کہ اب وہ مزید اپنے گردوں کی سرد، طوفانی گڑگڑاہٹ کو برداشت نہ کر سکے گا، اور نہ اپنی انتڑیوں کی ہوا کو، اور اس سراسیمگی کو کہ فرار ہو جائے، اور ساتھ ساتھ اس آرزو کو کہ اس برانگیختہ خاموشی اور مہیب تنہائی میں ہمیشہ کے لیے ٹھہرا رہے۔

اس کا نام پیلار ترنیرا تھا۔ وہ اس خروج کا حصہ تھی جو ماکوندو کی بنیاد پڑنے پر اختتام کو پہنچا تھا۔ گھر والے گھسیٹ کر اسے اپنے ساتھ لائے تھے، تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے اس شخص سے جدا کر سکیں جس نے اس کے ساتھ اس وقت دست درازی کی تھی جب وہ چودہ سال کی تھی، اور اس سے محبت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ بائیس برس کی ہو گئی۔ لیکن وہ اس صورت حال کو گاؤں پر ظاہر کرنے کا فیصلہ نہ کر پایا تھا، کیوں کہ وہ ان لوگوں سے الگ تھا۔ اس دنیا کے آخری کونے تک پیلار ترنیرا کا پیچھا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اپنے معاملات کو سلجھانے کے بعد، اور وہ اس کے انتظار سے تھک چکی تھی۔ وہ ان تمام لمبے یا پستہ قد، گورے یا کالے مردوں پر اس کا گمان کرتی رہی جو اس کے تاش کے پتوں کے خوش آئند وعدوں کے مطابق سمندر یا خشکی کے راستے، تین دن، تین ماہ یا تین سال کے اندر اندر آنے والے تھے۔ انتظار میں وہ اپنی رانوں کی مضبوطی، اپنے سینوں کی اٹھان اور اپنی نرم خوئی کھو بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اپنے دل کا پاگل پن برقرار رکھا تھا۔ اس انوکھے کھلونے نے حوزے آرکادیو کو پاگل کر دیا۔ وہ ہر رات اس کے کمرے کی بھول بھلیوں سے گزر کر اس تک پہنچتا۔ ایک رات اس نے دروازہ بند پایا، اور کئی دفعہ دستک دی، یہ سوچ کر کہ جب وہ پہلی دفعہ دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت کر چکا ہے تو اسے آخری لمحے تک دستک دینی ہو گی، یہاں تک کہ ایک ختم نہ ہونے والے انتظار کے بعد پیلار نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ دن بھر لیٹا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے، چپکے چپکے گزشتہ رات کی یادوں کا مزہ لیتا۔ لیکن جب وہ گھر آتی، شادمان، لاتعلق، باتونی، تو حوزے آرکادیو کو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی، کیوں کہ اس عورت کا، جس کے گونج دار قہقہے فاختاؤں کو خوف زدہ کر دیا کرتے، اس انجانی قوت سے کوئی واسطہ نہ تھا جس نے حوزے آرکادیو کو اپنی روح میں سانس لینا اور اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانا سکھایا تھا، اور اسے یہ بات سمجھنے کا موقع دیا تھا کہ مردوں کو موت سے خوف کیوں آتا ہے۔ حوزے آرکادیو اپنے آپ میں اتنا مگن تھا کہ جب اس کے باپ اور بھائی نے یہ مژدہ سنایا کہ وہ دھاتوں کے اس ملغوبے کو توڑنے اور ارسلا کا سونا الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، تو وہ سمجھ نہ پایا کہ گھر والے آخر کیوں اتنا خوش ہو رہے ہیں۔

وہ درحقیقت کئی دنوں کی پیچیدہ اور انتھک محنت کی وجہ سے کامیاب ہوئے تھے۔ ارسلا خوش تھی، یہاں تک کہ اس نے علم کیمیاگری کی ایجاد کے لیے خدا کا شکر ادا کیا، جبکہ گاؤں کے لوگوں نے تجربہ گاہ پر یلغار کر دی اور گھر والوں نے بسکٹوں پر امرود کی جیلی لگا کر ان کی خاطر تواضع کر کے اس شاندار کامیابی کا جشن منایا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا نے الگ

کیا ہوا سونا لوگوں کو اس طرح دکھایا گویا وہ اس نے ایجاد کیا ہو۔ سب کو دکھانے کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس گیا جو گزشتہ چند دنوں سے تجربہ گاہ میں شاذونادر ہی نمودار ہوا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے پہلی خشک ڈھیری بیٹے کی آنکھوں کے سامنے لا کر پوچھا ''تمہیں یہ کیا نظر آتا ہے؟'' حوزے آرکادیو سچائی سے بولا!

''کتے کا پاخانہ۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کو ایسا طمانچہ رسید کیا کہ اس کے منہ سے خون اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس رات پیلار نے اندھیرے میں روئی اور بوتل ٹٹول کر حوزے آرکادیو کے سوجے ہوئے منہ کی آرنیکا سے سکائی کی، اور ساتھ ساتھ وہ سب کچھ کیا جو وہ کرنا چاہتی تھی، اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دونوں آپس میں قربت کی اس کیفیت کو پہنچ گئے کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب انہوں نے آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کیں۔

''میں تمہارے ساتھ تنہا ہونا چاہتا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''میں آج کل میں سب کو بتانے جا رہا ہوں، اور پھر ہم چوری چھپے رات کے اندھیرے میں ملنا بند کر دیں گے۔''

پیلار نے اس کو تسلی دینے کی کوشش نہ کی۔

''یہ بہت اچھا ہوگا'' وہ بولی۔ ''اگر ہم تنہا ہیں تو میں لیمپ روشن رکھا کروں گی تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، اور میں دل کھول کر شور مچا سکوں گی اور کوئی ٹوکنے والا نہ ہوگا، اور تم میرے کانوں میں جو بھی بکواس کرنا چاہو، کر سکو گے۔''

اس گفتگو نے، اس چبھتی ہوئی عداوت نے جو اس کو اپنے باپ سے پیدا ہو گئی تھی، اور ایک غیر تابع محبت کے امکان نے، حوزے آرکادیو کے اندر ایک بردبار جرأت پیدا کر دی تھی۔ بے ساختگی میں، بغیر کسی تیاری کے، حوزے آرکادیو نے اپنے بھائی کو سب کچھ بتا دیا۔

شروع میں چھوٹا اوریلیانو صرف خطرے کو سمجھ سکا، خطرے کے بے پناہ امکان کو جو اس کے بھائی کے کارنامے سے منتج تھا، اور وہ اس شے کے طلسم کو نہ سمجھ پایا۔ رفتہ رفتہ فکر نے اسے آ جکڑا۔ خطروں کی تفصیلات کے بارے میں سوچ کر، اپنے بھائی کی اذیتوں اور لذتوں کا گمان کر کے، اس کو بیک وقت خوف اور مسرت محسوس ہوئی۔ وہ اس کے انتظار میں صبح تک آنکھیں کھولے بستر میں پڑا رہتا۔ اس تنہا بستر میں جس کے نیچے لگتا تھا کوئلے دہک رہے ہیں، اور پھر وہ لیٹے لیٹے باتیں کیا کرتے، یہاں تک کہ بستر سے اٹھنے کا وقت آ جاتا، لہٰذا جلد ہی دونوں لڑکے دن میں غنودگی کا شکار رہنے لگے، ان کو کیمیاگری اور باپ کے علم و دانش

سے کوئی دل چسپی نہ رہی اور دونوں نے تنہائی میں پناہ ڈھونڈی۔ ''یہ بچے پاگل ہو گئے ہیں۔'' ارسلا نے کہا ''یقیناً ان کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔'' اس نے ایک بدذائقہ، کڑوا کسیلا مشروب پیٹ کے کیڑے نکالنے والی جڑی بوٹی کو کچل کر بنایا، جسے ان دونوں نے غیر متوقع آمادگی کے ساتھ پی لیا اور وہ دونوں ایک ساتھ دن میں گیارہ دفعہ پاخانے گئے۔ اور سرخ رنگ کے کچھ کیڑے خارج کیے جو انہوں نے مسرت کے ساتھ سب کو دکھائے، تاکہ اس طرح وہ ارسلا کو اپنی لاتعلقی اور غنودگی کی اصل وجہ کی جانب سے فریب میں مبتلا رکھ سکیں۔ چھوٹے اور یلیانو کو نہ صرف اب سب کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا، بلکہ وہ اپنے بھائی کے تجربات کو اپنا سمجھ کر تصور ہی تصور میں ان تمام کیفیات سے گزرنے لگا، کیوں کہ ایک موقعے پر جب حوزے آرکادیو تفصیل کے ساتھ محبت کی ترکیبیں اسے سمجھا رہا تھا، اور یلیانو نے بات روک کر پوچھا: ''کیسا محسوس ہوتا ہے؟'' حوزے آرکادیو نے فوراً جواب دیا:

''یہ زلزلے کی طرح ہوتا ہے۔''

جنوری کی ایک جمعرات کو دو بجے رات امارانتا پیدا ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ لوگ کمرے میں داخل ہوتے، ارسلا نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا۔ وہ ہلکی پھلکی ریگ ماہی کی طرح تھی۔ لیکن اس کے تمام اعضا انسانی تھے اور یلیانو اس نئی چیز کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوا جب تک گھر لوگوں سے بھر نہ گیا۔ افراتفری کے پردے میں وہ اپنے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو گیارہ بجے رات سے غائب تھا۔ یہ ایک اتنا اضطراری فیصلہ تھا کہ اسے خود سے یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے بھائی کو پیلار ترنیرا کے کمرے سے کیسے نکالے گا۔ اس نے اس کے گھر کے کئی چکر لگائے، سیٹیاں بجائیں، یہاں تک کہ پو پھٹنے لگی اور اسے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ ماں کے کمرے میں اس نے دیکھا کہ حوزے آرکادیو معصوم سا چہرہ لیے نومولود بہن سے کھیل رہا ہے۔

ارسلا نے ابھی چلا بھی ختم نہ کیا تھا کہ خانہ بدوش پھر وارد ہو گئے۔ اور یہ وہی شعبدہ باز اور جادوگر تھے جو برف لے کر آئے تھے۔ ملکیادیس کے قبیلے کے برعکس، انہوں نے یہ بات جلد ہی واضح کر دی کہ وہ ترقی کے پیامبر نہیں بلکہ تفریح کے میر ساماں ہیں، یہاں تک کہ جب انہوں نے برف ان کے سامنے پیش کی تھی تب بھی انسانی زندگی کے لیے اس کے فوائد کی تشہیر نہیں کی تھی، بلکہ اسے صرف سرکس کے ایک عجوبے کے طور پر دکھایا تھا۔ اس دفعہ دوسری بہت سی نت نئی اشیا کے ساتھ، وہ اڑنے والا قالین بھی لائے۔ لیکن انہوں نے اسے حمل و رسد کی ترقی کے ایک مظہر کے بجائے ایک تفریحی شے کے طور پر پیش کیا۔

لوگوں نے فوراً اپنے آخری سکوں کو کھود کر نکالا، تاکہ گاؤں کے گھروں کے اوپر اڑنے کا مزہ لوٹ سکیں۔ ایک اجتماعی افراتفری کے مسرت آمیز پردے میں حوزے آرکادیو اور پیلار نے کئی خوش گوار گھنٹے ایک دوسرے کی قربت میں گزارے۔ وہ ہجوم میں ایک خوش و خرم، محبت میں گرفتار جوڑے کی مانند گھومتے رہے، یہاں تک کہ خود انہیں بھی شبہ ہونے لگا کہ محبت ایک ایسا احساس بھی ہو سکتی ہے جو ان کی خفیہ ملاقاتوں کی بے لگام، لیکن لمحاتی مسرت سے زیادہ گمبھیر اور فرحت بخش ہو۔ پیلار نے البتہ اس طلسم کو توڑ دیا۔ حوزے آرکادیو کے جوش و خروش سے جو اس میں اس کی قربت سے پیدا ہوا تھا، متاثر ہو کر پیلار نے موقعے اور دستور کو خلط ملط کر کے اچانک حوزے آرکادیو کے سر پر آسمان ڈھا دیا۔ "تم اب واقعی ایک مرد بن چکے ہو" اس نے کہا۔ اور چونکہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ پیلار کی بات کا کیا مطلب ہے، اس نے وضاحت کی:

"تم باپ بننے والے ہو۔"

چند روز تک حوزے آرکادیو کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باورچی خانے میں پیلار کے گونجتے ہوئے قہقہے سن کر وہ بھاگ کر تجربہ گاہ میں پناہ لیتا، جہاں ارسلا کی رضامندی سے کیمیاگری کے آلات میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اپنے گمراہ بیٹے کو مسرت کے ساتھ تجربہ گاہ میں خوش آمدید کہا اور اسے پارس پتھر کی تلاش سے روشناس کرایا، جو اس نے آخر کار شروع کر دی تھی۔ ایک سہ پہر لڑکے تجربہ گاہ کی کھڑکی کے قریب سے تیزی سے اڑتے ہوئے قالین کو دیکھ کر، جس پر خانہ بدوش اور گاؤں کے بچے بیٹھے ہاتھ ہلا رہے تھے، جوش میں آگئے، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ "انہیں خواب دیکھنے دو۔" اس نے "ہم ان سے بہتر طریقے پر پرواز کریں گے، ایک گھٹیا سی بستر کی چادر سے کہیں بہتر سائنسی وسائل کے ساتھ۔" گو کہ اس نے دل چسپی کا ڈھونگ رچایا، حوزے آرکادیو پارس پتھر کی قوتوں کو سمجھ نہ پایا، جو اسے ایک بے ہنگم بوتل کی مانند نظر آتا تھا۔ وہ اپنی فکروں سے آزاد ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی اور آنکھوں سے نیند غائب تھی، وہ بدمزاجی کا شکار ہو گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کا باپ اپنے تجربات کی ناکامی پر ہو جایا کرتا تھا، اور اس کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کو تجربہ گاہ کی ذمے داریوں سے سبک دوش کر دیا، یہ سوچ کر کہ غالباً وہ کیمیاگری کو دل پر لے گیا ہے۔ اوریلیانو البتہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے بھائی کی پریشانی کا سبب پارس پتھر کی تلاش نہیں، لیکن وہ اس کا اعتماد حاصل نہ کر سکا۔ حوزے آرکادیو اپنی پرانی بے

ساختگی کھو بیٹھا تھا۔ وہ ایک رازدار اور بے تکلف شخص سے اپنی ذات میں سمٹے ہوئے بداندیش انسان میں بدل گیا تھا۔ دنیا سے تلخ کینہ لیے، تنہائی کی تلاش میں ایک رات وہ حسب معمول گھر سے نکلا، لیکن پیلار ترنیرا کے گھر نہ گیا بلکہ میلے کی گہما گہمی میں جاکر گم ہو گیا۔ سب تماشوں کو بغیر کسی دل چسپی کے دیکھنے کے بعد اس کو ایک ایسی شے نظر آئی جو اس میلے کا حصہ نہ لگتی تھی، وہ ایک بے حد نوخیز، خانہ بدوش لڑکی تھی، تقریباً ایک بچی، جو منکوں موتیوں کے بوجھ تلے جھکی جاتی تھی، اور اس سے زیادہ حسین لڑکی حوزے آرکادیو نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ وہ اس مجمعے میں کھڑی تھی جو والدین کی نافرمانی کرنے کے سبب ایک شخص کے سانپ کے قالب میں ڈھل جانے کا مغموم تماشا دیکھ رہا تھا۔

حوزے آرکادیو نے تماشے پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب سانپ نما آدمی سے تکلیف دہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی، وہ مجمعے کو چیرتا پہلی قطار تک جا پہنچا، جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی، اور اس کے پیچھے جاکر رک گیا۔ اس نے لڑکی کی پشت پر دباؤ ڈالا۔ لڑکی نے ہٹنے کی کوشش کی، لیکن وہ زیادہ قوت کے ساتھ اس کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تب لڑکی نے اسے محسوس کیا۔ وہ ساکت کھڑی رہی، تعجب اور خوف سے لرزاں، اس کو اس لمس کا یقین نہیں آ رہا تھا، اور آخر اس نے ایک لرزتی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے مڑ کر حوزے آرکادیو کو دیکھا۔ اس لمحے دو خانہ بدوشوں نے سانپ نما آدمی کو پنجرے میں ڈالا اور خیمے کے اندر لے گئے۔ ایک خانہ بدوش نے، جو تماشا پیش کر رہا تھا، اعلان کیا:

"اور اب خواتین و حضرات، ہم آپ کے سامنے اس عورت کی خوفناک آزمائش کا تماشا پیش کرتے ہیں، جس کا سر ڈیڑھ سو سال سے قلم کیا جا رہا ہے، یہ سزا اسے اس بات کی مل رہی ہے کہ اس نے وہ دیکھ لیا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

حوزے آرکادیو اور خانہ بدوش لڑکی نے عورت کا سر قلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مجمعے سے نکل کر لڑکی کے خیمے میں چلے گئے، جہاں انہوں نے کپڑے اتارتے ہوئے ایک بے خوف اشتیاق کی کیفیت میں ایک دوسرے کو بوسے دیے۔ خانہ بدوش لڑکی نے کلف دار لیس کی قمیص اور انگیا اتاری۔ اب اس کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اپنے ابتدائی پستانوں اور پتلی پتلی ٹانگوں کے ساتھ، جو حوزے آرکادیو کے بازوؤں سے بھی پتلی تھیں، وہ ایک چھوٹے سے کمزور مینڈک کی مانند لگ رہی تھی، لیکن اس کی قوت فیصلہ اور حرارت نے اس کی کمزوری چھپالی تھی۔ لیکن پھر بھی حوزے آرکادیو پر اس کی گرمی کا اثر نہ ہوا۔ کیوں کہ وہ ایک خیمہ عام تھا جہاں خانہ بدوش کھیل تماشوں کی اشیا لیے آ جا رہے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف تھے،

یہاں تک کہ وہ بستر کے قریب پانسہ کھیلنے کے لیے توقف بھی کرتے۔ لیمپ نے جو وسط میں ایک کھمبے سے لٹک رہا تھا، تمام خیمے کو روشن کر رکھا تھا۔ خرمستیوں کے ایک وقفے میں حوزے آرکادیو، یہ جانے بغیر کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے، بستر میں دراز ہو گیا، جبکہ لڑکی اس کے جذبات جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد ایک بھرپور جسم والی خانہ بدوش عورت ایک آدمی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوئی، جو نہ خانہ بدوشوں میں سے تھا اور نہ گاؤں کا باسی تھا، اور وہ دونوں بستر کے قریب آکر کپڑے اتارنے لگے۔ عورت نے لیٹے ہوئے آرکادیو پر یوں ہی ایک نظر ڈالی۔ اور ایک جاں گداز شوق کے ساتھ اس کے شاندار، آسودہ عضو کا معائنہ کیا۔

"میرے بیٹے" اس نے کہا، "خدا تم کو سلامت رکھے، اسی طرح جیسے کہ تم ہو۔"

حوزے آرکادیو کی ساتھی نے ان سے کہا کہ وہ ان کو تنہا چھوڑ دیں اور وہ جوڑا بستر کے قریب فرش پر لیٹ گیا۔ ان کے شہوانی اختلاط سے حوزے آرکادیو کے جذبات جاگ اٹھے۔ پہلے لمس کے ساتھ ہی لڑکی کے جسم کی ہڈیوں کا ایک ایک جوڑ چیخ کر گوٹیوں کے ڈبے کی طرح کھل گیا، اس کی جلد پر پسینے کے قطرے ابھر آئے، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، اور اس کے جسم سے مٹی کی موہوم سی خوشبو اور ایک غمگین فغاں اٹھنے لگی۔ لیکن اس نے اس اتصال کو اپنی مضبوط خاصیت اور ایک قابل تحسین بہادری کے ساتھ برداشت کیا۔ حوزے آرکاڈیو نے خود کو فضا میں، ایک ملکوتی تاثر کی کیفیت کی جانب بلند ہوتے ہوئے محسوس کیا اور اس کا دل محبت آمیز فحش فقروں سے بھر آیا، جو اس نے لڑکی کے کانوں میں انڈیل دیے، اور جو لڑکی کے منہ سے اس کی اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر نکلے۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ سنیچر کے روز حوزے آرکادیو نے ایک سرخ کپڑا سر پر لپیٹا اور خانہ بدوشوں کے ساتھ نکل گیا۔

جب ارسلا کو اس کی غیر موجودگی کا علم ہوا تو اس نے حوزے آوکادیو کو پورے گاؤں میں تلاش کیا۔ جس مقام سے خانہ بدوشوں نے اپنے خیمے لپیٹے تھے، وہاں کوڑے کے ڈھیر اور بجھے ہوئے الاؤ سے دھواں دیتی راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی نے، جو کوڑے پر سے منکے چن رہا تھا، ارسلا کو بتایا کہ ایک رات پہلے اس نے ارسلا کے بیٹے کو کارواں کے ہنگامے میں سانپ نما آدمی کا پنجرہ دھکیلتے دیکھا تھا۔ "وہ خانہ بدوش ہو گیا ہے" ارسلا نے چیخ کر اپنے شوہر کو اطلاع دی، جس نے بیٹے کی گمشدگی پر ذرا بھی تشویش کا اظہار نہ کیا تھا۔

"کاش یہ بات سچ ہو" حوزے آرکادیو بوئندیا نے ہاون دستے میں اس شے کو کوٹتے ہوئے کہا جسے وہ ہزاروں دفعہ پیس کر گرم کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ رہا تھا۔ "اس طرح وہ

مرد بنا سیکھ لے گا۔"

ارسلا نے لوگوں سے پوچھا کہ خانہ بدوش کس سمت گئے ہیں۔ وہ اس راستے پر پوچھتے پوچھتے آگے نکلتی چلی گئی، اس خیال میں کہ خانہ بدوشوں کو جا پکڑے گی۔ وہ گاؤں سے دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اتنی مسافت طے کرلی کہ واپس پلٹنے کا خیال ہی نہ رہا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو رات کے آٹھ بجے اس وقت اپنی بیوی کے لاپتا ہو جانے کا علم ہوا جب وہ اس ملغوبے کو گوبر کی کیاری میں گرم ہونے کے لیے رکھ کر، ننھی امارانتا کے رونے کی آواز سن کر یہ دیکھنے کے لیے اندر گیا کہ بچی کو کیا ہوا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس نے ساز وسامان سے لیس لوگوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور امارانتا کو ایک عورت کے حوالے کر کے، جس نے اس کو دودھ پلانے کی ذمے داری لی، ارسلا کی تلاش میں ان دیکھی راہوں پر نکل کھڑا ہوا۔ اور ریلیانو ان کے ساتھ تھا۔ چند مقامی مچھیروں نے، جن کی زبان وہ نہ سمجھ سکے، اشاروں کی مدد سے بتایا کہ انہوں نے اس راستے سے کسی کو گزرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تین دن کی ناکام تلاش کے بعد وہ گاؤں لوٹ آئے۔

حوزے آرکادیو بوئندیا کئی ہفتے پریشانی کے عالم میں رہا۔ اس نے ننھی امارانتا کا ماں کی طرح خیال رکھا۔ وہ اس کو نہلاتا، کپڑے بدلاتا، دن میں چار دفعہ عورت کے گھر دودھ پلوانے لے جاتا، یہاں تک کہ رات کو اسے لوریاں بھی دیتا جو ارسلا کو کبھی سنانی نہ آئی تھیں۔ ایک دن پیلار نے گھر کا کام کاج اپنے ذمے لینے کی پیش کش کی۔ اور ریلیانو کو جس کی پراسرار حس اس افتاد کے بعد اور تیز ہو گئی تھی، پیلار کو آتے دیکھ کر ایک الہام سا ہوا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ پیلار کسی ناقابل بیان طریقے سے اس کے بھائی کے فرار اور اس کی ماں کی گمشدگی کی ذمے دار ہے، اور اس نے پیلار کو ایک خاموش اور کٹھور عداوت کے ساتھ اس طرح دیکھا کہ وہ اس گھر میں پھر کبھی داخل نہ ہوئی۔

وقت نے سب کچھ معمول کے مطابق کر دیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے بیٹے کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ کب وہ تجربہ گاہ میں واپس لوٹے، گرد و غبار صاف کیا، پانی کی نلکیاں سلگائیں اور دوبارہ دھات کے اس ملغوبے کو گوبر سے نکالا جہاں وہ مہینوں سے پڑا سو رہا تھا۔ ننھی امارانتا بید کی ٹوکری میں لیٹی تجسس سے اپنے باپ اور بھائی کو تجربوں میں ڈوبا ہوا دیکھا کرتی، اس چھوٹے سے کمرے میں جس کی فضا پارے کے بخارات کی موجودگی سے لطیف ہو گئی تھی۔ ارسلا کے جانے کے چند ماہ بعد، ایک خاص موقعے پر عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ ایک خالی فلاسک جو الماری میں مدتوں سے رکھا ہوا تھا، اتنا بھاری

ہو گیا کہ اسے ہلانا مشکل ہو گیا، برتن میں رکھا پانی بغیر آگ پر چڑھے ابلنے لگتا یہاں تک کہ بخارات بن کر اڑ جاتا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے بیٹے نے یہ عجیب و غریب کرشمے حیرانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھے۔ ایک دن امارانتا کی ٹوکری نے خود بخود ہلنا شروع کر دیا اور کمرے میں گردش کرنے لگی۔ اوریلیانو نے پریشانی کے عالم میں اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا باپ اس واقعے سے خائف نہ ہوا۔ اس نے ٹوکری کو اس کی جگہ پر رکھ کر میز کے پائے سے باندھ دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ جس واقعے کا اسے مدتوں سے انتظار تھا وہ رونما ہونے والا ہے۔ یہی وہ موقع تھا جب اوریلیانو نے اپنے باپ کو کہتے سنا:

"اگر تمہیں خدا کا خوف نہیں، تو دھاتوں کے ذریعے اس سے ڈرو۔"

ارسلا تقریباً پانچ ماہ بعد اچانک واپس آگئی۔ وہ ہشاش بشاش، تجدید شباب کے ساتھ، خوشی میں مست اور نئے کپڑوں میں ملبوس لوٹی جن کی وضع قطع گاؤں میں پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ ارسلا کی واپسی کا حوزے آرکادیو بوئندیا پر اتنا اثر ہوا کہ اس سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ "تو یہ بات تھی!" وہ چلایا۔ "مجھے معلوم تھا یہ ہونے والا ہے۔" اور اسے واقعی اس کا یقین تھا، کیوں کہ اس طویل قید کے دوران، جب وہ دھاتوں کے تجربات میں مصروف تھا، اس نے دل کی گہرائیوں سے تمنا کی تھی کہ وہ معجزہ جو ظہور میں آنے والا ہے، پارس پتھر کی دریافت، اس سانس کی آزادی جس سے خوابیدہ دھاتیں جی اٹھیں، یا وہ قوت جس سے گھر کے تالے اور چوکھٹیں سونے میں بدل جائیں، نہ ہو، بلکہ وہی ہو جو ہوا: ارسلا کی واپسی۔ لیکن ارسلا اس گرم جوشی میں شریک نہ ہوئی۔ اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک روایتی بوسہ دیا، گویا وہ محض ایک گھنٹے بعد گھر لوٹی ہو، اور کہا:

"دروازے کے باہر تو دیکھنا۔"

حوزے آرکادیو بوئندیا نے جب باہر جا کر گلی میں مجمعے کو دیکھا تو ششں و پنج سے نکلنے میں اسے کافی وقت لگا۔ وہ خانہ بدوش نہ تھے۔ وہ انہیں جیسے مرد اور عورتیں تھیں، سیدھے بالوں اور سانولی رنگت والے لوگ، جو انہیں کی زبان بولتے اور انہیں تکلیفوں کا رونا روتے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کی اشیا سے لدے خچر تھے، اور بیل گاڑیاں جن پر گھریلو استعمال کے برتن لدے ہوئے تھے، سیدھی سادی دنیاوی اشیاء جنہیں روزمرہ کی دنیا کے خوانچہ فروش بغیر کسی شور شرابے کے بیچ رہے تھے۔ وہ دلدلی علاقے کے اس پار سے آئے تھے جو صرف دو دن کے فاصلے پر تھا، جہاں ایسے قصبے تھے جن میں سال کے ہر ماہ ڈاک پہنچا کرتی تھی، اور جن کے باشندے عمدہ رہن سہن کے طور طریقوں سے واقف تھے۔ ارسلا کو خانہ بدوش تو نہ ملے

تھے، لیکن اس نے وہ راستہ پالیا تھا جو اس کا شوہر اپنی شاندار ایجادات کی بے نتیجہ جستجو کے دوران دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

پیلار ترنیرا کے بیٹے کو اس کی پیدائش کے دو ہفتے بعد دادا دادی کے گھر لے آیا گیا۔ ارسلانے اسے ناخوشی سے گھر میں داخل کیا، اپنے شوہر کی ضد کے آگے ایک بار پھر بے بس ہو کر، جو یہ خیال برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اس کا خون اس سے دور ہے، لیکن اس نے یہ شرط عائد کی کہ بچے کو اس کے اصل حسب و نسب کا کبھی پتا نہ چلے۔ گو کہ بچے کو حوزے آرکادیو کا نام دیا گیا۔ اسے سب لوگ صرف آرکادیو کہہ کر پکارتے تا کہ الجھن نہ ہو۔ ان دنوں گاؤں میں اتنی گہما گہمی اور گھر میں اتنی چہل پہل تھی کہ بچوں کی دیکھ بھال کا کام ضمنی سطح پر چلا گیا تھا۔ بچوں کو ویزیتا سیون، ایک مقامی گواہیرو عورت، کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جو اپنے بھائی کے ساتھ قصبے پہنچی تھی۔ بے خوابی کی وبا سے فرار ہو کر جو ان کے قبیلے میں کئی سال سے پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اتنے اطاعت گزار اور مدد کے لیے تیار تھے کہ ارسلانے انہیں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح آرکادیو اور امارانتا ہسپانوی زبان سیکھنے سے پہلے گواہیرو بولنے لگے تھے، اور انہوں نے چھپکلی کا شوربہ اور مکڑیوں کے انڈے کھانا سیکھ لیے، جس کا علم ارسلا کو نہ ہوا، جو اپنے شکر کے جانوروں کے بڑھتے ہوئے کاروبار میں بے حد مصروف رہنے لگی تھی۔ ماکوندو میں تبدیلی آ گئی تھی۔ جو لوگ ارسلا کے ساتھ آئے تھے، انہوں نے یہ خبر پھیلا دی کہ یہاں کی زمین بہت عمدہ ہے اور دلدلی علاقے کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے، لہٰذا ماکوندو پرانے وقتوں کے چھوٹے سے گاؤں سے ایک فعال قصبے میں بدل گیا، دکانوں، کارگاہوں اور ایک باقاعدہ تجارتی راستے والا قصبہ، جس سے عرب ڈھیلے ڈھالی پتلونیں پہنے اور کانوں میں بالے لٹکائے آتے، اور کانچ کے منکوں کے عوض توتے لیا کرتے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک لمحے کا آرام نہ ملتا۔ سامنے کی حقیقت کے سحر میں آ کر، جو اس کے تخیل کی وسیع کائنات سے زیادہ انوکھی تھی، وہ کیمیا گری میں تمام دل چسپی کھو بیٹھا، اس نے وہ مادہ اٹھا کر رکھ دیا جو مہینوں کے جوڑ توڑ سے رقیق ہو چلا تھا، اور دوبارہ پرانے دنوں والا ایک پر عزم آدمی بن گیا، جب اس نے گاؤں کا نقشہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ کوئی شخص ایسی مراعات نہ پا سکے جو سب کو حاصل نہ ہوں۔ نئے آنے والوں میں اس کو اتنا استناد حاصل ہو گیا کہ اس سے مشورہ کیے بغیر نہ گھر کی بنیاد ڈالی جاتی اور نہ دیواریں کھڑی کی جاتیں، اور فیصلہ کیا گیا کہ زمین کی تقسیم کا نگراں اسے بنایا جائے۔ جب

کرتب دکھانے والے خانہ بدوش واپس آئے، جن کا آوارہ کارنیوال تقدیر اور اتفاقات کے کھیلوں کے ایک عظیم الشان ادارے میں بدل گیا تھا، تو ان کا بے حد مسرت کے ساتھ استقبال کیا گیا، کیوں کہ خیال یہ تھا کہ حوزے آرکادیو ان کے ساتھ واپس آیا ہوگا لیکن حوزے آرکادیو واپس نہ آیا تھا اور نہ ہی وہ سانپ نما آدمی ان کے ساتھ تھا جو ارسلا کے خیال میں واحد شخص تھا جو حوزے آرکادیو کے بارے میں ان کو کچھ بتا سکتا تھا، لہٰذا خانہ بدوشوں کو قصبے میں پڑاؤ ڈالنے کی اجازت نہ ملی اور انہیں آئندہ وہاں قدم نہ رکھنے کی تنبیہ کی گئی، کیوں کہ انہیں شہوت پرستی اور جنسی کجروی کا پیامبر سمجھا جاتا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے البتہ صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ ملکیادیس کے پرانے قبیلے کے لیے گاؤں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے، جس نے گاؤں کی ترقی اور خوشحالی میں اپنے علم و دانش اور شاندار ایجادات کے ذریعے معاونت کی تھی۔ لیکن ملکیادیس کا قبیلہ، بقول ان خانہ بدوشوں کے روئے زمین سے فنا ہو چکا تھا، کیوں کہ وہ انسانی علم کی حدوں سے پرے نکل گیا تھا۔

تخیل کے عذاب سے کم از کم کچھ عرصے کے لیے آزاد ہو کر، حوزے آرکادیو بوئندیا نے مختصر سی مدت میں نظم و ضبط اور کام کا ایک نظام ترتیب دیا جس میں صرف ایک آزادی کی گنجائش رکھی گئی: ان پرندوں کی آزادی جنہوں نے ماکوندو کی بنیاد پڑنے سے اب تک وقت کے گزران کو خوش الحان نغموں سے پر مسرت کیا تھا، اور ان کی جگہ ہر گھر میں موسیقی والی گھڑیاں نصب کی گئیں۔ وہ شاندار گھڑیاں منقش لکڑی کی بنی ہوئی تھیں جو عربوں نے توتوں کے عوض انہیں دی تھیں، اور جنہیں حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس صراحت سے ہم وقت کیا تھا کہ پورا گاؤں ہر آدھ گھنٹے بعد ایک ہی نغمے کے اٹھتے ہوئے سروں سے جھوم اٹھتا، وہ نغمہ جو عین دوپہر کے وقت اپنے عروج پر پہنچتا، ایک مکمل والز کی طرح درست اور ہم آواز۔ یہ حوزے آرکادیو بوئندیا ہی تھا جس نے ان برسوں میں یہ فیصلہ کیا کہ انہیں کیکر کی جگہ گلیوں میں بادام کے درخت لگانے چاہییں، اور اسی نے ایسا طریقہ دریافت کیا، جو اس نے کسی کو نہ بتایا، جس سے وہ درخت ہمیشہ ہرے بھرے رہتے۔ بہت برسوں بعد، جب ماکوندو جست کی چھتوں والے لکڑی کے گھروں کے ایک میدان میں تبدیل ہو گیا تھا، بادام کے شکستہ اور گرد آلود درخت قدیم ترین گلیوں میں اب بھی کھڑے تھے، جو کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس نے لگائے تھے۔ جن دنوں اس کا باپ گاؤں کا نظام درست کر رہا تھا، اور اس کی ماں شکر کی مچھلیوں اور مرغیوں کے شاندار کاروبار سے گھر کی دولت میں اضافہ کر رہی تھی جس کی وجہ سے گھر میں دن میں دو دفعہ سالسا لکڑی کی ڈنڈیاں لگائی جاتیں،

اور یلیانو گھنٹوں اس ترک کردہ تجربہ گاہ میں گزارتا اور خود تجربے کر کر کے چاندی کا کام سیکھتا۔ مختصر سی مدت میں اس نے اتنی تیزی سے قد نکالا کہ بڑے بھائی کے چھوڑے ہوئے کپڑے اس پر تنگ ہونے لگے اور وہ اپنے باپ کے کپڑے پہننے لگا۔ لیکن ویزیتاسیون کو قمیضوں اور پتلونوں میں چنٹیں ڈالنی پڑتی تھیں، کیوں کہ اور یلیانو پر دوسرے لوگوں جیسا مٹاپا نہ چڑھا تھا۔ بلوغت نے اس کی آواز کی نرمی ختم کر دی تھی اور اس کو خاموش طبع اور قطعی طور پر تنہا کر دیا تھا، لیکن دوسری طرف اس کی آنکھوں میں تاثرات کی وہ شدت دوبارہ عود کر آئی تھی جو پیدائش کے وقت تھی۔ وہ چاندی کے کام پر اتنی توجہ مرکوز رکھتا کہ بمشکل کھانا کھانے کے لیے تجربہ گاہ سے نکلتا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا اس کے اندر ہی اندر سمٹنے سے اتنا متفکر ہوا کہ اس نے، یہ سوچ کر شاید اسے عورت کے پاس جانے کی ضرورت ہے، اسے گھر کی چابیاں اور کچھ پیسے دیئے، لیکن اور یلیانو نے وہ پیسے آب شاہی تیار کرنے کے لیے جوہر نمک خریدنے میں لگا دیئے، اور چابیوں پر سونے کا پانی چڑھا کر انہیں خوبصورت بنا دیا۔ اس کی بے اعتدالی کا آرکادیو اور امارانتا کی حرکتوں سے مقابلہ نہ ہو سکتا تھا، جن کے دودھ کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور نئے دانت نمودار ہو رہے تھے، اور جو مقامی انڈین لوگوں کی سی عبائیں گھسیٹتے پھرتے اور اس بات پر اڑے رہتے کہ ہسپانوی نہیں بلکہ گواہیرو ہی بولیں گے۔ ''تمہیں شکایت نہیں کرنی چاہیے،'' ارسلا نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''بچوں کو والدین کا پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔'' ارسلا نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''بچوں کو والدین کا پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔ اور جب وہ اپنی قسمت کو کوس رہی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بچوں کی وحشیانہ حرکتیں اتنی ہی خوفناک ہیں جتنی کہ سؤر کی دم، اور یلیانو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔

''کوئی آرہا ہے،'' اس نے ارسلا کو بتایا۔

ارسلا نے اس پیش گوئی کو گھریلو عورت کی منطق سے سمجھنا چاہا، جیسا کہ وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی جب بھی اور یلیانو اس قسم کی بات کرتا۔ کسی کا آنا عام بات تھی۔ روزانہ درجنوں اجنبی، بغیر شکوک و شبہات ابھارے اور بغیر کسی اسرار کے، ماکوندو آیا کرتے۔ بہر حال، ہر منطق سے بالاتر، اور یلیانو کو اپنی پیش گوئی پر پورا یقین تھا۔

''میں نہیں جانتا وہ کون ہو گا'' اس نے اصرار کیا، ''لیکن وہ جو کوئی بھی ہے، روانہ ہو چکا ہے۔''

اس اتوار کو درحقیقت ربیکا پہنچی۔ وہ صرف گیارہ سال کی تھی۔ اس نے مانورے سے

ماکوندو تک کا کٹھن سفر چمڑے کے چند تاجروں کے ہمراہ طے کیا تھا، جنہوں نے ربیکا کو ایک خط سمیت حوزے آرکادیو بوئندیا تک پہنچانے کی ذمے داری لی تھی، لیکن وہ ٹھیک سے سمجھ نہ پائے کہ آخر وہ کون شخص تھا جس نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا۔ ربیکا کا سازو سامان صرف ایک چھوٹے سے صندوق، رنگ دار پھولوں سے مزین ایک جھولنے والی کرسی اور ایک ٹاٹ کی بوری پر مشتمل تھا، جس سے کلاک، کلاک، کلاک کی آواز نکلتی، اور جس میں وہ اپنے والدین کی ہڈیاں لیے پھرتی تھی۔ وہ گرم جوش خط جو حوزے آرکادیو بوئندیا کے نام تھا، کسی ایک ایسے شخص کی طرف سے لکھا گیا تھا، جو اب تک، زمان و مکاں کے فاصلوں کے باوجود، اس سے محبت کرتا تھا، اور جس نے ایک بنیادی انسانی ہمدردی کے تحت اس بے سہارا یتیم بچی کو اس کے پاس بھیجا تھا، وہ ارسلا کے رشتے کی بہن تھی، اور اس طرح اس کا حوزے آرکادیو بوئندیا سے بھی دور کا رشتہ نکلتا تھا، اس لیے کہ وہ اس کے کبھی نہ بھلائے جانے والے دوست نکانوز الیوہا اور اس کی نیک بیوی ربیکا مونتیئل کی بیٹی تھی، خدا ان دونوں روحوں کو اپنی امان میں رکھے، اور ان کی ہڈیاں ساتھ لے کر آئی تھی تاکہ عیسائی طریقے سے ان کو دفنایا جاسکے۔ خط میں دیئے گئے نام اور دستخط صاف صاف پڑھے جاتے تھے، لیکن نہ حوزے آرکادیو بوئندیا کو اور نہ ارسلا کو اس نام کے کسی رشتے دار کا علم تھا، اور نہ ہی انہوں نے آج تک مانورے گاؤں کا نام سنا تھا۔ لڑکی سے کوئی مزید معلومات حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جس وقت سے وہ آئی تھی، جھولنے والی کرسی میں انگوٹھا چوستی ہوئی، ہر ایک کو اپنی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اور اس کے چہرے اور حرکات سے اس سے کیے جانے والے سوالات کے سمجھنے کے کوئی آثار نہ پائے جاتے تھے، وہ آڑی دھاریوں والا، کالے رنگ میں رنگا ہوا لباس پہنے تھی جو پرانا نظر آتا تھا۔ اس نے پٹی دار چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال کانوں کے پیچھے کالے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی جس پر بنی شبیہیں پسینے سے مٹ چلی تھیں، اور دائیں کلائی میں نظربد کے حفاظتی تعویذ کے طور پر گوشت خور جانور کے دانتوں سے منڈھا ہوا ایک تانبے کا کڑا تھا۔ اس کی سبزی مائل جلد اور ڈھول کی طرح تنا ہوا گول پیٹ اس کی خرابی صحت اور بھوک کی نشان دہی کرتا تھا، جس کی عمر اس کی عمر سے زیادہ تھی۔ لیکن جب انہوں نے اسے کچھ کھانے کو دیا تو وہ پلیٹ کو ٹخنوں پر رکھے بیٹھے رہی اور کچھ نہ چکھا۔ ان لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ وہ گونگی بہری ہے، یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے اپنی زبان میں اس سے پوچھا کہ آیا اسے پانی چاہیے، اور اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں، جیسے انہیں پہچان رہی ہو اور سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

انہوں نے بچی کو رکھ لیا، کیوں کہ اس کے سوا وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اسے ربیکا پکارنے کا فیصلہ کیا جو خط کے مطابق اس کی ماں کا نام تھا، کیوں کہ اور یلیانو نے انتہائی تحمل کے ساتھ تمام ولیوں کے نام لیے اور کسی بھی نام پر اس نے رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چوں کہ اس وقت تک ماکوندو میں قبرستان نہ تھا، انہوں نے ہڈیوں کی بوری کو تدفین کے مناسب مقام کی تلاش کے انتظار میں رکھا رہنے دیا، اور ایک طویل عرصے تک وہ بوری ہر جگہ نظر آتی اور مرغی کی کڑکڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ ایسی جگہ پائی جاتی جہاں اس کے ہونے کی کوئی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ ربیکا کو اس خاندان کی زندگی کا حصہ بننے میں طویل عرصہ لگا۔ وہ گھر کے کسی دور دراز کونے میں اپنی چھوٹی سی جھولنے والی کرسی پر بیٹھی انگوٹھا چوسا کرتی۔ اسے کوئی چیز متوجہ نہ کرتی سوائے گھڑیوں کی موسیقی کے، جس کے لیے وہ ہر آدھ گھنٹے بعد اپنی خوف زدہ آنکھیں اٹھا کر یوں دیکھتی گویا وہ اسے ہوا میں دکھائی دینے والی ہو۔ وہ اسے کئی دنوں تک کھانے پر مائل نہ کر سکے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اب تک بھوک سے مر کیوں نہیں گئی، یہاں تک کہ مقامی انڈین لوگوں نے جو کئی باتوں سے باخبر تھے، اور جو گھر میں دبے پاؤں بغیر کسی آہٹ کے آیا جایا کرتے، دریافت کیا کہ ربیکا صرف آنگن کی گیلی مٹی اور دیواروں کا چونا کھانا پسند کرتی ہے، جو وہ اپنے ناخنوں سے کھرچ کر نکالا کرتی۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کے والدین نے یا جس کسی نے اس کی پرورش کی، اس کی اس عادت پر خاصی سرزنش کی تھی، کیوں کہ وہ یہ کام چھپ کر اور ایک احساس جرم کے ساتھ کرتی، اور اس کوشش میں رہتی کہ کچھ مٹی چونا چھپا رکھے اور جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو، چپکے چپکے کھائے۔ تب سے انہوں نے اس کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ انہوں نے آنگن میں گائے کا گوبر پھیلا دیا اور دیواروں پر تیز مرچیں مل دیں، اس امید پر کہ اس طرح وہ اس کی مہلک عادت کو شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن اس نے مٹی حاصل کرنے میں اتنی ہوشیاری اور چترائی دکھائی کہ ارسلا کو مجبوراً سخت اقدامات کرنے پڑے۔ اس نے ایک برتن میں موسمبی کا عرق اور ریوند چینی ملا کر رات بھر کے لیے آنگن میں چھوڑ دیا تاکہ اس میں شبنم پڑ سکے، اور یہ دوا اس نے دوسرے دن ربیکا کو خالی پیٹ پلائی۔ گو کہ ارسلا کو کسی نے نہ بتایا تھا کہ یہ مٹی کھانے کی عادت کا علاج ہے، اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی تلخ مائع خالی پیٹ میں جائے گا تو جگر میں رد عمل پیدا کرے گا۔ ربیکا اپنے نازک جسم کے باوجود اتنی مضبوط اور سرکش تھی کہ انہیں اس کو ایک بچھڑے کی طرح باندھ کر دوا پلانی پڑی، اور انہوں نے بہ مشکل خود کو اس کی لاتوں سے بچایا اور ان عجیب و غریب آوازوں کو برداشت کیا جو وہ دانتوں سے کاٹنے اور تھوکنے کے دوران نکالتی رہی۔

صدمے سے حیرت زدہ مقامی لوگوں کے مطابق، یہ غلیظ ترین گالیاں تھیں، جو کوئی ان کی زبان میں سوچ سکتا تھا۔ جب ارسلا کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے دوا پلانے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب پٹائی بھی کی۔ یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ریوند چینی کا اثر تھا یا پٹائی کا، یا دونوں کا، لیکن سچ یہ ہے کہ چند ہی ہفتوں میں ربیکا کے سدھرنے کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ آرکادیو اور امارانتا کے ساتھ کھیلا کرتی جو اس سے بڑی بہن کا سا برتاؤ کرتے اور برتنوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے جی بھر کے کھانا کھاتی۔ جلد ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ وہ ہسپانوی زبان بھی اتنی ہی روانی سے بولتی ہے جتنی کہ مقامی اور جسمانی مشقوں کی اس مین حیرت انگیز استعداد ہے اور گھڑیوں کے والز کو وہ خود سے بنائے ہوئے مزاحیہ بولوں کے ساتھ گا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو اسے گھر کا فرد سمجھنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ وہ ارسلا سے اتنی محبت کرنے لگی تھی کہ اس کی حقیقی اولاد بھی نہ کرتی ہو گی۔ وہ آرکادیو اور امارانتا کو بھائی بہن، اور ریلیانو کو چاچا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا کو نانا کہہ کر پکارتی۔ اور اس طرح آخر کار دوسروں کی طرح، وہ ربیکا بوئندیا کے نام کی مستحق ہوئی، وہ نام جس کو اس نے اپنی موت تک وقار کے ساتھ برقرار رکھا۔

ان دنوں جب ربیکا کو مٹی کھانے کی عادت سے چھٹکارا دلا کر اسے دوسرے بچوں کے کمرے میں لایا جانے لگا تھا، ایک رات مقامی انڈین عورت کی، جو بچوں کے ساتھ سوئی تھی، اتفاق سے آنکھ کھل گئی، اور اسے کونے سے ایک عجیب و غریب آواز وقفے وقفے سے اٹھتی سنائی دی۔ وہ تشویش سے اٹھ بیٹھی، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید کمرے میں کوئی جانور گھس آیا ہے، اور تب اس نے ربیکا کو آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ انگوٹھا چوس رہی تھی اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ دہشت زدہ، اپنی تقدیر سے ہار کر، ویزیتاسیون نے ان آنکھوں میں اس بیماری کی علامات پہچان لیں جس کے اندیشے نے اسے اور اس کے بھائی کو ہمیشہ کے لیے اس قدیم سلطنت سے، جس کے وہ شہزادہ تھے، جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بے خوابی کی وبا تھی۔

مقامی انڈین، کاتورے، صبح تک گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کی بہن وہیں رہی، کیوں کہ اس کے تقدیر پرست دل نے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ جان لیوا بیماری دنیا کے آخری کونے تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ کوئی ویزیتاسیون کے خوف کو نہ سمجھ پایا۔ "اگر ہم کبھی نہ سو سکیں تو بہت اچھا ہو" حوزے آرکادیو بوئندیا نے ازراہ مذاق کہا "اس طرح ہم زندگی سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔" لیکن مقامی عورت نے سمجھایا کہ اس بیماری کا سب سے خوفناک پہلو یہ نہیں کہ نیند کا آنا ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ جسم کو تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا

رفتہ رفتہ بے رحمی سے ایک خطرناک مظہر کی جانب بڑھتا ہے، اور وہ ہے: یادداشت کی گم شدگی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب اس بیماری میں مبتلا آدمی اپنی بے خوابی کا عادی ہو جاتا، تو بچپن کے واقعات کی یادیں اس کے ذہن سے مٹنے لگتیں، اور پھر اشیا کے نام اور تصورات محو ہو جاتے، اور بالآخر لوگوں کی شناخت یہاں تک کہ خود اپنی ذات کی آگہی بھی جاتی رہتی، یہاں تک کہ وہ حماقت کی ایک ایسی کیفیت میں ڈوب جاتا جس کا کوئی ماضی نہ ہوتا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے جس کا ہنستے ہنستے دم نکلنے لگا، سوچا کہ یہ مقامی لوگوں کے توہمات کی ایجاد کردہ بیماریوں میں سے ایک ہے، لیکن ارسلا نے احتیاط کے طور پر ربیکا کو بچوں سے علیحدہ کر دیا۔

چند ہفتوں بعد جب ویزیتاسیون کی دہشت کم ہو چلی تھی، حوزے آرکادیو بوئندیا نے خود کو بستر پر کروٹیں بدلتے پایا۔ اس کو کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔ ارسلا نے، جو خود بھی جاگ اٹھی تھی، اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، اور اس نے جواب دیا: میں پھر پرودانسیو آگویلار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ "وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوئے، لیکن دوسرے دن خود کو اتنا ہشاش بشاش محسوس کر رہے تھے کہ انہیں یاد نہ رہا کہ ان کی رات کتنی بری طرح گزری ہے۔ اور ریلیانو نے دوپہر کے کھانے کے وقت اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا ہے، اس کے باوجود کہ اس نے پوری رات تجربہ گاہ میں ایک بروچ پر سونے کا پانی چڑھانے میں گزاری تھی جو وہ ارسلا کی سالگرہ پر دینا چاہتا تھا۔ انہیں کوئی تشویش نہ ہوئی، حتیٰ کہ تیسرے دن جب کسی کو رات میں نیند نہ آئی تو انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ پچاس گھنٹوں سے زیادہ وقت سوئے بغیر گزار چکے ہیں۔

"بچے بھی جاگ رہے ہیں۔" مقامی عورت نے تقدیر پرستانہ وثوق سے کہا۔ "ایک دفعہ یہ گھر میں داخل ہو جائے تو اس وبا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔"

وہ واقعی بے خوابی کی وبا کا شکار ہو گئے تھے۔ ارسلا نے، جس نے اپنی ماں سے جڑی بوٹیوں کی طبی خاصیتوں کے بارے میں سیکھا تھا، گل تاج ملک کشید کر کے سب کو پلایا، لیکن انہیں پھر بھی نیند نہ آئی اور وہ تمام رات کھڑے خواب دیکھتے رہے۔ فریب نظر کی اس تابندگی میں انہیں نہ صرف اپنے خوابوں کی شبیہیں نظر آئیں، بلکہ انمیں سے کچھ کو وہ شبیہیں بھی دکھائی دیں جو دوسروں نے خواب میں دیکھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر مہمانوں سے بھر گیا ہو۔ باورچی خانے کے ایک کونے میں اپنی جھولنے والی کرسی میں بیٹھے بیٹھے ربیکا نے دیکھا کہ ایک آدمی جو بالکل اس کا ہم شکل نظر آتا ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس ہے اور جس کی

قمیص کا کالر سونے کے بٹن سے بند ہے، اس کے لیے گلابوں کا ایک دستہ لیے آرہا ہے۔ اس کے ساتھ نازک ہاتھوں والی ایک عورت تھی جس نے گلدستے سے ایک گلاب نکال کر بچی کے بالوں میں لگایا۔ ارسلا سمجھ گئی کہ وہ مرد اور عورت ربیکا کے والدین ہیں، گو کہ ربیکا نے انہیں پہچاننے کی بڑی کوشش کی، وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نے ان لوگوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس دوران ایک لغزش کے تحت جس کے لیے حوزے آرکادیو بوئندیا نے خود کو کبھی معاف نہ کیا، گھر میں بننے والے شکر کے جانور قصبے بھر میں اسی طرح بکتے رہے۔ بچے اور بڑے مزے لے لے کر بے خوابی کے ننھے ننھے ہرے مرغ، بے خوابی کی لطیف گلابی مچھلیاں اور بے خوابی کے نازک پیلے گھوڑے چوستے رہے، لہٰذا سوموار کی صبح پورے قصبے کو جاگتے پایا گیا۔ شروع شروع میں کسی کو تردد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیند نہ آنے پر خوش تھے، کیوں کہ ان دنوں ماکوندو میں اتنا کچھ کرنے کو تھا کہ وقت بمشکل ہی بچتا۔ وہ اتنی محنت کرتے تھے کہ جلد ہی کرنے کو کچھ نہ رہ گیا۔ اور وہ صبح تین بجے ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھڑیوں کا والز سنتے پائے جاتے۔ وہ لوگ جو سونا چاہتے تھے، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ خوابوں کی آرزو میں، انہوں نے خود کو تھکانے کے تمام حربے استعمال کر ڈالے۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔ ایک ہی لطیفہ بار بار دوہراتے، خصی مرغ کی کہانی کو ابتری کی آخری حدوں تک گنجلک کرتے جو ایک کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل تھا، اور جس میں کہانی سنانے والا پوچھتا کہ آیا انہیں خصی مرغ کی کہانی سننی ہے، اگر وہ کہتے "ہاں" تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے ہاں کہنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ وہ خصی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں یا نہیں، اگر وہ کہتے "نہیں" تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے نہیں کہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ سوال کیا تھا کہ آیا وہ چاہتے ہیں کہ انہیں خصی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور اگر وہ خاموش ہو جاتے تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ پوچھا تھا کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ انہیں خصی مرغ کی کہانی سنائی جائے اور کوئی اٹھ کے نہ جا سکتا تھا کیوں کہ داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے جانے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ آیا وہ خصی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ ایک لاحاصل دائرے میں تمام رات گھومتے رہتے۔

جب حوزے آرکادیو بوئندیا کو احساس ہوا کہ قصبے پر وبا کا حملہ ہو چکا ہے تو اس نے خاندانوں کے سربراہوں کو اکٹھا کیا اور جو کچھ وہ بے خوابی کے مرض کے بارے میں جانتا تھا انہیں بتایا، اور انہوں نے وبا کو دلدلی علاقے کے دوسرے قصبوں میں پھیلنے سے روکنے کے لیے اقدامات طے کیے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بکریوں کے گلے سے گھنٹیاں اتار لیں جو

عربوں نے انہیں توتوں کے مول دی تھیں، اور ان گھنٹیوں کو قصبے میں داخل ہونے والی راہگزر پر ان لوگوں کے لیے رکھ دیا جو سنتریوں کی منت سماجت سے باز نہ آتے اور قصبے میں داخل ہونے کے لیے بضد رہتے۔ تمام اجنبیوں کو جوان دنوں ماکوندو کی گلیوں سے گزرتے، یہ گھنٹیاں بجانی پڑتیں، تاکہ بیماروں کو علم ہو سکے کہ وہ صحت مند لوگ ہیں۔ اپنے قیام کے دوران انہیں کھانے پینے کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ بیماری کے جراثیم منہ کے ذریعے پھیلتے ہیں، اور تمام کھانے پینے کی اشیا بے خوابی کے اثرات کی زد میں آچکی ہیں۔ اس طرح انہوں نے وبا کو قصبے تک محدود رکھا۔ یہ قرنطینہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ ان ناگہانی حالات کو ایک فطری چیز سمجھ کر قبول کر لیا گیا، اور زندگی کو اس طرح منظم کیا گیا کہ کام کاج کی رفتار معمول پر آگئی، اور لوگوں نے نیند کی بے کار عادت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

یہ اوریلیانو تھا جس نے وہ نسخہ دریافت کیا جو ان کی یادداشت کو گم ہونے سے کئی مہینے تک محفوظ رکھنے والا تھا۔ اس کو یہ نسخہ اتفاق سے معلوم ہوا۔ ایک ماہر بے خواب ہونے کی وجہ سے، کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں سب سے پہلے یہ بیماری لاحق ہوئی تھی، اس نے چاندی کے کام میں تکمیل کی حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک دن وہ چھوٹا سندان تلاش کر رہا تھا جسے وہ دھات پر ملمع چڑھانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا، اور اسے اس اوزار کا نام یاد نہ آسکا۔ اس کے باپ نے اسے بتایا: "دستہ" اوریلیانو نے کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر یہ نام لکھا اور اسے سندان کے پیندے سے چپکا دیا "دستہ" اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ آئندہ یہ لفظ نہ بھولے گا۔ اس کو اس بات کا خیال نہ آیا، کیوں کہ اس شے کا نام کافی مشکل تھا، کہ یہ یادداشت گم ہونے کی پہلی علامت ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسے احساس ہوا کہ تجربہ گاہ میں رکھی ہوئی تقریباً تمام چیزوں کے نام یاد رکھنے میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔ تب اس نے تمام اشیا پر ان کے نام لکھ کر لگا دیے، تاکہ وہ لکھے ہوئے نام پڑھ کر انہیں شناخت کر سکے۔ جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے قابل ذکر ترین واقعات بھی ذہن سے جاتے رہنے پر تشویش کا اظہار کیا، تو اوریلیانو نے اسے اپنا طریقہ بتایا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا نے پہلے اسے گھر بھر میں رائج کیا، اور پھر تمام گاؤں میں نافذ کر دیا۔ برش کو سیاہی میں ڈبو کر اس نے تمام اشیا پر ان کے نام لکھ دیے: میز، کرسی، گھڑی، دروازہ، دیوار، بستر، برتن۔ وہ جانوروں کے باڑے میں گیا، اور جانوروں اور پودوں پر نام لکھے: گائے، بکری، سؤر، مرغی، کساوا، کلادیم، کیلا۔ رفتہ رفتہ مٹتی ہوئی یادداشت کے لامتناہی امکانات پر غور کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ دن آسکتا ہے جب لوگ چیزوں کو ان پر لکھے ناموں کی مدد سے پہچان

لیں، لیکن ان کا استعمال انہیں یاد نہ رہے۔ تب وہ زیادہ وضاحت سے کام لینے لگا۔ وہ تختی جو اس نے گائے کی گردن میں لٹکائی، اس تدبیر کی عمدہ مثال تھی۔ جس سے ماکوندو کے باشندوں نے حافظے کے زوال کے خلاف جنگ کے لیے خود کو لیس کیا: یہ گائے ہے۔ اس کو ہر صبح دوہنا ہے تاکہ یہ دودھ پیدا کرتی رہے اور دودھ کو ابالنا ہے تاکہ کافی میں ملا کر دودھ کافی بنائی جا سکے۔" اس طرح وہ ایسی حقیقت میں رہا کیے جوان کے ہاتھوں سے پھسلتی جارہی تھی، وقتی طور پر الفاظ کے ذریعے گرفت میں لائی ہوئی حقیقت، لیکن جسے لکھے الفاظ کی قدر فراموش پر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانا تھا۔

اس راہ گزر کے آغاز پر جو دلدلی علاقے کو نکلتی تھی، انہوں نے "ماکوندو" کی تختی لگادی۔ اور ایک بڑی سی تختی شاہراہ عام پر نصب کر دی، جس پر لکھا تھا "خدا ہے" تمام گھروں میں اشیا اور احساسات کو یاد رکھنے کے لیے شرحیں تیار کر لی گئی تھیں۔ لیکن وہ نظام اتنی ہوشیاری اور اخلاقی قوت کا متقاضی تھا کہ بہت سے لوگ خیالی حقیقت کے طلسم سے زیر ہوگئے، اپنی گھڑی ہوئی حقیقت جوان کے لیے عملی کم، لیکن آرام دہ زیادہ تھی۔ پیلار ترنیرا وہ ہستی تھی جس کا اس پنہاں سازی کو مقبول کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اس کو تاش کے پتوں سے ماضی پڑھنے کی ترکیب سوجھی، جس طرح وہ پہلے مستقبل دیکھا کرتی تھی۔ اس ترکیب کی بدولت بے خوابی کے شکار لوگ ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جس کی بنیاد تاش کے پتوں کے غیر یقینی متبادل پر تھی، جہاں ایک باپ کو مبہم طور پر ایک ایسے سانولے آدمی کی صورت یاد کیا جاتا جو اپریل کے اوائل میں آیا تھا، اور ماں کو صرف ایک ایسی سانولی عورت کے روپ میں جس نے اپنے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی، اور جہاں جنم دن اس پچھلے منگل تک محدود ہو گیا جب برگ غار کے درخت پر چکاوک چہچہایا تھا۔ دل بہلانے کے ان طریقوں سے شکست کھا کر حوزے آرکادیو بوئندیا نے یادداشت کی مشین بنانے کی ٹھانی، جس کی اس نے کبھی تمنا کی تھی تاکہ خانہ بدوشوں کی شاندار ایجادات کو یاد رکھ سکے۔ یہ کل، انسان کی تمام زندگی میں حاصل کیے گئے علم پر، ہر صبح، شروع سے آخر تک نظر ڈالنے کے امکان پر مبنی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کا تصور ایک چرخی نما لغت کے طور پر کیا تھا، جس کو محور پر رکھ کر دستے کے ذریعے چلایا جا سکے، اور اس طرح، زندگی کے سب سے ضروری تصورات، ہر چند گھنٹوں بعد، اس کی آنکھوں کے سامنے آسکیں، وہ تقریباً چودہ ہزار اندراجات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جب دلدلی علاقے والی راہگزر سے ایک عجیب و غریب حلیے کا آدمی بے خوابی سے محفوظ لوگوں کی غمناک گھنٹی کے ساتھ نمودار ہوا،

جس نے رسی سے بندھا ایک پھولا ہوا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا، اور کالے کپڑے سے ڈھکے ایک ٹھیلے کو کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ سیدھا حوزے آرکادیو بوئندیا کے گھر پہنچا۔

ویزیتاسیون نے اسے نہ پہچانا جب اس نے دروازہ کھولا، اور اس نے سوچا شاید وہ کچھ بیچنے کے ارادے سے آیا ہے، اس بات سے بے خبر کہ اس قصبے میں جو فراموشی کی دلدل میں ہمیشہ کے لیے دھنستا جا رہا ہے، کوئی چیز نہیں بیچی جا سکتی۔ وہ ایک پیر فرتوت تھا۔ اس کی آواز بے اعتباری سے شکستہ تھی، اور اس کے ہاتھ لگتا تھا جیسے اشیا کے وجود پر شبہ کرنے لگے ہوں، مگر یہ بات واضح تھی کہ وہ ایک ایسی دنیا سے آ رہا ہے جہاں لوگ اب تک سو سکتے ہیں، اور یاد رکھ سکتے ہیں۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے بیٹھک میں پایا، جہاں وہ بیٹھا اپنے پیوند لگے کالے ہیٹ سے ہوا جھل رہا تھا، اور ایک دردمند توجہ کے ساتھ دیوار پر چسپاں ناموں اور علامتوں کو پڑھ رہا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے گرم جوشی کے کھلے مظاہرے کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اس بات پر فکر مند کہ وہ کسی زمانے میں اسے جانتا تھا اور اب پہچان نہیں پا رہا۔ لیکن ملاقاتی کو اس بناوٹی شیفتگی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے بھلایا جا چکا ہے، دل کے ناقابل علاج نسیان سے نہیں بلکہ ایک مختلف فراموشی سے، جو زیادہ ظالمانہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی تھی، اور جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا کیوں کہ وہ موت کی فراموشی تھی۔ تب وہ جان گیا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا، جو سمجھ میں نہ آنے والی اشیا سے بھرا ہوا تھا، اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پیٹی نکالی جس میں بہت ساری بوتلیں تھیں۔ اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک ہلکی رنگت والا مائع پینے کو دیا، اور اس کی یادداشت کے قمقمے جل اٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو ایک احمقانہ بیٹھک میں پاتا جہاں اشیا پر نشان لگے ہوئے تھے، اس سے پہلے کہ وہ دیواروں پر لکھی سنجیدہ بکواس پر شرمندہ ہوتا، اور اس سے پہلے کہ وہ آنے والے کو ایک تابناک مسرت کے ساتھ پہچانتا، اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ آنے والا ملکیادیس تھا۔

جب تمام ماکوندو یادداشت کے واپس آنے کا جشن منا رہا تھا، حوزے آرکادیو بوئندیا اور ملکیادیس نے اپنی پرانی دوستی پر پڑی گرد جھاڑی۔ خانہ بدوش قصبے میں ٹھہرنے پر مائل تھا۔ وہ حقیقتاً موت کے منہ میں جا چکا تھا۔ لیکن اس لیے واپس آ گیا کہ اس سے تنہائی برداشت نہ ہوئی۔ قبیلے سے باہر نکال دیے جانے کے بعد اپنی تمام مافوق الفطرت صلاحیتوں کو زندگی سے وفاداری کے سبب کھو دینے کے بعد، اس نے دنیا کے اس کونے میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا جسے موت اب تک نہ ڈھونڈ پائی تھی، اور خود کو ڈگیروٹائپ سے تصویر اتارنے کی ایک تجربہ گاہ کے کام پر مامور کر دیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس ایجاد کے بارے میں اب

تک نہ سنا تھا، لیکن جب اس نے خود کو اور پورے خاندان کو قزح رنگی دھات کے پترے پر ابد تک کے لیے نقش کیا ہوا پایا، وہ بد حواسی سے گنگ رہ گیا۔ وہ تاریخ تھی اس زنگ آلود ڈیگرو ٹائپ تصویر کی، جس میں حوزے آرکادیو بوئندیا اپنے سرمئی کھڑے بالوں کے ساتھ نظر آتا تھا۔ اس کے کلف دار کالر کانسی کے بٹن سے قمیص سے جڑے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک حیران کن سنجیدگی تھی، جس پر ارسلا نے ہنسی سے دوہرا ہوتے ہوئے اسے "خوفزدہ جرنیل" کا نام دیا تھا۔ دسمبر کی اس نکھری ہوئی صبح جب تصویر اتاری گئی، حوزے آرکادیو بوئندیا واقعی خوفزدہ تھا۔ کیوں کہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ لوگ رفتہ رفتہ بوڑھے ہوتے جائیں گے جبکہ اس کی شبیہہ دھات کے اس پترے پر ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جائے گی۔ رواج کی ایک انوکھی کایا کلپ میں، یہ ارسلا تھی جس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے ذہن سے یہ خیال نکالا، اور وہی تھی جس نے پرانی تلخی کو بھلا کر یہ فیصلہ کیا کہ ملکیادیس اس گھر میں ٹھہرے، گو کہ اس نے کبھی اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہ دی، کیوں کہ (بقول خود اس کے) وہ اپنے پڑپوتوں کی ہنسی کا سامان بننا نہ چاہتی تھی۔ اس صبح اس نے بچوں کو بہترین لباس پہنائے، چہروں پر پوڈر لگایا اور ہر بچے کو ایک ایک چمچا شربت مغز پلایا تاکہ وہ تصویر اتروانے کے لیے ملکیادیس کے انوکھے کیمرے کے سامنے دو منٹ بالکل ساکت رہیں۔ اس خاندانی ڈیگرو ٹائپ میں جو اپنی نوعیت کی واحد تصویر تھی، اوریلیانو سیاہ مخمل میں ملبوس، امارانتا اور ربیکا کے درمیان نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی افسردگی اور روشن بینی کی کیفیت تھی، جس کے ساتھ وہ بہت برسوں بعد فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرنے والا تھا۔ لیکن اس وقت تک اسے اپنی تقدیر کے بارے میں پیش آگہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ماہر نقرہ کار تھا۔ جس کے کام کی نزاکت کی تعریف تمام دلدلی خطے میں ہوتی تھی۔ اس کارگاہ میں، جس میں ملکیادیس کی جنونی تجربہ گاہ بھی واقع تھی، اس کے سانس لینے کی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی۔ یوں لگتا جیسے اوریلیانو نے کسی دوسرے زمانے میں پناہ لے رکھی ہو، جب کہ اس کا باپ اور ملکیادیس، بوتلوں اور طشتوں کے شور، تیزاب چھلکنے اور پارے کے ہر لمبے نلکی کے ہر خم اور ہر بل پر گم ہونے کے حادثات کے درمیان، چلا چلا کر ناستر ادیمس کی پیش گوئیوں کی تشریح کیا کرتے۔ اس سپردگی اور فیصلے کی عمدگی نے، جس سے وہ اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھتا، اوریلیانو کو اس قابل کر دیا کہ کم وقت میں وہ اس سے کہیں زیادہ پیسہ کما لے جتنا کہ ارسلا اپنے لذیذ شکر کے جانور بنا کر کمایا کرتی تھی، لیکن ہر ایک کو یہ بات عجیب لگتی تھی کہ بالغ ہونے کے باوجود اس نے آج تک کسی عورت کو نہ جانا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ کبھی کسی عورت کے پاس نہ گیا تھا۔

چند ماہ بعد مرد بچے فرانسسکو کی واپسی دیکھی گئی، ایک آوارہ گرد جو تقریباً دو سو سال کا بوڑھا تھا، اور جو اکثر اپنے بنائے ہوئے نغمے گاتا ہوا ماکوندو سے گزرتا۔ ان نغموں میں مرد بچہ فرانسسکو بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام گاؤوں میں ہونے والے واقعات سناتا جو مانورے سے لے کر دلدل کے آخری سرے تک واقع تھے، تاکہ اگر کسی کو کہیں کوئی پیغام بھیجنا ہو، یا کسی واقعے کی تشہیر کرنی ہو، تو اس کو دو سکے دے کر اس کے نغموں کی پٹاری میں شامل کروا دے۔ اسی طریقے سے ارسلا کو اپنی ماں کی موت کا علم ہوا، کیوں کہ وہ یہ نغمے اس امید میں سنا کرتی تھی کہ شاید ان میں اس کے بیٹے حوزے آرکادیو کی کوئی خبر ملے۔ مرد بچہ فرانسسکو، جسے یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ ایک دفعہ اس نے شیطان کو بدیہہ گوئی کے مقابلے میں شکست دی تھی، اور جس کا اصل نام کسی کو معلوم نہ تھا، بے خوابی کی وبا کے دنوں میں ماکوندو سے غائب ہو گیا تھا، اور ایک رات اچانک کاتارینو کی دکان میں پھر نمودار ہوا۔ پورے گاؤں کے لوگ اس کے نغمے سننے کے لیے گئے، یہ جاننے کے لیے کہ دنیا میں کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی آئی تھی، جو اتنی فربہ تھی کہ چار مقامی انڈین اس کو ایک جھولنے والی کرسی میں اٹھا کر چلتے تھے، اور اس کے ساتھ کھوئی کھوئی آنکھوں والی ایک نوخیز ملاتو لڑکی تھی، جو ایک چھتری اٹھائے عورت کو دھوپ سے بچائے رکھتی تھی۔ اور یلیانو اس رات کاتارینو کی دکان پر گیا۔ اس نے مرد بچے فرانسسکو کو تماشائیوں کے دائرے کے بیچ ایک کیم شحیم گرگٹ کی مانند بیٹھا پایا۔ وہ اپنی بوسیدہ، بے سری آواز میں خبروں بھرے نغمے گا رہا تھا، اس کے پاس وہی قدیم اکارڈین تھا جو سر والٹر ریلے نے اسے گیانا میں دیا تھا، اور وہ اپنے انتھک چلنے والے پیروں سے، جو شورے سے چیخ گئے تھے۔ تال دے رہا تھا، دکان کے عقب میں ایک دروازہ تھا جس میں سے لوگ آ جا رہے تھے اور جس کے سامنے جھولنے والی کرسی میں رئیسہ خاموشی سے بیٹھی خود کو پنکھا جھل رہی تھی۔ کاتارینو، کان کے پیچھے ایک مصنوعی گلاب لگائے، مجمع میں گنے کی شراب مگ میں بیچ رہا تھا، اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مردوں کے قریب جاتا اور ان پر وہاں ہاتھ رکھتا جہاں نہیں رکھنا چاہیے۔ اور اسے کوئی ایسی خبر نہ ملی جو اس کے خاندان کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ گھر جانے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ فربہ رئیسہ نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تم بھی اندر جاؤ" اس نے اور یلیانو سے کہا۔ "صرف بیس پیسو لگیں گے۔"

اور یلیانو نے رئیسہ کی گود میں دھری ٹوکری میں ایک سکہ پھینکا، اور بغیر سوچے سمجھے کمرے میں چلا گیا۔ نوبالغ ملاتو لڑکی، جس کے چھوٹے چھوٹے سرپستان کتیا کے سے تھے۔

بستر پر عریاں لیٹی تھی۔ اور یلیانو سے پہلے تریسٹھ آدمی اس رات اس کمرے سے گزرے تھے۔ کمرے کی کثیف فضا، پسینے اور آہوں میں گندھی ہوئی، کیچڑ میں بدلنے لگی تھی۔ لڑکی نے تر چادر اٹھائی، اور اور یلیانو سے اسے ایک طرف سے پکڑنے کو کہا، چادر کینوس کے ٹکڑے کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے اس کے سرے مروڑ کر اسے نچوڑا، یہاں تک کہ وہ اپنی اصل حالت پر واپس آ گئی۔ انہوں نے دری کو الٹایا اور دوسری طرف سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اور یلیانو فکر مند تھا، اس کی خواہش تھی کہ یہ کام کبھی ختم نہ ہو۔ وہ نظریاتی طور پر محبت کے عمل سے واقف تھا۔ لیکن اس کے گھٹنے جواب دے رہے تھے، اور گو کہ اس کی جلتی ہوئی کھال کا ایک ایک رواں کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی آنتوں کے بوجھ کو خارج کرنے کی فوری طلب کی مزاحمت نہ کر پا رہا تھا۔ جب لڑکی بستر درست کر چکی اور اس نے اور یلیانو سے کپڑے اتارنے کو کہا، اس نے ایک بوکھلائی ہوئی توجیہہ پیش کی: ''انہوں نے مجھے اندر بھیجا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بیس پیسو پھینکنے کو، اور جلدی کرنے کو کہا تھا۔'' لڑکی اس کی سراسیمگی کو سمجھ گئی۔ ''اگر تم جاتے وقت بیس پیسو اور ڈالتے جاؤ، تو تم کچھ دیر اور یہاں ٹھہر سکتے ہو۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ اور یلیانو نے کپڑے اتار دیے، شرم کی اذیت میں گرفتار وہ اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام رہا کہ اس کی برہنگی اس کے بھائی کے مقابلے کی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی کی کوششوں کے باوجود اس نے خود کو بے حد تنہا اور لاتعلق محسوس کیا۔ ''میں بیس پیسو اور ڈال دوں گا۔'' اس نے رونی آواز میں کہا۔ لڑکی نے خاموشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی پیٹھ ناپختہ تھی، اس کی کھال ہڈیوں سے منڈھی ہوئی تھی، اور وہ کوشش کر کے سانس کھینچتی تھی۔ کیوں کہ وہ ناقابل بیان حد تک نڈھال تھی۔ دو سال پہلے وہاں سے بہت دور، وہ شمع بجھائے بغیر سو گئی تھی، اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو شعلوں میں گھرا پایا تھا۔ وہ جہاں وہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی تھی۔ جس نے اسے پالا تھا، جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی دادی اسے قصبے قصبے لیے پھر رہی تھی۔ بیس بیس پیسو کے عوض اسے بستر پر لٹاتی، تاکہ جلے ہوئے گھر کی مالیت کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ لڑکی کے حساب کے مطابق اس کو دس سال مزید، ہر رات ستر مردوں کے ساتھ لیٹنا تھا، کیوں کہ اسے اپنے اور دادی کے سفر اور کھانے کا خرچ بھی اٹھانا تھا اور ان چار مقامیوں کی تنخواہ بھی دینی تھی جو کرسی اٹھا کر چلنے کے کام پر مامور تھے۔ جب رئیسہ نے دوسری دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تو اور یلیانو، بغیر کچھ کیے رونے کی شدید خواہش سے پریشان کمرے سے نکل آیا۔ اس رات وہ سو نہ سکا، آرزو اور رحم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔ اسے لڑکی سے محبت

کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کی ایک ناقابل رد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ صبح کے وقت بے خوابی اور بخار کی تھکن میں چور، اس نے خاموشی سے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرلے گا، تاکہ اس کو دادی کے چنگل سے آزاد کرا سکے، اور ان تمام راتوں کی لذتوں سے محظوظ ہو سکے جو وہ ستر مردوں کو بخشتی تھی۔ لیکن جب دس بجے صبح وہ کاتارینو کی دکان پر پہنچا تو لڑکی قصبہ چھوڑ کر جا چکی تھی۔

وقت نے رفتہ رفتہ اس دیوانگی کے خیال کو مندمل کر دیا، لیکن اس کا احساس محرومی بڑھتا گیا۔ اس نے کام میں پناہ لی۔ اس نے زندگی بھر بغیر عورت کے زندگی گزارنے کی قسمت پر رضا اختیار کر لی تاکہ اپنے بے کار وجود کی شرم چھپا سکے۔ اس دوران ملکیادیس دھات کے پتروں پر ماکوندو کی ان تمام چیزوں کے عکس اتار چکا تھا جو عکس اتارنے کے قابل تھیں۔ اور اس نے ڈگیروٹائپ کی تجربہ گاہ حوزے آرکادیو بوئندیا کے تخیلات کے لیے چھوڑ دی تھی، جس نے اسے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے استعمال میں لانے کی ٹھان لی تھی۔ گھر کے مختلف حصوں میں اتاری گئی تصویروں کو ایک دوسرے پر اتارنے کے پیچیدہ عمل سے اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ خدا کی تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو جائے گا، اگر اس کا وجود ہے، یا پھر ہمیشہ کے لیے خدا کے وجود کے مفروضے کا خاتمہ کر دے گا۔ ملکیادیس ناستراڈیمس کی پیش گوئیوں کی شرحوں کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ وہ رات دیر تک جاگتا، اپنی بوسیدہ، مخملی واسکٹ میں ملبوس، اپنے چھوٹے چھوٹے چڑیا جیسے ہاتھوں سے لکھتا رہتا، جن کی انگوٹھیوں سے پرانے دنوں کی چمک گم ہو چکی تھی۔ ایک رات اس نے سوچا کہ اس نے ماکوندو کے مستقبل کی پیش گوئی پا لی ہے۔ یہ ایک روشن شہر ہو گا، شیشے کے بڑے بڑے گھروں پر مشتمل، جہاں بوئندیا نسل کا نام و نشان تک باقی نہ ہو گا۔ "یہ غلط ہے" حوزے آرکادیو بوئندیا گرجا۔ "وہ شیشے کے نہیں بلکہ برف کے گھر ہوں گے، جیسا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا، اور یہاں ایک بوئندیا ہمیشہ رہے گا۔" ارسلا اس بے اعتدال گھر میں ہوش و حواس اور شعور کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہی، شکر کی ٹافیوں کے کاروبار کو ایک تنور کے ذریعے وسیع کر کے، جو تمام رات گرم رہتا، اور جس میں سے ٹوکریاں بھر ڈبل روٹیاں اور انوکھی انواع و اقسام کی پڈنگ اور بسکٹ نکلتے رہتے۔ جو چند گھنٹوں کے اندر اندر دلدلی خطے میں پیچ و خم کھاتی گلیوں میں بک جاتے۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ گئی تھی جب اسے آرام کرنے کا حق پہنچتا تھا، لیکن وہ مزید فعال ہو گئی تھی۔ وہ اپنے پھلتے پھولتے کاروبار میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ ایک دوپہر جب اس نے بے خیالی میں آنگن کی طرف نگاہ اٹھائی، جب مقامی انڈین عورت گندھے ہوئے

آنے میں شکر ملا رہی تھی، تو اس نے دو انجانی، خوبصورت، نو عمر لڑکیوں کو ڈوبتے سورج کی روشنی میں کشیدہ کاری کرتے پایا۔ وہ ریبکا اور امارانتا تھیں۔ جب سے انہوں نے ماتمی لباس اتارے تھے، جو وہ نانی کی موت کے بعد تین سال تک تن دہی سے پہنتی رہی تھیں۔ ان کے شوخ رنگا رنگ کپڑوں نے، لگتا تھا انہیں دنیا میں ایک خاص مقام دے دیا ہے۔ ریبکا، توقعات کے برخلاف، زیادہ خوب صورت نکلی تھی۔ اس کی رنگت گوری تھی، آنکھیں بڑی اور پرسکون اور جادوئی ہاتھ جو کشیدہ کاری کے نمونے لگتا تھا نظر نہ آنے والے دھاگوں سے کاڑھ رہے ہیں۔ امارانتا، جو اس سے چھوٹی تھی، نسبتاً کم پروقار تھی، لیکن اسے اپنی مرحوم نانی کا فطری امتیاز اور اندرونی استحکام حاصل تھا۔ آرکادیو، جو اگرچہ ابھی سے اپنے باپ کی سی جسمانی نشوونما کا مظہر تھا، ان کے سامنے بچہ سا نظر آتا تھا۔ وہ اور یلیانو سے چاندی کا کام سیکھنے میں جٹ گیا تھا۔ جس نے اسے پڑھنا لکھنا بھی سکھایا تھا۔

ارسلا نے اچانک محسوس کیا کہ گھر لوگوں سے بھر گیا ہے، اور اس کے بچے شادی کرنے اور اپنے بچے پیدا کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، اور ان کو جگہ کی کمی کے باعث تتر بتر ہونا پڑے گا۔ پھر اس نے وہ پیسے نکالے جو اس نے طویل برسوں میں کڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ اور اپنے کچھ گاہکوں کے ساتھ انتظامات کر کے گھر کو بڑا کرنے کے کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑا دیوان خانہ بنوایا۔ اور روزمرہ کے استعمال کے لیے ایک اور بیٹھک جو زیادہ آرام دہ اور ٹھنڈی تھی، ایک کھانے کا کمرہ، جس میں بارہ کرسیوں والی میز لگوائی تاکہ گھر کے تمام افراد اپنے مہمانوں سمیت اکٹھے بیٹھ سکیں، نو کمرے، جن کی کھڑکیاں آنگن میں کھلتی تھیں، اور ایک لمبی سی ڈیوڑھی جسے گلاب کے ایک باغ کے ذریعے دوپہر کی گرمی سے محفوظ کیا گیا تھا، باغ میں فرن اور بیگونیا کے گملے رکھنے کے لیے احاطہ لگایا گیا۔ ارسلا نے باورچی خانہ بڑا کروایا تاکہ اس میں دو تنور آ سکیں۔ وہ گودام جہاں پیلار ترنیرا نے حوزے آرکادیو کا مستقبل پڑھا تھا، توڑا گیا اور اس سے دگنا بڑا گودام تعمیر کرایا گیا، تاکہ گھر میں کھانے پینے کی اشیا کی کبھی قلت نہ ہو۔ اس نے آنگن میں شاہ بلوط کے درخت کی چھاؤں میں غسل خانے بنوائے، ایک عورتوں کے لیے، دوسرا مردوں کے لیے، اور گھر کے عقب میں ایک بڑا سا اصطبل، باڑھ لگا ہوا مرغی خانہ، بھینسوں کا باڑا، اور ایک چڑیا خانہ، جو چاروں سمت کی ہوا کے لیے کھلا تھا۔ تاکہ گزرتے ہوئے پرندے وہاں اپنی خوشی سے انڈے بچے دے سکیں۔ درجنوں مستریوں اور بڑھئیوں کو ساتھ لیے لیے گویا اسے اپنے شوہر کا سا ہذیانی بخار چڑھ گیا ہو، ارسلا روشنی اور دھوپ کے مقام طے کرتی اور حدود کی پروا کیے بغیر جگہ کی

تقسیم کرتی پھرتی۔ پرانی عمارت، جو بانیوں نے بنائی تھی اوزاروں اور سامان تعمیر اور پسینے میں شرابور، تھکے ہوئے مزدوروں سے بھر گئی، جو ہر ایک سے درخواست کرتے کہ براہ مہربانی ان کے کام میں مداخلت نہ کریں، اور ہڈیوں کی اس بوری سے پریشان رہتے جو ایک غمگین کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ان کا پیچھا کرتی۔ اس بے آرامی میں، چونے اور کولتار کے دھویں میں سانس لیتے ہوئے، کوئی درست طور پر نہ دیکھ سکتا تھا کہ زمین کے پیٹ سے یہ گھر کیوں کر ابھر رہا ہے، جو نہ صرف قصبے کا سب سے بڑا گھر تھا بلکہ سب سے زیادہ مہمان نواز اور ٹھنڈا گھر جو اس دلدلی خطے میں کبھی پایا گیا ہو۔

حوزے آرکادیو بوئندیا جو اس تمام ہنگامے کے دوران خدا کی قدرت کو حیرت میں ڈالنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ واحد شخص تھا جو اس بات کو بالکل نہ سمجھ پایا۔ نیا گھر تقریباً مکمل ہو چکا تھا جب ارسلا اسے اس کی خیالی دنیا سے کھینچ کر باہر لائی، یہ بتانے کے لیے کہ گھر کے باہر نیلا رنگ کرانے کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ وہ سفید رنگ کرانا چاہتی ہے۔ اس نے ایک سرکاری کاغذ نکال کر دکھایا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بغیر سمجھے کہ اس کی بیوی کیا کہہ رہی ہے، کاغذ میں کیے گئے دستخط کو پڑھا۔

"یہ کون شخص ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجسٹریٹ" ارسلا نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے بھیجا گیا بااختیار اہلکار ہے۔"

دون اپولینار موسکوتے، مجسٹریٹ، بے حد خاموشی کے ساتھ ماکوندو آیا تھا۔ وہ ہوٹل ہاکوب میں ٹھیرا، جو طوطوں کے عوض اشیاء دینے والے پہلے عربوں میں سے ایک نے بنایا تھا اور دوسرے دن اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے گھر سے دو بلاک دور ایک چھوٹا کمرہ کرائے پر لے لیا، جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا، اور اس نے ایک میز اور کرسی جو اس نے ہوٹل ہاکوب سے خریدی تھی، اس کمرے میں لگائی، کیل سے دیوار پر جمہوریہ کی مہر ٹھونک دی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اور دروازے کے باہر ایک تختی لگادی۔ "مجسٹریٹ" اس کا پہلا حکم یہ تھا کہ ملک کے یوم آزادی کا جشن منانے کے لیے تمام گھروں کو نیلا رنگ دیا جائے۔ حکم نامے کی نقل ہاتھ میں لیے، حوزے آرکادیو نے مجسٹریٹ کو ایک جھولنی میں قیلولہ کرتے پایا جو اس نے اپنے تنگ سے دفتر میں تان رکھی تھی، "کیا تم نے یہ لکھا ہے؟" اس نے مجسٹریٹ سے پوچھا۔ دون اپولینار موسکوتے نے جو ایک پختہ، شرمیلا، سرخی مائل رنگت والا شخص تھا، اثبات میں جواب دیا۔ "کس حق کے تحت؟" حوزے آرکادیو بوئندیا نے پھر

پوچھا۔ دون اپولینار موسکوتے نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ "مجھے اس قصبے کا مجسٹریٹ نامزد کیا گیا ہے۔" حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کی تقرری کے کاغذ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"اس قصبے میں ہم کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر حکم نہیں دیتے ہیں۔" وہ تحمل سے بولا۔ "اور تم یہ جان لو، اس وقت اور ہمیشہ کے لیے کہ ہمیں کسی جج کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر فیصلہ کرنا پڑے۔"

دون اپولینار موسکوتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، آواز اونچی کیے بغیر، حوزے آرکادیو بوئندیا نے تفصیل کے ساتھ ماکوندو بسانے کی روداد سنائی، کس طرح انہوں نے زمین تقسیم کی تھی، سڑکیں بنائی تھیں اور ضرورت کے تحت، بغیر حکومت کو تکلیف دیے اور بغیر کسی دخل اندازی کے اس کی بہتری کے کام کیے تھے۔ "ہم اتنے امن پسند ہیں کہ اب تک ہم میں سے کوئی طبعی موت بھی نہیں مرا ہے۔" کوئی اس بات سے پریشان نہ تھا کہ حکومت نے اب تک ان کی مدد نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ خوش تھے کہ اب تک حکومت نے ماکوندو کو سکون کے ساتھ پھلنے پھولنے دیا ہے، اور انہیں امید تھی کہ حکومت ان کو اسی طرح رہنے دے گی، کیوں کہ انہوں نے یہ قصبہ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ پہلا نیا نواب جو یہاں آئے وہ انہیں بتائے کہ کیا کرنا ہے۔ دون اپولینار موسکوتے، ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جنبشوں کا وقار کھوئے بغیر اپنی ڈینم کی جیکٹ پہن چکا تھا۔ جو اس کی پتلون کی طرح سفید تھی۔

"اس لیے اگر تم کسی بھی عام شہری کی طرح یہاں ٹھہرنا چاہو، تو تمہیں خوش آمدید کہا جائے گا۔" حوزے آرکادیو بوئندیا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم یہاں لوگوں کو اپنے گھر نیلے رنگنے پر مجبور کر کے بدامنی پھیلانے آئے ہو، تو تم اپنا کباڑ اٹھا کر اس جگہ واپس جا سکتے ہو جہاں سے تم آئے ہو۔ کیوں کہ میرا گھر فاختہ کی طرح سفید ہونے جا رہا ہے۔"

دون اپولینار موسکوتے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور جبڑے سکیڑ کر ایک خاص غضب کے ساتھ کہا:

"میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ میں مسلح ہوں۔"

حوزے آرکادیو بوئندیا کو پتہ نہ چلا کہ کس لمحے اس کے ہاتھوں میں وہ کارآمد قوت پھر لوٹ آئی جس سے وہ گھوڑوں کو کانوں سے پکڑ کر روک لیا کرتا تھا۔ اس نے دون اپولینار موسکوتے کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اپنی آنکھوں کی سطح تک اٹھا لیا۔

"میں یہ اس لیے کر رہا ہوں" اس نے کہا "کیوں کہ میں تمہیں زندہ اٹھائے پھرنا

چاہتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ تمہیں زندگی بھر کے لیے مردہ اٹھائے پھروں۔"

اور وہ اسی طرح دون اپولینار موسکوتے کو کالر سے اٹھائے سڑک کے وسط میں چلتا گیا، یہاں تک کہ دلدلی سڑک پر اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ایک ہفتے بعد وہ چھ عدد ننگے پاؤں، پھٹی وردیوں میں ملبوس، اور بندوقوں سے مسلح سپاہیوں، اور ایک بیل گاڑی کے ساتھ، جس میں اس کی بیوی اور سات بیٹیاں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھیں، واپس آیا۔ دو اور بیل گاڑیاں بعد میں فرنیچر، گھر کا سامان اور برتن لیے پہنچیں۔ اس نے اپنے خاندان کو گھر تلاش کرنے کے دوران ہوٹل ہاکوب میں ٹھہرایا، اور خود سپاہیوں کے پہرے میں اپنا دفتر کھولنے چل دیا۔ ماکوندو کے بانی، جنہوں نے حملہ آوروں کو قصبے سے نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا، اپنے اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ حوزے آرکادیو بوئندیا کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن وہ اس کے خلاف تھا، جیسا کہ اس نے وضاحت کی، کیوں کہ کسی کو اس کے بیوی بچوں کے سامنے پریشان کرنا مردانگی نہیں ہے۔ اور دون اپولینار موسکوتے بیوی بچوں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو خوشگوار طریقے سے حل کیا جائے۔

اوریلیانو اس کے ساتھ گیا۔ ان دنوں اس نے سیاہ مونچھیں رکھنا شروع کر دی تھیں، جن کی نوکوں پر تیل چپڑا ہوتا، اور اس کی آواز کچھ کچھ بلند ہو چلی تھی۔ وہی خصوصیات جو آئندہ جنگ میں اس کو ممیز کرنے والی تھیں۔ مسلح محافظوں کی پروا کیے بغیر، نہتے وہ مجسٹریٹ کے دفتر میں پہنچے۔ دون اپولینار موسکوتے نے اپنا تحمل برقرار رکھا۔ اس نے اپنی دو بیٹیوں کا جو اس وقت وہاں موجود تھیں، تعارف کرایا: امپارو، سولہ سالہ، اپنی ماں کی طرح سانولی، اور ریمیدیوس، صرف نو سال کی، ایک خوبصورت چھوٹی سی بچی، جس کی جلد گل سوسن کی طرح سفید اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ دونوں پروقار اور شائستہ تھیں۔ جیسے ہی مرد داخل ہوئے ان سے متعارف کرائے جانے سے پیشتر ہی، لڑکیوں نے ان کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔ لیکن وہ دونوں کھڑے رہے۔

"بہت خوب، میرے دوست۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا۔ "تم اگر چاہو تو یہاں ٹھہر سکتے ہو، اس لیے نہیں کہ تم نے دروازے پر مسلح ڈاکوؤں کو بٹھا رکھا ہے۔ بلکہ تمہاری بیوی اور بچوں کے احترام میں۔"

دون اپولینار موسکوتے پریشان ہو گیا۔ لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے جواب دینے کی مہلت نہ دی۔ "ہماری صرف دو شرائط ہیں۔" اس نے بات جاری رکھی، "اول: جو جس رنگ میں اپنا گھر رنگنا چاہے، رنگ سکتا ہے۔ دوم: سپاہی فوراً یہاں سے واپس چلے جائیں۔

ہم امن واماں اور نظم وضبط کی ضمانت دیتے ہیں۔" مجسٹریٹ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"تم اپنی زبان دیتے ہو؟"

"تمہارے دشمن کی زبان،" حوزے آرکا دیو بوئندیا نے کہا۔ اور تلخ لہجے میں وضاحت کی: "کیوں کہ میں ایک بات تم پر واضح کردوں: تم اور میں اب تک دشمن ہیں۔"

سپاہی اسی سہ پہر واپس چلے گئے۔ چند دنوں بعد حوزے آرکا دیو بوئندیا نے مجسٹریٹ کے خاندان کے لیے ایک گھر تلاش کر دیا۔ سوائے اورِیلیانو کے سب سکون سے ہوگئے۔ ریمیدیوس، مجسٹریٹ کی چھوٹی بیٹی، جو اپنی عمر کے لحاظ سے خود اس کی بیٹی ہو سکتی تھی، اس کے جسم کے کسی حصے میں درد جگاتی رہی۔ وہ ایک جسمانی ہیجان تھا جو اس کے چلنے میں اس طرح تنگ کیا کرتا جیسا کہ جوتے کا کنکر۔ ○○

# تنہائی کے سو سال

ترجمہ: اجمل کمال

لاطینی امریکی ادب اس براعظم کی فتح (THE CONQUEST) سے پیشتر بھی موجود تھا، اگرچہ وہ لاطینی نہیں تھا اور نہ خود کو امریکی کا نام دیتا تھا۔ لیکن اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ہے کہ وہ بار بار بے حد قریبی زمانے کا معلوم ہوتا ہے، گویا اسے ابھی دریافت کیا گیا ہو، اور یہ احساس صرف باہر والوں تک محدود نہیں۔ اس ادب کی تاریخ میں ہر طرح کے خلا موجود ہیں، اور اندھیرے کے اور بہاؤ رک جانے کے وقفے۔ اور چیلے کے ادیب جوزے دونوسو (JOSE DONOSO) کا کہنا ہے کہ معاصر لاطینی امریکی فکشن کا موجودہ عروج، جسے BOOM کا نام دیا جاتا ہے اور جو واضح اور قابل لحاظ نئی تحریروں کی صورت میں کوئی بیس سال قبل نمودار ہوا، ایسے ادیبوں کی پیداوار ہے جن کے دادا تو تھے لیکن باپ نہیں تھے۔ ان کی ادبی روایت میں ان سے فوراً پہلے کوئی مثال، یا کسی متعین راہ کا سراغ نہیں ملتا، لیکن اس کمی نے، ایک بار اس کا مکمل ادراک ہو جانے کے بعد ایک نہایت قابل دید موقعے کی صورت اختیار کرلی۔

اس عروج کے واسطے ہسپانوی زبان میں بھی انگریزی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس سے اس پورے معاملے پر ایک ہلکی سی بدیسی خوشبو چھا جاتی ہے، اور ایک نقارے کی سی گونج: El, BOOM-لاطینی امریکی فکشن کی یہ فراوانی نہایت گرما گرم بحثوں کا موضوع رہی ہے: اسے ذرائع ابلاغ کی ایجاد، اور فرانسیسی اور امریکی ناشروں کے ذہن کی پیداوار کے طور پر دیکھا گیا ہے، ایک طرح کے ادبی مافیا کے ارکان کی ایک دوسرے کی تحریروں کو بڑھاوا دینے کی سازش کے طور پر دیکھا گیا ہے، اور اسے ایک تابناک نئے جنم، بلکہ پہلے جنم، اس ادب کی آزاد زندگی میں پہلی بار آمد کے طور پر بھی دیکھا گیا ہے۔ "بوم" کی اصطلاح کو بازاری، نامناسب اور فن کے لیے توہین آمیز خیال کیا گیا ہے، اس کے باوجود، اگر ہم اسے زیادہ سنجیدگی سے نہ لیں، تو یہ اس مظہر کو بیان کرنے کے لیے مجھے نہایت موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اس سے نئے ادیبوں کی دریافت کے نوآموز جوش و خروش کا پتا چلتا ہے، اور بڑے

کار آمد طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ گویا ان ادیبوں نے تخیل کی سرزمین میں تیل کے ذخیرے دریافت کر لیے، اور مالا مال ہو گئے۔ "بوم" کی اس سرزمین کا سب سے دیرپا نشان راہ "تنہائی کے سو سال" ہے۔

لاطینی امریکی ادب کے اس عروج کے ساتھ بار بار وابستہ ہونے والے ناموں میں جولیو کورتازار (JULIO CORTAZAR)، کارلوس فونتیس (CARLOS FUENTES)، گلیئر موکابریرا انفانتے (GUILLERMO CABRERA INFANTE)، گابریئل گارسیا مارکیز اور ماریو برگس یوسا (MARIO VARGAS LIOSA) کے نام شامل ہیں، اگرچہ بہت سے دوسرے ادیبوں کے نام بھی اس تذکرے میں آتے جاتے رہتے ہیں، ان ناموں کی قومیتیں بھی ایک دلچسپ کہانی سناتی ہیں: ایک ارجنٹینین، ایک میکسیکن، ایک کیوبن، ایک کولومبین اور ایک پرودئین۔ پورے براعظموں پر محیط ادبی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اور لاطینی امریکی ادب کی تحریک میں نئی وفاداریوں کا واضح احساس موجود ہے: یہ اپنے اپنے ملک سے نہیں، بلکہ لاطینی امریکہ سے، ہسپانوی زبان سے، جدید ادب سے، اور فکشن اور دنیا کے درمیان تعلق کے مخصوص نظریات سے وفاداری ہے۔ اگر ہم (جوزے دونوسو کی بات میں) اتنا اضافہ کر سکیں کہ بن باپ کے ان ادیبوں کے ممتاز اور مقبول بدیسی چچا موجود تھے۔ جوئس، کافکا، ہیمنگ وے، فاکنر۔ اور انہوں نے لگتا ہے اپنی پوری زندگی سنیما دیکھنے میں گزاری ہے، تو ایک تصویر سی بننے لگتی ہے۔ ہمیں ان کے مقامی چچاؤں، مثلاً بورجیس (BORGES)، کارپنٹیئر (CARPENTIER) اور اونیتی (ONETTI) کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا ہے، حالانکہ یہ موقف اختیار کرنے کے لیے، کہ یہ باپ نہیں بلکہ چچا تھے، ادبی تاریخ کے ایک مکمل نظریے کی ضرورت پڑے گی، کہ یہ نئے ادیبوں کے لیے مواقع کی نشان دہی تو کرتے ہیں لیکن حسب و نسب کا سلسلہ ان سے قائم نہیں ہوتا۔

یہ "بوم" اتنا بڑا نہیں تھا کہ اسے نشاۃ الثانیہ کا نام دیا جا سکے، اور یہ ایک تحریک بھی نہیں تھا، اگر تحریک سے مراد ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل پر مبنی ایک ادبی دبستان ہو۔ لیکن لاطینی امریکہ میں اس کے نمودار ہونے کی معنویت کسی تہذیبی ابال یا عجیب الخلقت حادثے سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ اپنا شعور رکھنے والی جدت پسندی کا خود پر اصرار تھا، اس سے علاقائیت اور عذر خواہی کا خاتمہ ہوا اور اسے، ایک اور تعریف کی رو سے، بالکل درست طور پر ایک تحریک کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ مخصوص قوتوں کے ایک مخصوص وقت پر مجتمع ہو جانے کا مظہر تھا۔ یہ مخصوص وقت ۱۹۶۰ء کی دہائی کا تھا۔ (اس "بوم" کے دور سے تعلق رکھنے والا

آخری ناول شاید دونوسو کا THE OBSCENE BIRD OF NIGHT تھا جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا) اور یہ مخصوص قوتیں بنیادی طور پر ادبی بے صبری اور سیاسی ناامیدی کی قوتیں تھیں۔
بے صبری کا وجود واضح ہے۔ ان ادیبوں پر بدیسی اثرات، محبوب فلموں کے پر تخیل اور جذباتی عناصر، بورخیس، کارپنتیئر اور اونیتی کی عجیب و غریب اور ذہن پر چھا جانے والی انگیخت، ان سب نے مل کر قصہ گوئی کی ان تکنیکوں کے لیے سرمایہ فراہم کیا جو آزمائے جانے کے انتظار میں تھیں، طنز اور الفت کا ایک آمیزہ ایجاد کیا، منصوبہ بند حقیقت پسندی کے بارے میں۔ فکشن میں اور اس سے باہر کی دنیا دونوں میں -- گہرے شکوک پیدا کیے۔
کارپنتیئر نے لاطینی امریکی حقیقت کے عجائبات کا تذکرہ کیا، جو فریضے کے طور پر اختیار کردہ حقیقت پسندی میں لازمی طور پر غیر موجود ہوتے ہیں، اور مقبول عام تنقیدی اصطلاح ''جادوئی حقیقت نگاری'' جو اگرچہ ابہام سے بھرپور ہے، لیکن اس کے باوجود ادبی تناظر میں ایک تغیر کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس مقام تک آکر ہمارا سامنا قابل لحاظ فلسفیانہ اور تاریخی پیچیدگیوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے شاید اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ''بوم'' سے تعلق رکھنے والے ادیبوں پر گویا پہلی بار اور اچانک، یہ انکشاف ہوا کہ دنیا ایک ساختہ شے اور ہذیانی ناممکنات سے بھرپور ہونے کے باوجود ایک حقیقی وجود رکھتی ہے، اور یہ کہ تخیل تقریباً ہمیشہ درست ثابت ہوتا ہے، چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جو چیز آپ کے محض تخیل میں آئی ہے کوئی نہ کوئی شخص پہلے ہی اسے سرانجام دے چکا ہے، یا یہ کہ آپ کے تخیل نے کسی شخص کی ضرورت کے مطابق ایک موزوں استعارہ وضع کرلیا ہے، اور یہ کہ ان حالات میں فکشن کھیل کا میدان بھی ہے اور جنگ کا میدان بھی، یہی وہ مخصوص جگہ ہے جہاں کلچر کے بنیادی جھگڑے چکائے جاسکتے ہیں، اور چکائے جاتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔
ایک اعتبار سے یہ فراواں اور کچھ کچھ مضطرب بے صبری خاصی پرانی ہے۔ وقفوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، اور کئی پشت پیچھے جاکر، ہم ایک غیر متواتر ہسپانوی امریکی روایت کی تشکیل کرسکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ طریقہ پیچھے لوٹ کر اس روایت کے ٹکڑے جوڑنے کا عمل ہے، لیکن روایت کی شکل متعین کرنے کا مروج طریقہ اور کون سا ہے؟ مثلاً بیرک (BAROQUE)، یوروپ میں زوال کو پہنچ جانے کے بہت بعد تک لاطینی امریکہ میں پھلتا پھولتا رہا، اور یہ عجیب حقیقت ''بوم'' کو تحریروں کے بعض مخصوص نقوش کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے۔ ''بوم'' دوسری قسم کے ناول کے پھلنے پھولنے کا موقع ثابت ہوا: وہ ناول جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے، یہاں تک کہ وا ہمے اور خواب میں دیکھی ہوئی چیزوں کو بھی،

یہ بیروک کا ایک جدید روپ ہے۔

اس تحریک کے ابتدائی خدوخال ہمیں بورخیس کے ہاں نظر آتے ہیں، جہاں حقیقت کی ایماندارانہ نقل کی بجائے اس کی منقلب شدہ صورت کا رواج ہے۔ یہ بات کہ فکشن کا یہ ادراک اب خاصا مانوس لگتا ہے، بلکہ "بوم" کے لیے اس کی حیثیت ایک روزمرہ کے معمول کی سی ہے، بورخیس کے اثرات کی ہمہ گیری کی شاہد ہے۔

اوکتاویو پاز (OCTAVIO PAZ) کا کہنا ہے کہ تاریخی اعتبار سے لاطینی امریکہ یوروپ کی ایجاد ہے، "یوروپی یوٹوپیاؤں کی تاریخ کا ایک باب" اور یہ بات "غیر حقیقی" ہونے کے ایک آزار کن اور عجیب و غریب احساس کا مآخذ ہو سکتی ہے: یہ نہ تو جدید یوروپیوں کا مابعد الطبیعیاتی یا EPISTEMOLOGICAL کرب ہے، نہ شمالی امریکیوں کی، تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی اور جغرافیائی منظر سے پیدا ہونے والی، ناراحتی ہے، بلکہ یہ تو کسی اداکار کی اس تھکن اور اکتاہٹ کی طرح کا احساس ہے، جو ایک طویل عرصے تک جاری رہنے والے ناٹک سے پیدا ہوئی ہے، جس کے بارے میں وہ ایک قدیم اور دلی بے یقینی کا شکار ہے، یہ احساس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت ہرگز نہیں ہو سکتی، یہ تو کسی اور کا دیکھا ہوا خواب ہے۔ یہ "کوئی اور" مختلف زمانوں میں بلاشبہ مختلف روپ اور VANTAGE-POINTS اختیار کرتا رہا ہے، اور آزادی کے بعد کے لاطینی امریکی اور طرح کے خوابوں میں مقیم ہیں۔ لیکن غیر حقیقی پن کا وہ احساس اب بھی برقرار ہے۔

دوسرے الفاظ میں غیر حقیقی پن کا احساس مقامی حقیقت کا ایک حصہ ہے، جس کا بہترین بیان بیروک کی مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ اسی ادراک کی پر جوش اور اکثر حیرت خیز تفہیم کے اظہار کی بے تابی ہی وہ مظہر ہے جسے میں ادبی بے صبری کا نام دیتا ہوں۔

سیاسی ناامیدی کا تخمینہ لگانا البتہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ ایک زمانہ تھا جب "بوم" کو ۱۹۵۹ء کے کیوبن انقلاب کا ادبی بازوخیال کیا جاتا تھا، اور یہ ایک ایسا خیال تھا جس میں اگر ایک کچی پکی فہم کے بیج نہ ہوتے تو اسے قطعی مہمل قرار دیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام ادیب بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور کیوبن انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اس کے ہمدرد تھے۔ ان میں سے بعض نے۔۔ مثلاً گارسیا مارکیز نے، اور ۱۹۸۴ء میں وفات پانے تک کورتازار نے۔۔ ہمدردی، یا بلکہ ہمدردی سے زیادہ کا رویہ جاری رکھا، اور بعض نے اس سے محتاط فاصلہ اختیار کر لیا یا اس سے خود کو بالکل علیحدہ کر لیا، مثلاً کابریرا انفانتے نے، جو اب ایک برطانوی شہری کی حیثیت سے لندن میں مقیم ہے۔ لیکن یہ سب دراصل غیر اہم معمولی واقعات ہیں اور

در حقیقت اس کچی پکی فہم کا تعلق تمام لاطینی امریکیوں کے لیے کیوبن انقلاب کی نا قابل فرار حیثیت سے ہے، خواہ اس کے بارے میں ان کا رویہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ادب اس انقلاب کا حاشیہ بردار نہیں تھا، لیکن اس کا مسکن کوئی اور دنیا تو نہیں تھی۔

اس انقلاب کی اہمیت نہ صرف ادب کے لیے بلکہ تقریباً ہر چیز کے لیے مسلم ہے، لیکن اس اہمیت کا واضح طور پر تخمینہ لگانا ناممکن ہے۔ میں صرف ایک اندازہ لگانا چاہتا ہوں، جو میرے خیال کے مطابق گارسیا مارکیز کے معاملے میں، اور مارکیز کے بارے میں میرے احساس کے حوالے سے، تو خصوصاً برمحل ہے ہی، لیکن دوسرے ادیبوں کے سلسلے میں بھی اس میں کوئی کام کی بات ہو سکتی ہے۔ میں سیاسی ناامیدی کا ذکر کر رہا ہوں، اور کیوبن انقلاب نے اس احساس کو زائل بھی کیا اور اس میں پیچیدگی بھی پیدا کی۔ اس نے اس تصور کو تبدیل کیا کہ لاطینی امریکیوں کے لیے کیا کچھ ممکن ہے، اس نے ثابت کیا کہ جو چیز نا قابل تغیر دکھائی دیتی ہے اسے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے، اور عزم کے سہارے، ہر قسم کی حیران کن رکاوٹوں کو عبور کر کے کوئی بھی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انقلابات اپنے ابتدائی دنوں میں اسی طرح کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس انقلاب کے اثرات ایک چھوٹے سے جزیرے تک محدود رہے اور بقیہ برصغیر کی حالت پہلے کی طرح رہی، بلکہ پہلے سے روز بروز بدتر ہوتی گئی۔ انقلاب کی قائم کردہ مثال مستند تھی، لیکن اس کے اثرات کہاں تک پہنچ سکتے تھے؟ ان حالات میں ناامیدی تقدیر نہیں بلکہ انتخاب کا معاملہ بن گئی۔ اسے ترک کیا جا سکتا تھا اور بہت سوں نے کیا بھی۔ لیکن یہ ناامیدی کسی شخص کا اعتقاد متزلزل ہونے پر دوبارہ منتظر ملتی تھی، اور اکثر اوقات حقائق اسی کی تائید کرتے تھے۔

''بوم'' کے زمانے کا زیادہ تر فکشن اسی ناامیدی سے باوقار انداز میں انکار کیے جانے، لیکن اس کے پھر بھی منڈلاتے رہنے کی پیداوار ہے۔ یہ ادبی فراوانی، بیانیہ تکنیکوں کا یہ بلند ہمت مظاہرہ ایک آزادی کی خواہش کا جشن منانے کے لیے ہے، جو اخلاقی بھی ہے، سیاسی بھی اور فنکارانہ بھی، لیکن ایک سوگوار حس مزاح، الم اور باوقار شکست سے مانوس ذہنی کیفیت لاشیں شمار کرتی ہے، ایذاؤں، بظاہر لافانی حکمرانوں، فرقہ وارانہ جھڑپوں، اور آگے کے طویل راستے کا حساب کرتی ہے۔ گرامشی کے قول ''عقل کی قنوطیت، عزم کی رجائیت'' کی طرح، اس کیفیت کو ذہن اور دل کی رجائیت، لیکن جسم اور ہڈیوں کی قنوطیت، ایک غیر حقیقی اور مطلق العنان تاریخ کے نا قابل برداشت بوجھ کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

وہ ادیب خود شاید اس تجزیے سے اتفاق نہیں کریں گے اور غالباً ممکنات کے زیادہ

مثبت خیال کے حق میں بحث کریں گے، اور میں ان کو درست سمجھنا چاہوں گا۔ لیکن ان کی تصور کردہ دنیاؤں کا استناد ان کے خلاف شہادت دیتا ہے۔ ان کے حق میں جو بہترین بات کہی جا سکتی ہے۔۔ مگر یہ بہت بڑی بات ہے، اور ان کی تحریروں کی طاقت کے بنیادی سرچشمے کی نشاندہی کرتی ہے۔۔ وہ یہ ہے کہ وہ ناامیدی کو ایک شدید آزمائش میں ڈالتے ہیں، جو ان سے پہلے کسی نے شعوری اور حقیقت پسندانہ انداز میں کبھی نہیں کیا۔ یہ ادیب ناامیدی کے وجود سے انکار نہیں کرتے، نہ اس سے بغل گیر ہوتے ہیں، یہ تو اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ "تنہائی کے سو سال" میں ناامیدی کو پاش پاش کر دیا گیا ہے، اسے ایک واہمے، تقدیر کے ایک فریب نظر کی شکل دے دی گئی ہے۔ لیکن یہ ایک پرکشش واہمہ ہے، جبکہ پاش پاش کرنے کا عمل رازدارانہ ہے، جو آسانی سے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کو اس کتاب نے اور اس کے نام نہاد قنوطی اور معدومیت پسند انداز نے ہمیشہ الجھن میں ڈالا ہے۔ یہ انداز تو ذاتی اور تاریخی اسباب کی پیداوار ہے جسے ہر صورت میں موجود ہونا ہی تھا، لیکن جس توانائی سے کتاب میں اس کی مزاحمت کی گئی ہے، حتی کہ وہ مزاح اور تمسخر جس کے ذریعے سے اسے بیان کیا گیا ہے، بلاشبہ بڑی حد تک ناامیدی کے اس احساس کی پیچیدگی کا مرہون منت ہے جو کیوبا کی مثال سے پیدا ہوا ہے۔

لیکن اس نقطہ نظر میں معاصر لاطینی امریکی ادیبوں کی قومی شناخت کو نظر انداز کر کے ان پر ایک پین امیریکن ازم لاد دینے کا خدشہ موجود ہے۔ لاطینی امریکہ کے لوگ متوازی تاریخ اور مشترکہ امیدیں اور مشترکہ آسیب رکھتے ہیں، لیکن ان کی، درجہ بہ درجہ مختلف، مقامی تاریخیں بھی ہیں۔ "تنہائی کے سو سال" اس اعتبار سے "بوم" کے زمانے کی تحریروں کا مکمل طور پر نمائندہ ہے۔ یہ اختلافات کو حذف کر کے وقت اور سیاست، موسم اور تہذیب کے ایک مشترکہ لاطینی امریکی تجربے تک رسائی پانے کی کوشش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ اس تاثر کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوا ہے، لیکن اختلاف کو نہیں بلکہ صرف ناموں کو حذف کر کے۔ یہ تعمیم یا تجرید سے کام نہیں لیتا، یہ مسلمہ کولمبیئن حقیقتوں کو اٹھاتا ہے اور ان پر سے لیبل ہٹا دیتا ہے۔ اس سے ان حقیقتوں کے کولمبیئن ہونے میں کوئی کسر نہیں آتی، مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ صرف کولمبیئن نہیں رہ جاتیں۔

کولمبیا جمہوریت کی ایک طویل روایت رکھتا ہے، لیکن یہ اونچے طبقوں کی جمہوریت

ہے، جو در حقیقت امرا کے چند حریف گروہوں کے درمیان مسابقت سے زیادہ کچھ نہیں۔
لبرل اور کنزرویٹو جو پوری انیسوی صدی، اور بیسویں صدی کے بیشتر حصے کی سیاست پر چھائے رہے، قطعی مختلف اصولوں کے علم بردار تھے: اصلاح یا رجعت پسندی، آزادی تجارت یا تحفظات، کلیسا اور ریاست کی علیحدگی یا یکجائی۔ لیکن ان دونوں گروہوں کی یکسانیت کو "تنہائی کے سو سال" میں مبالغہ آمیز تمسخر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم یہ دونوں پارٹیاں طبقاتی مفادات کے ایک تنگ دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی دو متضاد تناظروں کی نمائندگی کرتی تھیں، اور انہوں نے مقامی طور پر شدید وفاداریوں اور نفرتوں کو جنم دیا جنہیں یہاں تک کہ لوگوں کے مفادات کے برخلاف بھی، سختی سے برقرار رکھا گیا، جس کے اثر سے لوگ خود کو ڈیموکریٹ اور ری پبلکن کی بجائے ("رومیو اینڈ جولیٹ" کے حریف خاندان) کپولیٹ اور مونٹیگو خیال کرنے لگے۔ ناول میں خانے دار ڈرافٹ کے کھیل سے متعلق ایک گفتگو میں اس سیاسی کیفیت پر ایک تیز اور پر مزاح تبصرہ کیا گیا ہے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا پادری کے ساتھ ڈرافٹ کھیلنے پر تیار نہیں، کیوں کہ وہ ایسے کسی مقابلے میں حصہ لینے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکتا جس میں حریفوں کے درمیان اصولوں پر اتفاق رائے ہو چکا ہو۔ پادری، جس نے ڈرافٹ کے کھیل کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا، کھیل جاری نہیں رکھ پاتا۔ یہ ایک دھیما اور معمولی سا تبصرہ ہے، لیکن اس کی وسعت قابل لحاظ ہے۔ اس سے یہ تاثر بھی مل سکتا ہے کہ حوزے آرکادیو بوئندیا، جسے فاترالعقل سمجھا جاتا ہے، ڈرافٹ کے کھیل کو نہیں سمجھ سکتا۔ کیوں کہ وہ جنگ یا سیاست، یا جنیوا کنونشن، کو سمجھنے کے قابل نہیں: یہ ایک انتشار زدہ اور للکارنے والی تنہائی ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ دنیا کے زیادہ تر تنازعات کا تعلق اصولوں کے سوا ہر چیز سے ہوتا ہے۔ اصولوں پر یا تو اتفاق رائے ہو چکا ہوتا ہے، یا پھر وہ قطعی غیر متعلق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس وقت جب کرنل اوریلیانو بوئندیا پر انکشاف ہوتا ہے کہ لبرل اور کنزرویٹو دونوں کی جنگ کا مقصد صرف اقتدار کا حصول ہے، اور وہ اس مقصد کے لیے اصولوں کے بنیادی نکات کو قربان کرنے پر تیار ہیں۔

کولو مبیا کی بیشتر تاریخ دبے پاؤں "تنہائی کے سو سال" میں در آتی ہے: انیسوی صدی میں اصلاحات پر بحثیں، ریلوے کی آمد، ہزار روزہ جنگ، امیریکن فروٹ کمپنی، سنیما، موٹر کاریں، ہڑتالی کھیت مزدوروں کا قتل عام، جو مارکیز کی پیدائش کے برس ہوا تھا۔ کولوبیا کی تاریخ سے ناول کے واقعات کی ان مطابقتوں نے کئی نقادوں کو یہ خیال کرنے پر آمادہ کیا ہے کہ مارکیز قطعی مخصوص طور پر ایک کولمبین ادیب ہے جو اپنے کرداروں کی تمام تر تاریخ پر

حاوی ہے، جب کہ اس کے بہت سے ہم وطن اس سے محروم ہیں۔
لیکن کولمبیا کی جدید تاریخ کی سب سے تعجب خیز حقیقت کا، یعنی تشدد کی اس لہر کا جسے صرف "دی وائلنس" (LA VIOLENCIA) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، "تنہائی کے سو سال" میں کہیں ذکر نہیں۔ یہ لہر گریلوں، غنڈوں، خود مدافعتی گروپوں، پولیس اور فوج کی پیدا کردہ تھی اور اس میں تقریباً دو لاکھ افراد مارے گئے تھے (جو اس کا کم سے کم تخمینہ ہے) انیس سو باسٹھ میں جب دعوی کیا گیا کہ اس کا خاتمہ ہو گیا ہے یا کم و بیش اس پر قابو پالیا گیا ہے، تب بھی ہر ماہ دو سو افراد اس کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ تشدد کی یہ لہر کولمبیا کے لوگوں کے لیے ناقابل فرار حقیقت ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر اس سے متاثر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، بالکل اسی طرح جیسے عموماً لاطینی امریکی باشندوں کے لیے کیوبن انقلاب ایک ناقابل گریز حقیقت رکھتا تھا۔ تشدد کی اس لہر نے فکشن کے ایک سیلاب کو جنم دیا، اور خود مارکیز کی تحریروں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "منحوس وقت" میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ گو کہ وہ اس کا ذکر نہایت ڈھکے چھپے انداز میں کرتا ہے، اور تاریخ کی بربریت کے ہاتھوں بے سکون محسوس ہوتا ہے، میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس کے ہاتھوں، ہم سب کی طرح، مضطرب ہے، بلکہ یہ کہ اسے تشویش ہے کہ کہیں اس کا فن اس کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ اس بات کے کئی پہلو ہیں۔ گارسیا مارکیز کا اسلوب تیز رفتار اور سرسری ہے، اور اسے خمار بیانیے میں کمال حاصل ہے۔ اس کی تحریروں میں ولن کے کردار تقریباً ناپید ہیں، کوئی صورتحال ایسی نہیں جو پیچیدگی میں انتہا کو پہنچی ہوئی نہ ہو۔۔ اس کے بیانیہ اسلوب کی سادگی ایک ظاہری پردہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے چارلی چپلن کا بے ڈھنگا پن۔۔ اور اس کے پاس ہولناکیوں کے بیان کے لیے مزاح اور طنز کی زبان کے سوا اور کوئی لغت نہیں۔ سب سے بڑھ کر اس کی نظر اس پر مرکوز ہے کہ لوگ، اپنے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ، کس طرح رہتے ہیں، اور اپنی دنیا کو کس طرح دیکھتے ہیں، اور اگر یہ ارد گرد کی دنیا تشدد کی اس لہر کی دنیا ہے تو بلاشبہ اسے بھی اسی سرسری عامیانہ انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی دنیا میں اسی طرح رہنا ممکن ہے۔ ہولناکی ان تحریروں میں اسی عامیانہ انداز کے باعث در آتی ہے جس سے کرفیو اور لاشوں اور غیر فرو شدہ نفرتوں کا ذکر کیا گیا ہے: گویا یہ سب کچھ روزمرہ کا معمول ہے۔
یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ "تنہائی کے سو سال" میں تشدد کی یہ لہر ہڑتالی مزدوروں کے قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ جو بجائے خود بے حد پر تشدد ہے اور بعد کے آنے والے واقعات کا خلاصہ اور ان کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ

خورخیا یلیسیر گیتان (JORGE ELIECER GRITAN) نے، جس کے قتل سے تشدد کی اس لہر کا آغاز ہوا تھا، سیاسی شہرت ۱۹۲۸ء کی اس ہڑتال کی تحقیقات ہی کے باعث حاصل کی تھی۔ گویا ان دونوں واقعات میں ایک طرح کا تعلق موجود ہے۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ ناول کے اختتام پر آنے والی وہ آندھی جس میں ماکوندو کا قصبہ نیست و نابود ہو جاتا ہے، درحقیقت تشدد کی اس لہر ہی کا "پردہ پوش استعارہ" ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو آندھی اور نہ قتل عام، تشدد کی اس لہر سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ یہ دونوں واقعات ظالمانہ لیکن ابہام سے پاک ہیں، خوفناک لیکن اسرار سے عاری ہیں: یہ ہلاکت خیز اور موثر ہیں، جبکہ تشدد کی لہر بے حد منتشر، سیاسی طور پر مبہم، اور ایک ٹوٹا اور بکھرا ہوا المیہ ہے: یہ کسی تعریف یا تخمینے، حدود یا معنویت کو روا نہیں رکھتی۔ اس کا احساس بے قابو ہو جانے والی جھڑپوں کے بے حد وسیع پھیلاؤ کا سا ہے۔ اور میرے خیال میں اس تشدد کی بے معنویت ہی ہے جو "تنہائی کے سو سال" پر مسلط ہے۔ یعنی یہ سبق نہیں کہ تاریخ سفاک ہوتی ہے، بلکہ یہ کہ تاریخ بے قابو اور وحشی بھی ہو سکتی ہے، اور یہ کہ محض انتشار بھی ممکن ہے، اور یہ کہ جب یہ ہماری سمجھ سے باہر ہو تو ہمیں اس کو سمجھنے کی اداکاری نہیں کرنی چاہیے۔

مورخوں نے بلاشبہ تشدد کی اس لہر کے اسباب کی بابت نہایت دلچسپ قیاس آرائیاں کی ہیں۔ ظاہر ہے یہ اسباب معاشی، سیاسی اور دیگر محرکات کا مرکب تھے، لیکن اگر ہم مورخ نہیں ہیں تو ان تمام محرکات پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں جیسے شمالی آئرلینڈ کی صورتحال، یا فٹ بال میچوں میں تشدد کے واقعات پر۔ ہم بعض محرکات کو قبول کر لیتے ہیں، بعض کو غیر اہم قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، اور بعض دوسرے محرکات کو متعلق قرار دے لیتے ہیں، بغیر یہ جانے کہ ان سب کی مل کر کیا صورت بنے گی۔ لیکن ان سب کو ملا کر بھی صورتحال کی وضاحت نہیں ہو پاتی، اور ایک ناقابل فہم مریضانہ کیفیت کا تاثر زائل نہیں ہوتا۔ تشدد کوئی غیر انسانی یا آسیبی شے نہیں ہے، نہ یہ کہیں اور سے بھیجی گئی کوئی وبا ہے، بلکہ یہ خود ہمارا مسخ شدہ چہرہ ہے، لیکن یہ چہرہ عقل کی رسائی سے باہر ہے اور ہماری جانب دیکھ کر دانت نکوستا ہے۔

"تنہائی کے سو سال" کے کردار خود بھی تاریخ کی بہت سی مختلف خواندگیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود اس نمائندگی کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہ خواندگیاں عموماً جاہلانہ یا مغالطے پر مبنی ہوتی ہیں، اور اکثر تاریخ سے قطعی طور پر جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن گارسیا مارکیز خود تاریخ کی ان تمام خواندگیوں کی حریف، یا ان سے بالاتر، کوئی خواندگی پیش نہیں کرتا۔ اس نے اپنے ناول کی شکل ان توہمات کی شکل پر ڈھالی ہے جو اس کا

حصہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ناول ناامیدی کا اظہار کرتا معلوم ہو سکتا ہے، اور خود مصنف اپنا اظہار محض تشکیک، صبر اور مزاح کے ذریعے کرتا ہے، اور دانائی کے سوانگ یا منافقت سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ اظہار خواہ کتنا ہی دھیما معلوم ہو تا ہو، بے حد قابل لحاظ ہے، اور بجائے خود ایک آزادی ہے، اور ہمیں اس انتہائی پر کشش اور بظاہر ناگزیر دیومالا کو بیک وقت جاننے اور اس پر یقین نہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

مارکیز کی ابتدائی افسانوی تحریریں ان خیرہ کردینے والے اکا دکا مکالمات کے باعث یادگار ہیں، بیانیہ جن کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ "دروازہ نہ کھولنا" ایک عورت کہتی ہے، "راہداری دشوار خوابوں سے بھری ہوئی ہے۔" "مادام" ایک ڈاکٹر کسی اور عورت سے کہتا ہے، "آپ کے بچے کو ایک سنگین مرض ہے: وہ مر چکا ہے۔" ان میں سے زیادہ تر تحریریں غیر معمولی، یا بمشکل تصور میں آنے والے حالات سے متعلق ہیں، مثلاً کسی ایسے شخص کی موت جو پہلے ہی مر چکا ہے، زندوں کو دیکھتی ہوئی کسی بدروح کی زندگی، آئینے میں ایک ہستی کا جداگانہ وجود، ایک مرد اور عورت کی گفتگو جو صرف خوابوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان تحریروں سے ایک ایسے نوجوان ادیب کا تصور ابھرتا ہے جو ایڈگر ایلن پو کو جدید روپ میں پیش کرنے کی کوشش میں ہو، جسے شعور کی مختلف حالتوں، اور نقل مکانی اور عدم وجود کے استعاروں سے دلچسپی ہو۔

"پتوں کا طوفان" (۱۹۵۵ء) میں گارسیا مارکیز ماکوندو کی دنیا کو دریافت کرنا شروع کرتا ہے، ماکوندو، منطقہ حارہ کی بارشوں کا شکار، کیلے کے باغوں والا قصبہ جو "تنہائی کے سو سال" کا محل وقوع ہے اور جو "بڑی ماما کا جنازہ" نامی مجموعے کی کئی کہانیوں میں کبھی اپنے نام کے ساتھ اور کبھی گمنام، نمودار ہوتا ہے۔ گارسیا مارکیز انکسار کے ساتھ، بالزاک اور فاکنر کی پیروی کرتے ہوئے، کرداروں اور واقعات کی جابجا تکرار سے کام لیتا ہے، اس طرح کہ کہانی کے ٹکڑے بہتے بہتے ایک متن سے دوسرے متن میں چلے جاتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت بھی پیش آتا ہے۔ مثلاً "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منحوس وقت" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں ۔۔ جب یہ مقام ماکوندو نہیں بلکہ اس بے نام ملک کے اسی حصے میں واقع ایک اور قصبہ ہے۔ جہاں ریلوے لائن نہیں ہے، اور جہاں تک صرف دریائی کشتی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ کرنل اور ریلیانو بوئندیا نے، مثال کے طور پر خانہ جنگی کے زمانے میں ماکوندو واپس آتے ہوئے اس قصبے کے ایک خستہ حال ہوٹل کی بالکنی میں ایک رات بسر کی تھی۔ کرنل، جس

کے نام خط نہیں آتا، پہلے ماکوندو ہی میں رہا کرتا تھا، لیکن جب کیلے کی تجارت کا جنون (BANANA FEVER) شروع ہوا تو وہ وہاں سے کوچ کر گیا۔ مزید بر آں، یہ قصبہ ماکوندو کے بعد کے زمانے کا ہے، اور اپنے مرکزی بیانیے کے اعتبار سے حالیہ تاریخ اور تشدد کی لہر کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ماکوندو ایک آندھی کی زد میں آکر وقت کے کسی ایسے نقطے پر نیست و نابود ہو گیا جس کی واضح طور پر نشان دہی نہیں کی گئی، لیکن یہ ۱۹۴۰ء کی دہائی سے بعد کا نہیں ہو سکتا۔ گارسیا مارکیز کا کہنا ہے کہ ماکوندو کا خاتمہ اس کی پیدائش۔ کے سال ہوا تھا، لیکن اس بات کے درست ہونے کے لیے ہمیں ہڑتال اور قتل عام کے واقعات کو ان کے اصل تاریخی سیاق و سباق سے بہت پیچھے لے جانا پڑے گا، کیوں کہ ان واقعات کے بعد سالہا سال گزرتے اور بچے بڑے ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ بلا شبہ اس طرح کی تاریخیں ناول میں نہیں دی گئیں، اور ہمیں واقعات کے تاریخ وار سلسلے کے بارے میں زیادہ ردو قدح نہیں کرنی چاہیے جس کے اشارے اندرونی طور پر موجود نہیں ہیں، جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ ماکوندو، دوسرے قصبے کے بر عکس، نابود شہر ہے، اور اسے نابود ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ ماکوندو صرف ایک یاد ہے، بلکہ یاد سے بھی کم، یہ افسانے کے اندر ایک افسانہ ہے۔

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" (۱۹۶۱ء) اور "منحوس وقت" (۱۹۶۲ء) دونوں ناول زبان اور ادب سے متعلق گارسیا مارکیز کے برتاؤ کی حکایات پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر ہزار روزہ جنگ میں بچ جانے والے ایک صابر اور باوقار کرنل کے بارے میں ہے، جو اپنی اس پنشن کا بے سود انتظار کر رہا ہے جس کا بہت پہلے وعدہ کیا گیا تھا، اور اس دوران مفلسی کے عالم میں اپنی بیمار بیوی کی دلجوئی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کا بیٹا تشدد کی لہر کے دوران مارا جا چکا ہے، اور خود کرنل اب تک کبھی کبھار ممنوعہ پمفلٹ تقسیم کیا کرتا ہے۔ یہ ایک با کفایت، تیکھی، متاثر کن اور پر مزاح کہانی ہے، جس میں درباری رکھ رکھاؤ والا کرنل گالی دینا سیکھتا ہے، اور یوں لفظوں کے تشدد پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اس طرح کی بد تہذیبیوں کے قطعاً خلاف رہا ہے لیکن اب خود کو لفظ "SHIT" (گو) کہتا ہوا پاتا ہے اس لیے کہ کسی اور لفظ سے وہ اپنا اظہار نہیں کر سکتا۔

> اس ایک لمحے تک پہنچنے میں کرنل کو ۷۵ برس لگے تھے،
> ایک ایک لمحہ کر کے بسر کیے ہوئے اس کی زندگی کے ۷۵
> برس۔ جواب دینے کے لمحے میں اس نے اپنے آپ کو مکمل
> طور پر پاک صاف، واضح اور ناقابل تسخیر محسوس کیا۔۔۔

یہ ایک پوری زندگی پر تبصرہ ہے، اور یہ تبصرہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ لیکن یہ اتنا تیکھا اور مرتکز ہے کہ اسے کھولنے کی کوشش میں اس کے معنی ضائع ہو جائیں گے، اور شاید ہمیں اس کوشش کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ نکتہ، میری رائے میں، دراصل یہی ہے کہ لفظ جملوں سے کہیں زیادہ کہہ جاتے ہیں، اور جہاں فتح پانا ناممکن ہو، وہاں ایک لفظ فتح کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

''منحوس وقت'' اسی قصبے کو ایک سیاسی جنگ بندی کی حالت سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میئر مالدار ہو رہا ہے، اور مزید مالدار ہونے کے لیے اسے امن درکار ہے۔ ''ہم ایک شائستہ قصبہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ کہتا ہے، اور ایک غریب عورت تیکھا جواب دیتی ہے: ''یہ ایک شائستہ قصبہ ہی تھا جب تک تم لوگ نہیں آئے تھے۔'' میئر کا ماضی بربریت سے بھرپور ہے، لیکن قصبے کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ اور جب یہ جنگ بندی، انتشار اور خوں ریزی کی جانب واپسی کے اشارے کے ساتھ، ختم ہوتی ہے، تو پوری آبادی ''اس بات کی تصدیق ہونے پر اجتماعی فتح کے احساس سے ہمکنار ہوتی ہے جو ہر شخص کے شعور میں موجود تھی: کہ حالات تبدیل نہیں ہوئے۔'' یہ احساس بدترین توقعات سے یہ تلخ ہمکناری ہی وہ شے ہے جس میں کیوبن انقلاب نے تبدیلی پیدا کی، کم از کم بعض لوگوں کے لیے۔

وہ کیا شے ہے جو جنگ بندی کو ختم کرتی ہے؟ غالباً ہجویہ دیواری پوسٹروں کی وبا، افواہیں جنہیں نیلی روشنائی میں لتھیڑ کر راتوں رات پورے شہر کی دیواروں پر پھیلایا جاتا ہے۔ بدکاریوں اور بدعنوانیوں کی داستانیں۔ سب لوگ ان سے واقف معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ اس بارے میں بات نہیں کرتے۔ یہ کسی کو حیرت زدہ نہیں کرتیں، لیکن بدنامیوں کو مشتہر ضرور کرتی ہیں، اور ہر اس شخص کو پریشان کرتی ہیں جس کے ان سے پریشان ہونے کی توقع ہو۔ ایک شخص ایک حاسد شوہر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، قصبے کی معزز خواتین کے متواتر طعنوں سے پادری کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اور میئر کرفیو نافذ کر دیتا ہے۔ میئر کے گرگے غلطی سے ایک قیدی کو مار ڈالتے ہیں، گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں، قصبے کے مرد قصبہ چھوڑ چھوڑ کر جنگل میں گریلوں سے جا ملنے لگتے ہیں۔ اور اس تمام کے باوجود ہجویہ پوسٹروں کا بانی اپنی یہ معمولی تباہ کن سرگرمی جاری رکھتا ہے، گویا ان تمام حالات سے اس کا کچھ تعلق ہی نہ ہو۔

شاید اس کا ان حالات سے کوئی تعلق ہے بھی نہیں، اس لیے کہ گارسیا مارکیز خود بھی اسباب کا ایک اور سلسلہ تجویز کرتا ہے۔ قصبے کا دنداں ساز خفیہ سیاسی پمفلٹ تقسیم کر رہا

ہے، قیدی، جسے مار ڈالا گیا، انہیں پمفلٹوں کو تقسیم کرنے پر گرفتار ہوا تھا۔ اور گولیاں چلنی اس لیے شروع ہوئیں کہ حجام کی دکان کے فرش میں سے بندوقیں برآمد ہوئیں تھیں۔ سیاست یا افواہ طرازی؟ ممکن ہے مصنف یہاں اپنے موضوع کے بارے میں ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو، اسے یقین نہ ہو کہ اسے کون سا رخ دے، لیکن ہجویہ پوسٹروں اور پمفلٹوں کا قریبی تعلق خاصا واضح لگتا ہے، اور ان دونوں کے افسانہ طرازی کے فن سے تعلق کو نظرانداز کرنا بھی آسان نہیں۔

یہ تعلق تخیل کی قوت کی طرف اشارہ نہیں کرتا، جیسا کہ ماریو برگس یوسا نے ''منحوس وقت'' کے بارے میں کہا ہے، بلکہ اس سے فتنہ انگیزی کی قوت کا اشارہ ملتا ہے۔ اگر معاصر ادب، ادب عالیہ کے بجائے افواہ طرازی اور پروپیگنڈا سے زیادہ قریب ہو تو؟ باوزن اور محفوظ ہونے کی بجائے بے وزن اور خطرناک ہو تو؟ تب شاید ذمے دارانہ ادب ہمیں اپنے خطروں کو پہچاننے کی تربیت دے سکے۔

وٹجینسٹائن (WITTGENSTEIN) نے ایک بار کہا تھا کہ اس کے لیے ایک ایسی فلسفیانہ تحریر کا تصور کرنا ممکن ہے جو تمام کی تمام لطیفوں پر مشتمل ہو۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لطیفے اگر فلسفے پر مبنی نہ بھی ہوں تو اس سے نہایت قریبی تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ لطیفہ اس شے کی عین ضد ہے جسے ہم سنجیدگی خیال کرتے ہیں، اور میں انہیں ان کے مقام سے ہٹا کر دیانت دار شہریوں کے رتبے پر فائز کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ لطیفوں کا سنجیدگی سے ایک نہایت دل چسپ تعلق ہوتا ہے، جو صرف تضاد کا تعلق نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ہلکے پھلکے، ٹیڑھے میڑھے یا احمقانہ انداز سے ان موضوعات کو چھوتے ہیں جن کی ہمارے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ اور یہ کہ معاصر فکشن —— خواہ ہم بیکٹ، بورخیس، کلوینو، کینو (QUENEAU)، گراس، رشدی، فلپ روتھ، گارسیا مارکیز یا کتنے ہی دوسرے ادیبوں کی تحریروں کا تصور کریں —— تمام کا تمام اس اعتبار سے لطیفوں سے بھرا پڑا ہے۔ تنقید کو ابھی تک اس انداز تحریر کے لیے مناسب زبان میسر نہیں آسکی ہے، اور وہ مسلسل معاصر ادیبوں کو ان سے پیشتر کے ادیبوں کی پیروی، یا ان کا رد کرنے والوں کے طور پر دیکھنے میں مشغول ہے، گویا یہ ادیب صرف ان معیارات پر پورا اتر کر یا ان کی مخالفت کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، جو ہمارے پاس تھوک کے حساب سے موجود ہیں۔

گارسیا مارکیز کسی وضاحت کا محتاج نہیں، وہ ان ادیبوں میں سے ہے جن تک رسائی نہایت آسان ہے۔ اور میں نے ''تنہائی کے سو سال'' میں کسی طرح کے مدفون، پوشیدہ

معانی کی کوئی جستجو نہیں کی۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس لیے کہ کتاب کے سطحی معانی ہی اس قدر فراواں اور متنوع اور بحث کو مہمیز دینے والے ہیں۔ بلاشبہ مارکیز کا اس قدر رسائی میں ہونا ہی دراصل انتہائی غیر معمولی خصوصیت ہے، کیوں کہ یہ ایک پیچیدہ وژن کے نہایت سادہ اظہار پر مشتمل ہے، جو سادہ لوحی سے، یا پیچیدگی کو کم یا زائل کرنے سے، ایک قطعی مختلف کارنامہ ہے۔ میں اسے قرین قیاس یا مناسب بات نہیں سمجھتا کہ کوئی ادیب ان تمام یا اکثر معانی سے باخبر ہو جو کوئی پڑھنے والا اس کی تحریر میں دریافت کر سکتا ہے، گو کہ "باخبر" بجائے خود ایک بحث طلب اصطلاح ہے۔ عملی طور پر ادیب وہ سب کچھ جانتے ہیں، جو تنقید نگار جاننے کا دعویٰ رکھتے ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ لیکن عموماً وہ اس کا اظہار تنقیدی الفاظ میں، بلکہ کسی بھی قسم کے الفاظ میں، نہیں کرتے، یا پھر وہ اس کا اظہار مصنوعی طور پر رفیع یا متروک الفاظ میں کرتے ہیں، ایک ایسے پیشے کی اصطلاحات میں جو ان کا پیشہ نہیں ہے۔ اس خطے میں بہروں کے درمیان بہت سے مکالمے ہوئے ہیں۔ ہنری جیمز کے ہیوویریکر (HUGH VEREKER) نے امتیازی طور پر نقادوں کو اپنے قالین میں کوئی شبیہ تلاش کرنے کی دعوت دی، یا بلکہ یہ خیال کرنے کی کہ کوئی شبیہ ہے جو، اور کسی کو بھی نہیں، نقاد کو نظر آسکتی ہے۔ میں نے "تنہائی کے سو سال" کے اڑتے ہوئے قالین میں کوئی شبیہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اس میں فتنہ انگیزی کی نمایاں ترین بُنت کو جاننے کی کوشش ضرور کی ہے۔ ○○

# صبح کے خوش نصیب

ہم لوگ بیچ جنگل میں تھے اور گاڑی رکی کھڑی تھی۔ کتنی مرتبہ گمان ہوا کہ گاڑی اب چلی۔۔۔۔ مگر نہیں چلی۔۔۔ کتنی مرتبہ گاڑی سے باہر بکھرے ہوئے مسافر سیٹی دیتے انجن سے اشارہ لے کر لپک جھپک واپس اپنی اپنی نشست پر آئے اور دم سادھ کر بیٹھ گئے کہ اب گاڑی چلے گی۔ دم سادھے بیٹھے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب گاڑی حرکت میں آتی ہے۔ گاڑی حرکت میں یا تو آئی ہی نہیں۔ آئی تو بس اس قدر کہ پہیے مشکل سے تھوڑا گھومے اور ڈبوں کو تھوڑا جھٹکا لگا، مگر پہیے پورا چکر لینے سے پہلے ہی رک گئے اور گاڑی ایک تھرتھری کے بعد پھر ساکت ہو گئی۔ مسافر بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے بے اطمینان ہو کر پہلو بدلا۔ کوئی بے زار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ایک کر کے پھر گاڑی سے اترنے اور پٹری پہ چہل قدمی کرنے لگے۔ کسی نے پٹری کو پار کیا اور درختوں کے سائے میں جا بیٹھا۔

"امی گاڑی کیوں نہیں چلتی؟" بچے نے بور ہو کر ماں سے سوال کیا۔

"چلے گی؟"

"کب چلے گی؟"

"بس ابھی چلے گی۔"

مگر وہ کمسن ماں سے یہ جواب پہلے بھی سن چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے سنا اور باہر جھانکنے لگا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے گود کے بچے کو پہلے خالی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا اور سینے پر دست درازی کرنے لگا تو اس نے قمیض کا دامن اٹھا کر بچہ کا منہ اندر کیا اور دامن گرا لیا۔ قمیض کا دامن اس نے اتنی چابکدستی سے اٹھایا کہ پیٹ کے ایک بے معنی سے گوشے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خیر اس سے اتنا پتہ چل ہی گیا کہ اس ملگجے لباس کے اندر کتنا روشن بند چھپا ہوا ہے۔

میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں جو بڑی یکسوئی سے اخبار پڑھے چلے جا رہے تھے بالآخر اخبار پڑھتے پڑھتے تھک گئے۔ اخبار کو ایک طرف رکھا اور بڑبڑائے

''بہت دیر ہو گئی ... آخر گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟''

''کوئی کراسنگ ہونا ہے۔'' قریب ہی بیٹھا ہوا بریف کیس والا آدمی بولا۔

''میرے خیال میں تیز گام آ رہی ہے۔'' دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

''تیز گام؟'' بریف کیس والے نے کلائی پر لگی خوبصورت گھڑی کو دیکھا۔ ''تیز گام کا تو یہ وقت نہیں ہے۔''

''پھر اور کوئی گاڑی ہو گی۔''

''ہاں اور کوئی گاڑی ہو گی۔ مگر بڑی دیر لگائی۔''

''اصل میں پسنجر کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ چیونٹی کی چال چلتی ہے اور قدم قدم پہ رکتی ہے۔ پسنجر ٹرین کی خرابیاں اب ان پر کھل رہی تھیں۔ سوار ہوتے وقت وہ انہیں کتنی نوح نظر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا۔ کتنی دھکم پیل کے ساتھ گاڑی میں گھس رہے تھے۔ اور سیٹ لینے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جو اندر داخل ہو گئے تھے ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے۔ جو باہر رہ گئے تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل ہو جانے والوں نے کتنی پھرتی سے ڈبے کے دروازے بند کئے تھے اور بعد میں آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے کھلوائے تھے اور سامنے آنے والوں کو دھکے دیتے ہوئے، بستروں اور بکسوں کو پھلانگتے ہوئے نشست کی تلاش میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کتنی دھینگا مشتی کے بعد کبھی بیٹھنے کی اور کبھی محض کھڑا ہونے کی جگہ میسر آئی۔ پھر جب گاڑی چلی تو ہم سوار ہو جانے والوں نے اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب اور پیچھے رہ جانے والوں کو کتنا بد نصیب جانا تھا۔ پھر یکایک پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہمارے یہاں کتنی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ دوڑتے دوڑتے اگر کوئی ہینڈل پکڑ کے لٹک گیا تو کسی نہ کسی نے جلدی سے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کی راہ دے دی۔ پھر چلتی ہوئی گاڑی سے ہم نے ایک گونہ اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا، پلیٹ فارم پر کھڑے رہ جانے والے مسافر کتنے بے آسرا اور کتنے قابل رحم نظر آ رہے تھے۔

اب پہیہ الٹا گھومنے لگا تھا۔ اس گاڑی کے مسافر ہونے کی بنا پر ہم اپنے آپ کو کتنا بے آسرا، کتنا قابل رحم سمجھ رہے تھے۔

اور وہ جو اس گاڑی میں سوار نہ ہو سکے؟ اچھے رہے وہ لوگ جو اس گاڑی میں سوار

ہوتے ہوتے رہ گئے۔

"میری سیٹ تو جہاز میں بکڈ تھی۔" بریف کیس والا بولا۔ "لیکن پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے مجھے اپنی سیٹ CANCEL کرانی پڑی۔ اس کے بعد کسی فلائٹ میں کوئی سیٹ نہیں ملی۔ سوچا کہ ٹرین پکڑی جائے۔ تیز گام، سپر، کسی میں سیٹ نہیں ملی۔ آخر کو پسنجر میں بیٹھنا پڑا۔"

ایک دفعہ پھر مسافر تیزی کے ساتھ اندر آئے اور اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔ اصل میں ابھی انجن نے سیٹی دی تھی۔

"گاڑی اب چلنے والی ہے۔" کہنے والے لہجہ میں دبی دبی خوشی کا رنگ شامل تھا۔

"واقعی؟"

"ہاں بس چلنے والی ہے۔ انجن نے سیٹی دے دی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

کمسن لڑکے نے باہر جھانک کر دیکھا۔

"امی دیکھو۔"

"کیوں، کیابات ہے؟"

"دھواں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے باہر جھانکا۔ واقعی انجن نے اچانک کتنے زور شور سے دھواں اگلنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹی ہی سے نہیں اس دھوئیں سے بھی شاید مسافروں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بس اب گاڑی چل پڑے گی۔ انجن کے منہ سے ایسا کالا دھواں نکل رہا تھا کہ لگتا تھا کہ جیسے کوئی دیر جاتی ہے کہ سارا جنگل کالا ہو جائے گا۔ چلتی گاڑی کا انجن جب دھواں اگلتا ہے تو اس کی بات اور ہوتی ہے۔ فضا میں کلونس کی ایک لکیر کھنچتی اور مٹتی چلی جاتی ہے۔ مگر جب کھڑا ہوا انجن دھواں اگلتا ہے تو فضا کی پاکیزگی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ انجن نے دھواں اگلتے اگلتے ایک دفعہ پھر سیٹی دی۔ اتنی تیز کہ پورے جنگل میں گونج گئی۔ جنگل میں بھی اور ہم مسافروں کے دلوں میں بھی، دل جیسے سیٹی کی آواز سے گرما گئے ہوں۔۔۔ وہ جو ایک بیزاری چھائی ہوئی تھی وہ کافور ہو گئی۔۔۔ ہم سب ہی مستعد اپنی نشستوں پہ بیٹھ گئے۔ لگ رہا تھا کہ گاڑی بس حرکت میں آنے والی ہے۔

بیٹھے رہے، بیٹھے رہے، پہیوں نے بالکل پہلے کی طرح ہلکی سی جنبش ضرور کی تھی اور اس سے ایک تکلیف بھری آواز بھی پیدا ہوئی تھی۔ جیسے پہیوں کو گردش کرنے

میں تکلیف ہو رہی ہو۔ مگر پھر وہی سکتہ اور اب تو دھوئیں کا زور بھی کم ہو تا جا رہا تھا۔ کالے سے بھورا ہوا اور پھر بالکل معدوم ہو گیا۔

جب گاڑی کسی طور پر حرکت میں نہ آئی تو پھر وہی بیزاری۔ بڑے میاں نے بور ہو کر پھر اخبار اٹھایا اور پڑھی ہوئی خبروں کو پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے بیزار گود میں بچہ پھر کلبلایا۔ اس نے اس مرتبہ اتنی بیزاری اور لا پرواہی سے قمیص اوپر اٹھائی کہ دم بھر کے لیے تو پیٹ سے اوپر کا ابھرا منطقہ بھی نمایاں ہو گیا۔

"گاڑی آج نہیں چلے گی۔" کسی نے بیزار ہو کر کہا۔

"امی گاڑی نہیں چلے گی؟" کمسن لڑکے نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"چلے گی بیٹے۔"

"کب چلے گی؟"

"بس تھوڑی دیر میں چلے گی۔"

کمسن لڑکے نے بے اعتباری سے ماں کا جواب سنا اور پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔

"شام ہو رہی ہے۔" ایک مسافر نے باہر سے جھانکتے ہوئے کہا۔

ہاں واقعی ۔۔۔ وہ وسیع و عریض میدان اور کھیت جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک دھوپ میں چمک رہے تھے، اب چھاؤں میں آ چکے تھے اور چھاؤں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جیسے اداسی پھیلتی جا رہی ہو۔

"رات کہیں اسی جنگل میں نہ گزارنی پڑ جائے۔"

"اس جنگل کا راستہ تو دن میں بھی محفوظ نہیں۔ رات گزارنی پڑی تو......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر اس کے تشویش بھرے لہجے نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

بڑے میاں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر کہنے والے کی صورت دیکھی۔ پھر اخبار ایک طرف ڈال کر منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھی لاالہ الا انت سبحانک ..... چپ ہوئے پھر انہوں نے بولنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر مجھے اپنے خطاب کے لیے چنا۔

"بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ سوال بے محل ہے۔"

انہوں نے غور سے میری صورت دیکھی۔ "بے محل کیسے ہے؟"

"ہم میں سے کسے کہاں جانا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں سے کب نکل رہے ہیں۔"

"اور نکل بھی رہے ہیں یا نہیں۔" کسی قریب بیٹھے ہوئے نے ٹکڑا لگایا۔
اسی گھڑی گارڈ اپنی سفید وردی میں گزرتا نظر آیا۔ ایک مسافر اسے دیکھ کر پھرتی سے اٹھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ سب نے اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔
"یہ گارڈ تھا؟"
"ہاں۔"
"کیا کہتا ہے؟ گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟"
"آگے گڑبڑ ہے۔"
"میرا خیال ہے...... " بریف کیس والا بولا۔ "آگے کوئی ACCIDENT ہوا ہے۔ نہیں تو گاڑی اتنی دیر تک نہیں رک سکتی تھی۔"
"ہوا تو نہیں ہے۔ ہو جاتا۔"
"اچھا؟"
"ہاں۔۔۔ اور اسی گاڑی کے ساتھ ہو جاتا۔ وہ تو بروقت پتہ چل گیا۔"
"اچھا کیا بات تھی؟"
"آگے پٹری اکھڑی ہوئی ہے۔"
"پھر تو بچ گئے۔"
"ہاں! یہاں سے نکل جائیں پھر جانیں۔"
ہاں واقعی...... میں نے سوچا، پہلے یہاں سے تو نکلیں۔ اور اس کے ساتھ مجھے پھر اس گھڑی کا خیال آیا جب ہم اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ کس طرح ایک احساس تحفظ کے ساتھ ان پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گے۔ خوش نصیبی اور بد نصیبی کا کتنی جلدی آپس میں تبادلہ ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بد نصیب بن چکے ہیں۔ اچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک وقتی بد قسمتی سے گزر کر خوش قسمت بن گئے...... اور ہم...... ہاں اور ہم، میں نے اردگرد نظر ڈالی۔ شام کی چھاؤں باہر سے رینگ رینگ کر اندر آ گئی تھی۔ ساتھ میں اداسی بھی جو شام کی چھاؤں کی ہمزاد ہے۔ ڈبے میں ابھی لائٹس نہیں جلی تھیں اپنی اپنی نشست پہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے سب آدمی سائے دکھائی پڑ رہے تھے۔ ○○

# جسم و زبان کی موت سے پہلے

**اس** کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اندھیرے ڈھول کے اندر تھا اور ڈھول بے طرح پیٹا جا رہا تھا۔

کیا آنکھ واقعی کھل گئی تھی؟

آنکھ کھلتے ہی روشنی بھی ساتھ چلی آتی ہے۔ جبکہ وہاں روشنی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس کی کنپٹیاں ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ پھڑکنے لگیں۔ تیز اور تیز۔ اس نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونسنا چاہیں، لیکن کانوں کے سوراخ چھوٹے ہو گئے تھے۔ انگلیاں ککڑیوں میں بدل گئی تھیں۔

اس نے سر کو جھٹکا۔ "نہیں...... یہ انگلیاں ہیں۔ میری انگلیاں۔" کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "انگلیاں تو لکھتی ہیں، رنگ بھرتی ہیں۔ یہ ککڑیاں ہیں جو کاٹی جاتی ہیں، کھائی جاتی ہیں۔"

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ ککڑیاں ہوتیں تو کب کی کھالی جاتیں۔ یہ انگلیاں ہیں۔" اس نے اپنی انگلیوں کو لہرایا، پھر بیتابی سے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے ٹٹولا اور خود کو تسلی دی۔ وہ لرز رہی تھیں۔ اس نے ان کی لرزش کو محسوس کیا۔

گھر کے پچھواڑے جو باڑی تھی، اس میں ککڑیوں کی ایک بیل تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب وہ گھونسلوں سے انڈے نکالنے کے لیے اور انہیں رنگ کر پھر سے گھونسلوں میں رکھ دینے کے لیے پیڑوں پر چڑھتا اور اس کی نظر ککڑیوں کی بیل پر پڑتی تو اس سے لٹکتی ہوئی ککڑیاں ہوا سے ہولے ہولے لرزتی ہوئی نظر آتیں۔ سینکڑوں انگلیاں جو اسے اشارے سے منع کرتیں۔ "یہ نہ کرنا۔ یہ نہ کرنا۔"

اماں کی آواز اس تک آئی۔ "میاں ہم نے تو تمہیں بہت سمجھایا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں سائے سے لہرائے۔ اس نے سسکی لی۔ "آپ یقین کریں اماں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو بس پیڑ پر چڑھا تھا۔"

وہ پیڑ پر کیوں چڑھا تھا؟ وہاں کوئی گھونسلہ تو نہ تھا۔ گھونسلے میں انڈے نہ تھے، وہاں تو

بس سر تھے اور سروں میں سفید و سیاہ خواب تھے۔ اڑے اڑے سے مٹے مٹے سے۔ اس نے انہیں امید رنگوں میں رنگنا چاہا تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ کی نسبت رنگین تصویریں تو سب ہی کو اچھی لگتی ہیں۔ تو پھر رنگین خواب کیوں اچھے نہیں لگیں گے۔ ؟

تیز ہوا شور مچاتی ہوئی چلتی ہے اسی لیے ککڑیاں لرزتی ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں ککڑیاں، ان کی ہلتی ہوئی انگلیاں مجھے منع کرتی ہیں۔ "یہ مت کرو۔ یہ مت کرو۔" "لیکن نہیں۔ وہ انگلیاں۔ نہیں ککڑیاں ہوتی ہیں۔ ETABLE RAWVEG جو کھانے کے ساتھ ہی نہیں کھانے کے بغیر بھی کھائی جاتی ہیں۔" "BUT WHEN PEOPLE BECOME VEGETABLE"

کس قدر فضول بات ہے۔ جب آلو، بینگن یا ٹماٹر انسان نہیں ہو سکتے تو انسان سبزی میں کیسے بدل سکتے ہیں؟

سر ہنڈولے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ رہٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ رہٹ میں بٹھا دیا گیا۔ رہٹ تیزی سے نیچے جا رہا تھا، اوپر آ رہا تھا لیکن کنواں خالی تھا۔ اور ڈھول کی آواز کنویں کے اندر بھی آ رہی تھی۔

ہنڈولے میں بیٹھے ہوئے سر کو اس نے اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ انگلیاں چپچپانے لگیں۔ ایک دوسرے سے چپکنے لگیں، اس نے حیرت سے اپنی انگلیوں کو چکھا۔ وہ شاید نمک ہی کی بنی ہوئی تھیں۔

"لیکن نمک میں چپچپاہٹ تو نہیں ہوتی؟" اس کے ذہن نے ایک دم سوال کیا۔

سوال......!

گھنٹوں، دنوں یا صدیوں بعد اس کا ذہن کوئی سوال قائم کر سکا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ابھی وہ زندہ تھا، گردن پر رکھے ہوئے سر میں ذہن ابھی دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا۔ ڈھول کی آواز پور پور میں چیخ رہی تھی۔ پھر بھی ذہن سوال کر سکتا تھا۔

سوال کر سکنا؟

" TO QUESTION "

ذہن کا وہ ستون جس پر انسان اور انسانیت قائم ہے۔

اب وہ ڈھول کے اندر لیٹا نہیں، بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کان ڈھول کے فرش سے دور تھے۔ شور اس سے ایک یا دو سینٹی میٹر دور ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی چپچپی انگلیوں کو منہ میں لیا تو شدید بھوک کا احساس ہوا۔ چاول اور دال کا آخری لقمہ...... کھانے کے بعد وہ

اسی طرح انگلیاں چاٹتا تھا۔
اور تب سچ اس پر صبح کی طرح طلوع ہوا۔
اس کی انگلیاں خون آلود تھیں۔
شور پر خون کا ذائقہ غالب آگیا۔ یہ اس کا اپنا خون تھا۔ اس نے اپنے خون کا نمک چکھ لیا تھا۔

''تو کیا میں سلجوقیوں کے عہد کا ''چاشناگیر باشی'' ہوں؟ پھر مجھ سے بڑا چکھنے والا کون ہوگا کہ جس نے اپنے خون کا نمک چکھا۔'' اس کے سوئے ہوئے حواس آنکھیں ملنے لگے۔

''ارے کم بخت اتنا نمک کیوں جھونک دیا؟'' اماں انجم کو پھٹکار رہی تھیں۔

ان کی آواز سنتے ہی بھوک نے اس کی انتڑیوں کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

''اماں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔'' اس نے انہیں آواز دی۔ ''دال چاول پر اچار کی پھانک رکھ دیں۔ چاول گرم ہوں تو ذرا سا گھی بھی...... '' تاریک اندھیرے میں ذائقے لہرائے اور منہ ان سے بھر گیا۔

''کس قدر نیند آرہی ہے۔'' اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔

''جانے انجم کہاں رہ گئی۔ شاید میرے اونگھتے میں وہ سینی رکھ گئی۔'' اس نے اپنی کپکپاتی ہوئی نمکین انگلیوں سے فرش پر سینی کو ٹٹولا۔

فرش کھردرا تھا۔ سیلن زدہ تھا اور خالی تھا۔

فرش نے اسے سب کچھ یاد دلا دیا۔ جیسے تاریک کمرے میں کوئی ماچس کی تیلی جلائے اور لحظہ بھر کے لیے سارا کمرہ روشن ہو جائے۔

اماں نہیں تھیں، انجم نہیں تھی...... گرم چاولوں کے اوپر رکھا ہوا اور نرمی سے پگھلتا ہوا زرد اور دانے دار گھی، آم کے اچار کی سیاہی مائل سبز پھانک اور ٹھنڈے پانی سے چھلکتا ہوا چاندی کا کٹورا نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا۔ سراب دھوپ سے تپتے ہوئے صحرا میں ہی نہیں، اندھی کوٹھریوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

یہ اس کی کوٹھری تھی۔

وہ اس میں تنہا تھا۔

نہیں، تنہا کہاں تھا۔؟

اس کے ساتھ اس کی پیاس تھی، بھوک تھی، اس کا بدن تھا جس میں اب اس کی بجائے درد رہتا تھا۔ وہ سمٹ سمٹا کر بس سر میں چلا گیا تھا اور کبھی کبھی تو اسے گمان گزرتا تھا کہ

شاید وہ اپنے سر میں بھی نہیں رہتا۔

وہ تنہا تو نہ تھا، ایک ہجوم میں تھا۔ اپنے سنگی ساتھیوں میں گھرا ہوا۔ یہ زخم ہے۔ یہ جلن ہے۔ یہ خراش ہے۔ یہ سوجن ہے اور سب سے آگے درد ہے۔ نفیری بجاتا ہوا، اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہوا۔

وہ اسے ایک بار پھر کوٹھری میں پھینک گئے تھے اور اب اپنے بھاری بوٹوں سے کوٹھری کی کھوکھلی چھت پر کود رہے تھے۔ نچلی منزل سے کوٹھری کے کھوکھلے فرش پر ڈنڈے مار رہے تھے۔ دھپ دھپ، ٹھک ٹھک، ناقابل برداشت شور چھت سے برس رہا تھا۔ فرش سے ابل رہا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور گٹھری بن گیا۔ سوجے ہوئے گھٹنوں نے اس کے کانوں کو ڈھانپ لیا۔ شور اب ایک اور سینٹی میٹر دور ہو گیا تھا۔

بدن کا ہر مسام کان بن جائے اور آواز کا مطلب ہی صرف شور ہو تو ایک سینٹی میٹر کی دوری بھی بہت ہوتی ہے۔ آرام، درد، سناٹا، شور۔ یہ سب اضافی ہیں۔ چھپ کر کودنے کی رفتار دھیمی کر دیں تو شور کے تسلسل میں دو منٹ کی یہ کمی سکون کی دو صدیاں ہیں۔

دونوں ہاتھوں کو موڑ کر پشت پر باندھ دیا گیا ہو اور بدن پر چلتے ہوئے کاکروچ کو ہٹانا ممکن نہ ہو۔ ہونٹوں کے کناروں سے بہہ نکلنے والی رال اور خون کو چاٹنے والی مکھیاں اڑائی نہ جاسکتی ہوں۔ پھر چوبیس گھنٹوں بعد مڑے ہوئے ہاتھ کھول کر انہیں سامنے کی طرف کر کے ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں تو یہ کتنا بڑا عیش ہے۔ بغلوں کے نرم گوشت میں اور بازوؤں کی مچھلیوں میں رہ رہ کر کیسا آرام بچھتا ہے۔ مکھیاں اڑائی جاسکتی ہیں۔ لمبی لمبی مونچھوں اور بڑے بڑے ٹانگروں والے کاکروچ کو انگوٹھے اور مشتری کی انگلی کی ہلکی سی چوٹ سے جھٹکا جاسکتا ہے۔

جانے کتنی صدیاں وہ گھٹنوں سے اپنے کان ڈھانپے بیٹھا رہا۔ ریڑھ کی ہڈی کمان ہو گئی تھی۔ پھر اچانک ہی شور مچاتا ہوا ڈھول صرف اندھیری کوٹھری رہ گیا۔ کھوکھلی چھت پر کودنے والے اور کھوکھلے فرش کو ڈنڈوں سے پیٹنے والے چلے گئے تھے۔ ہر طرف وہ مہیب سناٹا تھا جو کائنات کی تخلیق سے پہلے رہا ہو گا۔

وہ اب ٹھیک تھا۔ مربوط انداز میں سوچ سکتا تھا۔ شور نہ ہو تو بھوک، پیاس اور درد سب سے نمٹا جاسکتا ہے۔

"یہ جو چلے گئے ہیں تو ان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ہوگی۔ تھک گئے ہوں گے کود کود کر، اب اپنے گھروں میں جا کر آرام کریں گے۔"

اسے اپنا گھر یاد آیا۔ نیم کے پیڑ کی چھاؤں سے بھرا ہوا آنگن، موگرے، بیلے، مدھومالتی اور چمپا سے مہکتی ہوئی کیاریاں۔

ذہن پر اپنی یادوں کے رنگ چھوڑ کر، گھر کسی تتلی کی طرح اس کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔ جو چیزیں پہنچ میں نہ رہیں وہ کس قدر قیمتی ہو جاتی ہیں۔ اس نے گہری سانس لی اور مسکرانا چاہا لیکن کٹی ہوئی بانچھوں میں چرچراہٹ ہونے لگی۔

کچھ دیر بعد دوسرے آجائیں گے۔ وہ تازہ دم ہوں گے۔ شور بھی تازہ دم ہو جائے گا۔ مجھے سوچنا چاہیے، ذہن کو کام کرنا چاہیے۔ وہ کہیں سوچنا بھول نہ جائے، مجھے مربوط باتیں سوچنا چاہئیں۔ ایک خیال دوسرے خیال سے جڑا ہوا۔ ایک یاد، دوسری یاد سے لپٹی ہوئی۔

وہ ہمت کر کے اٹھا تو پیروں کی بیڑیاں بج اٹھیں۔ اس نے سنبھل سنبھل کر چلنا شروع کیا۔ چار قدم چوڑائی، چھ قدم لمبائی، اندھیرے میں چلتے ہوئے قدم گننا ضروری ہے ورنہ سر دیوار سے ٹکرا جاتا ہے۔

بدن کا ایک ایک جوڑ اور گوشت کا ایک ایک ریزہ فریاد کر رہا تھا۔ وہ چند ہی منٹ میں تھک گیا اور پہلو کے بل دراز ہو گیا۔ بدن لیٹ گیا اور ذہن نے یوگیوں کی طرح آسن جمایا۔

وہ بدن کے راستے ذہن کو توڑنا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ جس ذہن میں یقین اور ارادہ رہتا ہو، وہ بدن سے جدا ہو جاتا ہے، اس کا راستہ الگ ہوتا ہے، بدن کی اپنی محدودات ہوتی ہیں۔ ون، ٹو، تھری ...... ون، ٹو، تھری ...... بدن کو حرکت دیتے رہو، ذہن سے سوچتے رہو۔ زندہ رہنے کے لیے معاملات پر ذہن مرتکز کرنے کے لیے۔

وہ مجھے یہاں لائے تھے۔

جانے کب لائے تھے۔

اسے یاد رہتا بھی تو کیسے؟

وہ کہاں کہاں نہیں پھرایا گیا تھا۔ ایک حوالات سے دوسری حوالات۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری۔ ایک کوٹھری وہ تھی جو دائرہ نما تھی اور جس میں رہنے کے چند دنوں بعد ہی وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ سیدھا کھڑا ہو سکے۔ کھڑے ہوتے ہی اسے چکر آنے لگتے اور ایک کوٹھری وہ تھی جو اس کے قد سے آدھی تھی۔ جیسے کوئی سنگ خانہ ہو۔ اس میں وہ ہفتوں چاروں ہاتھ پیروں پر چند قدم چلتا تھا اور پھر دیواریں اس کا راستہ روک لیتی تھیں، جو اتنی تنگ تھی کہ اس میں پیر پھیلا کر سویا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ اسے کہاں کہاں نہیں لے گئے تھے؟

یہ بات تو ان کی سمجھ میں بہت دیر سے آئی تھی کہ وہ "شہزادہ" ہے اور شہزادے محلوں اور قلعوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ محل اب نہیں رہے تھے سو وہ اسے "شاہی قلعے" میں لے آئے تھے کہ یہی اس کے شایان شان تھا۔

انہوں نے جب اسے اپنی تحویل میں لیا تو سب سے پہلے اس کی گھڑی اتار لی تھی۔ گھڑی چلتی بھی رہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آمروں کے بنوائے ہوئے قید خانے ہوں یا بادشاہوں کے تعمیر کروائے ہوئے قلعے اور ان قلعوں کے تہہ خانے ہوں جن میں ہوا تک نہ آتی ہو تو روشنی کی کرن کہاں سے آئے گی کہ دن اور رات کا حساب رکھا جاسکے۔ صبح کے پانچ بجے اور شام کے چھ بجے میں فرق کیا جاسکے۔

اس قلعے میں خواب نہیں دیکھے جاسکتے تھے۔ یہاں وہ شہزادیاں حاشیہ خیال میں نہیں آتی تھیں جن کے اشارۂ ابرو سے ہر زنجیر پگھل جائے۔ اور زیر زمین غلام گردشوں میں لگے ہوئے میخوں جڑے دروازے اور آہنی قفل خوابوں میں ہی کھل جائیں۔

یہاں وہ غلام تھے جو آقا بن بیٹھے تھے۔ وہ خواجہ سرا تھے، جنہیں اس بات کا اصرار تھا کہ وہ آختہ نہیں کئے گئے اور جو کہانیوں کے دم کٹے لومڑ کی طرح ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ ان ایسوں کی تعداد میں اضافہ کیسے ہو۔

بدیسی آقا رخصت ہو چکے تھے اور یہ خواجہ سرا ان کی کمال نیابت کر رہے تھے۔ یہ ان بستیوں کے فاتح تھے جن کی حفاظت ان کا روزگار تھی۔ یہ ان نہتوں کے قاتل تھے جن کا یہ نمک کھاتے تھے۔ نو آبادیات کی تجربہ گاہ میں انہیں سکھایا گیا تھا کہ قوموں کے ساتھ زنا بالجبر کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی قوم کو آختہ کرنا ہو تو اس کے بازو اس کی پنڈلیاں، اس کے شانے کن مفادات کے تسموں سے باندھے جاتے ہیں۔

بدن پر کاکروچ چلا تو اس نے چٹکی مار کر اسے دوڑا دیا۔ تسموں کے خیال پر اسے یاد آیا کہ کتنے دنوں سے اس نے تسمے نہیں باندھے تھے۔ کس چیز کے تسمے باندھتا؟ اس نے تو جانے کب سے جوتے نہیں پہنے تھے۔ جوتوں کے خیال پر اسے ہنسی آئی اور اس نے پیروں کو جنبش دی۔

اندھیری کوٹھری میں بیڑیوں کی کسماہٹ گونج گئی۔ بیڑیاں پہننے والے پیروں کو جوتوں کی کیا ضرورت تھی؟

انہوں نے جب اسے پکڑا تب بھی وہ ننگے پیر تھا۔ اس کی آنکھ کسی آواز سے کھلی تھی۔ کوئی بری طرح دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ وہ نیند کا مارا بوکھلایا ہوا بستر سے اٹھا اور ننگے پیر

دروازہ کھولنے چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آئے تھے۔

وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹے ہوئے، رائفل کے کندوں سے پسلیوں، کمر کے نچلے حصے اور پیٹ پر مارتے ہوئے لے گئے تھے۔ اس کی چپلیں وہیں پلنگ کے نیچے رہ گئی تھیں۔ جوتے بھی کمرے میں ہی چھوٹ گئے تھے۔ جیسے سان تیاگو کے نیشنل اسٹیڈیم میں اسٹوڈیو ناسینول میں ہزاروں جوتے رہ گئے تھے۔ ان کے پہننے والے چلے گئے تھے۔ ہر سائز کے، ہر رنگ کے جوتے، ان کے پہنے والوں میں آٹھ اور نو سال کے بچے تھے۔ بوڑھے کلرک تھے، مزدور اور شاعر تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کارکن تھے، صحافی اور ادیب اور ہاں ان میں وکٹر جارا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اپنی زخمی اور ٹھٹھری ہوئی انگلیوں کالمس اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ وہ ان انگلیوں سے لکھتا تھا اور وکٹر کی انگلیاں گٹار کے تاروں کو زندہ کرتی تھیں، انہیں آواز بخشتی تھیں۔

بستیوں اور شہروں کی حفاظت کرنے والوں اور اس حفاظت کی کمائی کھانے والوں نے اپنے ہی شہروں اور نہتے شہریوں کو جب فتح کیا تو وہ ہزاروں کو کھدیڑ کر اسٹیڈیم میں لے آئے۔ وہ اسٹیڈیم جس میں کھلاڑیوں کی ہنر مندی دیکھی جاتی تھی اور جہاں فاتحوں پر پھول پھینکے جاتے تھے، اسی میں نہتوں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا۔ پھر وہ وکٹر جارا کو گھسیٹتے ہوئے اور سنگینیں چبھوتے ہوئے لائے۔

وکٹر کو لانے والے اس سے اپنی مدح سننا چاہتے تھے تاکہ اسے معاف کرسکیں۔ لیکن جب اس کے گلے سے ان کے لیے کوئی آواز نہ نکلی تو انہوں نے اسے مارا، اس پر تھوکا، اس کی انگلیاں توڑیں اور پھر بھی جب وہ گونگا رہا تو ایک میز لائی گئی جس پر سفید میز پوش پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اس میز پر رکھے گئے اور ان ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو چاپر کی ایک ضرب سے کاٹ دیا گیا۔ جیسے بڑے ہوٹلوں کے باورچی خانوں میں گاجریں، مولیاں اور ککڑیاں کاٹی جاتی ہیں۔ وہ ککڑیاں نہیں انگلیاں تھیں۔ خون بہتا رہا...... سپاہی ہنستے رہے...... وکٹر جارا ہماری منصف مزاجی کی تم داد کیوں نہیں دیتے...... کہ ہم نے صرف انگلیاں تراشی ہیں تمہاری ترشی ترشائی ہتھیلیوں سے تالی بجاؤ...... انگلیاں صرف ان ہاتھوں پر ہونی چاہئیں جو اپنے آقاؤں کو سلامی دیتے ہیں یا ان ہاتھوں پر جو حکمرانوں کی مدح سرائی کرتے ہیں...... باقی تمام انگلیاں بے کار ہیں...... انہیں کٹ جانا چاہیے، انہیں کاٹ دینا چاہیے......

خون بہتا رہا اور وکٹر کی اذیت سے مجروح آواز لبوں سے بہہ کر لوگوں تک پہنچتی

رہی...... آخری نغمہ ...... آخری آواز......

سب کی نظروں میں موت منجمد ہے۔

فوج اپنا کام بہت سلیقے سے کرتی ہے۔

خون ان کے لیے تمغہ ہے۔

اور قتل عام،

مردانگی اور بہادری کا نشان۔

اس نے جلدی سے اپنی انگلیوں کو ٹٹولا۔ وہ موجود تھیں۔ ابھی انہوں نے اس کی انگلیاں نہیں کاٹی تھیں لیکن کتنے ہی دنوں سے انہوں نے قلم نہیں پکڑا تھا۔ وہ کاٹی نہیں گئی تھیں پھر بھی کٹ گئی تھیں۔

''کہیں میں لکھنا ہی نہ بھول جاؤں۔'' اسے خیال آیا اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی بھوکی انتڑیوں میں گرہ لگ گئی۔ اس نے مشتری کی انگلی سے فرش پر اپنا نام لکھنا چاہا۔ لیکن کھردرا فرش اس کی انگلیوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ تب اس نے ہوا میں انگلی گھمائی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ اپنی انگلی کو ہوا میں حرکت کرتے اور اپنے نام کے دائرے بناتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ناہید نے اپنی چھنگلیا سے اس کے آنسو پونچھے۔ ''چھی...... مرد کہیں روتے ہیں۔''

''میں کب رو رہا ہوں۔'' اس نے پلکیں پٹپٹائیں۔

''تو کیا ہنس رہے ہو......؟ اچھا آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمہیں لیے چلتی ہوں۔''

''لیکن یہاں تو آہنی دروازے ہیں۔ دروازوں پر قفل ہیں اور مقفل دروازوں کے باہر پہرے دار ہیں۔'' اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ ''میں اس اندھیرے گھر میں ہوں جس میں داخل ہونے والا کبھی باہر نہیں نکلتا۔ وہ راستہ جس سے لوٹنے کی کوئی راہ نہیں، وہ مکان جس میں روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا اور جہاں دروازوں اور تالوں پر گرد جمی رہتی ہے۔''

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی کے شیرازی کبوتر اندھیری کوٹھری میں پر مارنے لگے۔ وہ مصریوں کے لیے پرندہ تھی، یونانیوں کے لیے وینس تھی۔ سمیریوں کے لیے عشار اور فنیقیوں کے لیے عشتروت، اہل فارس اسے ناہید پکارتے تھے۔

''میں عشار ہوں، تم تموز ہو۔ تم پاتال میں قید ہو اور میں تمہیں لینے کے لیے آئی ہوں۔'' ایک روشن ہاتھ اندھیرے میں تیرتا ہوا اس تک آیا اور اس نے روشنی کو تھام لیا۔ ہاں وہ ناہید تھی، شام کا پہلا تارا تھی، ستارۂ سحر تھی۔ وہ سمیری میں زب اور اکادی

میں وبست تھی۔ آسمانوں کی ملکہ تھی، اوشا تھی، اناہیت تھی، افزائش کی دیوی تھی۔ اشورو عشتر تھی...... وہ زندگی تھی، وہ صبح کا اجالا تھی۔

اس کی پر جلال آواز اندھیرے میں مشعل کی طرح بھڑکی۔ وہ پہریداروں سے اور ان کے آقاؤں سے مخاطب تھی۔

"پھاٹک کھولو ورنہ میں دروازوں کو توڑ دوں گی۔

ان کی چولیں اکھاڑ دوں گی۔

اور مردوں کو زندہ کر دوں گی۔

یہاں تک کہ ان کی تعداد زندوں سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔"

وہ اسے لے کر تیرتی ہوئی چلی۔ بند دروازہ موم کی طرح پگھلنے لگا۔ پگھلتے ہوئے موم کو دیکھ کر وہ لحظہ بھر کے لیے ٹھٹکا اور اسی لحظہ روشنی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ ناہید غروب ہو گئی۔ وہ دیوار سے سر ٹکرانے لگا، ہچکیوں سے رونے لگا۔

کوٹھری کی دیواروں سے شور پھوٹنے لگا۔ اس مرتبہ شور مچانے والے انسان نہیں تھے۔ ان کی بنائی ہوئی مشینیں تھیں، دیواریں چیخ رہی تھیں۔ ہذیانی انداز میں ان سے آوازیں آرہی تھیں۔ کراہنے والوں کی، مرنے والوں کی، عام وحشت میں ہنسنے والوں کی، شدت اذیت سے حیوان بن جانے والوں کی۔

اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا چاہیں لیکن انگلیاں کہاں تھیں؟ اس کے پاس تو بس لکڑیاں تھیں۔ شیطان اس کے کانوں کے راستے اس کے ذہن میں ہنس رہا تھا۔ سوچنے کے عمل کو اپنی ایڑیوں سے کچل رہا تھا۔

وہ شور کے سمندر میں مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ "میں تم سے اونچی آواز میں چیخ سکتا ہوں، شور مچا سکتا ہوں۔" وہ زور زور سے چیخنے لگا، قہقہے مارنے لگا۔ اس کا سوکھا ہوا حلق، ہرن کی دھوپ کھائی ہوئی کچی کھال کی طرح تڑخنے لگا۔

پہلی ٹھوکر اس کی دائیں پسلی پر پڑی اور دوسری اس کی بائیں پنڈلی پر، وہ چونک گیا۔ دیواریں خاموش تھیں اور جانے کب سے خاموش تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کوٹھری میں اس قدر تیز روشنی تھی کہ اس کی آنکھیں جو اب اندھیرے میں رہتی تھیں اس روشنی میں ٹمٹمانے لگیں۔

"اسے اٹھاؤ۔" ایک تحکمانہ آواز گونجی۔ یہ ان مہیب سایوں میں سے کسی ایک کی تھی جو دیوار پر بن اور بگڑ رہے تھے۔

اسے اٹھالیا گیا۔ وہ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹ رہے تھے۔ پیروں میں پڑا ہوا ڈنڈا جو بیڑیوں سے منسلک تھا۔ اس کے گھسیٹے جانے میں آڑے آرہا تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے سننے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں ایک لفظ نہ آیا۔ وہ اتنے دنوں سے ڈھول کے اندر تھا کہ اس کے کان کند ہو گئے تھے۔

اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ "صبح جب آئے گی، جب بھی آئے تو کیا میں ناہید کی سرگوشیاں سن سکوں گا؟" ناہید کے نام نے بے پناہ تنہائی اور خوف کے عالم میں کتنی ہی مرتبہ اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس وقت بھی وہ ذہن کے افق پر ستارے کی طرح دمک رہی تھی۔

وہ اسے گھسیٹتے ہوئے چلتے رہے۔ ان دنوں وہ اس چھوٹی سی عمارت میں تھا جو حال میں تعمیر کی گئی تھی۔ اور جس میں اذیت رسانوں کو وہ تمام جدید سہولتیں فراہم کی گئی تھیں جن سے پرانے شہنشاہ نابلد تھے۔

وہ چلتا رہا۔ تازہ ہوا کی خوشبو آہستہ آہستہ قریب آتی رہی۔ اس نے کسی بھڑکے ہوئے جانور کی طرح چہرہ قدرے اوپر اٹھا کر گہری سانسیں لیں۔ نتھنوں پر ہوا کی خنکی اور سرسراہٹ کو محسوس کیا۔ پو پھٹنے والی تھی۔ ہوا کے بہنے کا یہ انداز اور یہ خنکی پو پھٹنے سے ذرا ہی پہلے کی تھی۔

انہوں نے اسے ایک بڑے ٹھنڈے، روشن اور پر آسائش کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ سامنے ایک بڑی میز بچھی تھی۔ جس پر سبز کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ اسے وہ میز یاد آئی جو ڈکٹر جارا کی انگلیوں کے لیے لائی گئی تھی۔ اس پر سفید میز پوش تھا۔

اس نے سبز میز کو غور سے دیکھا۔ اس پر چند فائلیں تھیں۔ تھرماس تھا، روشنی میں ہیرے کی طرح جگمگاتا ہوا گلاس تھا۔ پیاس اس گلاس میں رہتی تھی یا اس کے حلق میں؟ ذہن میں ہر چیز گڈمڈ ہونے لگی۔

ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے گلاس پر سے اس نے اپنی نگاہوں کو نوچا، ذہن کو سمیٹنے کی کوشش کی اور سامنے دیکھا۔

میز کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اس کے نام سے واقف نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے کہ آج اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے شانے اس کا عہدہ بتا رہے تھے۔ اماں کہتی تھیں کہ کراماً کاتبین زندگی بھر شانوں پر بیٹھے رہتے ہیں اور انسانی اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ کراماً کاتبین تو اسے آج تک نظر نہیں آئے تھے لیکن شانوں پر کڑھے ہوئے اعمال اس نے پہلے بھی بہت دیکھے تھے۔

اسے لے کر آنے والوں نے ایڑی سے ایڑی بجائی اور سامنے والے کو سلامی دی۔ اس نے رعونت سے سر ہلایا اور اپنے قیدی کو دیکھنے لگا۔ وہ اسے نگاہوں میں تول رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، جیسے ایک دوسرے کے مقابل آنے والے مکہ باز ایک دوسرے کے بارے میں اندازے لگاتے ہیں، پھر وہ کرسی کھسکاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''پانی پیو گے''؟ اس کی آواز ریشم کا لچھا تھی۔

''نہیں۔'' اس کے سوکھے ہوئے، تڑخے ہوئے، ترسے ہوئے حلق سے اور پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلی، بھاری، پھنسی ہوئی۔

وہ مسکرایا۔ ''ایسی بھی کیا ضد، پانی نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ تھوڑا سا پی لو۔''

وہ خاموش کھڑا رہا۔

''یقین کرو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تھوڑا سا پانی پی لینے میں کوئی حرج نہیں۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔

''نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے تم کب سے پیاسے ہو؟ کتنے وقت سے تم نے کھانا نہیں کھایا؟'' وہ اب میز پر سے اپنا بید اٹھا کر ہتھیلی پر آہستہ آہستہ مار رہا تھا۔ آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں اور ان تمام لوگوں کی روح کی کھڑکیوں سے چھوٹے اور بڑے شیطان جھانکتے تھے۔

''نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔''

۴۸ گھنٹوں سے تم نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ کچھ نہیں پیا ہے۔ اس طرح تم مر جاؤ گے۔ چند گھونٹ پی لو۔'' اس نے اپنے ماتحتوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔

جسے اشارہ کیا گیا تھا، وہ آگے بڑھا۔ اس نے تھرماس کھولا اور صاف شفاف گلاس قلقل کرتے ہوئے پانی سے بھرنے لگا۔

پانی کی یہ آواز کس قدر شیطانی تھی۔ وہ لرز گیا۔ اس نے دیکھا کہ لمحے بھر کے اندر ہی گلاس کی سطح پر خنکی کی نمی ابھر آئی ہے۔ گرمیوں میں اماں صراحیوں میں کیوڑا ڈالتی تھیں۔ رات بھر کا اوس کھایا ہوا اور خوشبودار ٹھنڈا پانی سینے میں سکون بچھا دیتا تھا۔ پیاس اس کے اندر کسی دیو پیکر لہر کی طرح اٹھی۔ وہ TITANIC تھا۔ نہیں! وہ TITANIC نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ گلیوں میں اور کھیتوں میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ سر پر اڑتے ہوئے بادل تھے۔ پیروں کے نیچے دھوپ سے جھلسی ہوئی بھوری زمین تھی۔

”میگھامیاپانی دو۔“

”سیر سوئیاپانی دو۔“

”میگھامیاپانی دو۔“

وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ گلا ہلا کر چیخ رہا تھا۔ اس کے حلق میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ گرد اڑ رہی تھی۔ گرد میں آواز کا گرداب تھا۔ تانہر کسی پیاسے کو جام نہیں ملتا۔

”شاباش۔ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پی لو عباس۔“

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ آج کتنے دنوں کے بعد اس نے اپنا نام سنا تھا۔ ورنہ سب ہی اسے ”تم“ اور ”تو“ کہہ کر پکارتے تھے اور کبھی کبھی تو اسے شک ہونے لگا تھا کہ اس کا پیدائشی نام حرام زادہ ہے۔ انہوں نے اسے ”عباس“ سے THIRD PERSON SINGU LAR بنادیا تھا۔ کوئی اس کے اندر ”ہمکنے“ لگا۔ ”میں ہوں۔ میں موجود ہوں۔“

پانی انڈیلنے والا حکم کی تعمیل میں گلاس اس کی طرف لے کر بڑھا۔ عباس نے سر بلند کیا اور کناروں سے چھلکتے ہوئے پانی کو دیکھا، اس کی نگاہوں میں دریا لہریں مارنے لگے۔ آنکھیں سایوں سے اور سرابوں سے کھیلنے لگیں۔ آوازیں کانوں میں نوحہ خوانی کرنے لگیں۔

پانی کے لیے خون میں تر ہو گئے عباس...... تلوار جب آئی تو سپر ہو گئے عباس......

"BE A GOOD FELLOW AND DRINK IT" ایک غلیظ آواز کا آنکڑا اسے دریاؤں سے، سرابیوں سے، تشنہ کامیوں اور نوحہ خوانیوں سے باہر کھینچ لایا۔

عباس نے کپکپا کر اپنی طرف بڑھتے ہوئے گلاس کو دیکھا۔ پانی کی سطح پر کینچوے تیر رہے تھے۔ کانٹے میں پھنسے ہوئے کینچوے۔ مچھلیوں کو اپنی طرف بلانے کے لیے، اس کے کسی ساتھی نے کینچوے نہیں نگلے تھے۔ اسے ابکائی آنے لگی۔ اس نے گلاس بڑھانے والے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ گلاس فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور پانی فرش پر بہنے لگا۔ ناہید کی آواز کے پرندے اپنے پر کھولنے لگے، پیاسے گئے اور نہر سے پیاسے نکل آئے۔

زخموں سے بھری ہوئی پیٹھ پر بید پڑا تو وہ دہرا ہو گیا۔ اذیت اس کی پسلیوں کو ڈسنے لگی۔ اس کی کمر میں کن کھجورے اترنے لگے۔ وہ اپنی حیوانی چیخیں اور کراہیں سنتا رہا۔

”کتے تو ہمیں جھکانا چاہتا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ تیرا مقدمہ کھلی عدالت میں چلایا جائے۔ تجھے جیل منتقل کیا جائے۔ تجھے اخبار دیئے جائیں۔ وکیل فراہم کئے جائیں۔ تو ہمارا قیدی ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے؟“ وہ حلق کے بل دھاڑ رہا تھا۔

عباس کراہتا رہا اور گنتا رہا۔ اکیس، بائیس تئیس۔ جب وہ اسے مارتے تو وہ ہر ضرب

کو گنتا تھا۔ چیخیں مارتے ہوئے گنتی بھول جاتا تو پھر سے شروع کر دیتا۔ ذہن ایک مرکز پر رہے، بکھرنے نہ پائے۔

مارنے والا ہاتھ رک گیا۔ اس کی حیوانی آواز شہد میں لتھڑ گئی۔ "دیکھو عباس، ہم نے تمھیں کیا سے کیا بنادیا ہے۔ تم لکھنے والے تھے، عزت دار تھے، سفید پوش تھے، باذوق تھے، تمہاری ضد نے کہاں پہنچایا ہے۔ ہم نے تمھیں تمہاری ہی غلاظت میں سلایا ہے۔ ہم نے تمھیں چاروں ہاتھ پیروں پر چلایا ہے۔ ابھی تم کسی جانور کی طرح چیخ رہے تھے۔ کہاں گئی تمہاری وہ سحر انگیز آواز جس سے تم لوگوں پر جادو کیا کرتے تھے؟" اس کی آنکھوں میں رحم تھا، عباس اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

چند لمحوں بعد اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ بید سے اپنی ہتھیلی تھپ تھپائی۔ "تم اب ایک چیونٹی مسلنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ تمہارے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے پیر کھلوادوں، تب بھی تم میری طرف ایک قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ تم ویجی ٹیبل ہو اور ویجی ٹیبل کسی کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ تازہ ہو تو کھالی جاتی ہے اور تمہاری طرح باسی ہو جائے تو کوڑے میں پھینک دی جاتی ہے۔" وہ ہنسا۔

عباس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کیسا تڑخا ہوا، ٹوٹا ہوا اور مضحکہ خیز چہرہ تھا۔

بچپن میں وہ ایک مرتبہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ وہاں ایک آئینہ تھا۔ لکڑی کے چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف بہت سے چھوٹے اور بڑے آئینے لگے ہوئے تھے۔ اس نے جب ایک میں اپنا چہرہ دیکھا تھا تو ڈر گیا تھا۔ وہاں لگا ہوا ہر آئینہ ایسا ہی تھا۔ خوبصورت چہرہ ان میں اس طرح مسخ ہو جاتا تھا کہ شدید خوف کا احساس ہوتا تھا یا پھر چہرے کی مضحکہ خیزی پر ہنسی آنے لگتی تھی۔

اس کے سامنے والے کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ شیطانی، مسخ......، برباد شدہ، مضحکہ خیز، شدید اذیت کے عالم میں بھی اسے ہنسی آگئی۔ اسے DICTIONARY OF DEVILS یاد آئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ سرکس وہ جگہ ہے، جہاں گھوڑوں، خچروں اور ہاتھیوں کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو احمقوں کا کردار ادا کرتے ہوئے دیکھ سکیں، لیکن یہ تو CIRCUS OF TERROR تھا۔

"تو اس عالم میں بھی ہنستا ہے۔" سامنے والا چیخا۔ "میں ابھی بتاتا ہوں کہ مجھ پر ہنسنے کا، میرے دیئے ہوئے پانی کو گرا دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" وہ مڑا پھر اس نے اپنے ماتحتوں میں سے ایک کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

”لیں سر۔“ ماتحت چند قدم آگے بڑھ آیا۔

”لٹادو حرام زادے کو۔“ کمرے میں ایک غیر انسانی آواز گونجی اور عباس کا سارا بدن تن گیا۔

اس نے مزاحمت کرنی چاہی لیکن انہوں نے اسے پلک جھپکتے ہی زمین پر گرالیا۔ وہ اس کا منہ چیرنا چاہ رہے تھے اور وہ ان کی انگلیوں کو، ان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

”یہ ہمارا دیا ہوا پانی نہیں پیتا۔“ عباس کے کانوں میں تحقیر آمیز آواز آئی۔ پھر ایک کم منصب والے خواجہ سرا کے بدن کا گرم گندا پانی، اس کے چہرے پر، اس کی گردن پر، اس کے سینے پر گرنے لگا۔ اسے پکڑنے والے بدک کر دور ہٹ گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔ سوکھے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے اور سانس روک لی۔

”میں ویجی ٹیبل ہوں۔ کوڑے پر پڑی ہوئی سڑی ہوئی سبزی۔ کتے اپنی ٹانگ اٹھا کر مجھ پر پیشاب کرتے ہیں۔“ اس کے ذہن میں فلیتے سلگ رہے تھے۔ اس کے پکڑنے والے اب اس سے دور تھے لیکن پھر بھی اس نے حرکت نہیں کی، وہ کسی بے جان شے کی طرح پڑا رہا۔

بدن نے اس کا منہ چڑایا۔ ”تم ویجی ٹیبل ہو، سڑی ہوئی سبزی......“

وہ لڑکھڑاتا اور جھومتا ہوا اٹھا۔ فرش پر بہنے والے صاف پانی اور پیشاب نے ایک بڑا سا دھبہ بنادیا تھا۔ عباس نے اس دھبے کو غور سے دیکھنا چاہا لیکن آنکھوں میں لہریں تھیں۔ بڑے خواجہ سرا کی نظریں لحظہ بھر کے لیے ان لہروں میں ڈوبیں پھر اس نے غرور سے سر اٹھا کر اپنے ماتحتوں کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ان سب کے لیے تحقیر تھی۔

”SHIT تمہیں لوگوں کو توڑنا نہیں آتا۔ مڈل کلاس کے یہ خود ساختہ انقلابی، سزاؤں اور بھوک پیاس سے نہیں ٹوٹتے۔ ان کی عزت نفس پر چوٹ لگاؤ۔ یہ تنکے کی طرح دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔“ وہ ہنسا اور عباس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسیں عباس کے چہرے کو چھونے لگیں۔

”تم سب ٹوٹ جاتے ہو۔ پھر لونڈیوں کی طرح اتنے نخرے کیوں دکھاتے ہو؟“ اس کے بید نے عباس کے ناف کے نچلے حصے کو چھیڑا پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

عباس نے بڑے خواجہ سرا کی بید کو اپنی رانوں کے درمیان محسوس کیا اور اس کے قہقہہ مارتے ہوئے چہرے پر تھوک دیا۔

○○

# خوف زدہ کتّے

پچھلے چند برسوں میں شہر کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تھے۔ بالخصوص شمال کی ہر گلی اور ہر محلے کے مکینوں کی حیثیت بے بس یرغمالیوں جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسلحے بردار نوجوان کرخت چہروں کی سفاکی کے ساتھ ہر طرف غول بیابانی کی طرح دندناتے پھرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کو نگاہ غلط انداز ہی سے دیکھ سکتا۔ انہیں جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی، بلا تکلف ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیتے۔ جس گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتے وہاں سے کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتے۔ اگرچہ یہ صورت حال بعض غیرت مند نوجوانوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھی مگر کچھ کر گزرنے کا خیال ان کے ذہن میں نہ آتا کہ وہ اپنے سے زیادہ غیرت مندوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ایسے ہی حالات میں ان جواں مردوں کی رگ حمیت بھی پھڑکی تھی مگر دہشت گردوں کو للکارنے کے بعد جو کچھ ہوا تھا اس کو محلے والے کبھی نہیں بھلا سکتے تھے۔ ان کی مسخ شدہ لہولہان لاشوں کو خود ان کے لواحقین بڑی مشکل کے بعد شناخت کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پھر ایسی وحشیانہ وارداتوں کے بعد جواں مردی کو ہتھیلی پر رکھ کر گھر سے نکلنا ایک احمقانہ فعل ہی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ خاموشی کے ساتھ دہشت گردوں کے مطالبات پورے کرتے رہو اور دوبارہ اچھے دن دیکھنے کی دعا کے ساتھ دل ہی دل میں کڑھتے بھی رہو۔ بس شہر کے شمال میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔

مگر اس کے برخلاف میرا مکان جنوب کے ایک محفوظ محلے میں واقع تھا۔ اب تک بفضل تعالیٰ یہاں خیریت ہی خیریت تھی۔ شمال کے مقابلے میں یہاں کے حالات پرسکون تھے۔ دکانیں آدھی رات تک کھلی رہتی تھیں اور بڑی رات گئے تک جوان لڑکوں لڑکیوں کا دو دو تین تین کی ٹولیوں میں خوش گپیاں کرنا، اپنے مکانات کے ارد گرد ان گنت چکر لگانا ایک عام سی بات تھی۔ مگر پرسوں صبح جو کچھ ہوا تھا وہ ہم سب محلے والوں کے لیے ایک ڈراؤنے خواب سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس سے ایک دن پہلے تک سارا محلّہ کسی خاموش جھیل کی طرح پرسکون تھا۔ روز کی طرح سونے سے قبل دو تین گھنٹوں کے مطالعہ کے بعد جب میں نے کتاب شیلف میں رکھ کر کمرے کی لائٹ آف کر دی تو باہر رات کافی بھیگ چکی تھی۔ میرا

کمرہ مکان کی اوپری منزل پر تھا۔ بستر پر دراز ہونے سے قبل میں نے جب دریچے سے باہر نظریں دوڑائیں تو اس وقت بھی محلے کے کچھ زندہ دلان سڑک پر مٹر گشتی میں مصروف تھے۔ خود میرے بچے نچلی منزل میں شاید ڈش پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ چونکہ اگلے دن اتوار کی چھٹی تھی اس لیے میں نے انہیں اپنے مخصوص انداز میں سو جانے کے لیے کہا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے اس رات سونے سے قبل لیکسوتنل کی گولی بھی لی تھی اور بستر پر دراز ہوتے ہی اتنا غفیل ہو گیا تھا۔ کب تک سوتا رہا تھا، اس کا مجھے ہوش نہیں مگر آنکھ روز کی طرح خود سے نہیں کھلی تھی اور نہ الارم بجنے کی مخصوص آواز نے مجھے بیدار کیا تھا۔ وہ تو ایسی بھیانک آوازیں تھیں کہ مجھے ہڑبڑا کر اٹھ جانا پڑا تھا۔ کچھ دیر تک تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے سارا مکان زلزنے کی زد میں آکر ادھر ادھر ڈولنے لگا ہے۔ دریچوں کے شیشے مسلسل بجتے جا رہے تھے۔ میں بستر پر بیٹھا بکھرے ہوئے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے دروازے پر اپنی بیٹی کھڑی نظر آئی۔

"ابو۔ باہر گولیاں چل رہی ہیں۔" اس کا چہرہ خوف زدہ پڑ گیا تھا۔ "امی نے کہا ہے کہ آپ دریچے کے پاس نہ جائیں۔" ...... وہ تو یہ کہہ کر نیچے چلی گئی مگر میں نے صورت حال کی سنگینی کے متعلق سوچا تو پہلی مرتبہ عدم تحفظ کے احساس نے میرے اندر اتھل پتھل سی مچا دی۔ اب باہر کا شور صور اسرافیل کی گونج پیدا کرنے لگا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گولیوں کے ساتھ اب برسٹ کی زناٹے دار آوازیں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں۔ شہر کے شمال کی دہشت گردی اور خانہ بربادی نے اب جنوب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وال کلاک سے معلوم ہوا کہ صبح کے نو بج چکے ہیں۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر جیسے میرے اندر کے خوف نے میرے سارے وجود کو منجمد کر دیا تھا۔ میں بستر کے بیچوں بیچ آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ اندیشوں کی تلوار میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ تقریباً دس منٹوں تک متحارب گروپوں کے درمیان شدید فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ کلاشنکوف کے برسٹ بھی وقتاً فوقتاً مارے جاتے رہے۔ ان مکروہ آوازوں سے میری کیفیت جیسے بگڑتی گئی۔ مجھے احساس تھا کہ میں خوف زدہ ہوں مگر خالی الذہنی کی وجہ سے میرے سوچنے کی ساری صلاحیتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب طوفان کے بعد کی خاموشیاں پھیل چکی تھیں۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کچھ دیر بعد پہلے تک خود کار ہتھیار اپنے منہ سے چاروں طرف آگ اگل رہے تھے۔

جب میرا دس سالہ بیٹا جامی کمرے میں آیا تو اس وقت میں بالکونی میں کھڑا باہر دیکھنے میں منہمک تھا۔ بڑا عجیب سا ہولناک منظر میرے سامنے تھا۔ چوراہے سے ذرا پرے سڑک

پر چار نوجوانوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے ارد گرد سرخ سرخ خون منجمد حالت میں بکھرا ہوا تھا۔ شاید یہ وہی خون تھا جو کچھ دیر قبل تک ان کے زندہ جسموں کی رگوں میں دوڑ تا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اب محلے والے بھی گھروں سے نکل آئے ہیں مگر کسی نے اب تک لاشوں کے قریب جانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ سب جانتے ہوں گے کہ کچھ دیر بعد کرخت چہروں والے وردی پوش موبائیلوں میں وہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ کوئی بھی اپنے لیے خواہ مخواہ کی مصیبت کھڑی کرنے کو بالکل تیار نہیں تھا۔

اب جامی میرے بالکل قریب آکر بالکونی کی جھری سے سب کچھ دیکھنے میں محو ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے تو سوچا کہ اس کو نیچے بھیج دوں۔ بچہ ہے دس سال کا۔ ذہن پر برے اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ ہمارے محلے میں دہشت گردی کا یہ پہلا واقعہ تھا مگر شہر کی زندگی تو ایسی لاتعداد خونی وارداتوں سے بہنے والی لہو کی سرخیوں کا نظارہ کر چکی تھی۔ اب انسانی لہو ہی اس بدقسمت شہر کی پہچان بن چکا تھا اور چونکہ جامی بھی ایک شہری ہے، لہٰذا اس مخصوص پہچان سے اس کا روشناس ہونا بے حد ضروری تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ موت نگر کے باسی ہونے کی حیثیت سے اب جامی بھی اطراف کی لہو رنگ حقیقتوں سے پوری طرح باخبر ہو چکا ہے۔ میرا اندازہ شاید غلط نہیں تھا کہ وہ شے کی حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کی غرض سے ہر طرف نظروں کو دوڑاتا جا رہا تھا اور لبوں کی آزادی کے باوجود اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ سوال تو وہ پوچھتے ہیں جنہیں صورت حال کی خبر نہیں ہوتی اور صورت حال سے باخبر ہونے کے بعد کسی کو کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟

اب صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ یہاں وہاں کھڑے لوگوں کو ہجوم ہی کا نام دیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ لاشوں کے قریب کسی ذی نفس کا کوئی پتہ نہیں تھا مگر مکانوں کے دروازوں اور فلیٹوں کی بالکونیوں اور دریچوں پر لوگوں کی ایک بڑی تعداد نظر آ رہی تھی۔ اتنے سارے افراد کی موجودگی کے باوجود ہر طرف موت کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ سب کے ہونٹوں پر قفل سکوت تھا مگر چہروں سے ان کے اندر کی خوف زدگی کو آسانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا تھا۔ میرے اندر بھی ہول کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی مگر میں بھی اوروں کی طرح ایک بے بس معمول بن کر لاشوں کو ٹک ٹک تکتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ سامنے کا سارا منظر دھندلا چکا ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کے باوجود میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس کانوں میں ایسی پراسرار، مانوس اور عجیب و غریب آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے سارا مجمع سرگوشیوں کے مدہم لہجے میں باتیں کرنے لگا ہو۔ میں اس وقت چونکا جب جامی مجھے بری

طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں ہڑبڑا گیا۔ اگرچہ میری آواز خوش گوار نہیں تھی مگر اس کی یہ حرکت مجھے دوبارہ ہوش کی دنیا میں لے آئی تھی۔ اب وہی خوں ریزی کے بعد کا منظر تمام تر جزئیات کے ساتھ میری نظروں کے سامنے تھا۔ "کیا بات ہے جامی؟" میں نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

"ابو۔ آپ دیکھیں نا اس طرف...... " جامی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک لاش کی طرف مجھے متوجہ کیا۔ میں نے محسوس کیا، کرب و اذیت کے موقعوں پر بھی آدمی کا منہ حیرت کے سبب کھلا کا کھلا رہ سکتا ہے۔ اس وقت میری اندرونی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جامی کا جرمن شیفرڈ کتا شیرو ایک لاش پر بھرپور جائزہ لینے کے انداز میں جھکا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سارے بال پھولے ہوئے تھے اور وہ زبان نکالے بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ اس منظر کو ارد گرد کھڑے لوگ بھی حیرت اور توجہ کے جذبات کے ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ پھر شیرو باری باری ہر لاش کے پاس جاتا رہا اور جھک کر چند لمحوں تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ جانے کیا کیا دیکھتا رہا۔ ایک کتے کا یوں انسانی لاشوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنا میرے لیے ایک بالکل ہی عجیب تجربہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجمع کے دوسرے لوگ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے۔

"جامی۔ تم نے اپنے کتے کو باہر کیوں چھوڑ دیا؟" میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ شیرو کو ہر صبح حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے لیے باہر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شیرو اپنے باوقار طرز عمل سے سب پر یہ بات واضح کر دیتا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ نسل کا کتا ہے۔ محلے کے کتوں سے میل ملاپ اور یاری دوستی کو وہ بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنا زیادہ تر وقت گھر ہی میں گزارتا تھا۔ یہ کتا پچھلے دو برسوں سے ہمارے گھر میں بڑے مزے سے رہ رہا تھا۔ جب گھر میں لایا گیا تھا تو بالکل چھوٹا سا کھلونا دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت زیادہ تر دودھ ہی پر اس کا گزارا ہوتا تھا مگر اب تو توانا اور تنومند ہو گیا تھا اور قد و قامت میں بھی کافی بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس کا کسی بے حد شائستہ گھرانے سے تعلق تھا۔ اس کو ہر چیز کھانے پر بالکل مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چھیچھڑے اور کچا گوشت تو دور کی بات، وہ ایسی ویسی ڈشوں کو دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیتا تھا۔ اس کی غذا وہی تھی جو گھر کے افراد روز کھاتے تھے۔ ایک بار میں نے جامی کو آئس کریم کھلاتے دیکھا تو بڑی مشکل سے مجھے یقین آیا۔ وہ بھی دم ہلا ہلا کر بدمست انداز میں

مزے لے لے کر آئس کریم کھا رہا تھا۔ یوں ہی چلتے پھرتے کبھی کبھی میں محسوس کرتا کہ وہ اپنے اس دوسرے جنم میں کتے کے جون میں اس دنیا میں آگیا ہے...... گھر میں سرونٹ کوارٹرز کے قریب اس کے لیے مناسب جگہ کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ عادات واطوار میں بھی وہ عام کتوں سے بالکل مختلف تھا۔ جامی سے تو اس کی ایسی دوستی ہو گئی تھی کہ اس کے اشاروں کے پیغامات کو بھی سمجھ جاتا تھا۔ جامی کو اپنے سے زیادہ اس کا خیال رہتا تھا۔ اسکول جانے سے پہلے اور اسکول سے آنے کے فوری بعد وہ ملازم کو شیرو کے متعلق ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اگرچہ مجھے کتوں یا دوسرے جانوروں سے کبھی کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا تھا مگر جب میرے ایک قریبی دوست نے شیرو کی بابت بات کی تھی تو میرے کچھ کہنے سے پہلے جامی فوراً بول اٹھا تھا۔

''انکل پلیز...... ہمیں یہ ڈاگی دے دیجیے۔ پلیز۔''

اب میرے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش بھی نہیں رہ گئی تھی اور پھر ویسے بھی شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر گھر میں ایک جرمن شیفرڈ کی موجودگی کو بلا جواز نہیں کہا جا سکتا۔ کتوں کے تو کیا، میں انسانوں کے حسب نسب کا بھی کبھی قائل نہیں رہا تھا مگر چند مہینوں کے اندر شیرو نے اپنے مہذبانہ طرز عمل اور اعلیٰ ظرفی سے گھر کے ہر فرد کو اپنا گرویدہ بنا دیا تھا۔ محلے کے بازاری کتوں کو تو کیا، وہ گھر آنے والے ایسے ویسے کم مرتبہ لوگوں کو بھی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ ایک مرتبہ میرے آفس کا چپراسی نہ معلوم کس وجہ سے اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ شیرو کی مخصوص غراہٹ نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس جانور کے گھر میں آنے کے بعد جیسے مجھے اور گھر والوں کو عدم تحفظ کے احساسات سے نجات حاصل ہو گئی تھی۔ سونے سے قبل اسے گھر کے بیرونی صحن میں چھوڑ دیا جاتا، جہاں اس کی باخبر چوکسی ایک فرض شناس چوکیدار کی چوکنا نگہبانی کو بھی بہت پیچھے چھوڑ سکتی تھی۔ کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ قلانچیں بھرتا تو اس انداز سے جیسے کسی کی گردن میں اپنے سارے دانت پیوست کر دے گا۔ کبھی صحن کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھتا تو یوں کان کھڑے رکھتا جیسے گھر سے کچھ دور گزرنے والے کسی مشتبہ شخص کی بو سونگھ رہا ہو۔ لان کے اردگرد گھر کے بیرونی صحن اور دیگر کونے کھدروں میں یوں منڈلاتا پھرتا جیسے سچ مچ کسی چور کو تلاش کر رہا ہو۔ رات بھر نہ جانے کیا کیا کرتا رہتا مگر ایسی کوئی حرکت نہ کرتا جو گھر والوں کی نیندوں میں خلل اندازی کا باعث بن سکتی۔ گھر کے باہر کبھی کوئی آہٹ محسوس ہوتی تو وہ پہلی تنبیہ کے طور پر زور زور سے ایک مخصوص انداز میں غرانے لگتا۔ بھونکنے کی نوبت اس وقت پیش آتی جب اس کے شک کو تقویت پہنچتی کہ غراہٹ کے باوجود بھی باہر کوئی بری نیت کے ساتھ کھڑا ہے۔ گھر

کے کسی فرد نے اسے کبھی شعوری طور پر سدھانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی مگر اسے تو جیسے نہ صرف اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری کا احساس تھا بلکہ وہ ہر وقت ان کی انجام دہی میں مصروف بھی نظر آتا تھا۔

"ابو......ابو...... دیکھیے یہ شیرو کیا کرتا پھر رہا ہے۔" مجھے جامی کی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"کیا کر رہا ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ میرے خیالات کے تانے بانے بکھر گئے تھے۔

"آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کیا؟" جامی کی آواز میں ناراضگی سے زیادہ تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ "میں خود جاکر اسے گھر لے آتا ہوں۔"

"ارے نہیں بیٹا۔" میں نے محسوس کیا میں گھبرایا ہوا ہوں۔ "اس وقت گھر سے باہر نکلنا خطرناک ہے۔" اس کے آگے جامی شاید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس نے بھی یقیناً دوسرے تمام لوگوں کی طرح دور سے شور مچاتی ہوئی کئی موبائیلوں کو قریب آتے دیکھ لیا تھا جو آہستہ آہستہ لاشوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پھر جیسے ہجوم کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان نے نگل لیا تھا۔ وردی پوشوں کی آمد کے چند لمحوں کے اندر ہی ہمارے محلے میں سناٹوں کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ سب لوگ گواہی کے عذاب سے بچنے کے لیے ادھر ادھر رفوچکر ہو گئے تھے۔ خود میں بھی گھبراہٹ میں جامی کو جلدی سے کمرے میں لے آیا تھا۔ اور فی الفور بالکونی کی طرف کھلنے والے دروازے کو بند کر دیا تھا۔ چونکہ میں ایک بے حد محتاط شخص ہوں لہذا میں نے دریچے کو بھی اچھی طرح پردے سے ڈھک دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس شہر میں دہشت گردی کی طرح قانونی رسمیات بھی انسانی حسیات کے لیے بے انتہا اذیت کا باعث ہو سکتی ہیں۔ ضابطے کی کاروائی کا عذاب محلے کے بہت سے گھروں کو جھیلنا پڑا۔ پوچھ گچھ اور قانونی خانہ پری کے بہانے بہت سے مکینوں کو تنگ بھی کیا گیا۔ جب میں نے قریب کے فلیٹوں سے عورتوں کی چیخ و پکار کی آوازیں سنیں تو سمجھ گیا کہ وردی پوش محلے کے کم عمر لڑکوں کو اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ چھان بین کے بہانے یرغمال بنائے جانے والوں کی رہائی کی قیمت پچاس ہزار روپے فی نوجوان سے کم نہیں ہوا کرتی تھی۔ اگر گھر والوں سے رقم کا انتظام نہ ہو سکتا تو ان کے جگر گوشوں کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ ان کے خلاف بیک وقت کئی خطرناک قسم کے فوجداری کے الزامات رجسٹر ہو جاتے اور رہائی تو دور کی بات، ان کا ضمانت پر باہر آنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ شاید قسمت ہم پر مہربان تھی کہ ہمارے بند دروازے پر کھٹکھٹاہٹ کی

ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ موبائیلوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں تو میں نے بے اختیار اپنے سینے پر سے ایک وزنی بوجھ کو ہٹتے ہوئے محسوس کیا۔ مگر آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد جیسے ہمارے محلے کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ادھر ادھر لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں چہ میگوئیوں میں مصروف نظر آنے لگیں۔ میں بھی باہر آگیا تھا۔ محلے کی کئی عورتوں کو میں نے فلیٹوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ ان نوجوانوں کی ماؤں اور بہنوں کی تسلی و تشفی اور ان کا دکھ بانٹنے کی خاطر وہاں جا رہی تھیں جن کو کرخت چہرے والے وردی پوش تفتیش اور پوچھ گچھ کے بہانے تھانے لے گئے تھے۔ کچھ لوگوں سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ چاروں مقتول نوجوان ہمارے محلے کے نہیں تھے۔ اگرچہ یہ بات باعث اطمینان تو تھی مگر اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ محلے والے میری طرح بے نام تشویش اور اندیشوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ تردد بھلا کیا کم تھا کہ جنوب کا محفوظ علاقہ بھی اب غیر محفوظ ہو کر رہ گیا تھا۔

اب محلے والوں کی مزید باتوں پر دھیان دینا میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ سب تصویر کے تاریک رُخ کے حوالے سے مایوسی اور ناامیدی کی ایسی باتیں کر رہے تھے کہ مجھے اپنے اندر کا خوف پکے ہوئے السر کی طرح دکھتا ہوا محسوس ہوا۔ عورتوں کی دردناک گریہ و زاری کے پس منظر میں اردگرد کی ہر شے کے تعلق سے خالی پن کا تصور پھیلتا جا رہا تھا۔ جب میں واپس گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ شیرو گھر واپس آگیا ہے اور جامی ہر ممکن طریقے سے اس کو ناشتہ کھلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کتا بڑی ابتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم کے بال مجھے اب بھی پھولے ہوئے سے نظر آئے۔ وہ تھوتھنی لٹکائے، نظریں جھکائے ہلکے ہلکے کپکپا رہا تھا۔

"کیا بات ہے جامی؟"

"ابو شیرو نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" جامی نے بڑی تشویش کے ساتھ میری بات کا جواب دیا۔ "آپ دیکھیں یہ کیسے کانپ رہا ہے۔"

"جب اسے بھوک محسوس ہوگی تو وہ خود کھائے گا۔" میں نے جامی کو سمجھایا۔ "خواہ مخواہ اپنی توانائی اس پر برباد نہ کرو۔" ابھی میں نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ شیرو نے بڑے عجیب انداز میں جھرجھری سی لی۔ پہلی مرتبہ اس نے گردن اٹھائی تو میں نے دیکھا کہ اس کی دو موٹی موٹی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔ یکایک وہ سب کو یوں باری باری دیکھنے لگا جیسے ہمارے چہروں سے ہمارے ارادوں کو بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ دیر اس کام میں مصروف رہنے کے بعد اس نے صحن سے نظر آنے والے آسمان کی طرف رخ کر کے ایسی تیز، نامانوس اور گونجتی ہوئی آواز نکالی کہ قریب کھڑے سب لوگ ایک قدم پیچھے ہٹ

گئے۔ اگر شیرو میرے سامنے ایسی بھاری بھر کم آواز نہ نکالتا تو میں کبھی یقین نہ کرتا کہ یہ کسی کتے کی آواز ہے۔ کتا تو کیا میں نے کسی بھی جانور کو کبھی ایسی آواز میں چیختے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مجھے تو لگا جیسے وہ پکار ایک ایسے آدمی کی بیٹھی ہوئی آواز سے مختلف نہیں تھی جو کافی دیر تک مسلسل آہ وزاری اور رونے پیٹنے میں مصروف رہا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ وہ شیرو نہیں جو پچھلے دو برسوں سے بڑے ناز نخروں کے ساتھ پرورش پاکر اس گھر میں جواں سال ہوا تھا۔ آج تو جیسے اس کے نزدیک گھر کا ہر فرد اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بار بار ہم سب کو بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ شاید اس کے جسم کی ہلکی ہلکی کپکپاہٹ، اس کا بدلا ہوا تیور کسی ایسے خوف کا ردعمل تھا جس کے متعلق وہ خود بھی غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور اوپری منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

سارا دن بڑی بے کیفی کے ساتھ گزارا۔ اتوار کو ہماری گلی میں گوشت اور سبزی کی دکانوں کے علاوہ دوسری بہت سی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ سڑکوں پر کم عمر لڑکوں کا کرکٹ میچ بھی سارا دن جاری رہتا تھا مگر اس دن باہر غیر اعلانیہ کرفیو کا سا سماں نظر آیا تھا۔ محلے کی ساری گلیوں میں خاموشیوں اور سناٹوں نے اپنا ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ احتیاط اور خوف کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر محلے والوں نے گھر کے اندر سے اپنے دروازوں کو مضبوطی کے ساتھ بند کر لیا تھا۔ شاید ایسے ہی حالات میں چہار دیواریوں میں مقید ہونے کا تصور لوگوں کو کافی حد تک عدم تحفظ اور غیر یقینی کیفیت سے نجات دلا سکتا تھا۔

پتہ نہیں یہ صبح کے واقعے کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ کہ ذہن عالم بے معنی کی دھند میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ بار بار تصور میں آتش سیال سے ہم کنار کرنے والا ایک ایسا منظر ابھر آتا جس میں چار مسخ شدہ لاشوں کو سڑک پر کسمپرسی کی حالت میں پڑا ہوا پاتا۔ ان کی کھلی ہوئی آنکھیں خلاء میں کروڑوں میل اوپر نہ معلوم کن آسمانوں میں گھورے جا رہی تھیں۔ شاید برزخ کے اس مقام خاص کو تلاش کر رہی ہوں جہاں ان کی روحیں جسموں کا رشتہ توڑنے کے بعد جمع ہو گئی تھیں۔ ذہن تھکن سے چور ہو گیا تو گہری نیند کا غلبہ مجھ پر حاوی ہو گیا۔ پتہ نہیں میں کب تک سوتا رہا۔ شاید کافی دیر تک سوتا رہا تھا کہ جب مختلف ناقابل فہم آوازوں سے میری آنکھیں کھلیں تو ذہن سے پر اسرار جادو نگری کا ہر منظر غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اچانک ٹوٹتے ہوئے جسم کو ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ اگرچہ ذہن پوری طرح کام کرنے لگا تھا مگر ابھرتی ہوئی آوازوں کے نقطہ ارتکاز کا تعین کرنا اس وقت میرے لیے دشوار گزار مرحلے کو طے کرنے کے مترادف ہو گیا تھا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ بہت سارے افراد شور وغل مچانے

میں مصروف ہو گئے ہیں اور کوئی کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں ہے۔ پھر اچانک پس منظر میں ہچکیوں اور سسکیوں کی دردناک آوازوں کی گونج شامل ہو جاتی تو کمرہ ایک پیالہ بن کر صدیوں کی گریہ وزاری کے اثرات سے لبریز ہو کر قطرہ قطرہ چھلکنے لگتا۔ میں اس پر اسرار مگر ناقابل ادراک صورت حال کے متعلق سوچتا جا رہا تھا کہ یکایک شیرو کے لگاتار بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مگر یہ بھونکنے کی آوازیں تو نہیں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فریاد کی بھاری لے میں اپنی اس اذیت ناک کیفیت سے سب کو باخبر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے وہ اس وقت دو چار تھا۔ وہ چند لمحوں تک مسلسل بھونکتا گیا پھر آہستہ آہستہ اس کے بھونکنے کی آوازیں مدہم پڑتی ہوئی دور ہوتی گئیں۔ اگرچہ اب شیرو نے بھونکنا بند کر دیا تھا مگر ارد گرد کے ناقابل فہم آوازوں کے شور سے اب بھی میرے کان بجتے جا رہے تھے۔

سہ پہر کے وقت جامی میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شیرو مکان کی دیوار پھلانگ کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیرو اب اس گھر میں بالکل رہنا نہیں چاہتا۔ میں نے پر خیال انداز میں اپنے دس سالہ بیٹے کو دیکھا جو بڑے منطقی انداز میں اپنے استدلال پیش کر رہا تھا۔

''ابو میرا خیال ہے۔'' اس کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔ ''شیرو بے حد خوف زدہ ہے۔ اب آپ خود سوچیں ایسے حالات میں وہ کس طرح ہم پر اعتبار کر سکتا ہے۔'' میں جامی کی بات پر بری طرح چونکا۔

''جامی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے اس کے متین چہرے کی طرف دیکھا۔ ''تم بہت الجھی الجھی باتیں کر رہے ہو۔ صاف صاف کہونا......''

''ابو میرا خیال ہے، لاشوں کو اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد وہ خوف زدہ ہو گیا ہے۔'' جامی رک رک کر ایک خاص انداز سے مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''جب فائرنگ ہو رہی تھی تو اس وقت وہ گھر سے باہر تھا۔ یقیناً اس نے مرنے اور مارنے والوں کو دیکھا ہو گا۔''

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں جامی کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ''بیٹا...... یہ تو سوچو کہ وہ اس وقت باہر تھا اور بالکل ہی غیر محفوظ...... لہذا اس کا خوف زدہ ہونا یقینی سی بات تھی مگر یہاں تو وہ گھر میں ہے۔ انسانوں کے درمیان رہ رہا ہے۔ یہاں تو اس کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔''

"ابو یہی تو میرا پوائنٹ ہے۔" جامی کا چہرہ جذبات کی تپش سے سرخ ہو گیا۔
"کیسا پوائنٹ؟"
"یہی کہ وہ انسانوں سے خوف زدہ ہے۔" جامی کی یہ منطق بڑی نرالی تھی۔ "اس نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے کہ انسان نے انسان کو قتل کیا ہے۔ پہلے اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا کہ انسان اس قدر کٹھور بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر وہ خود کو انسانوں کے بیچ کیسے محفوظ سمجھ سکتا ہے ......" یہ دس سالہ بچے کی وہ منطق تھی جس کی نفی کرنے کے لیے اس وقت میرے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی۔ جامی اس وقت پیدا ہوا تھا جب شہر میں ہنگاموں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ہمارے نزدیک تو وہ محض ایک بچہ ہی تھا مگر شہر پر آشوب کی خوں ریزیوں اور حشر انگیزیوں نے شاید وقت سے بہت پہلے اس کو بلوغت اور پختگی بخش دی تھی۔ اور وہ غارت گری اور دہشت گردی کے حوالے سے ہر واقعے کی تشریح مجھ سے کہیں بہتر طریقے سے کر سکتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی یہ ساری مختصر زندگی ہی لہولہان شہر کے خونی واقعات کے مطالعے میں گزرتی رہی تھی۔ جب کہ میں نے ان خونچکاں وارداتوں کے علاوہ بھی وہ سب کچھ دیکھا تھا جس کی ان حالات میں اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔
"بیٹا تم پریشان نہ ہو۔ میں خود باہر جا کر شیرو کو گھر لے آؤں گا۔" میں نے جامی کی جذباتی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ آج صبح سے محلے میں جو کچھ ہو تا رہا تھا اس نے بحر الکاہلی طبیعت رکھنے والوں کو بھی دہلا کر رکھ دیا تھا۔ جامی تو محض ایک دس سالہ بچہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ کی غور و فکر سے اس کے ذہن پر غلط قسم کے اثرات مرتب ہوں۔ جب وہ کمرے سے جانے لگا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔
"جامی ...... میں کافی دیر تک شیرو کے بھونکنے کی آوازیں سنتا رہا ہوں۔" میں ایک لحظے کے لیے رکا۔ "مگر اس کے ساتھ عجیب و غریب قسم کا شور و غل کیسا تھا"؟ میں نے دیکھا، کمرے سے نکلتے نکلتے اچانک جامی رک کر مجھے دیکھنے لگا ہے۔ اس کا چہرہ حیرتوں کی گزرگاہ بنا ہوا تھا۔
"شیرو کے بھونکنے کی آوازیں ...... عجیب و غریب قسم کا شور و غل ......" میں نے محسوس کیا اس کا لہجہ اس کے ناقابل بیان محسوسات کا مظہر بن کر ابھرا ہے۔ "ابو یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"
اب اس کے ساتھ خواہ مخواہ کی بحث میں الجھنا میرے لیے ایک بے فائدہ سی بات تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جس ماورائے عقل کیفیت کی بدولت میں کچھ دیر پہلے تک کوہ طلسمات کی انتہائی بلند چوٹی پر الف پہلوی ابوالحسن بن کر بیٹھا رہا تھا، اس کے متعلق مزید کچھ

کہہ کر جامی کے کچے ذہن کے کنفیوژن میں اضافہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میں نے دیکھا کہ کمرے سے نکلنے سے پہلے جامی نے مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی، جیسے اسے میری صحیح الدماغی کے متعلق تشویش پیدا ہو گئی ہو۔

شام ڈوبنے سے پہلے میں جامی کو لے کر باہر نکل گیا۔ ہم دونوں شیرو کی تلاش میں محلے والوں سے پوچھتے پھر رہے تھے۔ مجھے کتے بلّیوں کی تلاش سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ بلا سے وہ کہیں بھی چلا جاتا مگر میں جانتا تھا کہ اس کے یوں غائب ہو جانے سے جامی جذباتی طور پر بکھرا بکھرا سا نظر آنے لگا تھا۔ اگرچہ اس نے شیرو کی تلاش کے سلسلے میں مجھ سے بالکل کچھ نہیں کہا تھا مگر کتے سے جامی کا بے پناہ لگاؤ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی آزردگی اور دل گرفتگی کو بھلا میں کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ چونکہ محلے میں شیرو کی کافی دھوم تھی اور بہت سے گھروں میں اس کے شائستہ عادات و خصائل کا تذکرہ رہتا ہی تھا، لہذا مجھے یقین تھا کہ اپنی خاندانی نجابت کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک روپوش نہیں رہ سکے گا۔ میرا خیال درست نکلا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ ہمیں نظر آگیا۔ مگر جس حال میں وہ ہمارے سامنے تھا اس کے متعلق میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جامی کی حالت بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھی بلکہ اس کے تحیر میں وحشت زدگی بھی گھل مل کر رہ گئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک دودھ والے کی دکان سے ذرا پرے شیرو بڑی بے نیازی کے ساتھ تین چار بازاری کتوں سے انجانی شرارتوں کے کھیل میں مصروف ہے۔ اس کے لمبوترے چہرے کی خوف زدگی معدوم ہو چکی تھی۔ ہلکے سرمئی رنگ کے بڑے بڑے بال بھی پھولے ہوئے نہیں تھے۔ جن کتوں کی بو سونگھتے ہی وہ پاگل پن کی حد تک غضب ناک ہو جایا کرتا تھا آج وہ ان کی رفاقت میں ہر طرح کی فکر مندی اور تشویش سے آزاد نظر آرہا تھا۔ آج ہمارے سامنے ایک بالکل ہی نئے مزاج کا شیرو تھا۔ محلے کے آوارہ گرد کتے تو کیا، وہ تو گھروں میں کام کرنے والے نوکروں کو بھی قریب پا کر یوں غرانے لگتا تھا جیسے انہیں اپنی اوقات یاد دلا رہا ہو۔ مگر آج تو اس کے طرز عمل میں وہ تنک مزاجی اور تیکھے تیوروں والی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اور جامی نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر درمیان کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کسی جانب سے نہیں ہوئی۔

جب جامی کو یقین ہو گیا کہ میری طرف سے کسی کارروائی کا کوئی امکان نہیں ہے تو وہ ذرا آگے بڑھا مگر اتنا آگے بھی نہیں کہ بازاری کتے اس پر جھپٹ پڑتے۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ شیرو شاید اسے نگاہ غلط انداز سے ہی دیکھ لے مگر اُسے بھلا کہاں فرصت تھی کہ وحشیانہ

کھیل کی لطف اندوزیوں کو بھول کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتا۔ جب جامی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک اٹھا تو پھر اس کے لیے شیرو کو اپنی جانب متوجہ کرنا ایک طرح سے ناگزیر ہو گیا۔ تھوڑا سا اور جھک کر اس نے ایک خاص انداز سے اپنے دونوں لبوں کو جوڑا اور پھر دوسرے ہی لمحے ہلکی ہلکی سیٹی کی گونج ادھر ادھر پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا شیرو جیسے اچانک ہی اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے لمبوترے چہرے پر حیرانی کے آثار بڑے عجیب دکھائی دینے لگے تھے۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ جامی اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ جائے گا۔ کچھ دیر اپنی جگہ جمے رہنے کے بعد اس نے ایک جھرجھری سی لی اور دوسرے کتوں کے درمیان پہنچ گیا۔ وہ منظر میرے لیے ناقابل بیان تھا اور ناقابل یقین بھی...... سارے کتے آنکھوں، چہروں اور جسم کی حرکات واشاروں سے جیسے پیغام رسانی اور تبادلہ خیال کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ یہ سلسلہ بس چند لمحوں تک جاری رہا اور اس کے بعد میں نے دیکھا کہ شیرو اپنے ساتھی کتوں کو چھوڑ کر دم ہلاتا ہوا جامی کے قریب آگیا۔ وہ بار بار اپنا جسم اس کے پتلون کے ساتھ رگڑتا جارہا تھا۔ کبھی وہ نیم باز نظروں سے جامی کو دیکھتا اور پھر دم ہلاتے ہوئے مہین سی آواز میں راز و نیاز جیسی سرگوشیوں میں اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتا۔ جامی کچھ دیر تک اس کے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر جب ہم دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے تو شیرو خاموشی سے ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ سورج ڈوبنے کی سرخیوں نے مغربی افق کو لہولہان کر دیا تھا۔

اس رات بالکونی کے باہر کا منظر دیکھ کر میرے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔ اجڑے ہوئے راستوں کا دور تک پھیلا ہوا سناٹا محلے والوں کی خوفزدگی کو آشکار کر رہا تھا۔ اس قدر دبیز خاموشی تھی کہ چھوٹی چھوٹی دکانوں کے کونے کھدروں میں دبکے ہوئے کتوں نے بھی خوف کے مارے بھونکنا بند کر دیا تھا۔ میرے گھر کے بائیں طرف کا راستہ دو تین کلومیٹر کے بعد سائیں سائیں کرتے ہوئے بلند قامت درختوں کے ویرانے سے جاملتا تھا۔ اگرچہ یہ مقام غیر محفوظ نہیں تھا مگر وہاں دن میں بھی کسی کو جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جس شہر کی آبادیوں میں دس بیس لاشیں روز گرتی ہوں وہاں کے بے آباد خرابوں میں کسی کو جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی؟ میں بڑی رات گئے تک کرسی پر بیٹھا بالکونی سے باہر گھپ اندھیروں میں نہ معلوم کیا کیا دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہر طرف اس قدر خاموشی تھی کہ مجھے اپنے وجود سے بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ آج جیسے محلے کے ہر فرد نے بالکل ہی نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ہر روز بڑی رات گئے تک ٹولیوں میں خوش گپیاں

کرنے والوں نے بھی آج خود کو گھروں میں مقید کر رکھا تھا۔ آدھی رات سے ذرا پہلے میں نے محسوس کیا جیسے چند کلومیٹر کے فاصلے کا سویا ہوا ویرانہ خود کار ہتھیاروں کی آگ اور شور سے بیدار ہو گیا ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد روشنی کے چھپاکے کے ساتھ کلاشنکوف کے برسٹ کی دل دہلا دینے والی آوازیں آنے لگتیں۔ کہیں دور یقیناً دو متحارب گروپ شدید فائرنگ کے تبادلے میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے مکانات کی اوپری منزلوں کی روشنیاں بجھا دی گئی ہیں۔ میرا کمرہ تو بہت پہلے سے تہہ دار اندھیروں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ میں دروازے کے قریب کرسی میں نہ جانے کب سے دھنسا ہوا تھا۔ میں ساحل سے طوفان کا نظارہ نہیں کر رہا تھا بلکہ میں تو خود کو ایسا کشتی بان محسوس کر رہا تھا جس کی ٹوٹی ہوئی کشتی ساحل سے دور بپھرے ہوئے طوفانوں میں گھر چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ نچلی منزل کا ایک چکر لگا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔ شیرو کی خیریت بھی مجھے نیک مطلوب تھی کہ صبح فائرنگ کے بعد سے تو جیسے اس کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ مگر نچلی منزل پر سناٹوں نے اپنا تسلط جما لیا تھا۔ شیرو کی بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنے تمام حوصلوں کو مجتمع کر کے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر جیسے کرسی نے مجھے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ شاید ذہنی طور پر وہیں بیٹھنے کا خواہش مند تھا، لہٰذا میں نے دوبارہ کرسی سے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بالکونی سے باہر اندھیروں میں گھورتا رہا۔

میں نے سوچا مجھے سو جانا چاہئے کیونکہ رات سفر کرتے ہوئے کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ مگر ذہنی سکون بخشنے والی لیکسوٹنل کی دو گولیوں کے استعمال کے باوجود میری آنکھوں میں نیند نام کی شے کا کوسوں دور پتہ نہ تھا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں اب بند ہو گئی تھیں مگر اطراف کے سناٹے کا خوف رگوں میں خون کے ساتھ بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے اچانک باہر کی خاموشیاں میرے ذہن کے تیز رفتار خیالات سے ٹکرا گئی ہیں۔ میرے وجود کی اکائی نہ معلوم کتنے ریزوں میں منقسم ہو کر ہر طرف بکھر گئی تھی۔ جیسے ہر ریزے کو اندھیروں کے سائیکلوپس نے نگل لیا تھا۔ میں نے اپنے آپ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹ کر دوبارہ اکائی میں منتقل کرنے کی کوشش کی تو جیسے میرے سوچنے کی تمام تر صلاحیتوں کو کوئی اپنی آہنی مٹھی میں دبا کر دیر تک بے دردی کے ساتھ مسلتا رہا۔ گھٹن کا احساس دو چند ہوا تو میرے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو ٹٹولا۔ اگر وہاں کوئی چیز ہوتی تو یقیناً میرے ہاتھ سے ٹکرا جاتی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ چند لمحوں قبل کسی نے میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔ میرا ابو جھل سر بھاری ہوتا گیا اور شاید

کرسی ہی پر سمٹی ہوئی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔
خدا معلوم وہ نیند تھی یا ڈراؤنے خواب میں نامعلوم قوتوں سے برسرپیکار ہو رہا تھا۔ بڑے دل دہلا دینے والے مناظر ذہن کے پردے پر ابھرتے رہے تھے اور میں خواب کی حالت میں بھی خوف زدگی کو محسوس کرتا رہا تھا۔ میں نے ایک منظر دیکھا کہ چند کفن پوش مردے ایک جنازے کو کندھا دے رہے ہیں تو اس کے بعد کے منظر میں چند خونخوار قسم کے وردی پوش مجھے بے لباسی کی حالت میں تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اسی خواب کے ایک سین میں میں پسینے میں شرابور بھاگتا جا رہا تھا اور غول بیابانی کا ایک لشکر میرے تعاقب میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ دوڑتے دوڑتے میں بند گلی میں پھنس گیا ہوں اور میرا پیچھا کرنے والے مجھ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے وحشت ناک چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں جیسے انہیں یقین ہو کہ ان کا شکار ان سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ پھر میں آسمان کی طرف منہ کر کے پاگلوں کی طرح چیختا ہوں، چیختا جاتا ہوں۔ میری بلند آہنگ چیخوں پر ان کے ابلیسی قہقہوں کی گونج تیز ہو جاتی ہے۔ میرا سارا چہرہ پسینے میں نہا چکا ہے۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں اور غول بیابانی کا لشکر نوکیلے پتھر ہاتھ میں لیے مجھے سنگ ساری کی کاروائی میں مصروف نظر آ رہا ہے۔
"میرے خدا مجھے بچا لے۔ میرے خدا......" میں آسمان کی طرف منہ کر کے اپنی نجات کی بھیک مانگتا ہوں۔ اچانک نہ معلوم کہاں سے دردناک چیخوں کی وہ فلک شگن آوازیں بلند ہوتی ہیں کہ کرۂ ارض کی بنیادیں ہلتی محسوس ہوتی ہیں۔ آوازوں کی شدت میں اس قدر تیزی آ جاتی ہے کہ خوف زدہ دہشت کے سبب میں بھی حلق کے بل دیوانہ وار چیختا جاتا ہوں۔
"ابو ابو۔۔۔۔ آپ کو کیا ہو گیا؟ آپ کیوں چیخ رہے ہیں؟" اب میں چونک کر گہری نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر بہ تر ہے۔ نہ معلوم کب سے میں نیند میں چیخ رہا تھا کہ مجھے اپنا حلق بے حد خشک محسوس ہوا۔ میں ہنوز کرسی میں دھنسا ہوا تھا اور میرے قریب جامی کھڑا پر تشویش نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔
"کچھ نہیں بیٹا، میں ٹھیک ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ میں شاید مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہی خواب کی آسمان شگن دل سوز چیخیں میرے اطراف میں بلند ہو رہی ہیں۔ صبح کے دھلے ہوئے اجالوں میں ایسی قیامت خیز عزاداری میرے نزدیک غیر متوقع تھی اور حیران کن بھی۔ یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ آس پاس کے فلیٹوں کی عورتیں اور بچے رو رو کر خود کو ہلکان کر رہے تھے۔ غم ناکی کے سر اور تال نے جیسے فضا کو بے حد مضمحل کر دیا تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے جامی کو دیکھا تو اسے

میری بات کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔
"ابو۔ چوراہے پر چار لاشیں ملنے کے بعد کل فلیٹوں سے بیس پچیس آدمیوں کو وردی والے لے گئے تھے۔"
"ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" میں نے پر خیال انداز میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "شاید انہیں پوچھ گچھ کے لیے لے جایا گیا تھا۔"
"پوچھ گچھ۔۔۔" جامی زہر خند کے ساتھ بولا۔ "جی ہاں وہ اسی بہانے شہریوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔"
"مگر تم ان لوگوں کا ذکر کیوں کر رہے ہو۔" میں ذرا جز بز سا ہو گیا۔ "اس بات کا ان عورتوں کی گریہ وزاری اور چیخ و پکار سے کیا تعلق؟"
"ابو تعلق تو ہے نا، تب ہی تو بے چاری عورتیں رو رو کر جان دے رہی ہیں۔" جامی کے لہجے کی تیزابی چبھن کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ "کچھ دیر پہلے خبر پہنچی ہے کہ ان پکڑے جانے والوں میں سے چھ آدمی پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔" جامی کی بات بجلی بن کر مجھ پر گری۔ اچانک جیسے میں سناٹے میں آ گیا۔
"مرد اُن کی لاشوں کو لینے گئے ہیں۔" جامی نے اس کے بعد بھی شاید کچھ اور باتیں کی تھیں مگر میرا وجود تو جیسے ذہن کے سائیں سائیں کرتے ہوئے سناٹوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں لہو لہان انسانی لاشوں کا انبار دیکھ رہا تھا اور اس انبار میں لحظہ بہ لحظہ بے شمار لاشوں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے میرے سامنے خوف زدہ مظلوم لوگ موت کے عفریت سے ڈر کر بھاگتے جا رہے تھے اور اس بھاگ دوڑ میں مسلح وردی پوش وحشیانہ قہقہوں کا راگ الاپتے ہوئے ان کے جسموں کو گولیوں سے چھلنی کرتے جا رہے تھے۔۔۔ نہ معلوم میں کب تک خیالات کی دنیا کا باسی بنا رہتا کہ اچانک نچلی منزل سے شیرو کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں آنے لگیں۔
"ابو۔۔۔" جامی اچانک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"کیا بات ہے بیٹا۔۔۔؟"
"وہ تو میں کل آپ کو بتا چکا ہوں۔" جامی بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ "اب انسان پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا ہے اور۔۔۔" جامی کی بات ادھوری رہ گئی کہ اب بہت سارے کتوں کے بیک وقت بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارے محلے پر کتوں نے یلغار کر دی ہو اور بھونک بھونک کر اپنی فتح کا جشن منا رہے ہوں۔ اب کرسی سے

اٹھنے کا صحیح وقت آن پہنچا تھا۔ نچلی منزل میں شیرو کا حلق جیسے بھونکتے بھونکتے سوکھ گیا تھا۔ جامی کو دیکھتے ہی وہ یوں اچانک خاموش ہو گیا جیسے بھونکنا بھول بیٹھا ہو۔ پہلے تو اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے دونوں اگلے پاؤں اٹھائے اور چلنے کے انداز میں جامی کے قریب آگیا، پھر لاڈ پیار کے انداز سے اپنے جسم کو جامی کے پیروں سے ٹکراتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مخصوص ڈھنگ سے اپنی دم ہلاتا رہا۔ وہ بار بار سر اٹھا اٹھا کر جامی کو دیکھتا بھی جارہا تھا۔ میں نے غور سے شیرو کی طرف دیکھا اور ایک عجیب سی ان کہی کیفیت سے دوچار ہو کر رہ گیا۔ مجھے اس کی سرخ سرخ آنکھیں نمناک سی نظر آئیں۔ پھر عین اسی لمحے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے لمبوترے چہرے پر بہہ نکلے۔ وہ اب بھی یک ٹک جامی کی طرف دیکھتا جارہا تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ جامی بھی بڑے دکھ کے ساتھ اس کے پھولے ہوئے بالوں کو بار بار اپنے ہاتھ سے سہلاتا جارہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جامی اس کی بے زبانی کے باوجود اس کی اندرونی حالت سے پوری طرح باخبر ہے۔

گھر کے سارے افراد صحن میں جمع تھے۔ بظاہر سب خاموش تھے مگر چہروں کے تاثرات سے دلوں کی ہنگامہ خیزی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اردگرد کی فضا کی سوگوار کیفیت کو بیان کرنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ فلیٹوں سے عورتوں اور بچوں کی دردانگیز چیخ وپکار کا طوفان اب بھی زمین و آسمان کو شرمندہ کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ ہمارے مکان کے گیٹ کے قریب کتوں کا ایک جم غفیر حلق پھاڑ پھاڑ کر مسلسل بھونکتا جارہا تھا۔ کبھی کبھی آہنی گیٹ کتوں کے دھکوں کی چوٹ کھا کر بڑی عجیب آواز کے ساتھ بج اٹھتا اور اس کے ساتھ ہی ان کے بھونکنے کی آوازوں کا شوروغل اور زیادہ تیز ہو جاتا۔ یہاں صحن میں شیرو بھوں بھوں اور ہلکی ہلکی غراہٹوں کے ساتھ اچھل اچھل کر کچھ کہنے کی بھی کوشش کرتا جارہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ گھر کے سارے افراد کے ذہنوں میں لاوا پک رہا ہے اور کسی کو نہیں معلوم کہ اگلے لمحے کا عذاب کس شکل میں ان پر نازل ہوگا۔

میں نے ملازم کو بلا کر کہا کہ وہ گیٹ کے باہر طوفان بدتمیزی کے ذمہ دار کتوں کو کہیں چلتا کرے۔ کم بختوں نے اپنے منحوس بھونکنے کی مکروہ آوازوں سے محلے کی سوگوار فضا کے تقدس کو داغ دار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ملازم گیٹ کی طرف قدم اٹھاتا، میرے بیٹے جامی نے اسے مکان کے اندر بھیج دیا۔ اگرچہ جامی کی یہ حرکت مجھے ناگوار گزری تھی مگر اس کے باوجود میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ صرف میری سوالیہ نظریں اسے گھور رہی تھیں۔

”ابو، آپ جاننے کی کوشش کریں کہ باہر محلے کے کتے کیوں اس قدر شوروغل مچا

رہے ہیں۔" جامی کا لہجہ بے حد ملتجیانہ تھا۔

"کیوں شور وغل مچا رہے ہیں؟" میں نے بھی جوابا ایک سوال داغ دیا اور ویسے بھی میں کتوں کی نفسیات کا کوئی ماہر نہیں تھا۔ کتے تو موقع بے موقع بھونکتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ ان کے بھونکنے کے محرکات پر ریسرچ شروع کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ جامی بڑی بے چارگی، بڑے دکھ کے ساتھ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کو اس بات کا قلق ہو کہ میں اتنی ذرا سی بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

"بیٹا بتاؤ نا آخر کیا بات ہے؟" شاید مسلسل ذہنی دباؤ نے میرے اندر تھوڑا سا چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا۔

"ابو۔۔۔ محلے کے سارے کتے باہر کھڑے شیرو کا انتظار کر رہے ہیں۔" جامی کی بات نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

"شیرو کا انتظار کر رہے ہیں؟" مجھے اپنا لہجہ اجنبی اجنبی سا محسوس ہوا۔

"وہ انسان تو ہیں نہیں کہ شیرو کو آواز دے کر باہر بلائیں۔ لہٰذا اتنی دیر سے وہ اپنا حلق خشک کر رہے ہیں۔" جامی کے نفسیاتی تجزیے نے مجھے دنگ کر دیا تھا۔ اس کی قبل از وقت ذہنی بلوغت مجھے حیران کیے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر گویا ہوا۔

"اب آپ شیرو کو دیکھیں۔۔ بے چارہ کس طرح باہر جانے کے لیے میری خوشامد کر رہا ہے۔ ابو پلیز اس کو نہ روکیں، باہر جانے دیں۔"

میں نے دیکھا کہ شیرو بڑی افسردگی کے عالم میں زبان باہر نکال کر ہانپ رہا ہے۔ اس کی نمناک آنکھیں یک ٹک جامی کو گھورتی جا رہی تھیں۔ اس کی کیفیت اس شخص کی حالت سے مختلف نہیں تھی جس کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ تھا مگر زبان نے جیسے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ظاہر ہے کتا جامی کا تھا۔ جب اس کو شیرو کے باہر جانے پر اعتراض نہیں تھا تو بھلا میں اس کو روکنے والا کون ہوتا تھا اور ویسے بھی اس گھر میں شیرو کی موجودگی یا عدم موجودگی سے میری صحت پر رتی برابر اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ جب ملازم نے گیٹ کھولا تو ہم سب ایک ناقابل یقین نظارے کے طلسم میں گم ہو کر رہ گئے۔ شیرو کو اپنی طرف اچھل کود کے انداز میں آتے دیکھ کر سارے کتوں نے بھونکنا بند کر دیا تھا۔ اس کی آمد کی غیر متوقع خوشی کو سنبھالنا جیسے سب کے لیے ایک مشکل ترین مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔ شیرو جب بہت سارے کتوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا تو وہ سب عجیب و غریب حرکتوں کا مظاہرہ کرنے میں مصروف

ہو گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے آپس میں اچانک مل گئے تھے۔ سب کی زبانیں بے انتہا خوشی کی وجہ سے باہر نکلی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار لوٹ پوٹ ہوتے جاتے اور پھر جھرجھری سی لے کر نہ معلوم کس اذیت ناک احساس کی گرد کو جھاڑ دیتے تھے۔

"بیٹا۔۔ محلے کے کتے شیرو کو بلانے کے لیے اب روز ہی ایسی حرکت کریں گے۔" میری بات سن کر جامی نے بڑے عجیب انداز سے مجھے دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ "ابو آپ بہت بھولے ہیں۔" مگر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ صرف چند لمحوں تک گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب اس نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھوں کے کٹورے گرم گرم آنسوؤں کے قطروں سے لبریز ہو کر چھلکنے کے قریب ہو چکے تھے۔

"ابو۔۔۔ اب شرو ہمارے گھر سے جا چکا ہے۔ وہ واپس کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں۔" جامی کی آواز گلوگیر تھی اور وہ آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نہیں بیٹا۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے جامی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔ "وہ اس گھر کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔"

"نہیں ابو۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" جامی کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔ اس وقت تک ہم دونوں گیٹ سے باہر آ چکے تھے۔ میں نے دیکھا سب کتے کافی دور نکل چکے ہیں۔ تھوڑی دور جا کر وہ کچھ دیر کو ٹھہرے اور آپس میں ایک دوسرے کے بالوں پر زبانیں پھیرتے، بدمستی کے عالم میں اچھلتے کودتے اور پھر آگے کی طرف ان کا سفر دوبارہ شروع ہو جاتا۔ میں خالی الذہنی کے عالم میں کتوں کے اس کارواں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے اندر جنم لینے والے ایک احساس نے مجھے بے چین سا کر دیا۔ میری آنکھوں میں بے تحاشا حیرت کا طوفان کروٹیں بدلنے لگا تھا۔

"جامی۔۔۔ تم نے دیکھا۔" میری آواز کپکپا رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی نظریں بھی اسی سمت مرکوز تھیں۔ "جامی یہ سارے کتے تو بستی چھوڑ کر ویرانے کی طرف جا رہے ہیں۔"

"جی۔۔۔" اس کی آواز سپاٹ تھی۔ "جی۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔"

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ آگے بھی کچھ کہے گا مگر وہ ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھے جا رہا تھا جس طرف کتوں کا قافلہ رواں دواں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سب کتے بائیں طرف مڑ گئے ہیں۔ وہاں سے کچھ دور بلند قامت درختوں کا سائیں سائیں کرتا ہوا جنگل شروع ہو جاتا تھا اور نہ معلوم کتنی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس بے آباد خرابے میں آج تک کسی شخص کو جانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ جب قافلہ گزر گیا اور گرد بھی ادھر ادھر بکھر گئی تو ہم باپ بیٹے

جیسے ارد گرد کی چلتی پھرتی دنیا میں دوبارہ واپس آ گئے۔ فلیٹوں کے مکینوں پر اب بھی قیامت گزر رہی تھی۔ وہ اب بھی فلک شگاف آوازوں کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر خود کو ہلکان کیے جا رہے تھے۔ پولیس مقابلے میں مرنے والے چھ نوجوانوں کی لاشیں اب تک وہاں نہیں پہنچی تھیں مگر محلے والے رضاکارانہ طور پر ان کی تجہیز و تکفین، ان کے آخری سفر کے انتظام میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جامی اب بھی گم سم، اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے چہرے کی گمبھیر متانت مجھے بار بار دہلا رہی تھی۔ جب میں نے اسے گھر چلنے کے لیے کہا تو اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔

"ابو، میں جانتا ہوں کہ شیرو اور محلے کے دوسرے کتوں نے انسانوں کی بستی کو کیوں چھوڑ دیا۔ میں جانتا ہوں۔" میں نے استفہامیہ نظروں سے جامی کی طرف دیکھا تو چونک سا گیا۔ اس وقت اس کا چہرہ جیسے ہر لمحے ایک نیا رنگ بدل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے مگر الفاظ جیسے اس کے لبوں سے باہر نکلنے سے پہلے ٹوٹ ٹوٹ جا رہے ہیں۔ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولا۔

"ابو۔۔۔ وہ کتے خوف زدہ تھے۔ بے حد خوف زدہ۔۔۔ انہوں نے چار زندہ انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں بیدردی کے ساتھ قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔" جامی ایک لمحے کے لیے رکا، پھر طویل سی سانس لے کر وہ گویا ہوا۔ "ابو...... مجھے یقین ہے کہ وہ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں جیسی موت مرنا نہیں چاہتے تھے۔ اب انسانوں کی بستی میں ان کا گزارا ناممکن ہو گیا تھا۔ ابو کیا ہم انسان اس قدر ظالم ہیں کہ اپنے جیسے زندہ انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہمارے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہ گئی ہے۔" میں نے دیکھا کہ ضبط کا پیمانہ بالآخر چھلک ہی گیا تھا اور جامی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

میرے دس سالہ بیٹے نے اس وقت جو بات کہی تھی وہ میں کبھی نہیں بھولا ہوں۔ وہ بات تو جیسے میرے ذہن سے ہمیشہ کے لیے چپک کر رہ گئی ہے۔ سارا شہر اب بھی میدان کارزار کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے روزمرہ کے کام تو کرنے ہی پڑتے ہیں مگر جب بھی میں کسی کام سے گھر سے باہر نکلتا ہوں تو خوف زدگی میرے اعصاب پر پیر تسمہ پا بن کر مسلط ہو جاتی ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو برحق ہے مگر اس شہر میں انسان کے ہاتھوں جس طرح انسان مارا جا رہا ہے، ایسی موت کا تصور کر کے میں بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔

○○

# کاتیائن بہنیں

## ایک ضروری نوٹ

قارئین! کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا مستقبل مصنف طے کرتا ہے لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا مستقبل کہانی کے کردار طے کرتے ہیں۔ یعنی جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے، اپنے مستقبل کے تانے بانے بنتی جاتی ہے اور حقیقت میں مصنف اپنے کرداروں کو راستہ دکھا کر خود پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

ایسا اس کہانی کے ساتھ بھی ہوا ہے...... اور ایسا اس لیے ہوا ہے کہ اس کہانی کا موضوع ہے...... 'عورت'...... کائنات میں بکھرے تمام اسرار سے زیادہ پر اسرار، خدا کی سب سے حسین تخلیق۔ یعنی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ عورت کو جان گیا ہے تو شاید اس سے زیادہ گھامڑ اور شیخی بگھارنے والا، یا اس صدی میں اتنا بڑا جھوٹا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ عورتیں جو کبھی گھریلو یا پالتو ہوا کرتی تھیں۔ چھوٹی اور کمزور تھیں۔ اپنی پر اسرار فطرت یا مکڑی کے جالے میں سمٹی، کوکھ میں مرد کے نطفے کی پرورش کرتیں...... صدیاں گزر جانے کے بعد بھی وہ محض بچہ دینے والی ایک گائے بن کر رہ گئی تھیں مگر شاید صدیوں میں مرد کے اندر دہکنے والا یہ نطفہ شانت ہوا تھا۔ یا عورت کے لیے یہ مرد دھیرے دھیرے بانجھ یا سر دیا محض بچہ پیدا کرنے والی مشین کا محض ایک پرزہ بن کر رہ گیا تھا...... تو یہ اس کہانی کی تمہید نہیں ہے کہ عورت اپنے اس احساس سے آزاد ہونا چاہتی ہے...... شاید اسی لیے اس کہانی کا جنم ہوا...... یا اس لیے کہ عورت جیسی پر اسرار مخلوق کو ابھی اور کریدنے یا اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے...... ہم نے ابھی بھی اس مہذب دنیا میں، اسے صرف مقدس ناموں یا رشتوں میں جکڑ رکھا ہے۔

تو قارئین! یہ کوئی پریوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہاں دو بہنیں ہیں...... کاتیائن بہنیں۔ ممکن ہے ان بہنوں کے نام پر آپ کو "لولتا" "انا کارنینا" اور "مادام بواری" کی یاد آجائے مگر نہیں! یہ دوسری طرح کی بہنیں ہیں۔ مردوں کی حاکمی کو للکارنے والی...... تو اس

کہانی کا جنم کچھ 'خاص' حالات میں ہوا ہے۔

## ایک واقعہ

گرچہ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا لیکن یہ فلمی منظر جیسا ہی تھا۔ مس کاتیائن کے ہاتھوں سے سبزی کا تھیلا پھسلا اور دو بڑے بڑے آلو لڑھکتے ہوئے بھوپندر پریہار کے پاؤں سے ٹکرائے۔ بھوپیندر پریہار، عمر ایک کم باسٹھ سال، تھوڑا لہرائے، تھوڑا رکے، آلوؤں کو اٹھایا اور سبزی منڈی کی ایک دوکان پر کھڑی مس کاتیائن پر جی جان سے نچھاور ہو گئے۔

"آپ مس کاتیائن ہیں نا...... وہ "اپنا کی ڈالی" والی دوکان کے سامنے والے گھر میں......؟"

"ہاں۔" مس کاتیائن اتنا بول کر خاموش ہو گئیں۔ شاید انہیں گفتگو کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ وہ بھی ایسی جگہ؟ سبزی منڈی میں...... کوئی 'مرد' اس طرح کسی عورت سے......

"میں وہیں رہتا ہوں...... آپ کے گھر کے پاس...... تھیلا بھاری ہے؟"

پتہ نہیں کہاں سے بھوپیندر پریہار کے لہجے میں اتنا اپنا پن سمٹ آیا تھا۔

"نہیں کوئی بات نہیں......"

"دیجئے نا۔ میں اٹھا لیتا ہوں......"

بھوپیندر پریہار نے آرام سے تھیلا اٹھایا اور سبزی منڈی کی دھول بھری سڑکوں پر دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ ہاں بھوپیندر پریہار کچھ لمحے کے لیے یہ بالکل ہی بھول بیٹھے تھے کہ وہ کوئی نوجوان نہیں بلکہ ایک کم باسٹھ سال کے گھوڑے پر سوار ہیں......

لیکن گھوڑے میں اچانک جوش آ گیا تھا۔

○○

ایک عالی شان مگر پرانے زمانے کا چندن کی لکڑی کا بنا ہوا محراب نما دروازہ تھا۔ یہ دروازہ چرچرانے کی بھیانک آواز کے ساتھ کسی ہارر فلم کی طرح کھلتا تھا اس کے بعد کافی کھلا ہوا صحن تھا۔ غرض یہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا بے رونق گھر تھا۔ یہاں آپ ہمیشہ ہر موسم میں بڑی مس کاتیائن کو دیکھ سکتے ہیں۔ جھکی ہوئی نظریں، ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تیلیاں۔ ایک طرف پڑا ہوا اون کا گچھا۔ تیلیوں میں الجھے ہوئے ہاتھ...... یعنی دنیا سے بے خبر مس کاتیائن سوئٹر بن رہی ہیں۔ جاڑا ہو گرمی یا برسات، مس کاتیائن کی بس اتنی سی دنیا ہے...... گہری فکر، اون کا

گولا اور تیلیاں۔ لیکن یہ باتیں زیادہ توجہ طلب نہیں ہیں کہ بڑی مس کاتیائن یہ سوئٹر کس کے لیے بنتی ہیں۔ انہیں پہننے والا کون ہے؟ یا بس سوئٹر بنا مس کاتیائن کا ایک شغل ہے۔ ایک ہی سوئٹر کو بار بار ادھیڑتے رہنا اور بنتے رہنا......

"اندر آجایئے......"

چھوٹی مس کاتیائن نے اشارہ کیا۔ بھوپیندر پریہار تھیلا لئے صحن میں آگئے...... ہمیشہ کی طرح بڑی مس کاتیائن نے گردن گھما کر چھوٹی مس کاتیائن کے ساتھ اندر آتے ہوئے اجنبی، کو دیکھا...... لیکن آنکھوں میں حیرانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ چہرہ پتھر جیسا بے حس۔

"یہ پڑوسی ہیں......" چھوٹی مس کاتیائن نے بڑی کے سامنے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... "بھاری تھا...... اس لیے مدد کرنے چلے آئے۔"

بھوپیندر پریہار کو یقین ہے کہ چھوٹی کاتیائن کی وضاحت پر بڑی کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک ضرور لہرائی ہوگی حالانکہ اس چمک کو وہ صرف محسوس کر سکے تھے۔ اس لیے کہ دوسرے ہی لمحے سوئٹر بنتے پتھر کے مجسمے سے آواز آئی تھی...... "بیٹھیے نا......"

یہ کاتیائن بہنوں کے ہاں بھوپیندر پریہار کی پہلی انٹری (ENTRY) تھی۔

## کچھ بھوپیندر پریہار کے بارے میں

بھوپیندر پریہار مرد آدمی تھے۔ مردوں کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی...... ایک خاص طرح کا فیسی نیشن (FASCINATION) تھا اس لفظ کے بارے میں...... مثلاً وہ سوچتے تھے کہ مرد ایک شاندار جسم رکھتا ہے۔ خوشبو میں ڈوبا ہوا جسم...... ایک صدا بہار، مست مست، کسی تناور درخت کی طرح شان سے ایستادہ...... بے پروا، بے نیاز کسی کو خاطر میں نہ لانے والا، عورت یا بیوی جیسی چیز اسی جسم کو قید میں رکھنا چاہتی ہے۔ یہ جسم بے لگام گھوڑے کی طرح ہے، شاہراہوں کو روندتا، منزلوں کو پیچھے چھوڑتا، سمندر کی طرح بے خوف، لہروں کی طرح چیختا دہاڑتا، طوفان کی طرح گرجتا۔ یا شیر ببر کی طرح بے قابو، سرکش اور دھرتی کو اپنے طاقتور پنجوں سے روندنے والا۔ یہ جسم کسی ایک درّے میں نہیں چھپ سکتا، کسی ایک بیرک میں قید نہیں رہ سکتا، کسی ایک قید خانے میں، کسی ایک گھر میں یا کسی ایک عورت میں......

لیکن ہوتا کیا ہے، وقت آنے پر یہ جسم ایک عورت کے حوالے کر دیا جاتا ہے، اور

کہا جاتا ہے بس...... اسے تمہارے حوالے کیا۔ بس یہی ہے...... اپنے جسم کی پتوار جیسے چاہو اس پر استعمال کرو۔

مسز پریہار عام عورتوں جیسی ہی ایک عورت تھی...... جس کے لیے زندگی کا مطلب ایک کنبے یا شوہر اور بچوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یا شاید بچے کے آنے کے بعد شوہر کی بھی کچھ زیادہ حیثیت نہیں رہتی۔ سمن کے آنے کے بعد مسز پریہار کی زندگی کا یہی ایک مقصد رہ گیا تھا۔ سمن۔ صرف سمن۔ اس لیے شاید کبھی کبھی شوہر کے پتوار جیسے تنے جسم کی مانگ کو بھی وہ نظر انداز کر جاتی......

"نہیں...... اسے اتنا پیار مت دو۔ بھگوان کے واسطے۔" بھوپیندر پریہار کے ہونٹوں پر تلخی تھی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ بچے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ لاپرواہ اور بے وفا......"

"پاگل ہو گئے ہو!"

"بچے تمہاری محبت کی قدر نہیں کریں گے۔ وہ ایک دن تاڑ جتنے ہو جائیں گے اور ہمیں بھول جائیں گے۔"

اور شاید یہی ہوا تھا۔ سمن بڑا ہوا...... لو میرج کی اور بیوی کو لے کر کناڈا چلا گیا۔ مسز پریہار اس فرض سے سبکدوش ہو کر ابدی نیند سو گئی۔ اکیلے رہ گئے بھوپیندر پریہار۔ لیکن وہ اس زندگی کو یادوں کا قبرستان نہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ بقول رسول حمزہ توف...... پیار کو زندہ رکھنا چاہتے تھے جس کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ زندگی سے پیار چلا گیا تو ہم بھی نہیں بچ سکتے۔ وہ کھونا نہیں چاہتے تھے، اور سچ کہا جائے تو اپنے مرد ہونے کے بھرم کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور شاید خالی پن کے یہی وہ لمحے تھے جب کاتیائن بہنوں سے ان کی دوستی کے در وا ہوئے تھے یا بقول رسول حمزہ توف...... اس بہانے وہ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتے تھے۔

## بڑی بہن یعنی رما کاتیائن کا نظریہ

کاتیائن بہنوں کی زندگی میں ویرانی کی شاید ایک لمبی تاریخ رہی تھی...... آس پاس کے لوگوں کے لیے اس گھر یا بہنوں کے بارے میں سب کچھ پراسرار تھا...... یعنی جب یہ بہنیں گھر میں ہوتیں یا وہ وقت جب بے ہنگم آواز کے ساتھ کھلنے والے دروازوں سے یہ باہر

نکلتیں تو گویا سر گوشیوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ ان کی زندگی پر اسرار کا دبیز پردہ پڑا تھا...... شاید اس مکمل کائنات سے بھی زیادہ پر اسرار تھیں وہ۔ بڑی بہن کے ہاتھ میں ایک گل بوٹوں والی چھتری ہوتی جس کا ساتھ ان کے لیے ہر موسم میں لازمی تھا۔ جاڑا ہو، گرمی ہو یا برسات، گویا اندر کوئی خوف ہو اور پھول دار چھتری کسی باڈی گارڈ کی طرح ان کی نگرانی کرتی ہو۔ چہرہ اس چٹان کی طرح سخت، سمندر کی لہریں جس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتیں۔ آج تک کسی نے بھی رما کاتیائن کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آپ اپنے گھر کی بالائی منزل سے شام ڈھلنے تک جب بھی جی چاہے انہیں دیکھ لیجئے ...... ایک کرسی پر سوئٹر بنتی ہوئی رما کاتیائن آپ کو ضرور مل جائیں گی۔ عمر ساٹھ کے آس پاس۔ چھوٹی ریتا کاتیائن بڑی سے دو تین سال چھوٹی رہی ہوں گی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ مگر ریتا رما کی طرح سخت نہیں تھیں۔ کسی زمانے میں خوش مزاج بھی رہی ہوں گی مگر وقت کے ساتھ ساتھ مزاج میں ایک قسم کی سنجیدگی آگئی تھی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے پہلے کاتیائن بہنوں کی پر اسرار دنیا میں کوئی آیا تھا یا نہیں۔ مگر بھوپیندر پریہار کی اچانک آمد گھر میں شکوک و شبہات کی فصل لے کر آئی تھی اور یہ شک بھوپیندر پریہار کے جاتے ہی شتر مرغ کی طرح ریت سے اپنا سر نکالنے لگا تھا۔

بڑی کاتیائن کی آنکھوں میں حیرانی کے دوڑے تھے اور چھوٹی کاتیائن کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری خاموشی۔

"کب سے جانتی ہو اسے؟"

"کسے؟"

"وہی، جسے لے کر تم گھر آئی تھی"

"اچھا وہ۔ بھوپیندر پریہار......"

"نام بھی جانتی ہو۔ اس کا مطلب پرانی ملاقات ہے...... کب سے جانتی ہو اسے؟"

"آج سے پہلے...... نہیں۔"

"ایک ہی دن میں اس نے سبزی کا تھیلا بھی تھام لیا اور گھر میں آ ٹپکا......"

"نہیں۔ آپ نے سمجھا نہیں۔"

"کیا ایک اجنبی شخص کو تم اس گھر میں لے آئیں اتنا کافی نہیں......"

چھوٹی مس کاتیائن کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔ "نہیں، دراصل آپ ابھی بھی نہیں سمجھیں...... تھیلا بھاری تھا......"

"صفائی مت پیش کرو۔ اس سے پہلے ایسا حادثہ اس گھر میں کبھی نہیں ہوا۔"

بڑی مس کاتیائن کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''ابھی تم سبزی کاٹو۔ رات کا کھانا بنانے کی تیاریاں کرتے ہیں، مگر یاد رکھو...... رات میں۔ رات میں اس واقعہ کے بارے میں دوبارہ غور کریں گے۔''

## دہشت بھری رہگزار سے

ہم کہہ سکتے ہیں وہ رات کاتیائن بہنوں کی نظر میں بہت عام سی رات نہیں تھی۔ بڑی کاتیائن کمرے میں ٹہل رہی تھیں...... جیسے اندر ہی اندر کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی تیاری کر رہی ہوں یا جیسے رات کے وقت شوہر اپنے کمرے میں کچن سے لوٹنے والی اپنی نو بیاہتا دلہن کا انتظار کرتا ہے...... کہ وہ اب آئے گی یا بتی بجھائے گی یا اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دے گی۔

لیکن آپ اس طرح بڑی کاتیائن کو ٹہلتے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بڑھاپے کے گلیاروں میں اتنی دور تک نکل آئی ہیں۔ نہیں، حیرت انگیز طور پر اس وقت وہ کسی نوجوان سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔ یقیناً ایک ایسے نوجوان سے جو اپنی بیوی کی کسی بات سے ناراض ہو اٹھا ہو اور اس سے گفتگو شروع کرنے کی ذہنی کشمکش سے گزر رہا ہو۔ چھوٹی کاتیائن کے اندر داخل ہوتے ہی بڑی نے کسی لومڑی کی طرح اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں......

—— آؤ ٹرسٹ ایکسر سائز (TRUST EXCERCISE) کرتے ہیں۔

—— ٹرسٹ ایکسر سائز؟ لیکن کیوں؟

—— جرح مت کرو۔ مردوں کی طرح مت بنو...... کیونکہ تم نے اپنا TRUST کھویا ہے......

—— یا تم نے؟

—— ممکن ہے۔ اس لیے آؤ آنکھیں بند کریں اور شروع ہو جائیں......

اور اسی کے ساتھ دونوں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ بڑی کاتیائن کی پتلیاں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں...... چھوٹی کاتیائن کچھ سوچ کر مسکرائیں اور پتھریلی زمین پر وہ بھی بڑی کاتیائن کے آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ٹرسٹ ایکسر سائز میں ایک دوسرے پر آنکھیں موند کر گرنا ہوتا ہے۔ سامنے والے کو اپنے ساتھی کو تھامنا ہوتا ہے۔ ایسا کئی بار کرنا ہوتا ہے۔ سامنے والے نے اگر تھام لیا تو مطلب صاف ہے۔ ابھی یقین میں کمی نہیں آئی یا ابھی یقین بحال ہے۔ یہ عمل پتھریلی زمین پر اس لیے کرتے ہیں تاکہ گرنے یا چوٹ لگنے سے پیدا ہونے والا احساس اس یقین کو پھر سے بحال کر سکے۔ دراصل مغربی ممالک سے ہم لگاتار

کچھ نہ کچھ بطور تحفہ لیتے رہے ہیں اور ''ٹرسٹ'' کرنے کا یہ نایاب طریقہ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی وہاں سے امپورٹ ہو کر آیا ہے......

تو کاتیائن بہنوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ممکن ہے آپ کے لیے یہ سارا منظر بے لطف، اکتا دینے والا اور واہیات ہو...... مگر شاید کاتیائن بہنوں کو یقین کی دوڑ سے باندھنے کے لیے یہ کھیل کافی معنی رکھتا تھا۔ اور جیسا کہ ہمیں بھی یقین تھا آنکھیں بند کرنے، ایک دوسرے پر گرنے کے عمل میں چھوٹی سر کے بل گری تھی۔ شاید یہ ایک عمر پار کرنے کی حد کے سبب تھا۔ یا جو بھی ہو، مگر طے تھا کہ بڑی اسے تھام نہیں پائی اور چھوٹی کاتیائن کے ہونٹوں سے، لڑکھڑاتے، گرتے ہوئے ایک زور کی چیخ نکل گئی تھی......

''آہ جیسا کہ مجھے یقین تھا۔'' بڑی کاتیائن کا لہجہ برف سا سرد تھا۔ ''وہ آدمی...... تم نے سچ مچ اپنا ٹرسٹ کھو دیا ہے۔ چلو...... بہت دنوں کے بعد ہی سہی ذرا ماضی کی راکھ کریدتے ہیں۔'' بڑی کاتیائن نے چھوٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھا......

''تمہیں کچھ یاد آرہا ہے؟''

''ہاں۔''

—''تمہیں یاد رکھنا بھی چاہیے۔'' بڑی کی آواز میں لرزش تھی۔ ''اس آدمی کی یاد جو مرد تھا یا باپ تھا...... یا جنگلی سانڈ۔ یہی کمرہ تھا نا...... اور وہاں دروازے پر......''

چھوٹی کاتیائن کو یاد تھا۔ باپ دروازے پر شراب پی کر شام کے وقت آکر، ماں کا نام لے کر زور زور سے چلاتا تھا......

''—سب یاد ہے۔''

''—باپ کیوں یاد ہے اس لیے کہ اس میں بے رحمی تھی۔ وہ ایک خوفناک انسان تھا۔ بلکہ حیوان...... تمہیں یاد ہے، ماں رویا کرتی تھی۔ کبھی کبھی خوب زوروں سے...... ساری ساری رات چلایا کرتی تھی...... اور باپ نشے میں دھت سویا رہتا تھا......''

''—ہاں، مگر وہ سب بھیانک یادیں ہیں۔ اور رونگٹے کھڑی کرنے والی...... میری ماں ایک سہمی ہوئی گائے تھی۔ نہیں، وہ ایک معصوم میمنا تھی...... اور بچپن سے باپ تھوڑا تھوڑا کر کے اس میمنے کو ذبح کرتا رہا تھا۔''

''—تمہیں یاد ہے؟ اس وقت یا ان دنوں تم گرتی تھی تو...... روتی تھی تو...... یا کسی پریشان کر دینے والے ڈر سے سہم جاتی تھی تو...... یہ میں ہوتی تھی، میں...... میں بڑی تھی۔ اور میں انہیں دنوں تمہیں چاہنے بھی لگی تھی...... نہیں، تمہیں یاد ہونا چاہیے، جب یکایک ڈر

کر سہم کر تم مجھ سے چپک جایا کرتی تھی تو...... یا میری گود میں اپنا سر رکھ دیتی تھی تو......
یہاں ٹانگوں کے درمیان سے...... کسی ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو...... کیسا لگتا ہو گا؟
اندر سنسناہٹ کا ایک طوفان سا آجاتا تھا۔ شاید ایسا اس لیے بھی تھا کہ دنیا میں اور بھی لوگ
ہو سکتے ہیں، ہمیں پتہ نہیں تھا۔ ہم صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے یا پھر ماں کو۔ جسے اس
زمانے میں معصوم میمنا کہہ کر ہم اداس ہو جایا کرتے تھے یا پھر اپنے باپ کو، جس کی پرچھائیں
تک سے ہمیں ڈر لگتا تھا۔ ہم کسی مرد کو صحیح طور سے پہچان نہیں پاتے تھے، جیسے عورت
ہونے کے نام پر ہمارے سامنے صرف مظلوم ماں کا تصور رہ گیا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے۔" چھوٹی کاتیائن کی آواز بوجھل تھی۔

— "تو تمہیں یاد ہونا چاہئے۔" بڑی کاتیائن نے اپنی بات جاری رکھی...... "وہ دن
...... شاید وہ دن ہماری زندگی کے چند خوبصورت دنوں میں ایک تھا...... گلی میں ایک سانڈ پاگل
ہو گیا تھا...... یاد ہے، وہ اپنی بڑی بڑی سینگیں اٹھائے، کبھی ادھر کبھی ادھر دوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر
تک ہم بھی اس تماشے کا حصہ بنے رہے۔ مگر اب باپ کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ باہر
دوکاندار، راہگیر سب تالیاں بجا رہے تھے۔ ہم کمرے میں آگئے...... ہم ایک دوسرے کو برابر
دیکھے جارہے تھے...... جیسے، اب میمنے کے لرزنے کی آواز آئے گی۔ اچانک آنکھوں کے
سامنے باپ کی شبیہہ ابھری۔ اس کا چہرہ سانڈ جیسا تھا...... اس کی سینگیں نکلی ہوئی تھیں...... اور
وہ ان سینگوں سے دیوانہ وار میمنے کو زخمی کر رہا تھا...... تم میری طرف دیکھ رہی تھیں، اور میں
ان لہروں کی ہلچل گن رہی تھی جو تمہارے اس طرح دیکھنے سے میرے بدن میں اٹھنے لگی
تھیں...... یاد ہے...... میں نے کہا تھا...... مجھے چھوؤ...... مجھے بخار لگ رہا ہے...... تم دھیرے سے
میری طرف بڑھی تھیں اور تبھی باہر زوردار گرج کے ساتھ دروازے پر کچھ گرنے کی آواز
آئی تھی۔ زبردست شور ہوا تھا۔ تم کانپتی ہوئی میرے بدن میں سما گئی تھی۔ اور میں۔ "جیسے کسی
ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو"...... میں تمہیں لے کر کانپ رہی تھیں...... اندر سنسناہٹ
ہو رہی تھی...... تبھی میمنے کی بے خوف، پرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی......"

"دروازہ کھولو سانڈ نے تمہارے باپ کو پٹخ دیا ہے...... شاید وہ مر گیا ہے......"

دروازہ کھول کر میں نے پہلی بار ماں کو دیکھا۔ وہ حسین لگ رہی تھی...... ماں کے
چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ باہر دروازے پر ایک ہجوم اکٹھا تھا...... اور وہیں گلی
میں کھلنے والے دروازے کے پاس باپ کا بے جان جسم اوندھا پڑا تھا...... شرٹ خون سے تر
تھی۔ اس نے شراب پی رکھی تھی ہمیشہ کی طرح...... راہگیروں کے شبہ دینے پر وہ سانڈ سے

بھر گیا۔ لوگ ماں کو صبر کی تلقین کر رہے تھے...... "کسے معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا"...... یاد ہے۔ ماں خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی...... پر یکایک سب کے سامنے زور زور سے ہنس دی تھی...... لوگوں کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی پڑی تھیں۔ ممکن ہے یہ سمجھا گیا ہو کہ شوہر کے صدمے کو نہ سہہ پانے کی وجہ سے...... لیکن ماں کی کیفیت تو صرف ہمیں معلوم تھی......"

"ہاں...... اس کے بعد ماں جب تک زندہ رہی...... وہ بیٹھی بیٹھی ہنس پڑتی تھی......"

اور مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر یہ ہنسی موجود تھی۔ گویا ماں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا، کہ باپ جیسا آدمی ایک دن مر سکتا ہے۔ بڑی کاتیائن کے لہجے میں سنجیدگی تھی...... مگر آخر یہ سب میں تمہیں کیوں یاد دلا رہی ہوں؟ کیوں؟ تو سنو ریتا کاتیائن!" بڑی کاتیائن کے الفاظ برف ہو رہے تھے...... "سنو اور غور سے سنو۔ اس لیے کہ عورت اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے۔ ایک مکمل سماج۔ مرد کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ جو مرد ایسا سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں...... مرد کو عورت کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن عورت کو مرد کی نہیں...... اس لیے، ابھی سے کچھ روز پہلے جو آدمی تمہاری زندگی میں آیا ہے......

چھوٹی کاتیائن نے بات بیچ میں ہی کاٹ دی...... "آپ کی غلط فہمی ہے" اس نے دوسرے ہی پل نظر جھکالی۔ "میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا ہے۔ میں نے کہا نا...... وہ محض ایک حادثہ......"

"ٹھیک ہے...... لیکن تم نے حادثوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یاد رکھنا۔ وہ آدمی...... کیا نام بتایا تم نے...... ہاں بھوپیندر پریہار۔ وہ دوبارہ بھی آسکتا ہے...... اور اس کے لیے تمہارا جواب کیا ہو گا۔ کیا بتانا پڑے گا مجھے۔"

"نہیں" چھوٹی کاتیائن مسکرائی۔ "عورت اپنے آپ میں مکمل ہے۔ ایک مکمل سماج۔"

"اور اب میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ اس مکمل سماج کے پاس کیسی کیسی فینتاسی موجود ہے...... ٹھہرو، ہاں۔ ہو سکے تو وارڈروپ سے اپنی کھلی کھلی نائٹی نکال لو۔ سلیولیس (SLEEVLESS)۔ تم اس عمر میں بھی آہ۔ اس عمر میں بھی"...... بڑی کاتیائن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ "سنا تم نے۔ میں بس ابھی آئی۔"

## کاتیائن بہنوں کی فینتاسی

رات دھیرے دھیرے خاموشی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ مگر یہاں......
اینا کی ڈالی والی دوکان کے سامنے والے گھر میں رات ایک نئے 'ایڈونچر' سے آنکھیں چار کر رہی تھی...... شاید! بہت ممکن ہے ہمارے ہندوستانی معاشرے میں سوچا جائے، اس عمر میں تو آگ بہت پہلے کی کسی منزل میں بجھ چکی ہوتی ہے...... اور کیسی آگ؟ کیسی راکھ؟ مستی کے ساتویں آسمان پر پہنچانے والے نئے نشیلے براؤن شوگر اور ہیروئن بھی وہ ہیجان نہ پیدا کر پائیں جو اس خستہ اور سیلن زدہ کمرے میں پیدا ہو رہا تھا......

"اس وقت میں تمام کائنات کی سوامی ہوں...... سمجھا تم نے۔" بڑی کاتیائن کے ہاتھوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی، جیسے جاڑے کے دنوں میں صبح صبح منہ کھولنے سے اٹھتی ہے...... اس کے ہاتھ میں ایک اسٹیل کی کٹوری تھی...... کٹوری میں پگھلا ہوا اصلی گھی پڑا تھا۔ چھوٹی کا چہرہ قد آدم آئینے کی جانب تھا...... اس نے سلیولیس سیاہ نائٹی پہن رکھی تھی...... شاید نہیں۔ نائٹی نے اچانک اس کی عمر پہن لی تھی...... اس چھوٹے سے کپڑے میں وہ ایک دم سے چھوئی موئی لگ رہی تھی۔ بڑھاپے اور جھریوں سے میلوں پیچھے۔ جہاں صرف ہنستا گاتا ڈھول بجاتا حسن ہوتا ہے۔ حسن کا ساز چھیڑنے والے جذبات ہوتے ہیں...... اور جذبات کے پیچھے چھپی مجروح ہوسناکی ہوتی ہے......"ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیٹ جاؤ اور کپڑے اتار دو......" بڑی کاتیائن کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ڈھیر ساری "ماریجوانا" پی لی ہو...... اور وہ پوری طرح نشے میں آ گئی ہو......

چھوٹی کاتیائن لیٹ گئی...... اندھیرے میں جلتی ٹیوب لائٹ میں اس کا جسم چمکا...... بڑی نے اسٹیل کی کٹوری تھام لی۔ اس کا سخت جھریوں بھرا ہاتھ گھی کے اندر گیا...... جیسے کبھی میدے کی چھوٹی چھوٹی 'لوئیاں' بنتی ہیں اور انہیں ڈھیر سارے گھی میں ڈبویا جاتا ہے...... گورے چٹے بدن پر بڑی کاتیائن گھی اس طرح ملنے لگیں گویا چھوٹی کا بدن اچانک میدے کی 'لوئیوں' میں تبدیل ہو گیا ہو...... جھپ...... جھپ

"آہ، تم اب بھی ویسی ہو......" بڑی کے ہاتھ میں حرکت ہوئی۔ "بالکل ویسی...... سنو ریتا کاتیائن...... دیکھو...... خود کو دیکھو، غور سے۔ آہ...... اپنی عمر کو دیکھو۔ نہیں، عمر کو مت دیکھو۔ مگر سنو۔ غور سے سنو۔ مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے، ایک لاش گھر کی طرح۔ مگر یہاں تم اپنے آپ کو دیکھو۔ تم لاش گھر نہیں ہو، برف گھر بھی نہیں ہو، تم تندور ہو۔"

بڑی کاتیائن اپنے غیر مفتوح ہونے کے خیال سے زور سے ہنسی

"اسے بتا دینا...... کیا نام بتایا تم نے۔ بھوپیندر پربہار...... اسے بتا دینا، عورت اپنے

آپ میں مکمل ہوتی ہے...... اسے مرد کی ضرورت نہیں......"
پھر وہ اس پر جھک گئی۔ رات خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

## بھوپیندر پریہار اور عشق کی ڈگر

اتنی عمر گزر جانے کے بعد بھی بھوپیندر پریہار زندگی کے اسی فلسفے پر قائم تھے کہ ایک عمر گزر جانے کے بعد بھی ایک عمر بچی رہ جاتی ہے...... اور جو عمر باقی بچ جاتی ہے اسے اسی طرح گزارنے یا جینے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ مسز پریہار کے گزر جانے اور سمن کے کناڈا بھاگ جانے کے بعد اچانک ان پر بڑھاپا طاری ہونے لگا تھا...... حالانکہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جسم بوڑھا بھی ہو سکتا ہے...... وہ تو بقول رسول حمزہ توف۔ جسم تو بس عشق کے لیے ہے اور عشق کو زندہ رکھنا ہی انسان کا اولین فرض ہے...... شاید بڑھاپے کی یہ شروعات انہیں کافی آگے لے گئی ہوتی، وہ تو اچھا ہوا جو اچانک چھوٹی کاتیائن ان سے آٹکرائیں...... مدتوں بعد اندر کہیں کوئی چنگاری سی لپکی تھی...... بڑھاپے کی تنہائی میں چہرے اور بالوں کو سنوارتے ہوئے وہ جیسے برسوں پرانے چہرے والے بھوپیندر پریہار کو واپس لانے کی کوشش کر رہے تھے...... کتنی ہی بار قدم "اینا کی ڈالی" والی دوکان کے سامنے والے گھر کی طرف اٹھے۔ ہر بار دروازہ کھلتا تھا اور بند ہو جاتا تھا۔

"کاتیائن بہنوں کی دنیا"...... بھوپیندر پریہار کو لگتا، باہر کی دنیا میں ان کے بارے میں جتنی کہانیاں ہیں...... شاید وہ سب کی سب سچ ہیں...... یہاں تو کسی پریوں کی کہانی سے بھی زیادہ الجھا ہوا معاملہ تھا، لیکن انہوں نے ہار نہ ماننے کا فیصلہ کیا تھا اور شاید اسی لیے اس دن انہیں کامیابی مل گئی تھی۔

دو ایک دستک کے بعد دروازہ کھلا تو سامنے چھوٹی کاتیائن کھڑی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ بڑی کاتیائن سو رہی ہیں۔ جو بولنا ہے جلدی بولو۔"

"اندر آجاؤں؟"

چھوٹی کاتیائن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "آسکتے ہو۔ ویسے بھی بڑی کو اٹھنے میں دو ایک گھنٹے تو لگیں گے ہی۔"

وہ اندر آگئے۔ چندن کی لکڑی کے بنے محراب نما دروازے سے گزرتے ہوئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں آپ ہر موسم میں بڑی کاتیائن کو دیکھ سکتے ہیں...... ہاتھ میں تیلیاں

تھامے، سر جھکائے سوئٹر بنتی ہوئی...... وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا جیسا کالج کے دنوں میں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا پیار کی پہلی بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی یہ سب ان کی اداؤں میں شامل ہو جاتے ہیں......

چھوٹی کاتیائن کچھ دیر تک اسے گھورتی رہی۔

بھوپیندر پریہار نے نظریں جھکالیں۔

ذرا دیر بعد چھوٹی کاتیائن کے لب ہلے...... "تمہاری...... تمہاری بیوی۔"

"نہیں ہے، گزر گئی۔"

"اوہ......"

"نہیں، اس میں افسوس کرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ جی چکی تھی......"

"عمر سے زیادہ......؟" چھوٹی کاتیائن نے حیرانی ظاہر کی۔

"ہاں، مرنے سے دس برس پہلے تک مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ہے...... یعنی گھر میں ہے۔"

"ایسا کیوں تھا؟" چھوٹی کاتیائن کی ہرنی جیسی آنکھوں میں چمک جاگی۔

"پتہ نہیں، پر مجھ میں جیسے ایک نئے اور جوان بھوپیندر پریہار کی واپسی ہو رہی تھی...... تم...... یعنی آپ سمجھ سکتی ہیں...... اس عمر میں...... یعنی مجھے دیکھ کر......" وہ کہتے کہتے لڑکھڑائے تھے۔

چھوٹی کاتیائن کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "وہی...... غلط فہمی کی روایت...... مرد سمجھتا ہے وہ ساٹھ کے بعد پھر سے بچہ بن گیا ہے...... اور عورت تو اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی ہو گئی ہے...... ہے نا، ایسا ہی کچھ۔" وہ پھر زور سے ہنسی۔

"پتہ نہیں۔" بھوپیندر پریہار کے کھوکھلے لفظوں میں ہلچل ہوئی۔ "مگر میرا خیال ہے...... مرد...... یعنی......"

"مرد۔ مرد کے نام پر اتنی رعونت کیوں بھر جاتی ہے مرد میں۔ بار بار اس لفظ کو دہراتے ہوئے، اپنی کسی کمزوری پر پردہ تو نہیں ڈالتے......" چھوٹی کاتیائن نے الفاظ جیسے زہر میں ڈبو رکھے تھے۔ "خیر! جو بھی کہنا ہے جلدی کہو۔ بڑی کاتیائن تمہارے اس طرح آنے کو پسند نہیں کرتیں۔"

"کیوں؟" بھوپیندر پریہار اچانک ٹھہر سے گئے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں......

"تمہاری اپنی زندگی ہے، ان کی اپنی......"

"نہیں، ہماری زندگیاں ایک ہیں۔"

بھوپیندر پریہار زور سے لڑکھڑائے...... "کیا؟"

"ہاں، ہم لسبین (LESBIAN) ہیں...... لسبین۔" وہ بڑے اطمینان سے ناخن چباتے ہوئے بولی۔

"لسبین۔"...... بھوپیندر پریہار اچھل پڑے...... جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہاں، میں لسبین ہوں...... لیکن تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے میں کوڑھی ہوں، یا مجھے ایڈس ہو گیا ہے۔"

"لیکن تم......" ان کی آنکھیں اب بھی پھٹی پھٹی تھیں۔

"کیوں آتے ہو میرے پاس، اچھی طرح جانتی ہوں۔" چھوٹی کاتیائن کے لہجے میں شدید نفرت تھی...... "اپنے باپ کو بھی جانتی تھی۔ تمہیں بھی...... تمہارے اس پورے مردانہ سماج کو۔ حیران مت ہو۔ بس وہی غلط فہمی پر مبنی روایتیں۔ مرد ہونے کی خوش خیالی۔ یہ احساس ہی اچانک تمہیں ایک بے وقوف راکشش بنا دیتا ہے۔ تم سمجھتے ہو سب تمہاری طاقت کے ماتحت ہیں۔ تو یہ تمہاری ناسمجھی ہے...... سنو بھوپیندر پریہار...... تمہاری بیوی نہیں ہے، یہ بات ذہن کی گانٹھ کھول کر نکال کیوں نہیں دیتے کہ تمہاری بیوی، دس برس پہلے ہی کھوئی نہیں تھی بلکہ مر چکی تھی اور تم نے مارا تھا اسے......"

"میں نے؟" بھوپیندر پریہار ایک دم سے چونکے۔

"ہاں تم نے۔ ہاں، اس لیے کہ دس برس پہلے ہی اس کے اندر کے لاوے کو بجھا چکے تھے تم...... اور اسی لیے وہ تمہارے لیے نہیں تھی...... یا مر گئی تھی...... اور اس بڑھاپے میں بھی تمہارے اندر ایک گرم، دہکتا ہوا جسم ہے...... سنو پریہار...... تم نے اپنی تہذیب اور روایت کے وہ موتی چنے ہیں جہاں صرف "ایک بیوی بس، یا لوگ کیا کہیں گے" کی بندشیں ہوتی ہیں۔ تم لاکھ ماڈرن بننے کی کوشش کرو مگر تم ہو وہی...... ایک بزدل مرد...... اگر اتنی ہی آگ تمہارے اندر ہے تو تم اپنا جسم کسی مرد سے کیوں نہیں بانٹتے...... جہاں تمہیں بند کمرے میں داخل ہونے کے لیے بہت سے سوالوں کا جواب نہیں دینا ہو گا......"

"لیکن خود کو......" بھوپیندر پریہار کا جسم تھر تھرایا۔

"بھول کر رہے ہو تم۔ خود کو ابھی دیکھا کہاں ہے۔ اسے تو تم نے GAY یا HOMOSEXUALITY اور کئی دوسرے غلط ناموں میں باندھ رکھا ہے...... میں کہتی ہوں میں

لسبین ہوں، تب بھی تمہارا سماج اچانک ہم پر بے رحم ہو جاتا ہے۔ لسبین یعنی کسی ناجائز نظریے کی اولاد۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم نے آپس میں سکھ، امن، شان و شوکت اور سرشاری کی انتہا ڈھونڈلی ہے۔ اب تم چاہو تو جاسکتے ہو......"

آخری جملہ اس قدر ٹھہر ٹھہر کر بولا گیا تھا کہ بھوپیندر پر یہار کی آنکھوں کے آگے اندھرا چھا گیا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹ رہا تھا...... چھوٹی کاتیائن کے لفظ چیخ رہے تھے اور اس چھٹتے ہوئے اندھیرے میں وہ کئی پرچھائیوں کو سمٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے...... ماں، بابو جی، بیوی، سمن...... پرچھائیاں ایک دم سے ہٹ گئی تھیں...... گے، لسبین اور کتنے ہی غیر فطری رشتے...... اب ایک سہما سا اجالا تھا...... اور اس اجالے میں وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ جی چکے ہیں۔ زندگی، موت، سکھ...... کہنا چاہیے ایک پل کو چھوٹی کاتیائن کے الفاظ کے تیر سے گھبرا کر وہ کافی دور نکل آئے تھے...... اور اب...... بھوپیندر پر یہار کے ہونٹوں پر ایک تیکھی سی مسکراہٹ تھی......

"سنو رما کاتیائن...... وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے...... ٹٹول ٹٹول کر اپنے لفظوں کو یکجا کرتے ہوئے بولے۔ "سنو۔ ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی مر سکتا ہے...... سمجھ رہی ہونا۔ کبھی بھی مر سکتا ہے۔ کیوں کہ ہم اپنی عمر سے زیادہ جی چکے ہیں...... اس لیے......" پتہ نہیں وہ اور کیا کیا کہہ رہے تھے لیکن چھوٹی کاتیائن...... انہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف ایک ٹک بھوپیندر پر یہار کا چہرہ تکے جا رہی تھیں۔ ہاں، اس عمل کے دوران، ان کے اندر تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ جو اس سنسناہٹ سے مختلف تھی جیسی سانڈ والے حادثے کے دن بڑی کاتیائن کی باہوں میں سمٹ کر اس نے محسوس کی تھی...... پتہ نہیں یہ کیا تھا، اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... یا۔ وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

## آخری مکالمہ چھوٹی کاتیائن کا

وہ اسی نائٹی میں تھیں۔ سلیولیس سیاہ نائٹی میں۔ آئینے کے سامنے...... لیکن آئینہ شانت تھا۔ آئینے میں کہیں کوئی آگ، کوئی بھڑکیلا پن کوئی لگاؤ، کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے ریتا کاتیائن نے نائٹی کے تمام ہک کھول ڈالے۔ ذرا فاصلے پر بڑی کاتیائن کھڑی تھیں، اور انہیں گھورے جا رہی تھیں۔ لیکن ان کے اس طرح دیکھنے میں کوئی بزرگی، کوئی حکم یا کوئی خفگی شامل نہیں تھی۔

اچانک چھوٹی کاتیائن کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی۔ نائٹی کے تمام ہک انہوں نے کھول ڈالے تھے۔ آئینے میں ایک سہما، بے ڈھنگا جسم مردہ پڑا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں چیختی ہوئی بڑی کاتیائن کی طرف جھپٹیں......

"آگ کہاں ہے؟ میرے جسم کی آگ کیا ہوئی؟"

بڑی کاتیائن ایسے چپ تھی، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔

"سنو، میرے اندر...... تم نے تو کہا تھا......" چھوٹی کاتیائن کی نظریں جیسے مدتوں بعد بڑی کاتیائن کی آنکھوں میں سمائی جا رہی تھیں...... یاد ہے...... سنو، تم نے ہی کہا تھا، آہ تم اب بھی ویسی ہو...... بالکل ویسی ریتا کاتیائن...... سنو، مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے"...... وہ پھر چیخی...... "آگ کہاں ہے، میرے اندر کی آگ کہاں ہے......؟"

بڑی کاتیائن کا چہرہ ہر پل تیزی سے بدل رہا تھا۔

"تم...... تم سن رہی ہو۔ میں...... میں کیا پوچھ رہی ہوں......؟"

کافی دیر بعد بڑی کاتیائن کے بدن میں حرکت ہوئی...... اس نے چھوٹی کی جلتی آنکھوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکالیں۔

"آگ تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

بڑی کاتیائن کے الفاظ سرد ہو چکے تھے۔ پھر وہ ٹھہری نہیں، تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

آئینے میں ابھی بھی چھوٹی کاتیائن کا سہما، بے ڈھنگا جسم پڑا تھا...... اور شاید مردہ بھی۔

○○

# دھند سے گھرا مکان

میں بہت دیر سے بس کی کیو میں کھڑا ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک اس میں چھپی ہوئی ایک غزل پر میری نظر پڑی...... شاعر کا نام پڑھ کر میں چونک گیا۔ کیونکہ جس شاعر کی یہ غزل تھی وہ میرا کالج کا بہت ذہین اور ہونہار ساتھی تھا اور میرا بہت اچھا دوست۔ میں نے اس کا پتہ اپنے ذہن میں محفوظ کیا اور شاندار غزل کہنے پر اسے مبارکباد دینے اس کے گھر کی طرف چل دیا۔

وہ دور تک پھیلی ہوئی سرکاری ملازمین کی کالونی تھی۔ میں نے اس کا پہلا بلاک پار کیا، دوسرا پار کیا پھر تیسرا اور چوتھا بلاک پار کرنے کے بعد میں نے ایک عمارت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ دوسری منزل پر اس کا گھر تھا۔ مجھے تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ اس کی نیم پلیٹ غائب تھی لیکن دوسرے تمام مکانوں کے دروازوں پر نیم پلیٹ اور نمبر موجود تھے۔ اس کے مکان کا صرف نمبر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی، ایک نوجوان نے آکر دروازہ کھولا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان کے پیچھے پیچھے وہ خود بھی آگیا تھا۔ میں نے تناؤ کی لکیریں اس کے چہرے پر صاف دیکھیں۔...... اس نے لمحہ بھر کو مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور دروازہ کھول دیا۔

"اندر آؤ......" بڑی سرد مہری اور گہری لاتعلقی کے ساتھ اس نے مجھے گھر میں آنے کی دعوت دی۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا اور ہم مدتوں کے بعد مل رہے تھے۔ پھر بھی وہ میری آمد سے خوش نہ تھا بلکہ بیزاری کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ اس نے ایک گلاس پانی پیا اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں نے آپ کی غزل ایک رسالے میں پڑھی تھی۔ غزل مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے سوچا آپ کو مبارکباد دے آؤں۔ اور یوں بھی آپ کے ساتھ ماضی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔"

"یقیناً...... ہم لوگ ماضی بعید کے اچھے دوست تھے......" اس نے قدرے توقف

کے بعد اور کچھ خوش اخلاقی سے جواب دیا...... وہ شاید بالکل نارمل ہو چکا تھا۔

''شاعری آپ اتنی اچھی کرتے ہیں، مجھے بالکل پہلی بار اس کا علم ہوا......''

''عرصہ ہوا مجھے شاعری چھوڑے ہوئے۔ اب میں کبھی کوئی شعر نہیں کہوں گا۔''

''کیوں......؟'' میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ یہ کالونی جو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، سرکاری ملازمین کی کالونی ہے...... میں اس کالونی میں اکیلا ہوں اور کالونی ہی میں کیا، اپنے دفتر میں اکیلا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ مجھے کوئی شک کی نظر سے دیکھے...... اس لیے میں لوگوں سے کم سے کم تعلق رکھتا ہوں...... میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے ملنے کوئی آئے۔ خاص طور سے میں اپنے پڑوسی ملک کے لوگوں سے تو بالکل ملنا نہیں چاہتا...... میری شاعری کے حوالہ سے اکثر پڑوسی ملک کے لوگ مجھے خط لکھتے ہیں، مجھ سے ملنا چاہتے ہیں...... میں نہ تو ان کے کسی خط کا جواب دیتا ہوں اور نہ ہی ان سے ملتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں کی سرحدیں حساس ہیں اور ذرا سی بھی کوئی بات ہو تو ہم شکوک کے گھیرے میں آجاتے ہیں اور میں تو یوں بھی سرکاری ملازم ہوں۔ ذرا سی کسی بات پر انکوائری شروع ہو جائے، تو کوئی پرسان حال نہیں۔ نوکری بھی جائے اور گھر سے بھی بے گھر ہو جائیں۔''

''میری بہن پڑوسی ملک میں رہتی ہے۔ وہ اس بات پر سخت ناراض ہے کہ میں اسے اپنے ملک آنے کی کبھی دعوت نہیں دیتا، نہ ہی اسے کوئی خط لکھتا ہوں۔ حالانکہ پرانے شہر میں آپ دیکھیں، ہمارے یہاں سیکڑوں لوگ پڑوسی ملک میں جاتے ہیں۔ اور سیکڑوں وہاں سے آتے ہیں۔ لیکن ان کالونیوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ ایک بار میری بہن پڑوسی ملک سے آئی اور یہاں پرانے شہر میں ایک عزیز کے یہاں آکر ٹھہری۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں خاموشی سے جا کر اس سے مل آیا۔ میں جا کر اس سے مل تو آیا، لیکن ایک مستقل عارضہ میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے اب ایسا لگتا ہے کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ کوئی درندہ یا کوئی خوفناک شے، جس کا جبڑا کھلا ہوا ہے۔ شاید اژدھے کی مانند، جو مجھے نگل لینا چاہتا ہے۔ آپ یقین کریں، مجھے اپنے دفتر آتے جاتے یوں لگتا ہے کہ ہر موڑ پر کوئی ہے، جس کا جبڑا کھلا ہوا ہے اور مجھے اپنے اندر کھینچ رہا ہے۔ میرے سینے میں ہر وقت ایک چبھن سی رہتی ہے...... دل کے آس پاس ایک جلن ہے جس سے نجات نہیں ملتی۔ پھر ہمارے پڑوسی عجیب لوگ ہیں۔ ہر وقت اس چکر میں لگے رہتے ہیں کہ میرے گھر کون آیا اور کون گیا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ شاعری سے کچھ ملنا تو ہے نہیں، پھر میں اس کے حوالے سے کیوں تکلیفیں اور پریشانیاں اٹھاؤں۔؟''

وہ اسی طرح کی شاید کچھ اور باتیں بھی بتا رہا تھا۔ لیکن اب میری توجہ اس کی بجائے اس کے نوجوان بیٹے کی طرف تھی، جو پاس میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے کی لکریں تنی ہوئی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''میاں کیا بات ہے، آپ کیوں پریشان ہیں؟''

اس نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھئے، ملک میں کتنی جگہ فساد ہوا ہے اور کتنے بے گناہ لوگ مارے گئے ہیں۔''

اس کی بیوی، جو پاس ہی کھڑی ہوئی ہماری باتوں کو بہت دیر سے سن رہی تھی، کہنے لگی۔ ''نیچے کے فلیٹ والے ہمارے راشن اور سبزی کے تھیلوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم ان میں بم یا دوسری کوئی غیر قانونی چیز لے کر آ رہے ہیں۔''

اس نے ایک گلاس پانی پیا اور بیوی سے بولا۔ ''آہستہ بولو، دروازے اور کھڑکیاں بند کر دو۔''

میں جب اس کے گھر سے باہر نکلا تو چاروں طرف اندھیرا حکمراں تھا اور رات مسلسل...... کچھ دور جا کر میں نے پلٹ کر اس پوری کالونی کو دیکھا، دور دور تک پھیلی ہوئی کالونی میں مجھے اس کا گھر گہری دھند میں گھرا ہوا لگا...... میں نے محسوس کیا کہ اس مکان کے چاروں طرف بھی گہری گرد جمی ہوئی ہے اور اس کے مکین بھی اپنی سمتیں کھو چکے ہیں۔

میں یقینی اور غیر یقینی میں گھرا آگے بڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ پھولوں سے میرا اور اس مکان میں رہنے والوں کا کیا رشتہ ہے؟ پرندوں سے میرا کیا رشتہ ہے؟ جن راستوں سے ہو کر خوشیاں، تحفظ، سکون، وقار اور عظمت سفر کرتے ہیں، وہ راستہ مجھ سے کتنی دور ہے؟ کبھی ملے گا بھی یا نہیں، اس مکان سے کتنا دور ہے...... اس کے نوجوان بیٹے سے وہ راہیں کتنی دور ہیں؟ ان کے ذہنوں پر چھائی ہوئی گرد کبھی چھٹ سکے گی یا نہیں۔ انہیں کابوس سے نجات مل سکے گی یا نہیں۔ وہ کسی سمت کے راہی بن سکیں گے یا نہیں،...... میں ان ہی خیالات میں ڈوبتا ابھرتا آگے بڑھتا رہا۔

پت جھڑ کا موسم ختم ہو چکا تھا، پیڑوں میں نئی کونپلیں اور پھول در آئے تھے...... یہ شاید موسم بہار کی صبح تھی۔ وہ صبحیں کہاں گئیں، جب میں چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ اٹھتا، جسم بالکل ہلکا پھلکا ہوتا، خلاؤں میں اڑنے کو جی چاہتا۔ وہ صبحیں کہ کائنات کے ہر گوشے میں خوشیاں پھوٹتی محسوس ہوتیں...... ادراک کا پہلا دن ہی ایسا قیامت خیز نکلا کہ تمام صبحیں دھند لکی اور ساری شامیں تاریک ہو گئیں...... کیا میں کبھی اس دھند سے باہر

نکل سکوں گا۔ سفر کی صعوبتوں سے نجات مل سکے گی۔ روح پر چھائی ہوئی کائی کبھی چھٹ سکے گی یا نہیں۔ وہ مدار، جس میں برسوں سے چکر کاٹ رہا ہوں، کبھی ٹوٹ سکے گا یا نہیں، میں کسی سمت کا راہی بن سکوں گا یا نہیں۔ اور اگر میں کبھی اس مدار سے باہر آسکا جس میں مجھے دھکیل دیا گیا ہے، اس دھند سے باہر نکل سکا، جو میرے چاروں طرف چھائی ہوئی ہے تو کیا ضروری ہے کہ میں انسان ہی کے خدوخال میں باہر آؤں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں سمندر کے کنارے پڑے ہوئے گھونگھے کی شکل میں باہر آؤں یا ہو سکتا ہے کہ کیکڑے کی شکل میں تبدیل ہو جاؤں، کچھوے یا جھینگر میں بھی تو بدل سکتا ہوں...... اتفاق سے اگر انسان کی شکل میں باہر نکلنے میں کامیاب ہوا تو کیا ضروری ہے کہ میری سوچ و فکر بھی قائم رہے...... میرے دماغ سے سوالیہ نشان شروع ہوتا ہے اور پورے وجود میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔

افق سے افق تک پھیلے ہوئے قوس کے رنگوں کو میری ماں مجھے انگلی پکڑ کر دکھایا کرتی تھی۔ مجھے تمام رنگوں کا علم تھا۔ میں کتنا خوش ہوتا تھا قوس قزح کو دیکھ کر...... پھر اچانک یہ کیا ہوا؟ میں ان رنگوں کی پہچان کھو بیٹھا، آسمان کے دھنک رنگوں کی لذت بھول گیا، شبنمی بارش میں جسم کے مساموں سے پھوٹتی خوشی کے احساس کو بھول گیا...... اب تو افق سے افق تک گہرے دھنویں کی لکیریں نظر آتی ہیں۔ شبنمی بارش کے بجائے آسمان سے بھاری بوٹ، رائفلیں، تعصب، نفرت اور عدم تحفظ ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔

میں مسلسل سفر کر رہا ہوں، اپنے مرکز کی تلاش میں ہوں، سمت کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ دھند سے گھرا دھند سے نکلنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں۔ میرا تیز گام سفر جاری ہے، صبح کی تلاش جاری ہے...... لیکن ابھی تک میری تمام کوششیں لاحاصل رہی ہیں...... کہ روشنی کسی کابوس کی مانند میرے اندر طلوع ہوئی، اندھیرا چاروں طرف حکمراں ہے اور رات مسلسل۔

کئی پت جھڑ اور کئی موسم بہار گزرنے کے بعد کہرے سے ڈھکی ایک صبح میں پھر اس کالونی میں جا پہنچا...... اس سرکاری ملازم کے مکان پر دستک دی۔ دروازے کے سراخ سے کسی نے دیکھا اور دروازہ کھول دیا...... سامنے اس کی دبلی پتلی بیوی کھڑی تھی۔

''میں آپ کے شوہر سے ملنے آیا تھا......''

''وہ تو ہسپتال میں ہیں...... اندر تشریف لے آئیں۔''

''کیا ہوا ان کو۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟......''

''ان کو دل کا دورہ پڑا تھا، اب قدرے بہتر ہیں۔''

"پہلی بار دل کا دورہ پڑا تھایا اس سے پہلے بھی......؟"
"بالکل پہلی بار......"
"کوئی خاص بات تھی یا......"
"ہوا یہ تھا......" اس نے اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "آپ شاید جانتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس خوف زدہ ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ اور کتنے سہمے ہوئے رہتے ہیں...... میرے شوہر کچھ زیادہ ہی خوفزدہ رہتے ہیں۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ پڑوسی ملک کے لوگوں سے تو ملتے ہی نہیں...... اب اس دن ہمارے گھر پڑوسی ملک کے ایک صاحب تشریف لے آئے۔ گھر آئے مہمان کو نکالا بھی نہیں جاتا...... وہ صاحب دو دن ہمارے گھر ٹھہرے۔ ہم لوگ ان کے ساتھ باہر تک نہیں نکلے۔ چپ چاپ گھر میں پڑے رہے۔ میرے شوہر دفتر جاتے وقت مجھ سے کہہ گئے کہ یہ صاحب اگر جانا چاہیں تو ان کو تکلفاً بھی مت روکنا...... اگلے دن وہ خود ہی چلے گئے اور ہم نے چین کی سانس لی...... سب کچھ معمول پر آگیا......"

وہ کچھ لمحوں کے لیے رکی، ایک دو لمبی سانسیں لیں اور بولی...... "اچانک پندرہ بیس دن کے بعد شام کو دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے دروازہ کھول کر دیکھا، سامنے پولیس کا آدمی کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہم سب کا خون سوکھ گیا...۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے...... پھر بھی کسی طرح ہم نے اپنی اکھڑی سانسوں اور خوف پر قابو پایا...... پولیس والے کو اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ اندر آکر بیٹھ گیا۔ میرے شوہر اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ پولیس والے نے ان سے کہا۔

"میں آپ کے دفتر بھی گیا، لیکن آپ وہاں سے آچکے تھے۔" وہ خاموش رہے۔ پولیس والا پھر بولا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ پڑوسی ملک میں آپ کے کون کون رشتہ دار رہتے ہیں۔؟"

"پڑوسی ملک میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا۔" میرے شوہر نے صاف جھوٹ بولا۔

"پچھلے دنوں آپ کے یہاں باہر سے کوئی آیا تھا؟"

"نہیں کوئی نہیں آیا۔" انہوں نے پھر جھوٹ بولا۔ میں اس بیچ میں پولیس والے کے لیے چائے اور بسکٹ لے آئی۔ اس نے شکریہ کے ساتھ چائے لے لی۔ پھر وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک

ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پڑوسی ملک میں آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا۔ اور پچھلے دنوں آپ کے گھر وہاں سے کوئی آیا بھی نہیں۔ کوئی بات نہیں، آپ خیال رکھیں میں پھر آؤں گا۔"

وہ یہ کہہ کر کہ "میں پھر آؤں گا" بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اسی وقت سے میرے شوہر کی چھاتی میں درد شروع ہو گیا...... کچھ دیر کے بعد ان کو دل کا دورہ پڑا۔ میں پریشان ہو اٹھی، فوراً ہی بچوں کی مدد سے انہیں اسپتال لے گئی۔ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔

میں جب اس مکان سے باہر نکلا تو چاروں طرف کہرا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں سے کالونی کے خوبصورت درختوں کے پتیوں کے اوپر سے پھسلتی ہوئی آواز آرہی تھی۔ "ایشور اللہ تیرے نام، سب کو سمتی دے بھگوان۔"

تیز سرد ہوا کا جھونکا آیا اور میرے پورے وجود کو بیچ میں سے چیرتا ہوا گزر گیا کہ روشنی ایک کابوس کی مانند میرے اندر طلوع ہوئی، اندھیرا چاروں طرف حکمراں تھا اور رات مسلسل......

OO

# شہید

درد اچانک شروع ہوا، جیسے درد شروع ہوتا ہے۔

بے وقت بے موقع بغیر اطلاع واشارے کے، اچانک اس کے بدن میں ایک لہر سی اٹھی، جیسے روح کی طنابیں کھنچی جارہی ہیں اور بدن رہائی چاہتا ہو۔ لیکن ابھی رہائی کا وقت نہیں ہوا تھا کہ یہ سزا کوئی گھڑی تھی۔ اس گھڑی اس نے مجھے پکارا لیکن آواز حلق سے بمشکل لبوں تک پہنچی کہ دل کے دائیں طرف نیچے پسلیوں کے آس پاس چھپے درد نے ایک چھلاوے کی طرح جست لگائی، آواز کو دبوچ لیا، نہ جانے کتنی دیر تک وہ بے سدھ پڑا ہانپتا رہا۔ چند سانس سینے کی کال کوٹھری میں جمع ہوئے تو اس نے دکھتی جگہ پر ہاتھ رکھ کر پھر پکارا۔ اس کی نحیف و نزار آواز سسک سسک کر کمرے کی حد پار کر کے چھت تک آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے بہت دور سے، بہت گہرائی سے میرا نام لیا ہو۔ مجھے گمان گزرا کہ جیسے میں نے خود کو پکارا ہے کہ کبھی کبھی میں اپنے ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے اپنا نام لیتا ہوں اور پھر اثبات میں سر ہلاتا ہوں۔ اس وقت بھی میں نے سر کو جنبش دی کہ ایک مرتبہ پھر شک میں بھیگی ہوئی صدا نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

میں سونے سے پیشتر چھت پہ تھوڑی دیر کے لیے ٹہلتا ہوں کہ یہ میری عادت ہے۔ مجھے بند دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دان کے پیچھے جلتی بجھتی روشنی دیکھنے اور آوازیں سننے کا شوق ہے۔ اس کے علاوہ سامنے والے پل سے گزرتے ان لوگوں کو دیکھنا بھی مجھے پسند ہے جو سنیما کا آخری شو دیکھ کر آرہے ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بھلے لگتے ہیں۔ پل کے ایک سرے پہ لگے بجلی کے اکیلے کھمبے کی ناکافی روشنی میں سڑک کھلے تھان کی طرح پھیلی نظر آتی ہے۔ سنیما کے آخری شو کے تماشائی اس رسہ پر سے گزرتے وقت مجھے بہت لبھاتے ہیں۔ فلم کے مکالمے بولتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے اور اونچی صداؤں میں گیت گاتے جب وہ پل سے گزر رہے ہوتے ہیں تو فلم کا ایک نامکمل سین بن جاتا ہے۔ اس دوران جب کبھی کوئی رکشہ یا ٹیکسی ان کے قریب سے گزرتی ہے تو روشنی اور شور کے بے ہنگم پن میں ان کے سائے مجسم ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ لوگ ایسی فلم کے ایکسٹرا کردار نظر آتے ہیں جو کبھی مکمل

نہیں ہو گی۔ جونہی تماشائی گزر جاتے، پل ڈولی اٹھنے والے گھر کی طرح اداس ہو جاتا ہے۔ تب میں واپس مڑتا ہوں اور اپنے کمرے میں آکر سو جاتا ہوں۔ لیکن آج بہت کم تماشائی تھے۔لوگوں نے نہ جانے کیوں آخری شو دیکھنا کم کر دیا ہے۔ مجھے صرف ایک رکشہ تیزی سے سڑک پہ دوڑتا پل کراس کرتا نظر آیا، اور پھر ایک ٹیکسی زن سے گزر گئی۔ شاید اسٹیشن کی طرف جانے والے مسافر لے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک پل تنے رسّے کی طرح اکیلا دکھائی دیا اور پھر دو آدمی موڑ سے ظاہر ہوئے۔ان کی اونچی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے انہوں نے چھیرے کے خوف سے بچنے کے لیے بلند آہنگی کا سہارا لے رکھا ہو۔ جونہی وہ دونوں پل پار کر کے سڑک کے آخری موڑ پر اوجھل ہوئے، ایک بیکراں مشکوک سناٹا سا پھیل گیا۔اس تہہ در تہہ پل کی مشکوک خاموشی میں اس کی فریاد میرے نام کا سہارا لیے مجھ تک پہنچی تو میں جلدی سے پلٹا، دل میں وسوسوں کے انبار لیے نیچے کی طرف دوڑا، سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے وہ پڑا تھا۔

اس کا آدھا دھڑ بستر سے نیچے لٹک رہا تھا۔ایک ہاتھ سینے کے نیچے پسلیوں کے آس پاس کے ماس میں پیوست تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے فرش کی ٹیک لے رکھی تھی۔

"سعدی...... "میرے منہ سے چیخ نکلی۔

اس نے لاچار نگاہوں سے مجھے دیکھا، بمشکل لب ہلائے۔

"در... درد... میں مر رہا ہوں۔"

میں نے پہلو میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا۔ بستر پہ سیدھا لٹایا۔ اس کی پھٹی ویران آنکھوں میں کوئی ڈوب رہا تھا۔ میں، یا وہ خود یا ہم دونوں۔ بس ایک چیز تھی جو اس کی گہری پرکشش آنکھوں کی تہہ میں اتر رہی تھی۔

"سعدی! کیا ہو گیا ہے سعدی۔ اللہ خیر کرے گا۔"

جواب دینے کے لیے، اپنا احوال بتانے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ ہلائے مگر کراہوں کے سوا کچھ نہ نکلا۔ سیخ میں پروئی ہوئی آنکھوں نے میز پہ رکھے گلاس کا رخ کیا تو میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پانی بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔پانی کے چند قطرے کسی ٹھوس شے کی طرح اس کے حلق سے اترے تو ایک عجیب سی آواز ابھری جیسے کوئی کنکر سوکھی شاخ سے ٹکرایا ہے۔

اس درد کی کہانی نرالی ہے۔ ڈاکٹروں نے آخری مرتبہ دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ

اپنڈکس کا کوئی اعتبار نہیں کب پھٹ جائے، آپریشن کرالو۔ اس نے حامی بھر لی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ خطرے سے قبل خطرے کا سد باب خطرہ ختم کر دیتا ہے۔ اس نے میری بات کی تائید کی تھی اور کہا تھا، جونہی فرصت ملے گی اپنے بدن کی اس فالتو ناڑ سے نجات پالوں گا۔
اور اب اس وقت رات کے اس پہر اچانک درد نے اس کے بدن پر شب خون مارا۔

''سعدی۔۔ اٹھو جلدی کرو۔۔ ہسپتال چلتے ہیں۔''

میں نے کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر سے نیچے اتارا۔ پاؤں میں سلیپر پہننے کی کوشش میں کئی مرتبہ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن اذیت سے نجات کی آرزو نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔

باہر گلی میں رات اپنے جوبن پہ تھی۔ چاند کی پندرھویں تھی اور ہم تھے یا پھر ایک پراسرار مشکوک سناٹا۔ اسے میں نے اپنے ساتھ ایسے لپٹا رکھا تھا کہ ہمارا سایہ ایک اکائی بن گیا۔ چاند کی روشنی میں اپنے قدموں کے پاس اس سائے کو دیکھ کر یوں لگا۔ جیسے میں نے اسے اوڑھ لیا ہے۔ وہ میرے وجود کے تابوت میں ایک لاش کی طرح فٹ آگیا ہے۔ پتہ نہیں کہ کس طرح وہ مجھ سے جڑا گھسٹ کر چل رہا تھا۔ سنسان گلی سے گزر کر جب ہم پل پہ پہنچے تو میں نے پکارا۔

''سعدی...... درد ہو رہا ہے۔ اب بھی......''

اس نے تشکر میں بھیگی نظروں سے مجھے تکتے ہوئے لبوں کو دانتوں تلے، دبایا سسکاری روکی اور رک رک کر بولا۔

''یہ...... یہ...... یہاں کوئی شے پھٹ رہی ہے۔ خدا کے لیے یہاں دباؤ...... میں ہم مر، مر، مر۔''

میں جانتا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے مگر لاچار ہے۔ اس وقت بے آباد سڑک پہ کوئی سواری نظر نہیں آرہی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی پٹڑی پہ کسی انجن نے سیٹی بجائی تو میں نے بے دھیانی میں مڑ کر دیکھا، دور تک پھیلی اجلی چاندنی میں ویران سڑک پر اکلاپے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

''ابھی ہسپتال پہنچ جائیں گے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بہت مشکل ہے، میری جان نکل رہی ہے۔ اف خدایا۔ کوئی چیز اندر ٹوٹ رہی ہے۔ سس۔ سریا مارا جا رہا ہے۔ کوئی اندر ہی اندر...... میں مر رہا ہوں یہاں اس جگہ......؟''

اس نے کراہ کر بدن ڈھیلا چھوڑا اور میرے ہاتھوں سے پھسل کر سڑک پر گرنے لگا کہ میں نے اسے کلاوے میں بھر لیا۔

وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے جس توانائی کے ساتھ زندگی گزاری تھی اسے یاد کر کے مجھے اس کی موجودہ حالت پہ رونا آرہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کے بعد تسلی کے الفاظ کو اپنے لباب سے بھگویا، سینے میں پھیلی رقت پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔

"سعدی یار، حوصلہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ ابھی ہسپتال پہنچ جائیں گے، میں تیرے ساتھ ہوں۔"

اس نے درد کی جگہ کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔

"تب۔ تم، ہاں، تم میرے ساتھ ہو لیکن میرا اپنا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔"

"سعدی یار حوصلہ کرو۔ کچھ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پل ہمارے وجود سے آباد ہو چکا تھا۔ اس کے ایک سرے پہ لگے واحد بجلی کے کھمبے کی ناکافی روشنی میں ہم شرابیوں کی طرح گزر رہے تھے۔

"کوئی سواری نہیں۔ ہسپتال بہت دور ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ یہاں ہاتھ رکھو۔ دباؤ خدا کے لیے اُف، مجھے واپس لے چلو۔ میں...... میں......" جونہی لفظوں نے ساتھ چھوڑا کراہوں نے آواز کی صورت پکڑلی اور تہہ در تہہ مشکوک سناٹے میں اس کی سسکیاں چابک کی طرح شونک رہی تھیں۔ ان آہوں کا خاتمہ اس وقت ہوا جب دور سے آتی رکشہ کی آواز ہمارے قریب آکر بڑھ گئی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ رکشہ کی کرخت بھری آواز نے مجھے لبھایا۔ میں نے لپک کر اسے رکشہ میں ڈالا اور خود اس کے پاس سمٹ کر بیٹھ گیا۔

"ہسپتال چلو۔ جلدی کرو۔"

رکشہ والے نے پلٹ کر دیکھے بغیر سپیڈ پکڑلی۔ میں نے بجلی کے اکلوتے کھمبے کی ناکافی روشنی میں رکشہ والے کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ سفید باریش چہرہ، سر پہ رومال، اس کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ بت کی طرح ہینڈل پہ ہاتھ جمائے بازو کھولے بیٹھا تھا۔ صرف ہاتھوں کی خفیف حرکت سے احساس ہو رہا تھا کہ اسے ہسپتال کی بہت جلدی ہے۔

اچانک سعدی ایک طرف کو دہرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ درد کے مارے سکڑ کر اس کپڑے کی طرح ہو گیا جیسے بھگو کر نچوڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔ طویل سانسوں اور اذیت بھری ہچکیوں کے درمیان اس نے بولنے کی کوشش کی۔

"بہت مشکل ہے پہنچنا۔ میں مر رہا ہوں، تم میری ماں کو ابھی مت بتلانا۔ آہستہ آہستہ اسے خبر کرنا ورنہ وہ اجڑ جائے گی۔ خط لکھ دینا میری بیماری کا...... اچھا اور، اور پونم کو

بھی۔ اسے میں نے کل کا وقت دے رکھا تھا۔ معذرت کر دینا، کہنا میں مصروف ہوں۔ مرنے کی خبر نہ دینا۔ اس نے بھی کہا تھا آپریشن کرا لو۔ لیکن...... اب...... کیا ہو سکتا؟"

"سعدی ہوش کرو، تم بالکل ٹھیک ہو۔"

اس نے اپنے ہونٹ میرے کان سے لگا رکھے تھے۔ دونوں ہاتھ درد والی جگہ پر بدستور جمے ہوئے تھے اور آدھا دھڑ میری گود میں تھا۔ میرے کانوں میں اس کی سرسراہٹ جاگی۔

"دفتر سے میں نے ایڈوانس لیا تھا سات سو...... میرے جی پی فنڈ سے واپس کر دینا۔ پونم کے لیے کمرے میں میز کی دراز میں ایک گھڑی رکھی ہے۔ بخشی لایا تھا حج سے، یاد ہے نا۔ وہ گھڑی پونم کو دے دینا۔ ایک آدھ دن باندھ لے گی۔ بعد میں تو اسے پتہ چل جائے گا اور بخشی کو کہنا میں اسے یاد کر رہا تھا۔ ادھر کمرے میں میرے تکیہ تلے جائے نماز رکھی ہے، وہ بھی بخشی لایا تھا۔...... میری اماں کو بھجوا دینا یار۔ بخشی بہت اچھا ہے۔ میرے بعد ملتے رہنا۔ پونم کو مت ملنا، تمہیں دیکھ کر اسے میں یاد آؤں گا اداس ہو گئی ہے نا۔"

آنسوؤں کے قطرے میرے گالوں سے بہتے، لبوں تک آئے تو میں نے چادر سے زبان باہر نکال کر انہیں سنبھالا اور ان کی نمی سے اپنی آواز کو تر کیا۔

"سعدی یار۔ میرے بانکے۔ مت کر ایسی باتیں، تم بالکل ٹھیک ہو۔ ہم ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک منٹ کی بات ہے۔"

اس نے گہری سانس لے کر اپنا سر چھاتی پہ ٹکا دیا۔ اور درد والی جگہ کو پوری قوت سے دباتے ہوئے بدن کے تناؤ کو آخری حد تک پھیلا دیا۔ ابھی اس کے نہ جانے درد کے ساتھ کتنی دیر آنکھ مچولی ہونی تھی کہ اچانک رکشہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

سامنے چوراہے پر پولیس کا پہرا تھا۔ چاروں سڑکوں پر ڈرم رکھ کر ٹریفک کے لیے بند کر دیا تھا۔ اِکّا دُکّا کھڑی گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ ایک کونے میں بنے کھوکھے کے سامنے اسٹور میں جلتی آگ پہ چائے کے دیگچے رکھے تھے اور قریب ہی ایک بوڑھا شخص سگریٹ کا چھابا لیے بیٹھا تھا۔ چوراہے کے عین وسط میں ایک بھورے رنگ کی کتیا اطمینان سے نیم دراز اپنے پلوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ جس سڑک سے ہم آئے تھے اس کے سامنے چوک پہ رکھے ڈرموں کے پاس کھڑے سپاہیوں نے کرسیاں اور چارپائیاں بچھا رکھی تھیں۔ سپاہی چارپائیوں پہ نیم دراز، کرسیوں پہ بیٹھے اور چوراہے میں ٹہلتے بہت غیر مانوس اور پرائے لگ رہے تھے۔

ہمیں رکشہ کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز دیکھ کر ایک سپاہی نے ٹارچ کی روشنی اندر پھینکی اور بولا۔

"ہونہہ، پی رکھی، باہر آؤ۔"

"میرا دوست ہے۔ بیمار ہے بہت سخت۔"

سپاہی نے بے یقینی سے دوبارہ اندر جھانکا اور پھر ٹارچ پتلون کی بیلٹ میں اڑس کر بولا۔

"زیادہ پی کر بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔ باہر نکلو۔ میاں صاحب ادھر گوریلوں کے بجائے نشی ہیں۔"

اس کی پرجوش تیز آواز سن کر سپاہی بھڑوں کی طرح رکشہ کے چاروں طرف پل پڑے۔

"کون ہے باہر نکلو۔"

میں نے بہت دشواری کے ساتھ رکشہ سے باہر جھانکا۔ متعدد چہروں میں ایک ہمدرد چہرے کی خواہش لیے باری باری انہیں دیکھا اور پھر مایوس ہو گیا۔

"میرا دوست ہے، اسے درد ہے۔ ہسپتال جا رہے ہیں ہم۔"

"صحیح صحیح بتاؤ کیا چکر ہے۔ ادھر کرو منہ سونگھاؤ۔ ہاں ذرا زور سے سانس باہر نکال نا۔ پی کر اوپر کیا کھایا ہے کہ بو مر گئی ہے۔ اوئے اس دوسرے کی حالت دیکھو نشہ میں دھرا ہو گیا ہے۔"

اس لمحہ سعدی کے منہ سے ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی۔ رکشہ کے گرد کھڑے سپاہی یہ غیر انسانی صدا سن کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"خدا کے واسطے جانے دو۔ یہ مر رہا ہے، یہ مر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کوئی اور ڈرامہ ہے۔ شناخت کراؤ اپنی۔ جلدی کراؤ شناخت۔"

ان گنت یکساں چہروں اور آوازوں میں ایک آواز ابھری اور پھر اپنے سوال کے جواب کے لیے ہمارے اوپر تن گئی۔

"شناخت ......" میں بے بسی سے بولا۔ "ہماری کوئی شناخت نہیں ہے۔"

"کوئی ماں باپ آگے پیچھے۔ اتنی رات گئے گھوم رہے ہو۔ پتہ ہے ادھر گوریلا آئے ہوئے ہیں۔"

"یہ مر رہا ہے درد سے۔ خدا کے لیے ہسپتال جانے دو۔"

میری آواز روتے بچے جیسی بن گئی۔ سارا بدن غصہ کی شدت سے کانپنے لگا۔

"اوئے رو رہا ہے اتنا بڑا ہو کر...... اچھا ادھر ہو۔"

ان گنت یکساں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ آگے بڑھا۔ ہم دونوں کے جسم ٹٹولنے کے لیے اور پھر بغلوں، چھاتی، پیٹ کے نیچے کے ممنوعہ حصے اور پنڈلیوں کو جھٹکوں نے جھبور ڈالا۔

"خالی ہیں___ رکشہ والے کا نمبر نوٹ کرلو۔"

میں نے اپنی گلوگیر آواز میں رکی رکی سسکیوں میں رکشہ کے چلنے کی آواز سنی اور چند لمحوں کے لیے سعدی بیگانہ ہو گیا۔ بیگانگی کے اس لمحہ میں سعدی نے اپنے کھنچے لبوں کو میرے کانوں سے لگایا اور درد بھری سرگوشیوں میں بولا۔

"ابھی سے حساب کتاب شروع ہو گیا۔ کون تھے کیا چاہتے تھے، اب کیا رہ گیا ہے، جس کی شناخت کرائیں۔ تم میری ماں کو ذرا تاخیر سے میرے گزرنے کے بعد بتانا۔ آہستہ آہستہ جو ادھار میں نے لیا ہے نا دفتر سے، واپس کر دینا۔ اور ہاں، پونم کو کہنا اگر کوئی اور اچھا لگے، پسند آجائے، تو اپنا لینا۔ جو گزر گیا اس کا انتظار کیا۔ اب ہم کہاں جارہے ہیں، کس طرف جارہے ہیں۔ کب تک چلتے جائیں گے۔ یہ سرنگ کیسی ہے۔ یہ روشنیاں، یہ لوگ کون ہیں یار، تم بولو نا۔ میرا درد، میں تو عادی ہو گیا ہوں۔ عادی۔ آ آہ آ۔"

اس نے کربناک چیخ کے ساتھ پہلو بدلا تو آدھا دھڑ بھاگتے رکشہ سے باہر چلا گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگوں کو اندر کیا۔ واپس اپنی پرانی جگہ پر رکھ کر اپنے ہاتھ سے اس کی دکھتی جگہ کو دبانا شروع کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے چہرے پہ پھیلی آنسوؤں کی لکیروں کو صاف کیا۔ اس کے بدن میں ٹھنڈک جاگ رہی تھی۔ مسلسل کراہوں نے مجھے بھی لاغر کر دیا تھا۔ لاغری کے اس سفر میں ہم مرکزی سڑک پر پہنچ گئے۔ آگے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہسپتال تھا۔ راستہ میں اکا۔ دُکا پولیس کی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگانے کے لیے ابھی منزل کتنی دور ہے، گردن باہر نکال کر سامنے دیکھا۔

سامنے سڑک کے درمیان نیلی پیلی جلتی بجھتی بتیاں نظر آرہی تھیں۔ جوں جوں رکشہ قریب ہوتا گیا، صورتیں واضح ہونے لگیں۔ ایک مرتبہ پھر رکشہ نے بریک لگائے۔ سامنے شہریوں کی پہریدار ٹولی اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ سڑک کے ایک کنارے فٹ پاتھ پہ چند نوجوان کیرم بورڈ کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی چار آدمیوں کی ٹولی تاش کھیل رہی تھی۔ دوسرے کنارے پہ دکانوں کے بند دروازوں کے آگے کرسیاں ڈال کر سپاہی بیٹھے

تھے اور سڑک کے عین وسط میں جیپ کھڑی تھی، جس نے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ جیپ کے بونٹ کے سہارے چند سپاہی کہنیاں ٹکائے سگریٹ پی رہے تھے۔ بونٹ کے وسط میں بڑا سا تھرماس رکھا تھا، جس پہ بنے نقش و نگار اس چاند رات میں اور مرکزی سڑک کی روشنیوں میں بہت واضح نظر آ رہے تھے۔

رکشہ رکتے ہی سفید پوش شہری نے ایک مسلح لڑکے کے ساتھ آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کون ہے بھئی، اس وقت؟"

"مریض ہے، اسپتال لے جا رہا ہوں۔"

"مریض اس وقت؟" سفید پوش شہری نے مشکوک انداز میں کہا" یہ تو گوریلوں کے پھرنے کا وقت ہے۔ آپ کو پتہ نہیں ملک میں دشمنوں کے ایجنٹ گھس آئے ہیں۔"

"ہماری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ ہم تو......"

"کیا مطلب ہے؟ مریض کو دن کے وقت ہسپتال کیوں نہیں لے گئے؟ اچھا...... اچھا...... کارڈ نکالو اپنا۔"

سفید پوش شہری کی باتیں سن کر سپاہی بھی جیپ کے بونٹ کا سہارا چھوڑ کر رکشہ کے پاس آ گئے۔

"پچھلے چوک میں ہماری پڑتال ہو چکی ہے۔"

"کون سا پچھلا چوک؟" ایک سپاہی بولا۔ "ذرا باہر آ کر شناخت کراؤ۔"

"خدا کے لیے جانے دیں، اپنڈکس کا مریض ہے۔ بہت خطرناک حالت ہے۔ درد سے مر رہا ہے۔" ...... پچھلے چوک پہ سپاہیوں نے ہمارا منہ بھی سونگھا تھا، پوری تسلی کی تھی۔ خدا کے لیے ہمیں جانے دیں۔ بہت درد ہو رہا ہے...... مر جائے گا۔"

"پچھلا چوک کیا مطلب؟ کیا پتہ وہ جعلی سپاہی ہوں۔ کیوں جی، ٹھیک ہے نا۔ یہ گوریلے تو ہر روپ بدل لیتے ہیں۔"

"خدا کے لیے آپ یقین کریں۔ بہت تکلیف میں ہے میرا دوست۔ آپ ہمارے ساتھ ہسپتال چلیں۔ یہ مر جائے گا۔ اگر دیر ہو گئی تو یہ مر جائے گا۔ مر جائے گا۔"

نہ جانے کب تک میری سسکیاں رونے کی آواز میں ڈھلتی رہیں۔ نہ جانے کب تک ان کے سوالوں کے تیر ہم پہ چلتے رہے۔ مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ میرے مسلسل رونے کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب رکشہ کے جھٹکوں نے سعدی کے جسم کو ہاتھ سے مسلسل لگاتار ٹکرانا شروع کیا۔ میں نے آنکھوں کے سامنے پھیلی دھند کو صاف کیا۔ آنسوؤں کی نمی چہرے سے پونچھی

اور منہ کے نمکین ذائقہ کو لعاب میں شامل کر کے حلق تر کیا۔ تب میری نگاہ سعدی کے چہرے پر گئی۔ جہاں زندگی اپنی آخری لو دے رہی تھی۔ بھاگتے رکشہ میں میں نے اس کے بدن کی ٹوٹتی طنابوں کی آواز سنی۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ میت کا بوجھ زندہ انسانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس وقت سعدی مجھے بہت بوجھل لگ رہا تھا۔ میں نے کان اس کے دل کے ساتھ لگا کر دھڑکن سنی۔ نبض پہ ہاتھ رکھا۔ آنکھوں سے چہرے کا طواف کیا، سب کچھ ٹھیک تھا۔ صرف تھوڑی دیر کی بات تھی۔

ہسپتال کے گیٹ سے داخل ہو کر رکشہ ایمرجنسی کے دروازے کے سامنے جا رُکا۔ میں نے سعدی کو اپنے ساتھ لپٹا کر باہر نکالا۔ رکشہ والے کے ہاتھ میں دس دس کے دو نوٹ رکھے اور پھر اپنے عقب میں رکشہ کی کرخت آواز سنی جو بہت جلد دور جا کے غائب ہو گئی۔

اب پھر چار چفیرے اک تہ در تہ اجڑی مشکوک خاموشی تھی جس کے وسط میں، میں سعدی کو گھسیٹ کر برآمدے تک لایا۔ فرش پہ اس کے بدن کے گھسٹنے کی سرسراہٹ سسکیوں کی طرح ابھری تو ویرانی اور بڑھ گئی۔ برآمدے میں اطمینان کے ساتھ اسے میں نے قبلہ رخ لٹا دیا اور خود اندر کمرے میں چلا گیا جہاں ڈاکٹر آنکھوں میں جگراتے کی سرخی لیے سگریٹ پی رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کرسی پہ تھوڑا ہلا، آگے کو جھکا، اٹھنا چاہا لیکن رک گیا کہ میں ہاتھ پھیلائے باہیں کھولے اس کے روبرو فریاد کیے جا رہا تھا۔

"مجھے ایمبولینس چاہیے ڈاکٹر...... لاش لے جانے کے لیے ...... واپسی پر وہ مجھے روکیں گے۔ دیر ہو جائے تو اپنڈکس پھٹ جاتا ہے ناں۔ لاش خراب ہو جاتی ہے۔ آپ مجھے واپسی کے لیے ایمبولینس دیں گے نا۔ پلیز ڈاکٹر...... خدا کے لیے مجھے ایمبولینس......" ○○

# بوکا

تپش اگلتی زمین...... مضبوطی سے گڑے ہوئے حبس کے خیمے، شکر دوپہر رات ہر طرف ہولناک سناٹا۔ رات کا کوئی پابہ زنجیر لمحہ۔

ٹھمس ٹھمس ٹھمس ...... پیاس پیاس پیاس!

عجیب و خوفناک رات ہے۔ جس کی بھی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے لگتی ہے وہ ایک جیسا ڈراؤنا خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں۔

ایک تاریک اور گہرا کنواں ہے۔ جس کے ارد گرد بہت سے لوگ جن کی صورتیں دھند اور تاریکی میں پہچانی نہیں جا رہیں، کھڑے ہیں۔ وہ باری باری کنوئیں کے اندر جھانکتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اپنی باری آنے پر...... میں اندر جھانکتا ہوں...... اندر...... باہر سے زیادہ تاریکی اور خاموشی ہے۔ مجھے پانی دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے خیال سے میری پیاس اور بھڑک جاتی ہے۔ میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا ہوں۔ ان میں سے ایک بار بار کھنکارتا، تھوک سے گلا تر کرتا اور کہتا ہے۔

"کچھ کرو...... ورنہ سب پیاس سے مر جائیں گے۔"

"کیا کریں؟"

"ایک بار اور کنڈا ڈال کر دیکھو...... شاید مل ہی جائے۔"

"نہیں ملے گا...... ہم کنڈے ڈال ڈال کر تھک لیے ہیں۔"

"کسی غوطہ خور کو بلواؤ۔"

"بلوایا۔"

"پھر......؟"

"اس نے کہا اس میں کیچڑ اور دلدل ہے، اس سے ڈر لگتا ہے۔"

"پھر کیا کریں؟"

"کوئی ہمت کرے اور جا کر نکال لائے۔"
"نہیں...... پہلے یہ پتہ چلاؤ یہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟"
"یہ بعد میں پتہ چلائیں گے۔"
"ہاں ہاں، پہلے نکالنے تو دو۔"
"کچھ فائدہ نہیں...... پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار پھینک کون دیتا ہے؟"
"چپ کراوئے۔ پہلے نکالنے تو دے۔"
"ہاں پہلے نکال کر پیاس بجھانی چاہیے۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔"
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"
"کوئی ہے جو اترے؟"
"کوئی ہے؟"
"کوئی ہے؟"
"کوئی نہیں...... ہم سب پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔"
"میں ہوں۔" ایک طرف سے آواز آتی ہے۔
"تم؟"
"ہاں میں...... میں جاؤں گا اور نکال کر لاؤں گا۔"
میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن آواز میرے حلق میں پھنس جاتی ہے۔ وہ کنوئیں کی منڈیر سے رسی باندھتا اور مضبوطی سے گانٹھ لگاتا ہے۔ سب حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھتے ہیں۔ وہ رسی ہاتھ میں لے کر کنوئیں میں اترتا ہے۔ میں تھوک نگل کر گلا تر کرتا ہوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہوں۔
"یہ کیا کر رہے ہو ابا؟"
وہ کہتا ہے۔
"مجھ سے لوگوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی ہے۔ میں نکال کر لاؤں گا۔"
"بوکا نہیں ملے گا ابا...... تم خود کھو جاؤ گے۔"
"تم فکر نہ کرو۔" وہ کہتا ہے۔ "میں ڈوب نہیں جاؤں گا۔ بوکا ڈھونڈ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔"
میں اسے آواز بھی دیتا ہوں مگر وہ نہیں رکتا۔ رسی تھامے آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا

جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی آواز بہت دور ہوتی چلی جاتی ہے۔

پھر اس کے پانی میں غوطہ لگانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

سب منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں گھبرا کر پکارتا ہوں۔

''ابا''

میری آواز دیر تک کنوئیں کی دیواروں پر موٹر سائیکل چلاتی رہتی ہے۔ پھر ڈوب جاتی ہے۔

''ڈوب گیا۔''

''کیچڑ میں دھنس گیا ہو گا۔''

''دلدل میں پھنس گیا ہے۔''

''مجھے پہلے ہی ڈر تھا۔''

میں اسے آوازیں دیتا ہوں۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ کنوئیں میں لٹکتی بے حرکت رسّی کو دیکھتا ہوں اور میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔

میری چیخ کی آواز سن کر وہ ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا ہے اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔

''کیا ہوا بیٹے...... خیریت تو ہے؟''

میں پسینے میں شرابور ابھی تک لرز رہا ہوں۔ کانپتے ہاتھوں سے اسے ٹٹولتا اور پوچھتا ہوں۔ ''ابا...... یہ تم ہی ہو نا...... بو کا نکال لائے ہو؟''

''معلوم ہوتا ہے۔'' وہ کہتا ہے ''تم نے بھی کوئی برا خواب دیکھا ہے۔''

''تم نے بھی دیکھا ہے ابا۔''

''ہاں بیٹے بہت برا۔''

''کیا دیکھا ہے ابا؟''

''میں نے دیکھا۔'' وہ کہتا ہے ''ایک دنبہ ہے سفید سفید اون اور بھاری خوبصورت چکنی والا میرے آگے آگے دوڑ رہا ہے۔ میں چھری لیے اس کے پیچھے بھاگتا ہوں مگر اسے پکڑ نہیں پا رہا ہوں۔ جب میں ہانپ جاتا ہوں تو کہتا ہوں۔ ''بزدل! اللہ کی راہ میں جانے سے ڈرتے ہو؟''

میری بات سن کر وہ رک جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ

گردن جھکا کر کہتا ہے۔ ''اچھا...... جیسے اس کی رضا۔ ''میں اسے زمین پر لٹاتا ہوں۔ گردن پر چھری رکھتا ہوں اور چلانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔

''آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔''

''میں آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا ہوں اور اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلا دیتا ہوں۔ اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل جاتی ہے کہ اس کی جگہ تم ذبح ہوئے پڑے ہو...... استغفار بیٹے...... اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔'' کچھ دیر کے لیے ہم دونوں خاموش ہو جاتے ہیں وہ زیر لب کچھ پڑھ کر میری طرف پھونکنے لگتا ہے۔ اور ابھی اس نے تیسری پھونک مارنا ہوتی ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا ابو ابو پکارتا اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ پھر اس کی ماں جاگتی ہے اور اسے سینے سے چمٹا کر وہ بھی رونے لگتی ہے۔ ابا اپنی پھونکوں کا رخ ان کی طرف کر لیتا ہے۔

وہ پوچھتی ہے۔ ''کیا وقت ہو گا؟''

''پتہ نہیں۔'' میں جواب دیتا ہوں۔ ''کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ آسمان دھند میں چھپا ہوا ہے۔ کوئی ستارہ نظر نہیں آتا۔ جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے۔ عجیب رات ہے۔ لگتا ہے وقت ایک جگہ پر رک گیا ہے اور اب کبھی صبح نہیں ہو گی۔''

''کیا صبح نہیں ہو گی؟'' وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

''ہو گی، ضرور ہو گی۔ تم سو جاؤ۔'' ابا جواب دیتا ہے پھر کہتا ہے۔ ''ضرور کہیں کچھ ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' وہ اور پریشان ہو کر پوچھتی ہے۔

''کوئی انہونی بات۔ پتہ نہیں کس پر کیا گزری ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔''

''کب، کیا ہوا تھا ابا؟''

''یہ پرانی بات ہے بیٹے۔ کتابوں میں لکھی ہے۔ دن چڑھے گا تو خود پڑھ لینا۔''

''دن چڑھے گا ابا۔''

''ہاں بیٹے...... ہر رات خواہ وہ کتنی ہی قیامت کی رات کیوں نہ ہو آخر کار ختم ہو جاتی ہے اور سورج نکلتا ہے۔ صبح ہوتی ہے۔''

''اب کیا وقت ہو گا؟'' وہ پھر پوچھتی ہے۔

''صبح کاذب معلوم ہوتی ہے۔''

''اور صبح صادق؟''

''صبح کاذب کے بعد صبح صادق ہوتی ہے۔ پھر شفق پھوٹتی ہے اور سورج طلوع ہوتا ہے۔''

''مگر مرغ نے اذان نہیں دی؟''

"ہاں...... مرغ نے اذان نہیں دی؟...... تم جاؤ...... جا کر دیکھو۔" میں اٹھ کر ڈربے کے قریب آتا ہوں۔ دروازہ کھولتا ہوں۔ مرغ زندہ اور سلامت ہے۔ مگر بری طرح خوفزدہ ہے اور ہانپ رہا ہے۔ شاید اس نے بھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ میں اسے پکڑ کر باہر نکالنا چاہتا ہوں مگر وہ سہمی ہوئی مرغیوں کے پروں میں سر چھپا کر دبک جانا چاہتا ہے۔ میں اسے زبردستی پکڑ کر باہر نکالتا ہوں، اس کی گردن کو اوپر کرتا اور اسے کھینچ کر اس کے اندر سے آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہوں مگر آواز نہیں نکلتی۔

"چھوڑ دے۔" ابا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ "ایسے آواز نہیں نکالی جا سکتی...... اور نکل بھی آئے تو ایسی اذان کا کیا فائدہ؟" میں مرغ کو واپس ڈربے میں دھکیل دیتا ہوں اور آکر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ ابا کہتا ہے۔

"پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرغ اذان نہ بھی دے تو بھی وقت رکتا نہیں ہے۔"

"مجھے تو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں بیٹے، جب ہمیں وقت ٹھہرا ہوا لگتا ہے، اس وقت دراصل ہم خود ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اندر اندھیرا ہو جائے تو دن رات ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ نیکی اور بدی کی پہچان نہیں رہتی۔ عدل اور بے عدلی میں تمیز نہیں رہتی۔ مگر وقت چلتا رہتا ہے اور ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ضرور پھیلتا ہے اور چیزوں کی اصلی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔"

"اگر صبح نہ ہوئی تو؟" وہ کہتی ہے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" ابا کہتا ہے۔ "پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔"

"پہلے کبھی ایسی ہولناک رات اور اس طرح کے بھیانک خواب بھی تو دکھائی نہیں دیئے۔"

"اللہ خیر کرے گا...... تم لوگ سو جاؤ۔"

"سو جائیں؟...... کیوں؟...... کس طرح؟"

"مجھے نیند نہیں آتی۔" وہ کہتی ہے۔ "اور کاکا بھی بار بار ڈر کر چونکتا ہے۔"

"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔" میں کہتا ہوں۔ "اور ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں پھر ویسا ہی خواب۔"

"نہیں بیٹے۔" ابا کہتا ہے۔ تم سو جاؤ...... میں جاگتا ہوں۔ میں جاگتا اور پڑھتا رہوں گا تو تمہیں بُرے خواب دکھائی نہیں دیں گے۔"

اسی لمحے اچانک آہٹ سنائی دیتی ہے۔ ہم چونک کر ڈربے کی طرف دیکھتے ہیں۔ لگتا

ہے، مرغ ڈربے سے باہر نکل آیا اور اپنے پر پھڑپھڑا کر اذان دینے کے لیے زور لگا رہا ہے مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی ہے۔ زور لگاتے لگاتے وہ ہانپ جاتا اور اذان کو ادھورا چھوڑ کر پھر ڈربے میں گھس جاتا ہے ...... جاگتے جاگتے اور حبس اور دھند کے سائبان میں ستارے تلاش کرتے کرتے ہماری آنکھیں تھک جاتی ہیں اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں مگر روشنی اور صبح کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے رات کا کوئی لمحہ ساکت ہو گیا ہے یا مرغ کے گلے میں اذان کی صورت اٹک گیا ہے۔

مگر پھر گرمی اور حبس کے باوجود نجانے کب اور کیسے میری آنکھ لگ جاتی ہے اور میں نیند کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں۔ مگر ابھی نیند کے پہلے زینے پر قدم رکھتا ہوں کہ وہی ڈراؤنا خواب پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے جہاں میری آنکھ کھل گئی تھی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ کنویں میں لٹکی ہوئی رسی اچانک ہلنے لگتی ہے۔ میں اندر جھانکتا ہوں۔ کان لگا کر سنتا ہوں اور کہتا ہوں۔

"وہ ابھی ڈوبا نہیں ...... بو کا ڈھونڈ رہا ہے۔"

وہ جاتے جاتے پلٹ جاتے ہیں اور منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں۔ پانی میں اس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ پھر اس کی آواز گونجتی ہے۔ "بو کا مل گیا ہے۔"

سب خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس کی آواز پھر آتی ہے۔

"میں بو کا لے کر اوپر آ رہا ہوں۔"

"مجھے پہلے ہی یقین تھا۔" ایک کہتا ہے "وہ خالی ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"کمال کا آدمی ہے۔"

"میں کہتا ہوں ...... پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار پھینک کون دیتا ہے۔"

"چپ کرا وے ...... شکر کرو مل گیا ہے۔"

"کچھ فائدہ نہیں ...... جب تک اس کو نہ پکڑا جائے جو بار بار پھینک دیتا ہے۔"

"میں بتاؤں وہ کون ہے؟" پیچھے سے ایک شخص سب کو دھکیلتا ہوا آگے آ کر کہتا ہے۔

"بتاؤ۔"

وہ نیفے میں سے چھری نکالتا، ہوا میں لہراتا ہے اور تنی ہوئی رسی کاٹ دیتا ہے۔ پھر ہنستا ہوا ایک طرف چلا جاتا ہے۔ دہشت اور خوف کے مارے سب خاموش رہتے ہیں۔ کنوئیں کے اندر سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے منہ سے چیخ

نکل جاتی ہے۔

میری چیخ کی آواز سن کر وہ...... ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا ہے اور جھک کر کہتا ہے۔

"اٹھو بیٹے...... جلدی کرو...... دن نکل آیا ہے۔"

"دن نکل آیا ہے؟"

"ہاں"

"مگر ابھی صبح کاذب تھی۔"

"ہاں بیٹے...... آج صبح کاذب ہی کے وقت سورج نکل آیا ہے۔ پتہ نہیں اب کیسی شکر دوپہر ہمارا راستہ روکے کھڑی ہے۔"

○○

# التجا

(خلیجی جنگ پر ایک کہانی)

ہوس پس (۱) کے کشادہ باغ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خزاں بریدہ درختوں کی شاخیں برف کے شگوفوں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھیں جیسے راتوں رات چپکے سے آکر بہار وہاں خیمہ زن ہوگئی ہے اور نازک نازک چمیلی جیسے سفید پھول ہر طرف کھلادیئے ہوں۔ جگہ جگہ لان میں ان کے انباروں پر سورج کی کرنیں جگمگارہی تھیں۔

اس کی کھڑکی کے سامنے کچھ فاصلہ پر میری مریم کا حسین مجسمہ سورج کی نئی نویلی روشنی میں نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ ایسے پلنگ پر لیٹے لیٹے بارہا اس نے اس کی خوبصورتی کو سراہا تھا۔ بارہا دل ہی دل میں اس سے باتیں کی تھیں۔ اسے محسوس ہوا تھا دور ہونے پر بھی وہ اس کے بہت قریب ہے۔ میری کا مسکراتا ہوا معصوم چہرہ کتنی بار اس نے خوابوں میں دیکھا تھا۔ جب درد کی شدت سے نجات دلانے کے لیے خواب آور دواؤں کے انجکشن کی مدد سے وہ اس دنیا میں پہنچ جاتی تھی جو ہوش اور مدہوشی کے درمیان تھی، اس حالت میں اس نے آہستہ آہستہ اس کا نام لے کر بارہا پکارا تھا۔ ''میری۔ میری کہاں ہو تم؟'' ...... ''میں تمہارے ہی پاس ہوں۔'' اسے جواب ملا تھا اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا کہ وہ کم عمر خوبصورت نرس جوئن بھی تھی اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی۔ میری کے مجسمے کی طرح وہ بھی نیلا لباس پہنے تھی۔ اس کے سر پر بندھا ہوا سفید رومال اس کے چہرے کے اردگرد نور کے ہالے کی طرح نظر آرہا تھا۔ وہ پھر نیند کے ساگر میں ڈوب گئی۔

اب صبح ہوگئی تھی۔ وہ بھی جاگ گئی تھی۔ نرسوں نے اس کا منہ ہاتھ دھلا کر اور کپڑے بدلوا کر اسے تکیوں کے سہارے بٹھادیا تھا۔ اس کی بیٹی کا لایا ہوا چھوٹا سا ٹیلی ویژن اس کے سامنے میز پر رکھا تھا اور صبح کی خبریں دکھائی جارہی تھیں۔ دور تک پھیلا ہوا ریگستان، بم گراتے ہوئے ہوائی جہاز، غم سے تڑپتی ہوئی عورتوں اور روتے ہوئے بچوں کی تصویریں، مشہور لوگوں کے

---

(۱) ہوس پس: جہاں کینسر جیسے امراض کے مریض آخری دنوں میں جاتے ہیں۔ (Hospice)

جانے پہچانے چہرے جو کچھ کہہ رہے تھے لیکن وہ انہیں سن نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ خیموں اور تڑپتی ہوئی عورتوں کے بچوں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ کمرے میں اکیلی ہی تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ ایک ہجوم اس کے چاروں طرف ہے۔ اور وہ اس سے پوچھ رہے ہیں۔ "کیوں، کیوں۔ یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے ہم پر......" پھر ایک مشہور سیاست داں کا چہرہ ٹیلی ویژن پر نظر آیا اور اس نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "یہ ظلم ان پر کیوں ہو رہا ہے؟" مگر سیاست داں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے لب تیزی سے ہلتے رہے اور اس کے چہرے پر بے رحم مسکراہٹ منجمد ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ خواب آور دواؤں کا اثر کم ہو جائے۔ اسے پھر انجکشن دے دیا گیا تھا اور وہ خمار کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں جھول رہی تھی، اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ٹیلی ویژن بند کر دے لیکن اس نے اپنی تمام قوت ارادی کے زور سے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھول کر باغ میں استادہ میری کے مجسمے کو ایک بار پھر دیکھا تاکہ بڑھتی ہوئی نیند کے غلبہ میں آکر جب وہ سو جائے تو وہی حسین اور معصوم چہرہ اس کے خوابوں کو روشن کرتا رہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کیتھولک تھی یا میری کی پرستار۔ اس کا کوئی مذہب ہی نہیں تھا۔ مذہب سے اس کا رشتہ جو شروع سے ہی قائم نہیں ہوا تھا وہ کبھی بھی نہیں جڑ سکا تھا۔ اپنے باپ کے اشتراکی خیالات کی وجہ سے نہ وہ کبھی چرچ گئی اور نہ ہی اسکول میں صبح کے وقت سب کے ساتھ مل کر دعائیں مانگی۔ کبھی کبھی اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر ہمس (HYMS) گا سکے۔ کیونکہ موسیقی سے اسے بڑی الفت تھی، جو اس کے گھر میں گونجتی رہتی تھی۔ لیکن اس کا باپ FOLK SINGER تھا۔ وہ اور ان کے دوست مل کر ساری دنیا کے خوبصورت لوک گیت گاتے تھے اور اس کی ماں بھی ان کے ساتھ مل کر گاتی تھیں۔ ان کی آواز کیسی پیاری تھی۔ نیند کے خمار میں آج عرصہ بعد ان کا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ گندمی سارنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں اور کالے کالے گھنگھرالے بال۔ وہ اس کے قد آور خوبرو باپ کے ساتھ کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ جانے پہچانے اور بھی عزیز چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اس نے سوچا خاکی وردی پہنے ہوئے یہ طرحدار نوجوان کیوں مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرا رہا ہے۔ پھر اسے ایک دھکا سا لگا۔ "یہ تو جارج ہے۔ میرا شوہر۔" پہلی بار جب اس سے DANCE HALL میں ملاقات ہوئی تھی تب بھی مجھے دیکھ کر وہ اسی طرح مسکرایا تھا اور میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لی تھیں۔ لیکن یہ تو میرے بیٹے نائجل سے بھی کم عمر ہے۔ یہ تو مجھ سے پانچ سال بڑا تھا۔ اس نے سوچا...... پھر اس کی نظروں کے سامنے وہ تصویر آگئی جو اب بھی اس کے پلنگ کے پاس والی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ جسے اتنے طویل عرصے کی گرد نے مدھم کر دیا

تھا۔ اس کا سپیارنگ اب زرد ہو گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ آہستہ آہستہ وقت اسے بالکل مٹا ڈالے گا۔ لیکن آج کیسے اس تصویر کے رنگ جاگ اٹھے تھے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں سنہرے گھنگھرالے بال اور سرخ مسکراتے ہوئے ہونٹ اب شاید بول پڑیں گے۔ "جارج تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ تم نے کہا تھا کہ بہت جلد واپس آجاؤ گے۔ اتنے دن لگادیے۔ میں تو تمہارا انتظار کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی۔" پھر وہ چہرہ جھک کر اس کے قریب آگیا۔ "جہاں میں ہوں وہاں ہر ایک جوان ہے۔ وہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

"تم کہاں ہو جارج! تم تو فرانس بھیجے گئے تھے۔ نارمنڈی، پھر وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے۔ بس خط آیا تھا کہ تم لاپتہ ہو۔"

"میں لاپتہ نہیں ہوں۔ نینا..... نینا آنکھیں کھولو۔" لیکن وہ آنکھیں کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ آج اتنے دن بعد تو ملن ہوا ہے۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں آنکھیں کھول کر وہ اسے کھو نہ دے۔

"نینا آنکھیں کھولو۔" پھر کسی نے اسے پکارا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، لیکن وہ کھل ہی نہیں رہی تھیں۔

"نینا فادر مائیکل آئے ہیں۔ SACRAMENT کے لیے تمہارے ساتھ مل کر تمہارے گناہوں کی معافی مانگنے کے لیے۔"

"گناہ؟" اس نے آہستہ سے دہرایا۔ "میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ مجھے تو گناہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔" اور پھر وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔ اپنے بچپن کی طرف لوٹ گئی۔ "یہ کون ہیں۔ یہ دبلے پتلے۔ نڈھال، فاقہ زدہ لوگ۔ ان کا یہ جلوس تو ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ یہ کہاں جارہے ہیں؟" وہ اپنی ماں سے سوال کر رہی تھی۔ "یہ ہینگر مارچ ہیں۔ یہ غریب اور فاقہ زدہ مزدور ہیں۔"

"لیکن یہ مارچ کیوں کر رہے ہیں؟"

"یہ اپنی غربت اور فاقہ زدگی کے لیے احتجاج کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں نے کبھی اپنی غربت کے لیے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ کیسے غریبی کے دن گزر گئے۔ جارج کی بیکاری کے زمانہ میں بھی میں نے اپنے بچوں کو بھوکا نہیں سونے دیا۔ کتنی بار ماں کی دی ہوئی انگوٹھیاں گروی رکھنا پڑیں اور کسی طرح انہیں پھر چھڑا لیا۔ کیونکہ وہی تو ہمارے اور فاقوں کے درمیان بار بار آجاتی تھیں۔ پھر جارج کو جنگ پر جانا ہی پڑا اور میں چھوٹے چھوٹے تین بچوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ بالکل اکیلی۔ کیسے دکھ کے دن تھے وہ۔ راتوں کو سائرن کی آواز

کتنی خوفناک ہوتی تھی۔ ہوائی جہازوں کے اڑنے کی آوازیں۔ بم گرنے کے دھماکے۔ گھر ایسے ہلتا تھا جیسے گرنے ہی والا ہے۔ میں اپنے بچوں کو لے کر تہہ خانے میں چلی جاتی تھی اور وہ مجھ سے چمٹ کر کچھ دیر سہمے سہمے بیٹھے رہتے تھے اور پھر میری گود میں سو جاتے تھے۔ کیسی گہری نیند سو جاتے تھے وہ۔ جیسے انہیں یقین ہو کہ جب تک میں ان کے پاس ہوں انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ان کا یہ اعتماد میرے لیے کتنا بڑا سہارا تھا۔ اسی کے بل پر تو سب سہہ گئی۔ غربت، ہر طرف تباہی، موتیں، سب ہی سہہ گئی۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ کسی نے نہیں جانا ہم پر کیا گزر گئی۔ جارج کے بعد وہ گھر جو ہم نے اپنی ساری پونجی جمع کر کے لیا تھا، کتنا بڑا سہارا ہو گیا تھا۔ جنگ کے بعد کمروں میں کرائے دار رکھ کر میں نے اپنے اخراجات چلائے تھے۔ جارج کی پینشن سے سارے اخراجات کیسے چلتے؟" اسے یاد آیا، زیادہ تر اُن میں طالب علم تھے۔ کن کن ملکوں سے آئے تھے وہ...... ان کی آنکھوں میں امیدوں کے دیئے جل رہے تھے۔ ان میں سے چند چہرے اس کی بند آنکھوں کے سامنے ابھر اور ڈوب رہے تھے۔ وہ بھی تو اس کی زندگی کا ایک حصہ تھے۔ وہ نوجوان ہندوستانی لڑکی جو بری انداز میں اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر اسے پھولوں سے سجاتی تھی اور خوبصورت ساڑی میں شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ وہ دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت جو اپنے بچوں کو چھوڑ کر ایک سال کے لیے پڑھنے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کن غموں کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس کا نحیف جسم لندن کی برف باری اور شدید سردی کو برداشت کر ہی نہیں سکے گا۔ لیکن وہ بھی سب سہار گئی اور اس کے بھی جدائی کے دن ختم ہو گئے۔ وہ چلی تو گئی لیکن اس نے کبھی مجھے بھلایا نہیں۔ کرسمس کے دن اس کا کارڈ مجھے اس کی ہی نہیں ان سب کی یاد دلا جاتا ہے، جو کتنے ملکوں سے آ کر میرے گھر میں بس گئے تھے۔ اور میرا رشتہ ساری دنیا سے ہی قائم ہو گیا۔ کس محبت سے انہوں نے مجھے بار بار بلایا مگر گھر چھوڑ کر میں کہاں جا سکتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو دن بدن بڑھ رہے تھے، ان کی ضروریات بڑھ رہی تھیں۔ کتنی بار میں نے سوچا تھا ان بے باپ کے بچوں کے ساتھ کیا میں انصاف کر سکوں گی۔ لیکن میرے بچے تو خود ہی ایک دوسرے کا سہارا بن گئے اور میرا بھی۔ نائجل تو جیسے ان کا ہی بچہ تھا۔ ہائے میرا نائجل جو جارج کی آخری نشانی تھا۔ جس نے اپنے باپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ فرانس جانے سے پہلے جارج کس قدر مختصر وقفے کے لیے آیا تھا۔ اور چلنے سے پہلے جب اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اس نے خدا حافظ کہا تھا تو میرا دل چاہا تھا وہ مجھے اسی طرح جکڑے رہے۔ میں نے سوچا تھا، میں ان کے سہارے سب سہہ جاؤں گی۔ لیکن اکیلے ہی ساری ذمہ داریاں کیسے اٹھا سکوں گی۔ میں اپنے آپ کو کتنا کمزور محسوس کر رہی تھی، جیسے بے پتوار کی ناؤ ہوں، جسے طوفان

میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ لیکن سب سہہ گئی۔ نائجل کی موت بھی سہہ گئی۔ اسے بھی جنگ نے مجھ سے چھین لیا۔ اس بار آئر لینڈ میں میری امیدوں کا چراغ، میرے دل کا سہارا، میرا لعل کسی چھپے ہوئے دشمن کی گولی کھا کر سو گیا۔ اس کا غم برداشت نہ کر پاتی اگر ان بچوں کا سہارا نہ ہوتا۔ میں نے ساری زندگی ان کے لیے وقف کر دی۔ چارہ ہی کیا تھا؟ میرے سوا ان کا کون تھا اور یہ بھی تو دیکھتے ہی دیکھتے پروان چڑھ گئے۔ اب سب اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہیں۔ ان کی مصروفیات ہیں، ان کے پھول سے بچے ہیں۔ لیکن میں تو اکیلی رہ گئی۔ جدائی کی محرومیوں کے غم کس طرح سہار لے گئی۔ لیکن اب تو دل ہی نہیں جسم بھی چھلنی ہو گیا ہے۔ اور اس کا مداوا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں۔

وہ نیند کی امنڈتی ہوئی لہروں کے پنجے میں کھو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح مدہوش رہی پھر چونک کر اس نے دیکھا اس کے چاروں طرف میری ہی میری کے مجسمے ہیں۔ وہ میری جو نیلے لباس میں ملبوس تھی اور جس کے چہرے کے چاروں طرف نور کا حلقہ تھا۔ مسکراتی ہوئی سفید کوٹ میں سنہرے بالوں والی میری۔ اور وہ میری جس کا چہرہ اس کی بڑی بیٹی آنا کی طرح تھا، جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جو اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اور دور دور باغ میں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جگمگاتا ہوا میری کا مجسمہ۔

"میری......" اس نے آہستہ سے پکارا۔

"ممی میں میری نہیں ہوں۔ میں تو آپ کی بیٹی آنا ہوں۔" اسے جواب ملا اور پھر وہ آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

پھر سنہرے بالوں والی میری نے کہا۔ "نینا! میں آپ کو ایک اور انجکشن دے رہی ہوں تاکہ گہری نیند آجائے اور بالکل درد نہ ہو۔"

نیند اور مدہوشی کے غلبے نے اس پر قابو پا لیا تھا۔

لیکن ایک بار پھر اس نے آنکھیں کھول کر اس میری کی طرف دیکھا جو نیلا لباس پہنے تھی اور اس کے چہرے کے چاروں طرف نور کا حلقہ سا تھا۔ میز پر ٹیلی ویژن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے اس نے کہا۔ "میری! اسے بند کر دو۔"

"یہ تو بند ہے نینا۔" میری نے جواب دیا۔

"نہیں، ......" اس کی آواز پہلے سے اونچی تھی۔ "جو ہو رہا ہے اسے بند کر دو۔"

......اس کی نظریں باغ میں استادہ مجسمہ کی طرف چلی گئیں۔ ان آنکھوں میں درد تھا، التجا تھی۔ اس کے آنسو ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو گئے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ ○○

# مہم

الف اور بے میں سے کسی کو ضروری پیغام کے لیے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

وہ جس دوکان میں ہوتے ہیں اس کے کاؤنٹر پر ایک لڑکا رنگ برنگ دھبوں والا لباس پہنے بیٹھا ہے۔ سوجی ہوئی آنکھوں میں میلہ، پیلاہٹ اور گید کا جال سا بنا ہوا ہے۔

اس کی طرف دیکھتے ہی، ایک عجیب سی سرد لہر ان کے لہو کے ساتھ دوڑتی ہوئی پاؤں کے راستے زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔

ان میں سے ایک لڑکے سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''ہمیں فون کرنا ہے۔''

لڑکا بیزاری سے ان کی طرف دیکھتا ہے اور انتہائی سرد لہجے میں چند لمحوں بعد جو انہیں بہت طویل محسوس ہوتے ہیں، جواب دیتا ہے۔ ''میں کہہ چکا ہوں، فون خراب ہے۔''

دونوں سڑک پر سے نظریں ہٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، پھر پہچان لیے گئے۔ وہ سوچتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے کبھی وہ اس دوکان پر نہیں آئے تھے، پھر بھی وہ شرمندہ تھے۔ لڑکے کا لہجہ اس قدر پر یقین تھا کہ انہیں سوچ حقیقی اور یقین بے معنی محسوس ہونے لگے۔

''لیکن کیا تم بتا سکتے ہو فون کب سے خراب ہے۔'' غالباً بے، الف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھتا ہے۔ اس کی آواز کھوکھلی اور دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

''مجھے معلوم نہیں، مجھے تو بس اتنا ہی کہنا تھا کہ فون خراب ہے۔ میرا کام تو جھوٹی پلیٹیں صاف کرنا ہے۔'' اس کا لہجہ بہت زیادہ بیزاری لیے ہوئے تھا۔ اس نے بات مکمل کی اور کاؤنٹر کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔

الف اور بے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے دوکان سے باہر نکل گئے۔

''دراصل پیغام بہت ضروری ہے۔'' بہت آہستگی سے الف نے خود کلامی کی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' بے نے جواب دیا۔

''کیا؟'' الف نے سوال کیا۔

''یہی کہ پیغام بہت ضروری ہے۔'' بے نے لاپرواہی سے کہا۔

''تمہیں بھی معلوم ہے، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' الف نے حیرت، خوف اور بے یقینی سے کہا اور بے کا راستہ روک لیا۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ اگر اس نے الف کے سوال کا جواب نہ دیا تو وہ اسے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

''کیا بات ہے؟'' بے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ الف نے غصے سے کہا۔

''میں نے یہ کب کہا ہے۔'' اس کی آواز میں خوف تھا اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''ہم نے ابھی کہا تھا۔'' الف نے اسی انداز میں کہا۔

''حالانکہ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ کیا ضروری ہے اور کیا نہیں اور تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیے، تم مجھ پر یقین کر سکتے ہو۔ ممکن ہے، میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا ہو اور میں نے یونہی کہہ دیا ہو کہ ...... تم سمجھ رہے ہو نا۔'' اس نے رک رک کر معذرت طلب لہجے میں کہا...... لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے الف آگے بڑھ چکا تھا۔

جب وہ پٹرول پمپ کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں صرف ایک بوڑھا تھا، مضطرب اور خوف زدہ، ان کے داخل ہوتے ہی وہ میز کی طرف پیٹھ کر کے اس طرح کھڑا ہو گیا تھا جیسے کسی اچانک حملے سے بچنے کی تیاری کر رہا ہو۔

''سنو ہمیں بہت ضروری فون کرنا ہے۔'' بے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ٹیلی فون ...... کرلیں ...... لیکن میرے پاس ڈائیل نہیں ہے، میرا کام پیغام وصول کرنا ہے۔'' بوڑھے نے مشینی انداز میں جواب دیا۔ ابھی وہ دونوں اس کے جواب پر غور ہی کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور بوڑھا انہیں نظر انداز کر کے ریسیور کی طرف جھپٹا۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا اور کچھ دیر بعد بولا الف کی کال ہے۔ اس بار اس کی آواز میں خوف نہیں تھا۔

الف نے ریسیور لیا اور کچھ دیر تک کمرے میں اس کی ہوں ہوں، گونجتی رہی۔ وہ انتہائی مؤدب تھا۔ پھر اس نے ریسیور بوڑھے کے ہاتھ میں تھمایا اور بے کو ساتھ لیتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ بے الف سے پوچھتا ہے۔ ''تم نے مجھے بات نہیں کرنے دی......؟''

''بوڑھا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، یہاں صرف پیغامات وصول ہوتے ہیں، ہمیں کہیں اور جانا ہے۔'' الف نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

اب وہ ایک ایسے کلینک میں داخل ہو رہے تھے، جس میں ایک ڈاکٹر پہلے ہی ریسیور سے کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ جوں ہی وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، ڈاکٹر نے بیزاری

سے پوچھا۔ ''کیابات ہے؟ میں بہت مصروف ہوں۔''
''ڈاکٹر! ہمیں فون کرنا ہے، بہت ضروری پیغام ہے۔'' الف نے جواب دیا۔
''یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے، خود میرے لیے پیغام آنے والا ہے۔'' ڈاکٹر نے لاتعلق لہجے میں کہا۔
''ڈاکٹر پلیز، ہم زیادہ دیر نہیں لگائیں گے، ٹھیک ہے نا۔'' اس نے بے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا، جو اب بھی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''ہاں ہاں...... ڈاکٹر بالکل ہاں۔'' بے نے کھوکھلی آواز میں چیخ کر کہا۔
''نہیں...... میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ ایک بار میرے باپ سے یہ غلطی ہوئی تھی ...... میں اب تک اس گم شدہ پیغام کا انتظار کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔
''لیکن ڈاکٹر! میں نے کہا ہے نا کہ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے اور پھر پیغام بہت ضروری ہے۔ الف کی ٹھٹھری ہوئی مدھم سی چیخ بہت دور سے آ رہی تھی۔
''ہاں ڈاکٹر...... پیغام بہت ضروری ہے۔'' بے کی کھوکھلی چیخ بھی الف کی چیخ میں مل گئی۔
اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر نے ریسیور کو اپنے کان سے الگ نہیں کیا تھا۔ بہت دیر تک خاموشی ان کے درمیان چکراتی رہی...... آخر ڈاکٹر کو ان پر رحم آ گیا اور اس نے مجبوری بھرے لہجے میں کہا۔ ''اچھا لو...... مگر زیادہ دیر مت لگانا...... مگر نہیں...... نمبر بتاؤ۔ میں خود ملا کر دوں گا۔''
''نمبر......!'' دونوں نے ایک ساتھ کہا، دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور پھر بے نے الف سے کہا۔ ''تمہیں نمبر معلوم ہے؟''
''نہیں، مجھے تو، مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ پیغام بہت ضروری ہے۔'' الف نے جواب دیا۔
''اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ نمبر کیا ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ نمبر بتائے ہی نہ گئے ہوں۔''
''شاید...... مجھے اس کے بارے میں علم نہیں۔'' الف نے بے کی تحقیقات کا جواب دیا۔
''تو ہمیں پہلے نمبر تلاش کرنا چاہیے۔'' بے نے کہا اور باہر کی طرف مڑ گیا۔
دونوں مخالف سمتوں میں چل پڑے اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔
کلینک میں ڈاکٹر حیرت سے ٹیلیفون کو دیکھ رہا تھا، اس پر نہ تو ڈائل تھا اور نہ ہی نمبر......!

○○

# مسیحا کی موت

ابو آج آپ میرے ساتھ شاپنگ چلیں گے؟" سلمیٰ نے پروفیسر بشیر کو تیار ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"نہیں تو۔ سلو آج تو مجھے ریاست کے وزیر اعلیٰ سے ملنے جانا ہے۔" بشیر نے مسکراتے ہوئے اپنی چھوٹی لڑکی سلمیٰ سے کہا۔

"مگر ابو، آپ آج تیسرے دن اپنا وعدہ ٹال رہے ہیں۔" سلمیٰ نے مچل کر کہا۔

"آج اچانک ہی پیغام ملا ہے بیٹی۔ مجھے ان سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں، نہ میرا ان سے کوئی کام ہے۔ پروفیسر سلیم بہت اصرار کر رہے تھے۔ میں ٹال نہ سکا۔

کوئی خاص بات ابو! سلمیٰ نے ان کے کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے پوچھا۔

پتہ نہیں۔ پروفیسر سلیم نے اصرار کے باوجود تفصیلات نہیں بتلائیں۔ ہمارے ملک میں لے دے کر یہی ایک ریاست رہ گئی ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہاں کے وزیر اعلیٰ ملنا چاہتے ہیں تو شاید مذہبی مسائل پر کچھ دریافت کرنا چاہتے ہوں۔" بشیر الحق اپنی بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ساتھ ہی بالوں میں پھنسے ہوئے سوکھے پتے کو جھٹکتے ہوئے بولے۔ "اچھا تو کل چلیں۔" سلمیٰ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ ضدی تھی لیکن اپنے والد کی مصروفیات میں خلل بننا اس کو پسند نہ تھا۔ "کل کا وعدہ پکا رہا۔" بشیر الحق جیب میں پرس اور قلم رکھتے ہوئے باہر نکل پڑے۔

"خدا حافظ ابو۔" سلمیٰ نے معصوم اور بھولے لہجے میں روز کی مانند انہیں وداع کیا۔

"خدا حافظ بیٹی......" بشیر الحق کار میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

پروفیسر بشیر الحق اسلامیات کے ماہر ہی نہیں بلکہ دنیا کے سارے مذاہب کی تعلیمات پر عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے مذاہب عالم میں ڈاکٹریٹ اس وقت حاصل کی تھی جب ہمارے ملک میں اس مخصوص علم پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ پیرس سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے بجائے یوروپ میں نوکری کرنے کے اپنے ملک کے کالجوں میں کام کرنے کو فوقیت دی۔ وہ اپنی علمی قابلیت ذہانت اور تدبر کی بدولت بہت جلد شہرت

کے اس مقام پر پہونچ گئے کہ جہاں پر پہنچنے کے لیے سینکڑوں علماء خواب دیکھتے ہیں۔ مشاہیرین اسلام ہی نہیں بلکہ ملک کے تقریباً ہر دانشور، ہر مفکر، ہر مدبر نے پروفیسر بشیر الحق کی تحقیق و جستجو کو سراہا اور دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیمات کی جو ترجمانی پروفیسر بشیر الحق نے اپنی تقریروں، لکچروں اور تحریروں کے ذریعے پیش کی اس ترجمانی کو تسلیم بھی کیا تھا۔ پروفیسر بشیر الحق کے مطابق مخلوق ایک، قدرت ایک، کائنات ایک، خالق کی قدرت قائم و دائم اور کائنات و مخلوق فانی۔ فنا بقا سے نکل چکی ہے اور بقا اس کے پیچھے ہے؟ ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں بلکہ عملی مذاہب کا نمونہ تھا۔

فنا بقا کا مصنوعی لبادہ اوڑھے مغالطے میں ہے کہ وہ بقا ہے اور بقا فنا کے زعم کو مسمار کرنے لگی ہوئی ہے؟ یہی کش مکش زندگی ہے۔ اس کشمکش کا اختتام بقا کی نصرت و فتح ہے۔

کار پہاڑی ہاؤس کے پھاٹک پر پہنچی۔ مسلح گارڈ پھاٹک کے پٹ کھولنے سے قبل ان سے شناخت دریافت کرنے لگا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ اس بڑی کار میں بیٹھا ہوا پچپن کلو کا آدمی بے ضرر ہے تو سنتری کو پٹ کھولنے کا اشارہ کرنے لگا۔

پروفیسر بشیر الحق کو تیغ و شمشیر، نظریات و اصول منوانے یہاں تک کہ اپنا حق حاصل کرنے تک کے لیے بھی ظلم و استبداد اور جبر و تشدد کے استعمال سے نفرت تھی۔ تلوار جہاں بہادری کی علامت تھی وہاں بزدلوں نے تلوار بھی استعمال کی ہے۔ بندوق بزدلی اور مکاری کی تصویر تھی۔ تلوار کا دھنی تلوار کا استعمال صرف تلوار اٹھانے والے پر ہی کرتا تھا اور بندوق چلانے والا نہتوں پر گولی چلاتا ہے۔

ان کی کار پھاٹک سے ہو کر پورٹیکو پار کر کے پارکنگ میں رک گئی۔ شاید ان کی آمد کی اطلاع اندر پہنچ چکی تھی۔ شیشہ چڑھا کر ابھی وہ دروازہ بند کر ہی رہے تھے ان کے شاگرد پروفیسر سلیم دو اور آدمیوں کے ساتھ ان کے استقبال کو پہنچ گئے اور میزبانوں کا تعارف کرانے لگے۔

"آپ غلام رسول پنڈت سیکرٹری محکمہ تعلیم اور آپ غلام نبی بٹ وزیر تعلیم اور آپ پروفیسر بشیر الحق۔"

"السلام و علیکم......"

"......السلام و علیکم۔"

سب نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ وزیر تعلیم کی موجودگی سادہ لوح پروفیسر بشیر الحق کی سمجھ سے باہر تھی کہ بشیر الحق کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وزیر تعلیم ان کا استقبال کرنے کس لیے آئے۔ جب وہ برآمدے سے گزر کر ایوان خاص میں داخل ہوئے تو

قیمتی قالین پر اخروٹ سے بنے ہوئے صوفوں پر سے ایک خوبرو وجیہہ آدمی کو کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہوئے دیکھا تو ایوان خاص کی آرائش وزیبائش سے پروفیسر بشیر الحق کو سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگی کہ یہی وزیر اعلیٰ ہیں۔

''السلام وعلیکم......''

''السلام وعلیکم......''

بہت خوشی ہوئی آپ سے ملک کر۔ بائی گاڈ۔ جب سے عشائی صاحب نے آپ کا نام تجویز کیا میرے بچوں کی قسم، ہم سب لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ میں سچ کہتا ہوں۔ میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جناب! ہماری ریاست کو بائی گاڈ آپ جیسے عالم کی ضرورت تھی۔''

وزیر اعلیٰ کا یہ طویل حلف نامہ ختم ہوا تو بشیر الحق نے حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا:

''میں نہیں سمجھا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''بائی گاڈ! آپ غلام رسول سے دریافت کر لیجئے۔ اللہ قسم غلام نبی سے پوچھ لیجئے۔ بچوں کی قسم آپ میرے ساتھی پروفیسر سلیم سے پوچھ لیجئے۔'' وزیر اعلیٰ کچھ اس طرح فرمارہے تھے کہ جیسے بشیر الحق اس ملاقات کی نوعیت سے واقف تھے۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔) ''یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے قبلہ، آپ نے مجھے اتنی عزت بخشی۔ ورنہ کہاں ایک ریاست کا وزیر اعلیٰ اور کہاں ایک مدرس۔''

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وزیر اعلیٰ نے کہا۔ ''آپ جیسا عالم جناب ہماری دعوت پر تشریف لائے۔ ہمارا فادر فرماتا تھا کہ آپ کی تصنیف جو آپ نے بیس سال کی عمر میں لکھی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد نے تعریف کی تھی۔ اللہ قسم مولانا جیسی شخصیت نے جس کی تعریف کی ہو وہ ہمارے لیے کتنا متبرک ہو سکتا ہے۔'' بشیر الحق خاموشی سے ان کو دیکھتے رہے کہ اس بات کو جاننے کی جستجو میں ان کو ملاقات مقصود تھی یا اور کوئی کام۔ فضا میں تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ بشیر الحق پروفیسر سلیم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''بات یہ ہے۔'' پروفیسر سلیم نے اپنی استاد کی سوالیہ نگاہوں کو بھانپ کر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب آپ کو اپنی ریاست کی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنانا چاہتے ہیں۔''

''شکریہ۔'' بشیر الحق نے وزیر اعلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ میں نے وظیفہ پانے کے بعد کوئی بھی عہدہ قبول نہیں کیا۔ میرے کئی پروجکٹ ہیں اور مجھے لیکچرس کے لیے دنیا بھر کے ممالک کو جانا پڑتا ہے اس لیے......''

"بائی گاڈ!" وزیر اعلیٰ نے فرط مسرت سے چلا کر کہا۔ بالکل اس معصوم اور خواہشمند بچے کی طرح جو اپنی پسند کی چیز مل جانے پر پکار اٹھتا ہے۔ "قسم اللہ کی...... مجھے معلوم تھا۔ جانتے ہو غلام نبی او ئے غلام رسول۔ بائی گاڈ مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی۔"

"یعنی آپ جانتے تھے کہ پروفیسر صاحب اس پیش کش کو نہیں قبول کریں گے۔" سلیم نے کہا۔ "ہاں جی۔ میں جانتا تھا۔ اسی لیے تو یہاں آیا تھا۔ آپ کو پیغام بھجوایا تھا۔" وزیر اعلیٰ اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں جکڑ کر آگے پیچھے کرنے لگے۔ پروفیسر بشیر الحق کچھ پریشان سے ہو کر بولے۔ "کیا مطلب؟"

"ہاں جی! ہاں جی! میرے باپ کہتے تھے کوئی بھی شریف آدمی بڑے عہدے پر ٹوٹ نہیں پڑتا۔ اس کے پاس عہدے ایسے آتے ہیں جیسا جھیل میں مچھلیاں۔ بائی گاڈ۔ جناب آپ ہی ہماری جامعہ کے وائس چانسلر ہوں گے۔ بائی گاڈ! سچ جی۔ غلام نبی رسول ایسا ہی آدمی ہمیں چاہیے جی۔ تم آج ہی آرڈر نکال دو۔ بائی گاڈ۔ اچھا السلام و علیکم، مبارک ہو۔" یہ کہتے ہوئے وزیر اعلیٰ صوفے سے اٹھ کر کمرے کی طرف مڑ گئے اور ماحول پر خاموشی چھا گئی۔

پروفیسر بشیر الحق صرف دو سال کے لیے وائس چانسلر مقرر کیے گئے لیکن پانچ سال ہو جانے پر بھی ان کو نجات نہیں مل سکی تھی۔ آدمی عملی تھے، پر خلوص تھے، صوفی منش تھے اور شاید اس جامعہ کے وہ پہلے وائس چانسلر تھے، کہ جس نے اپنے اقرباء کو جامعہ کے کسی بھی شعبہ میں تقرر کیا ہو اور نہ ہی اپنی ریاست کے غیر معروف ادیبوں، شاعروں اور استادوں کو یہاں کے عالموں، فاضلوں، مدبروں، مفکروں اور اساتذہ پر لادنے کی کوشش کی ہو۔ سارے لوگ ان سے خوش تھے، اسی لیے حکومتوں کے بدلنے کے باوجود بھی ان پر کوئی حرف نہیں آیا۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی دھوپ بھی کڑ کڑا کے نکل آتی تو بادل اپنی پوری قوت سے زمین پر اپنا سایہ کر دیتے۔ پروفیسر بشیر الحق نہا دھو کر بخاری کے پاس بیٹھے اپنی بیٹی سلمیٰ کے خط کا جواب لکھ رہے تھے۔ یہ خط اواخر جنوری کا لکھا تھا۔ ریاست کے حالات کے خراب ہونے کی وجہ سے دو تین اپریل کو ملا تھا۔ ویسے فون پر بات چیت ہو جاتی تھی مگر وہ اپنی بیٹی سے خط کے ذریعہ جس طرح بات کر پاتے تھے وہ فون پر نہیں ہو پاتی تھی۔ اتنے میں بیگم بشیر کچھ ریشمی لباس لے کر آئیں اور ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"اچھا تو یہ کپڑے ہیں سلو کے لیے؟" پروفیسر نے کاغذ پر سے نظریں اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بازار بند ہیں۔ ورنہ یہاں رمضان کے لیے جو خاص جوڑے بنتے ہیں ان کی

افراط ہوتی۔" بیگم نے کرتوں کو دری پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

ان ہی میں سے تین چار پسند کرلو۔ شادی کے بعد سلو آئے گی تو اپنی پسند کے کپڑے خرید لے گی۔" بشیر الحق نے کہا۔

"آپ کبھی ان باتوں کو نہیں سمجھ پائیں گے۔ لڑکیوں کی شادی کے پہلے کی ایک پسند ہوتی ہے۔ شادی کے جوڑوں کی خاص پسند ہوتی ہے۔ اور شادی کے بعد ان کی پسند میں دوسری پسند بھی شامل ہوتی ہے وہ اس وقت دوسرے خرید لے گی۔ اب ان میں سے آپ کو جتنے پسند آتے ہیں کہہ دیجئے۔" بیگم نے کہا۔

"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ لڑکی کی شادی کے لیے ایک خاص پسند ہوتی ہے۔ اگر میں نے ان میں سے کچھ جوڑے چن لیے تو اس میں سلو کی پسند کہاں ہوئی۔" بشیر الحق نے کہا۔

"سلمٰی نے آج تک اپنی پسند کے نام پر کوئی لباس پہنا ہے؟ جب تک آپ اس کو کپڑے لا کر نہیں دیتے یا اس کے ساتھ جا کر نہیں خریدوا دیتے وہ کوئی کپڑا پہنتی ہے۔ یاد ہے دو سال آپ امریکہ میں رہے۔ اس نے دو سال تک نئے کپڑے نہیں بنائے، اس وقت وہ صرف پانچ سال کی تھی۔ آپ ان میں سے کچھ پسند کر لیجئے۔ میں ۱۰ ر تاریخ کو جا رہی ہوں لیتی جاؤں گی۔ آپ عید کے بعد تب تک حالات اچھے ہو جائیں تو اور لیتے آیئے۔

"دس تاریخ تک یہ خط بھی ختم ہو جائے گا لیتی جانا۔ جمعہ کا وقت ہو رہا ہے۔ میں نماز کے بعد آ کر کپڑے دیکھ لوں گا۔ پروفیسر بشیر اپنا رائٹنگ پیڈ گود سے اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

ساڑھے بارہ بجے انہوں نے بیگم سے سلمٰی کے نئے لباس کو اندر رکھنے کے لیے کہا کہ کہیں بخاری کی راکھ سے کپڑے ضائع نہ ہو جائیں۔ بیوی کے ہاتھ سے ٹوپی لیتے ہوئے کہا...... "خدا حافظ"

"خدا حافظ"۔ بیوی نے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کو اندر آنے سے روکنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

سرکار نے ان کو ایک پرسنل سیکورٹی گارڈ دے رکھا تھا۔ مگر وہ کبھی اس کو ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پولیس نے سلامی دی اور گاڑی پھاٹک سے نکل کر ان کے پرسنل سکریٹری کے گھر کی طرف جانے لگی۔ غنائی ایک بہت ہی بااخلاق نوجوان تھے جو اپنے کام کے ساتھ ساتھ بشیر الحق سے علمی استفادہ کرتے آ رہے تھے۔ مصروف لوگوں کے لیے سفر کے دوران کا وقت بحث و مباحثہ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ غنائی

اس وقت سے فائدہ اٹھاتے۔ گاڑی ان کے مکان کے سامنے رکی۔ وہ آواز سنتے ہی گھر سے باہر نکل بڑی سرعت سے ان کے بغل میں آکر بیٹھ گئے اور کار آگے بڑھ گئی۔

''آج وائس آف امریکہ سے خبریں سن رہا تھا۔'' غنائی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''وہ اپنی نشریات کا آغاز ''السلام وعلیکم'' سے کرتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔''

''غلط ہے۔'' بشیر الحق نے سامنے کی برف سے لدی پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ السلام وعلیکم ایک مذہبی "SALUTATION" ہے۔ اس کے آداب مخصوص ہیں۔ اس کے استعمال کے اصول مقرر ہیں۔ عوامی نشریات چاہے کسی بھی ملک کے ہوں سبھی کے لیے ہوتے ہیں۔ خاص مسلمانوں کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کلمات سے خبروں کا آغاز روا نہیں ہو سکتا۔''

''تو السلام وعلیکم نشریات کے لیے ممنوع ہے۔'' غنائی نے تجسس سے پوچھا۔

''نہیں ایسی نشریات جو خالص مذہبی ہوں یا مسلمانوں کے لیے ہوں، جیسے نماز کا طریقہ بتایا جارہا ہو یا زکوۃ یا روزہ یا حج کے فضائل۔''

''کیا ان ممالک کی نشریات بھی جہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔'' غنائی نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ آپ کا سوال ہی جواب بھی ہے۔ وہاں اقلیت بھی تو ہے۔ اس کی خبریں اور عام نشریات ان کے لیے بھی ہیں۔ مخاطب وہ بھی ہیں۔ یہ مسئلہ بالکل ایسا ہے جیسا غیر مسلم نماز کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا۔ بشیر الحق ابھی کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ کار ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ پانچ بندوق دھاریوں نے ان کی کار کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پانچ نوجوان تھے۔ ان میں کوئی بیس سال کی عمر سے زیادہ کا دکھائی نہیں دیا۔ ایک نے ڈرائیور کا دروازہ کھول کر اس کی کنپٹی پر بندوق کی نال رکھ کر اسے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ دو نوجوانوں نے پھرتی سے پچھلا دروازہ کھول کر بشیر الحق اور غنائی کی کنپٹیوں پر اپنے ریوالور رکھ دیئے۔ ایک نوجوان نے ڈرائیونگ سنبھالی اور پہاڑیوں کی طرف تیز رفتاری سے جانے لگا۔ ان دونوں پر سکتہ طاری تھا۔ جب ان کے حواس ٹھکانے ہوئے تو بشیر الحق کی زبان سے نکلا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ آپ یرغمالی ہیں۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''کیوں۔ کس لیے؟'' بشیر الحق نے کہا۔

''آپ دونوں خاموش رہیے۔ یہ آپ کو بعد میں پتہ چل جائے گا۔'' جواب ملا۔ بشیر الحق خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے سلمیٰ کی شادی کے وہ نئے جوڑے گھومنے

لگے جوان کے مکان میں صوفوں پر بکھرے پڑے تھے۔ جوان کو نماز کے بعد پسند کر کے بیگم کے حوالہ کرنا تھے۔

تھوڑی دیر بعد غنائی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور پھر بشیر الحق کے بھی۔ کار کبھی تیز کبھی دھیمی رفتار سے ہچکولے کھاتی چلتی رہی۔ قریب ایک گھنٹے کے سفر کے بعد کار رک گئی۔ اب دونوں کو اترنے کے لیے کہا گیا اور ان کے بازوؤں کو پکڑ کر ایک مکان میں لے جایا گیا۔ جب بشیر الحق کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو وہ ایک بند کمرے میں تھے۔ دو نوجوان ریوالور تھامے کھڑے تھے۔ ایک ان کے پیچھے تھا۔ وہاں غنائی نہیں تھے۔ ایک بیڈ چار کرسیاں، صوفہ سیٹ، رائٹنگ ٹیبل، بخاری وغیرہ۔ چیزوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ ایک امیر آدمی کا مکان ہے۔

''آپ اب آرام کیجیے۔ تھوڑی دیر بعد بھات آجائے گا۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''میں روزہ دار ہوں۔ کھانے کی ضرورت نہیں۔ جمعہ کی نماز ہو گئی ہو گی۔ ظہر ادا کروں گا۔ جاء نماز کا بندوبست کر دو۔'' بشیر الحق نے کہا۔

''یہ ہو جائے گا جناب۔ وضو کے لیے اندر غسل خانہ ہے۔'' ایک نوجوان نے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی وضو ٹوٹا نہیں ہے۔'' بشیر الحق نے مسکراتے ہوئے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ آج ان کی جمعہ خطا ہوئی تھی۔ سوچ رہے تھے پچھلی بار کب ہوئی تھی۔ نہیں تو ان کی جمعہ کبھی خطا ہوئی ہو ان کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ جہاں بھی گئے، جس ملک میں گئے پچیس تیس آدمی مل ہی جاتے تھے۔ مگر آج پتہ نہیں۔ آج ان کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ دونوں نوجوان ان کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ تیسرا شاید جاء نماز لینے گیا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے سلمیٰ گھوم گئی جس کی شادی آئندہ مہینے طے تھی۔ برات برلن سے آنے والی تھی۔ ان کا ہونے والا داماد ایک بڑے جرمن اخبار میں مذہب اسلام پر کالم لکھا کرتا تھا۔ سلمیٰ اور ان کا رشتہ باپ بیٹی کے رشتہ سے بہت آگے تھا۔ وہ اپنے باپ کے علم کی مداح تھی اور یہ پچھلے پندرہ سال سے جبکہ وہ صرف دس سال کی بچی تھی اپنے مضامین اور مقالے اس کو پڑھ کر سناتے اور اہم نکات سمجھاتے اور پھر اس کی رائے لیتے کہ ان کا مضمون یا مقالہ کیا ہے۔ وہ ان کی تعریف کرتی تو خوشی سے جھوم جاتے۔ ان کی بیگم، بڑی لڑکی اور لڑکا پہلے تو ان کی حرکات کا مذاق اڑاتے رہے پھر علمی ماحول کے اس نئے انداز سے مانوس ہو گئے۔ جب بشیر الحق ملک سے یا گھر سے باہر ہوتے تو اپنے مقالے اور مضامین خط کے ذریعہ سے بیٹی

کو روانہ کرتے۔ بیٹی کے تعریفی جواب پر مسرور ہوتے۔ بیٹی کو وہ جو خط لکھ رہے تھے اس میں یہی لکھ رہے تھے کہ اس کی شادی کے بعد باپ بیٹی کی نشستیں نہیں کے برابر ہو جائیں گی۔ سلمٰی کو ایک ہمراز مل جائے گا اور وہ ایک ہمراز سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ وہ خیالوں میں گم تھے۔

جب جاء نماز آگئی تو مسئلہ قبلہ کا تھا۔ چارپائی پر تکیہ کو دیکھ کر قبلہ دو سمتوں میں ایک ہو سکتا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ قبلہ کس رخ پر ہے۔ تو نوجوان فوراً باہر نکلا اور تھوڑی دیر بعد آکر چارپائی کے بائیں جانب اشارہ کیا اور جاء نماز ان کے ہاتھ سے لے کر بچھانے لگا۔ نماز کے بعد وہ لیٹ گئے۔

پورے کمرے پر خاموشی تھی۔ دو نئے نوجوان پرانوں کی جگہ لے چکے تھے۔ افطار کے لیے پانی اور کھیر دی گئی۔ نماز کے بعد انہوں نے ٹرانسسٹر مانگا تو دونوں نے ایکدوسرے کا منہ دیکھا اور خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لایا گیا تو انہوں نے غنائی کے بارے میں پوچھا۔ ان کو کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے کہا کہ جب تک غنائی کو ان کے پاس لے کر نہیں آئیں گے یا انہیں غنائی کے پاس لے کر نہیں جائیں گے تب تک وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ان کی دھمکی سن کر کھانا لانے والا نوجوان باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آکر بولا کہ غنائی یہاں سے دور پہنچا دیئے گئے ہیں ان کو یہاں لانا ممکن نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر وہ کھانے پر بیٹھ گئے مگر بیگم کی یاد نے ان کو کھانے سے ہاتھ روکنے پر مجبور کر دیا۔

عشاء کی نماز کے بعد انہوں نے تراویح پڑھی۔ آج ان کی قرأت میں خود انہوں نے محسوس کیا کہ ایک عجیب خوش لحانی آگئی تھی۔ وہ جھوم جھوم کر سورتیں تلاوت کر رہے تھے۔ جب انہوں نے نماز ختم کی تو سمجھے آدھی رات ہو گئی ہو گی مگر ابھی تو ساڑھے دس بجے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ ان کو کس لیے یرغمالی بنایا گیا ہے اور نوجوان کا نصب العین کیا ہے؟ تو ایک نوجوان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ دوسرے نے اپنے پر قابو پاکر اسے باہر جانے کا حکم دیا اور بڑی سختی سے بشیر الحق سے کہا اگر ((پیار)) ہے تو فوراً بستر پر دراز ہو جایئے اور کسی سے گفتگو نہ کیجیے۔

"ان کپڑوں میں؟" انہوں نے نوجوان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر بستر پر دراز ہوگئے۔ سحری پر جگا دینا۔ ویسے میں مرچ کم کھاتا ہوں۔ اگر اس کا بھی خیال رکھا جائے تو اچھا ہے۔"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دھیمی روشنی کے بلب کو روشن رکھ کر اس نے دوسرے بلب گل کر دیئے اور کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

صبح کی نماز کے بعد انہوں نے کافی دیر تلاوت کی۔ تلاوت کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو خلاف معمول ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ان ہاتھوں میں ان کو پہلے تو سلمٰی کی تصویر نظر آئی اور پھر وہ تصویر ان ریشمی سرخ جوڑوں میں تحلیل ہو گئی جن کو چھوڑ کر وہ اپنے مکان سے نکلے تھے۔ انہوں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اعوذ باللہ پڑھ کر دعا میں مشغول ہو گئے۔ نماز تلاوت و دعا کے بعد ان کو جو سکون ہمیشہ ملا کرتا تھا آج وہ اس سے محروم تھے۔ ایک عجیب بے چینی سے دو چار اپنے خیالوں میں گم کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ایک نوجوان برابر سحری سے کمرے کے اندر ریوالور سے نشانہ بنائے گم سم ان کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ان سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ بات چیت نہ کریں۔ ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ سات بجنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے حلق سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ایک ٹرانسسٹر مہیا کرنے کی درخواست کی۔ اس نوجوان نے ان کی بات ان سنی کر دی اور بغیر کسی جذبے کے ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

شاید ان کی زندگی میں بہت دنوں بعد ان کی درخواست کو کسی نے اس طرح رد کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی گھڑی پر نگاہ ڈال کر اس سے درخواست کرنے ہی والے تھے کہ ان کے اضطراب پر ان کے صبر نے غالب آکر ان کو منہ بند رکھنے پر مجبور کیا اور وہ دل ہی دل میں سورۃ یٰسین ورد کرنے لگے۔

سات سے آٹھ بجے تک کا وقفہ، ایک گھنٹہ، ساٹھ منٹ یعنی تین ہزار چھ سو سیکنڈ کیا ہوتے ہیں ان کو اس کا اندازہ ہوا۔ نہ پڑھنے کے لیے کوئی کاغذ نہ سننے کے لیے کوئی آواز، نہ دیکھنے کے لیے کوئی چیز جیسے جیسے ان کی گھڑی سست رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے ان کا اشتیاق کہ دنیا پر ان کے یرغمالی بن جانے کا کیا ردعمل ہوا ہے بڑھتا گیا۔ وہ مجبور تھے۔ ان کو وہ چیز نہیں مل رہی تھی جس کو سننے سے وہ اس بند کمرے کے باہر کا حال جان سکتے تھے۔ وہ اپنی بے بسی پر پریشان ہو اٹھے۔ اس پریشانی سے ان کے اندر کی قوت جاگ اٹھی، وہ ہمت کر کے نوجوان کی طرف بڑھنے لگے۔ اب نہ ان کو اس ریوالور کی نال کا خوف تھا نہ اس سے نکلنے والی گولی کا۔ ان کو اس طرح بڑھتا دیکھ کر وہ کچھ کچھ سہم سا گیا۔ انہوں نے قریب پہنچ کر اپنی نرم آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ٹرانسسٹر چاہئے۔ تم فوراً لا کر دو یا مجھے گولی مار دو۔'' نوجوان ان کو نشانے پر رکھ کر الٹے پاؤں دروازے تک گیا۔ پلٹ کر دروازہ کھولا۔ باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ بشیر الحق پلٹ کر چارپائی کے پاس آئے اور نیچے ہیٹر کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلا کر گرمی لینے لگے۔

مدیروں کے نام اور ان کی افادیت یاد آجاتی جو ملک کے اندر ہونے والے ظلم واستبداد کو کچلنے اور ظالموں کو سزا دلانے میں پیش پیش رہے۔ کبھی ان وکلا و سماجی کارکنوں کے چہرے دھندلتے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے لہراتے جو مفلس و غریب مظلوموں کی داد و فریاد حکام اعلیٰ تک پہنچا کر انصاف دلواتے۔ ان کے ہوش و حواس پر امید کے بادل منڈلانے لگے اور دھیرے دھیرے وہ نیند کی دیوی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو عصر کا وقت ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر وضو کیا اور بارگاہ ایزدی میں سر جھکا دیا۔

روزہ افطاری کے بعد انہوں نے پھر ٹرانسٹر سے کھیلنا شروع کیا۔ دنیا اپنے معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ ہمہ قسم کے پروگرام ان کو سننے کے لیے مل رہے تھے۔ انہوں نے شاید ہی زندگی میں کبھی نشر ہونے والے پروگراموں کو سنا ہو۔ شاید ہی ان کو معلوم ہو کہ دنیا میں اتنے سارے اسٹیشن ہیں اور برابر پروگرام دیتے رہتے ہیں۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ان کے اضطراب میں کمی آگئی۔ وہ بے جا فکر سے آزاد ہو گئے۔ دل کو سکون سا ملنے لگا۔ ان کو گھر کی بھی یاد نہیں آئی اور نہ موت کے ڈر نے ان کی حالت میں بے چینی پیدا کی۔ عشاء سے پہلے وہ خبریں سننا چاہتے تھے۔ خبروں میں ان کے ذکر کے ساتھ یہ جملے سن کر ان کو بہت خوش فہمی ہوئی کہ یرغمالیوں سے انہیں رہا کرانے کے لیے شد و مد سے بات چیت جاری ہے اور ان کو معینہ وقت سے پہلے رہا کر دیا جائے گا۔ انہوں نے خبریں سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور نماز میں دل کو لگا دیا۔ تراویح کے بعد ریوالور تھامے نوجوان کو سحری کے بندوبست کی فرمائش کی اور بستر پر دراز ہو گئے۔

سحری کے بعد انہوں نے تلاوت کی اور نماز کے بعد تلاوت جاری رکھی۔ وہی بند کمرہ تھا اور ریوالور تھامے نوجوان بھی موجود تھا۔ قید وہی تھی آزادی مقصود تھی مگر ان کا دل آزاد تھا۔ کیونکہ آج ان کو آزاد ہونا تھا۔ ان کی آنکھوں کو پھر کھلے آسمان کا نظارہ ہونے والا تھا۔ باہر ٹھنڈی سرد ہوائیں تھیں مگر وہ اسی بند کمرے میں زیادہ لذت محسوس کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ گھر جاتے ہی سب سے پہلے سلمٰی کے جوڑے پسند کریں گے۔ اس خط کو مکمل کریں گے۔ بیوی کو ان دو شب گزاریوں کے واقعات کو افسانوی رنگ دے کر سنائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا جب ان کی بیگم اس ماحول کے واقعات کو سن کر خوف سے کانپنے لگیں گی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا اٹھے۔ گھڑی پر نظر ڈال کر وہ ٹرانسٹر کی سوئی گھمانے لگے۔ کہیں بھجن کہیں قرات، کہیں حمد و نعت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی اسٹیشن سے مختلف مذاہب کے بزرگوں کے اقوال سنائے جا رہے تھے۔ کسی جگہ سے گیہوں کے پودوں پر

دوائیاں چھڑکنے کے طریقے بتائے جارہے تھے۔ اب خبروں کا وقت تھا۔ خبریں نشر ہونے لگیں۔ ان کے بارے میں ذکر کیا گیا۔ وہ بڑے انہماک سے خبریں سننے لگے۔ ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ بات چیت ناکام ہوگئی تھی۔ مگر ان کی زندگی کے چوبیس گھنٹے اور بڑھا دیے گئے تھے۔ یرغمالیوں کا بیان تھا کہ حکومت گفت وشنید میں دلچسپی نہیں دکھارہی ہے اور سرکاری بیان تھا کہ یرغمالی اپنے مطالبات کی فہرست میں برابر اضافہ کرتے جارہے ہیں۔ خبر کوئی اچھی نہیں تھی مگر بری بھی نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا کامیابی تو ہوگی ہی مگر ان کو چوبیس گھنٹے اس زندان میں اور گزارنے پڑیں گے۔

پھر چوبیس گھنٹے...... انہوں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈال کر دل ہی دل میں کہا۔ ٹرانسسٹر سے فلمی نغمے شروع ہو چکے تھے۔ کل شب موسیقی کی آواز سن کر ان کے دل کو جو سرور ملا تھا وہ اب نہیں تھا۔ بلکہ اب یہ آوازیں شور بن کر ان کو پریشان کر رہی تھیں۔ انہوں نے بٹن دبا کر آواز کو بند کر دیا اور اچانک کمرے میں ایک بھیانک خموشی چھا گئی۔ جیسے دنیا رک گئی ہو۔ ساری دنیا نے کھنڈرات میں تبدیل ہو کر چپ سادھ لی ہو۔ ہر طرف ویرانی ہو۔ ان کو کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا۔ وہ لڑکھڑا کر بستر پر بیٹھ گئے۔ ان کا جسم ٹھنڈے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دماغ منجمد ہو گیا۔ وہ برف کے ایک تودے کی طرح پلنگ پر لڑھک گئے۔

کمرے میں تعینات نوجوان نے جب ان کو بستر پر اس طرح لڑھکتے دیکھا تو وہ فوراً کمرے سے باہر نکلا۔ بشیر الحق کچھ دیر اسی طرح پڑے رہے۔ مگر دھیرے دھیرے انہوں نے اپنے آپ پر قابو پانا شروع کیا۔ قریب پڑے تولئے سے اپنے پسینے کو پونچھا۔ پھر اٹھ کر قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بخاری کی گرمی سے اپنے جسم میں آئی اچانک سردی کو دور کرنے لگے۔

وہ اب منتشر خیالات میں گم اپنے ہاتھوں کو تاپ رہے تھے کہ اتنے میں وہ نوجوان چار آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بشیر الحق کو اس کرسی پر بیٹھے دیکھا تو ٹپٹا کر کہنے لگا۔ ''میں سچ کہتا ہوں جناب، یہ بستر پر چکرا کر گر پڑے تھے۔ ابھی ابھی۔'' وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ان لوگوں کی آنکھیں بشیر الحق کی نگاہوں سے ملیں تو چاروں نے ایک ساتھ ''سلام علیکم'' کہا۔

''وعلیکم السلام ـــــ'' بشیر الحق نے دو دنوں کے بعد چار مہذب آدمیوں کو بغیر ریوالور کے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آیئے تشریف رکھیے۔'' دو آدمی صوفے پر بیٹھ گئے اور دو کرسیوں پر۔ بشیر الحق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا میں اپنے میز بانوں کے تعارف کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟" چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک آدمی قریب والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، کہنے لگا۔

"بات یہ ہے۔ ہمارے نوجوان رفیق نے جو آپ کے کمرے میں ہے اطلاع دی کہ آپ چکرا کے گر پڑے۔ اس لیے ہم ڈاکٹر کو لے کر آئے ہیں تاکہ وہ آپ کو دیکھ لیں۔"

اس آدمی نے جس چالاکی سے بشیر الحق کے سوال کو نظر انداز کیا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ اس بات کو بھانپ کر بشیر الحق نے کہا۔

"کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ انسان پر کبھی کبھی بشری کمزوری غالب آجاتی ہے تو وہ ڈگمگاتا ہے۔ شاید مجھ پر بھی کوئی بشریت طاری ہوگئی ہوگی۔ ویسے میں بالکل صحت مند ہوں۔"

"پھر بھی ہمارا فرض بنتا ہے جناب۔" صوفے پر سے اٹھتے ہوئے ایک آدمی جو شاید ڈاکٹر تھا ان کی طرف بڑھا۔ "میں ذرا آپ کی نبض دیکھ لیتا ہوں۔"

"جس بے گناہ کو چوبیس گھنٹے بعد مرنا ہی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ بیمار مرے یا تندرست؟" بشیر الحق نے ہلکے سے طنز سے کہا۔

"خدا نہ کرے جناب کہ آپ کو مار دیا جائے۔ یہ ایسے ہی ہم اپنے مطالبات منوانے کے لیے آپ کو یہاں لائے ہیں۔" ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔

"اگر مطالبات پورے نہیں کیے گئے تو؟" بشیر الحق اس سے مخاطب ہوئے۔ ڈاکٹر نے ان کی نبض دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

"نہیں جناب، ہو جائیں گے۔ آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ ان کو ماننا پڑے گا۔" اس آدمی نے کہا۔

"مگر صاحب آپ کے مطالبات کیا ہیں اور آپ کیا چاہتے ہیں۔ یہ معلوم بھی تو ہو۔ اور مطالبات منوانے کا یہ وحشیانہ طریقہ ٹھیک بھی تو نہیں ہے۔" بشیر الحق نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "ذرا میں آپ کا بلڈ پریشر لے لوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

بشیر الحق نے کچھ نہیں کہا۔ ڈاکٹر ان کے بازو پر پٹی باندھ کر آلہ میں بلڈ پریشر دیکھنے لگا۔ کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ ایک دوسرے کی سانسوں کی آوازیں فضا کی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔

آپ کا بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے۔ ہم تو گھبرا گئے تھے کہ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ میں زندگی میں بہت کم بیمار پڑا ہوں۔ اور پھر جیسا کہ میں

نے کہا، ان چوبیس گھنٹوں میں کیا بیماری اور کیا تندرستی۔"

"آپ ناامید مت ہوئے جناب۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم نے کہا نا کہ صرف چند مطالبات منوانے کے لیے آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا اور وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دیکھئے اگر آپ کچھ مطالبے منوانا چاہتے ہیں تو ان غیر مہذب طریقوں کو ترک کر دیجئے۔ کیا انسانیت یہاں سے اٹھ چکی ہے۔ کیا اسلام ان طریقوں کی اجازت دیتا ہے۔ گفت و شنید سے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالیے۔ اگر آپ کو پسند ہو تو بندے کی خدمت حاصل کر سکتے ہیں۔" بشیر الحق نے ان لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے پر خلوص انداز میں کہا۔

"یہ تو ہمارے کمانڈر ہی طے کر سکتے ہیں جناب کہ آپ کو ثالث بنائیں یا نہ بنائیں۔ ویسے ہم نے چالیس سال تک ہر وہ طریقہ اپنایا جس کو آپ مہذب کہتے ہیں۔ اور نتیجے میں ہمارا استحصال ہی ہوتا رہا۔ اب ہم نے اپنا لائحہ عمل طے کر لیا ہے۔ اس سے پلٹنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔" کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہم آپ کا پیغام کمانڈروں تک پہنچا دیں گے۔ السلام علیکم!" "وعلیکم السلام۔"

جب وہ چاروں کمرے سے چلے گئے تو بشیر الحق نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تو نو ہی بجے تھے۔ ان کو اس قید میں ابھی چوبیس گھنٹے گزارنا تھا۔ چوبیس گھنٹے کے بعد ان کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ فیصلہ کیا تھا ان کا مقدر تھا۔ ہمیشہ وہ کہتے آئے تھے کہ موت کا وقت معین ہے تو گھبرانا کیا۔ انسان کی زندگی میں موت صرف ایک بار آتی ہے۔ اس کا ذریعہ بھی مقرر ہے۔ بیماری، حادثہ یا کوئی بھی معمولی بہانہ ...... انسان کی حیات باقی رہتی ہے تو وہ بڑے سے بڑے حادثات سے بچ نکلتا ہے اور موت آجاتی ہے تو ایک چھوٹی سی چوٹ جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان کو اس سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ ایک مجاہد کی طرح موت کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ مگر جس طریقہ سے یہ گمراہ نوجوان اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے وہ سراسر غیر مہذب تھا۔ یہ بات ان کو پریشان کرنے لگی۔ ساری زندگی انہوں نے مغرب والوں کو یہ سمجھانے میں صرف کی تھی کہ ان کا مذہب جو ظلم و تشدد کا مذہب نہیں ہے بلکہ امن و امان و سلامتی پر چلنے کی ترغیب کرتا ہے۔ اہل مغرب نے تاریخ کے چیدہ چیدہ واقعات اور حکمرانوں کے نجی فرمانوں کو اسلامی رنگ دے کر اس مذہب کو تلوار سے پھیلنے والا اور مظلوموں پر زبردستی ٹھونس کر مجبوراً تبدیلیٔ مذہب کرانے والا دین قرار دیا تھا۔ بشیر الحق کو اس بات کا علم تھا کہ یہ نوجوان مغرب کے متعصب مورخوں کے ترجمان بنے ہوئے تھے اور دنیا پر اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مغرب کا مورخ اسلام کے بارے میں ٹھیک

کہتا ہے اور آج اسلام صرف گولی اور طاقت سے ہی پھیل سکتا ہے۔ بشیر الحق ان ہی خیالات میں اسلامی تاریخ کے صفحات کو اپنے ذہن میں پلٹنے لگے۔ کس طرح ایک صوفی بزرگ کی آمد سے پورے کا پورا سندھ اسلام قبول کر بیٹھا۔ پنجاب، کشمیر، بنگال، کرناٹک، راجستھان میں یہ مذہب بزرگوں کی تعلیم و عمل و خوش اخلاقی سے پھیلا۔ سارے کا سارا منگولیا، روس، ترکستان، وسط ایشیا، انہی بزرگوں کا مرہون منت ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا صرف ایک بزرگ کے فیض و کرم سے کلمہ گو بن گئے۔ وہ ایک ایک ملک کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خاموشی سے آنے والی نسلوں کی روحوں کو اپنے مذہب پر لگائے گئے الزامات کی تردید کر رہے ہیں اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر رہے ہیں جن کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ ان کو وہ پیران طریقت یاد آگئے جو جانے مانے چور، لٹیرے اور ڈاکو تھے۔ کسی قاری سے قرآن کی ایک آیت سن کر اماموں کا درجہ پالیا۔ ان کو تاریخ کے وہ واقعات یاد آگئے جہاں مسلمانوں پر مسلسل ظلم کرنے والوں نے مسلمانوں کے صبر و تحمل کو دیکھ کر اسلامی تعلیمات کا مطالبہ کیا اور اسلام قبول کرلیا۔ مگر آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم ہمارے اسلاف کے عمل کو بھول کیوں گئے۔ آج کل تو ذرائع ابلاغ کی کمی نہیں اور حقیقت سے بھری کتابیں بھی ہیں۔ نوجوان مطالعہ کیوں نہیں کرتے؟ وہ ان خیالات میں گم تھے۔ ذہن کے کسی کونے میں ان کو ان کی بیگم کی سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ آپ نے نماز کے بعد آکر اپنی سلو کے کپڑے پسند کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ ابھی نہیں آئے۔ آج آٹھ تاریخ ہے۔ مجھے دس تاریخ کو دہلی جانا ہے۔ آپ آجاتے تو میں محمود سے کہہ کر کپڑے خرید لیتی۔ سلمیٰ کسی اور کے پسند کئے ہوئے کپڑے نہیں پہنے گی۔ وہ خود بھی کوئی اپنی پسند کے کپڑے نہیں خریدے گی۔ آپ جلدی آجاتے تو مجھے کتنی آسانی ہو جاتی۔ آپ کہاں چلے گئے ہیں؟ آپ زندگی بھر علم حاصل کرتے رہے، علم پر عمل کرتے رہے۔ دوسروں کو عمل کی ترغیب دیتے رہے۔ آخر آپ کو کیا ملا؟ وہی اضطراب، بے قراری اور اس عمر میں بھی آرام و سکون نہیں۔ آخر دنیا والوں نے آپ کو دیا ہی کیا؟

نہیں بیگم نہیں۔ انہوں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ خدا کے دوستوں کا دل ہر گز ساکن نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں کیونکہ اس طبقے پر سکون و آرام حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے لیے دنیاوی خوشی کا حصول ان کی منزل نہیں ہوتی۔ ان کا مقصود و مراد اس کی محبت کی وارفتگی ہے۔ ان کے لیے اپنے مقصود و مراد سے بے خبری و غفلت دنیا و آخرت دونوں جگہ جائز نہیں۔ آج کے بعد سلو اپنے کپڑے خود پسند کرے گی یا تم اپنی پسند کے کپڑے پہنا دینا۔ اللہ تعالیٰ میرا امتحان لے رہا ہے۔ دعا کرو

اس وقت صبر و تحمل ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے اور میں نے زندگی بھر جس مشن کی تلقین و تبلیغ کی اس میں خود ناکام نہ ہو جاؤں اور اس زندگی کے آخری لمحات میں اس کا شکر نہ کر کے ہمیشہ کے لیے اس کی رضا سے محروم نہ ہو جاؤں۔ ان کی بیگم کی آواز پھر آئی۔ "آپ کیوں نہیں سمجھتے کہ نہ صرف میں پریشان ہوں بلکہ آپ کے سب چاہنے والے بھی پریشان ہیں۔ سب اپنی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ آپ کو ڈھونڈ نکالیں مگر کوئی بھی کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ آپ کے اتنے جان پہچان کے حکام اعلیٰ ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ سب خاموش ہیں۔ ذرا اور پہل ہو جائے تھوڑی اور توجہ ہو جائے تو آپ کی زندگی بچ سکتی ہے۔ یہاں جو کچھ میں نے سنا اور پڑھا اس کو میں بیان نہیں کر سکتی۔ وحشت ہوتی ہے۔ دل خوف سے کانپ جاتا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں خود دہلی جا کر اعلیٰ حکام سے ملوں اور آپ کی رہائی کی درخواست کروں۔

نہیں بیگم نہیں۔ اس سے آگے مت بڑھو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں جس مقام پر ہوں وہاں میرے لیے مناسب نہیں ہے کہ میں اپنے مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی طرف نظر ڈالوں کیونکہ غیر کی طرف نظر اٹھانا میری ذلت کا موجب ہے۔ اگر لوگ اپنی طرف سے اس کوشش میں لگے ہیں تو میرے مرتبے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اگر تم نے میری طرف سے کسی کے سامنے التجا کی تو میں اپنے وجود کے ساتھ ہلاک ہو جاؤں گا۔

بشیر الحق کی خود کلامی بلند آواز میں تبدیل ہو گئی جس سے وہ نوجوان جو کمرے میں تھا گھبرا کر ان کی طرف بڑھا۔ اس کے اچانک اس طرح سامنے آ جانے سے ان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ پر جمال نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی نورانی کرنوں کو دیکھ کر اُس نوجوان پر کپکپی طاری ہو گئی۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور سارا دن ذکر و عبادت میں گزار دیا۔

اس بند کمرے میں آج ان کی تیسری صبح ہوئی تھی۔ سحری و نماز کے بعد وہ سکون سے کرسی پر بیٹھے ہوئے خدا کی یاد میں مشغول تھے۔ آج انہوں نے نہ ٹرانسسٹر کی طرف توجہ کی اور نہ خبریں سننے میں دلچسپی لی۔ وقت کس طرح گزر رہا تھا اس کا ان کو اندازہ ہی نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی کھلے باغ میں بیٹھے اس کے رنگ و بو سے بے خبر ہو کر اپنی بشریت کو فنا کر رہے ہیں۔ کمرے میں چار آدمی آکر ان کو سلام کر کے کھڑے رہے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ نوجوان گھبرائے کہ کہیں آپ انتقال تو نہیں فرما گئے۔ ان میں ایک آدمی نے آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا تو انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بڑی نفیس مسکراہٹ سے ان کو دیکھا۔ چاروں کی نگاہیں ان سے ملیں۔ وہ ان کی آنکھوں میں

جمالی کرنیں دیکھ کر لڑکھڑائے اور نیاز مندی سے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ چاروں دبک کر جہاں جگہ ملی وہاں بیٹھ گئے۔ یہ چاروں آدمی نئے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ وہ تحریک کے سر براہوں میں سے ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریک کے بارے میں بتایا۔ ان کی قوم پر ہوئی جائز و ناجائز زیادتیوں کا ذکر کیا۔ ظلم وستم کی داستانوں کے قصے سنائے اور نصب العین کو پانے کے لیے کیوں اور کس لیے بندوق و گولی کو اختیار کیا اس کا اظہار کیا۔

وہ جب اپنی باتیں ختم کر چکے تو بشیر الحق نے ان کو سمجھایا۔ "کسی بھی قوم پر ظلم وستم برا ہوتا ہے۔ کسی برائی کو دور کرنے کے لیے برائی کی مدد لینا بہت برا ہوتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی ناانصافی کو دور کرنے کا حل ہتھیار نہیں ہیں۔ اس سے ظلم اور بڑھتا ہے اور معصوم لوگوں کا خون بہتا ہے۔ معاشرے میں دہشت پھیلتی ہے۔ دہشت پھیلا کر حاصل کی ہوئی کامیابی دیرپا نہیں ہوتی۔ ایک فریق دوسرے فریق کے تشدد کا جواب تشدد سے دے گا۔ جس سے خون خرابہ بڑھے گا اور دلوں میں نفرت بڑھے گی۔ سارے مذاہب خدا کی طرف سے نفرت کو دلوں سے نکالنے اور آپسی محبت کو بڑھانے آئے ہیں۔ ہم جس مذہب پر چلتے ہیں وہ پیار و محبت کا عظیم الشان پیغام لے کر آیا ہے۔ اس لیے ہمیں گفت وشنید سے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہئے۔"

کافی دیر تک بحث و تکرار ہوتی رہی۔ بشیر الحق نے ان نوجوانوں کو مطمئن کر دیا کہ اگر کوئی قوم کسی اور کے ظلم وستم کا شکار ہوتی ہے تو اس کو پہلے علم اور پھر عمل سے یہ ظاہر کرنا چاہئے کہ وہ بھی ایک مقام رکھتی ہے۔ اس میں ناکامی ممکن نہیں بلکہ کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اس لیے ان نوجوانوں کو اپنے علم و عمل سے دنیا پر ظاہر کرنا ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ اس راستے کو چھوڑ دینا چاہئے جس سے خلق خدا کے امن و امان میں خلل پڑتا ہے۔ اجر دینے والا مالک حقیقی ہے۔ اس کا فیض عام ہے خاص نہیں۔ اس لیے علم و عمل کے بعد اسی سے امید لگائے رکھنا ہے مخلوق سے نہیں۔ چاروں ان کی باتوں سے متاثر ہوئے۔ بشیر الحق نے ظہر کی نماز کی امامت کی وہ مقتدی بنے۔ نماز کے بعد ان کی باتیں ہائی کمان تک پہنچا کر ان کے خیالات کی ترجمانی کرنے کا وعدہ کر کے انہوں نے رخصتی لی۔ بشیر الحق کافی مطمئن ہو کر بستر پر دراز ہو گئے۔

عصر کی نماز کے بعد وہ تلاوت میں مشغول تھے کہ دو نوجوان کمرے میں آئے اور کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

"کیا آزاد کر دیا گیا ہوں؟" انہوں نے یک لخت خوشی سے کہا؟"

ہاں جناب؟ ہمیں یہی پیغام ملا ہے۔"

"کیا میں شیونگ لے سکتا ہوں۔ مجھے کہیں سے ریزر اور بلیڈ لا کر دے دو۔ میں لوگوں کے سامنے اس طرح جانا پسند نہیں کرتا۔ ورنہ کہیں گے کہ مجھے کافی ستایا گیا ہے۔" وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلے۔ آزاد ہوا کے بے پروا جھونکوں نے ان کا استقبال کیا۔ تین دن بعد ان کی آنکھوں نے آسمان کی بلندی کا نظارہ کیا۔ ایسا لگا کہ فردوس کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے گئے ہیں۔ وہ گھر سے نکل کر زینے اترنے لگے تو دیکھا کہ سامنے ایک جیپ کھڑی ہے جس کے اندر ان کے سکریٹری غنائی اپنے چہرے پر تین دن کی داڑھی بڑھائے نیم مردہ حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کو زینے اترتے دیکھ کر وہ جیپ سے کود پڑے اور دوڑے ہوئے ان کے پاس آئے اور گلے مل کر رونے لگے۔ بشیر الحق ان کے پاس آئے اور گلے مل کر اس طرح چمٹے کھڑے رہے جیسے ان کو الگ کرنا مشکل ہے۔ دونوں مشکل سے الگ ہوئے۔ ان نوجوانوں کے اشارے پر وہ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے، جس میں پہلے ہی دو اور نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔

جیپ آگے بڑھتی رہی۔ چونکہ پیچھے کا پھاٹک بند تھا اور شیشوں پر پردے چڑھے ہوئے تھے اس لیے سڑک کا تعین کرنا مشکل تھا۔ یہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کرتے رہے۔ بشیر الحق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خیالی طور پر سلمٰی کے جوڑے پسند کر رہے تھے۔ قریب پون گھنٹہ گزرا ہوگا۔ جیپ رک گئی۔ باہر سے پھاٹک کھلا۔ پھاٹک کھولنے والے نوجوان نے معذرت سے کہا۔

"معاف کرنا جناب! آپ دونوں کو یہیں اترنا پڑے گا۔ حفاظتی دستے ہیں۔ گاڑی چیک کریں گے تو ہم گرفتار ہو جائیں گے۔ آپ جا کر موڑ پر گھوم جایئے۔ وہاں سے آپ کو شہر جانے کے لیے گاڑیاں مل جائیں گی۔" دونوں نے اندر بیٹھے نوجوانوں سے ہاتھ ملایا۔ اور خوشی خوشی نیچے اتر پڑے۔ وہ نوجوان جا کر سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا۔ گاڑی کا پھاٹک کھلا ہوا ہی تھا۔ بشیر الحق ایک بار پھر شکریہ ادا کرنے جیپ کی طرف مڑے۔ الوداعی انداز سے ہاتھ اٹھا کر شکریہ کہنے ہی والے تھے کہ ایک نوجوان کی مشین گن کا منہ ان کے سینوں پر کھل گیا۔ گولیوں کی آواز سے قریب کے درختوں پر بیٹھے پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ گئے۔ بشیر الحق اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر منہ کے بل زمین پر گر پڑے اور ان کے بغل میں غنائی۔ بشیر الحق کو جاتی جیپ میں سلو کے ہزاروں جوڑے لدے ہوئے نظر آئے، جو جیپ سے نکل کر پرندوں کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کرنے لگے۔ ان کے ساتھ بشیر الحق اور غنائی بھی شامل ہو گئے۔

○○

## مظہر امام

# ہوائے ناآشنا سے کہنا

کبھی کبھی میں اداس لمحوں میں سوچتا ہوں
یہ کیسی راہیں ہیں
جن پہ میرا کہیں کوئی نقش پا نہیں ہے
مری بیاض سفر کی تحریر مٹ چکی ہے
مرے خیالات منتشر کی طرح
ہوا میں
غبار ملبوں کا اڑ رہا ہے
مری نگاہوں کے سامنے ہے
وہ سیل خوں
جس میں سارے آدرش بہہ گئے ہیں
یہ کیسی انصاف کش فضا ہے
کہ سانس لینا بھی اک سزا ہے!

گلی کے نکڑ پہ لاش کب سے پڑی ہوئی ہے
کہ وارثوں میں ابھی وراثت کی جنگ جاری ہے
اور اب تک
کسی عدالت سے فیصلے کی خبر نہیں ہے!

مگر میں کس سے کہوں کہ آؤ
مری نظر سے یہ حادثہ اک نظر تو دیکھو.... !

ہمارے دریا ہمارے صحرا سے دور بہتے ہیں
تشنگی ہونٹ پر جمی ہے
پرانے رستوں پہ ٹھوکریں ہیں
نئے خیالوں پہ سخت پہرے لگے ہوئے ہیں
ہمیں اجازت نہیں ہے اب خواب دیکھنے کی!
ہماری اپنی شناخت کیا ہے
کہ ہم تجارت کا مال ہیں
اور ہمیں سے بیوپار چل رہا ہے!

ہوا سے کہنا
ہوائے ناآشنا سے کہنا
کسی شناسا کو ساتھ لائے
جو آ کے شانوں پہ ہاتھ رکھے
کہے کہ، تم سے بچھڑ کے خود سے بچھڑ گیا ہوں
کہیں سے جگنو تو کوئی چمکے
کہیں سے گھنگھرو تو کوئی چھنکے
کہ اب ہمارے تھکے قدم کے
پچاس برسوں کے اس
مسلسل سفر کی تکمیل ہو چکی ہے!

○○

## مخمور سعیدی

# سمندر کا نوحہ سنو!

سمندر کا نوحہ سنو۔۔۔اور سوچو
سمندر کو یوں کس نے نالہ بہ لب کر دیا ہے
سمندر کے پرشور سنگیت میں کس نے غم بھر
دیا ہے،
خروشاں سمندر کی موجوں کو کیا دکھ ہے،
یہ کس لئے اس المناک انداز میں چیختی ہیں
سسکتی سی آواز میں چیختی ہیں!

○

سمندر کا نوحہ سنو۔۔۔اور سوچو
سمندر کا پانی لہو رنگ کیوں ہے
سمندر کا سینہ۔۔۔۔
چمکتی ہوئی خوش نما سیپیوں، بے بہا موتیوں
کا خزینہ
سمندر کے سینے پہ کس نے یہ خونی سفینے اتارے
سمندر کی دولت
سمندر کی گہرائیوں سے نکالی
کنارے پہ ڈالی
لٹیرے جہاں صف بہ صف ہاتھ اپنے
پسارے کھڑے تھے
سمندر کی شہ رگ میں جن کی ہوسناک
نظروں کے خنجر گڑے تھے

○

سمندر کا نوحہ سنو۔۔۔اور سوچو
سمندر کی شہ رگ سے بہتا لہو قطرہ قطرہ
نہیں۔۔۔ قطرہ قطرہ نہیں، شعلہ شعلہ
سمندر میں پھیلا
کناروں کی جانب بڑھا آگ اور خوں کا ریلا
تو کس سے رُکے گا
کوئی ہے جو طوفان کے بڑھتے قدم روک
لے گا؟

○

سمندر کا نوحہ سنو۔۔۔اور سوچو
یہ پھولوں بھری بستیاں۔۔۔
جو تمہارے لئے نغمہ زار ارم ہیں
یہ آتش بجاں، نوحہ برلب سمندر کی سیال سرحد
سے
اب گے، قدم ہیں؟

○○

# حفیظ آتش

## دریافت

کبھی پرندوں کو دیکھوں
کبھی شجر سوچوں
بساط تنکوں کی پھیلاؤں
اور گھر سوچوں
کبھی ندی کے بہکتے ہوئے
جنوں کا رقص
بدن میں گونجنے لگتا ہے
شعلگی بن کر
نشیب ہوں میں کہاں تک
فراز کیسے ہوں
ہنوز پیٹ کا دوزخ
لدا ہے کاندھوں پر
میں تیرے رحم و کرم کا
جواز کیسے ہوں
کسی کو ہو اگر ادراک
مجھ کو سمجھائے
میں کون ہوں
میں کہاں ہوں
یہ کوئی بتلائے

○○

## حادثہ

میں ایک روز
نشے کی شدت میں جب گر پڑا
تو
اٹھانے کی زحمت بھی تم نے ہی کی
اس سے پہلے کئی بار ایسا ہوا
تم گرے
میں تمہیں گھر کی دہلیز تک
چھوڑ کر آگیا
اور پھر شام کو
جب ملے دونوں ہنسنے لگے
آج کیا ہو گیا
میں کئی بار گر کر اٹھا
تم نے ایک بار بھی
اس طرف مڑ کے دیکھا نہیں
کون سی قدر ٹوٹی
تمہارے مرے درمیان
رات بھر سوچتا ہی رہا

○○

## عورت

مہر و محبت، اُنس اور شفقت
ممتا، اپنائیت و صداقت
رنگ اور خوشبو
انگ معطر
دلکش، دلبر
مہ رو، نازک
حسن طبیعت
وجہ مُسرّت
وِیرانے کو
کر دے جنت
یہ سب دے کر
اس گل تن کو
پتھر سیرت
سخت اور بے حس
خار بدن
خود عاشق طینت
کی سنگت کو
کیوں تھا بنایا
پتھر سے کلیوں، پتیوں کو کیا نسبت ہے
کانٹے کیا زخمی نہ کریں گے پھول بدن کو؟

○○

## مرد

اس نے مطلب کی خاطر
کیا استعمال
بیچتا بھی رہا
اور خریدا کیا
شیشۂ دل کو توڑا
بدن کے لیے
پھر بدن کو بھی چھوڑا
کسی دوسرے تن کی خاطر
کہ اس کی تلاش
اب بھی جاری ہے اور
جانے کب تک یہ جاری
رہے گی ابھی،
خونی ہونٹوں کی وہ
دائمی تشنگی
کس کی شفاف گردن
کی نیلی نسوں سے
بجھے گی کبھی یا بجھے گی نہیں

○○

# خواب در خواب

مجھ کو مسحور کئے دیتا ہے
برف پر پھیلی ہوئی چاند کی کرنوں کا طلسم
ہر طرف ایک فسوں خیز سی خاموشی ہے
برف کے پھول سجائے ہوئے
بے برگ درخت
نیم خوابیدہ مکانوں کے دریچے ہیں
کہیں پر روشن
اور بہت دور وہاں ماؤنٹ رائل[1] پہ
چمکتا ہے نشان عیسیٰ
منجمد پانی کے اس پار نظر آتا ہے
جگمگاتا ہوا آباد جزیرہ روشن
جھلملاتا ہوا منظر سارا، جاگتی آنکھوں کا ایک
خواب نظر آیا تھا
دھیرے دھیرے میری رگ رگ میں
اتر آیا تھا

ہاں مگر دل پہ ابھی نقش ہیں وہ گلیاں بھی
جن کو چھوڑ آئے تھے برسوں پیچھے
وہ در و بام وہ کوچے وہ لوگ
جو کہ رگ رگ میں سمائے ہیں
لہو کی صورت
وہ بھی سب خواب ہیں
ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں
سیکڑوں میل کی دوری نہیں معنی رکھتی
ہم تو چھوڑے ہوئے گھر کی خوشبو
اپنی ہر سانس میں محسوس کیا کرتے ہیں
زندگی اپنی کچھ اس طور سے گزری ہے
کہ ہم
خود کو دو حصوں میں تقسیم کیے
خواب در خواب جیا کرتے ہیں

○○

[1] ماؤنٹ رائل (Mount Royal) کناڈا کے شہر مانٹریال کے وسط میں ایک پہاڑی ہے، جس کی چوٹی پر ایک Cross نصب ہے، جس پر رات کو برقی روشنیاں جلتی ہیں۔

# غزلیں

تحفے بھیگی رتوں کے وہ دے گا　غم کے نشتر درد کی گھاتیں وہی
درد کی کھیتیاں سی بو دے گا　رات کی جھولی میں سوغاتیں وہی

دھیمے لہجے میں بات ہوگی مگر　اس کی نظروں میں وہی بیگانگی
کانٹے لفظوں میں وہ پرودے گا　اور مری آنکھوں میں برساتیں وہی

پہلے گھاؤ لگائے گا دل پر　جھوٹ کی چادر پہ پسرے دن مرے
پھر مرے آنسوؤں پہ رودے گا　سچ کی سولی پر مری راتیں وہی

کچے نکلیں گے میرے سارے رنگ　روح پر ان دیکھی زنجیروں کا بوجھ
اپنے رنگوں میں یوں بھگودے گا　تشنہ تشنہ سی ملاقاتیں وہی

کشتی اس کی ہے، باد باں اس کے　دردِ دل پوشیدہ رکھنے کی وہ ضد
جب بھی چاہے گا وہ ڈبودے گا　اس سے اُس سے سرپھری باتیں وہی

میں نے جس روز پالیا خود کو　خود کو کھویا دو جہاں کو پالیا
دیکھ لینا مجھے وہ کھودے گا　عشق کی ساری کراماتیں وہی

# آدی واسیوں سے بڑھ کر میری خود نوشت سوانح حیات نہیں ہے۔

(مہا شویتا دیوی سے کرپا شنکر چوبے کی بات چیت)

**سوال:** پچھلے تین برسوں سے آپ آتم کتھا لکھ رہی ہیں۔ کب تک مکمل ہونے کی امید ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ آٹو بایو گرافی کو لے کر آپ کا IDEAL کیا ہے؟

جواب: آتم کتھا لکھنا اب بند کر دیا ہے۔ جتنا لکھا وہ ''پربھا'' کے کئی شماروں میں شائع ہوا۔ مگر مجھے پسند نہیں آیا۔ منظم انداز سے اسے پھر لکھنا پڑے گا۔ نئی شروعات کرنی ہوگی۔ آٹو بایو گرافی کو لے کر میرا IDEAL یہ ہے کہ اس کے پڑھتے ہی انسان کی صحیح پہچان ہو جائے۔ سوانح حیات صاف و شفاف ہونی چاہیے۔

سوال: نئے سرے سے اپنی سوانح حیات لکھنے کی کوشش شروعات کب کریں گی؟

جواب: ۱۹۹۸ء میں تو شروعات نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ ابھی ہمارے کام کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ یہ پورا سال میں ''DENOTIFIED TRIBES'' کو دے رہی ہوں۔ ان کے لیے جدو جہد کر رہی ہوں۔ ان کے حق کی لڑائی میں شامل ہونے کا یہ وقت ہے۔ پورے ملک کے DENOTIFIED TRIBES کی آزادی منظم ہو کر چلنے لگے تب سوچونگی۔ سوانح حیات کے بارے میں DENOTIFIED TRIBES سے بڑھ کر میری سوانح حیات نہیں ہے۔

سوال: آپ کے ادب میں آج کی زندگی کتنی دکھائی دیتی ہے؟ عصری فکر زیادہ کام میں آتی ہے یا ماضی کی زندگی، تجربہ اور یادیں؟

جواب: زندگی میں تجربہ اور فکر دونوں آتے ہیں۔ مظلوموں اور آدی واسیوں کے ساتھ جو تجربے ہیں وہ تو آتے ہی ہیں۔ ان کے ساتھ میرا لگاؤ بھی الگ قسم کا ہے۔ میری زندگی ندی کی طرح ہے جو ہمیشہ رواں ہے۔

سوال: ابھی کوئی ادیب ہے جس سے آپ اپنی جگہ بدلنا چاہیں؟

جواب: میری زندگی میں تو کوئی نہیں دکھائی دیتا۔

سوال: دل میں کوئی ایسی خواہش رہ گئی ہے کہ کاش یہ بھی ہوا ہوتا؟

جواب: میں بہت کچھ لکھنا چاہتی تھی۔ لکھ نہیں پائی۔ مستقبل میں بھی نہیں لکھ سکوں گی۔ مگر نہ لکھ پانے کا افسوس نہیں۔ کیونکہ آدی واسیوں کی خدمت کرنے کا موقع تو ملا۔ ۱۹۷۵ء سے ہی روزانہ ۱۸ ار گھنٹے کام کرتی ہوں۔ یہ کام گھٹتا نہیں بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ میں نے بہت سارے کام ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔ جانتی ہوں انہیں پورا کئے بغیر ہی جانا پڑے گا۔ کیونکہ سارے کاموں کو پورا کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ سب کچھ کر کے جانا ممکن نہیں ہے۔

سوال: جس کے بعد کچھ نہیں واقع ہوتا وہ موت ہے؟ موت کے راز پر کبھی غور کیا؟

جواب: کبھی نہیں سوچا اور نہ ہی میں موت سے ڈرتی ہوں۔ ویسے میں کبھی مروں گی نہیں۔ آدی واسیوں کے درمیان ہمیشہ زندہ رہوں گی۔ "اِف دے آر الائیو، آئی ول بی الائیو۔" میں آدی واسیوں سے الگ نہیں ہوں میں دولت، چمک دمک کی وجہ سے زندہ نہیں رہوں گی۔ بلکہ میرا ماننا ہے کہ آدی واسی بچے رہیں گے تو میں بھی زندہ رہوں گی۔

سوال: مان لیں، کسی غیر آباد غیر انسانی جزیرہ میں آپ کو رہنے کے لیے بھیج دیا جائے اور اپنی لکھی یا دوسرے کی پانچ کتابیں ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے تو کون کون سی کتابیں لے جائیں گی؟

جواب: میں کسی بھی غیر آباد جزیرے میں کبھی نہیں جاؤں گی۔

سوال: اچھا آخری سانس کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرنے کو کہا جائے، تو کہاں جانا چاہیں گی؟

جواب: کسی آدی واسی علاقہ میں۔ ان کے درمیان کام کرتے ہوئے ہی آخری سانس لینا چاہوں گی۔

سوال: ابھی کیا پڑھنے کو دل کرتا ہے؟

جواب: ابھی کم پڑھتی ہوں۔ کیونکہ کتابوں سے زیادہ آدی واسیوں سے سبق سیکھتی ہوں۔ آدی واسیوں کی زندگی، ان کے قانون، زمین سدھار قانون وغیرہ کے بارے میں پڑھتی ہوں۔ جاسوسی کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔

سوال: آج کے آرٹ اور ادب کو لے کر آپ کو کوئی فکر؟

جواب: میں کیا فکر کروں؟ میں ایک سپاہی ہوں۔ ادب کے میدان میں بھی ایک سپاہی ہوں۔ کام کے میدان میں بھی سپاہی ہوں۔ زندگی میں بھی سپاہی۔ ایک SOLDIER سولجر کی جو فکر ہوتی ہے وہ کیا کم ہے۔

سوال: آزادی کے پچاس سال بعد قومی سطح پر بنگال کا مقام کہاں ہے؟ سیاست، تعلیم کھیل کود، ادب، کلچر کے میدان میں وہ کہاں پہنچا ہے؟ کیا بنگال مختلف میدان میں اپنی الگ شناخت اور انفرادیت بر قرار رکھ سکا ہے یا جس اونچائی تک پہنچنا تھا وہاں تک نہیں پہنچ سکا ہے؟

جواب: ملک کے بٹوارے کے بعد مغربی بنگال کے ساتھ سنٹرل گورنمنٹ نے سوتیلا برتاؤ کیا ہے۔ مرکز کی طرف سے نئی امداد صوبہ کو ملنی چاہئے تھی، نہیں ملی۔ ملک کے بٹوارے کے بعد جو گھس پیٹھ شروع ہوئی وہ آج تک جاری ہے۔ صرف بنگلہ دیش کے لوگ ہی یہاں نہیں آتے بلکہ بہار، اتر پردیش اور راجستھان کے لوگ بھی بھاری تعداد میں روزی روٹی کی تلاش میں آتے رہے ہیں۔ بنگال کو جو مقام ملنا چاہیے تھا، مرکزی حکومت نے نہیں دیا۔ آزادی کے پچاس برسوں میں بنگال کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان رابطہ بنائے رکھا۔ جہاں تک سیاست میں بنگال کے مقام کی بات ہے تو ملک میں آج جیوتی باسو جیسا باوقار کوئی بھی سیاست داں نہیں ہے۔ کھیل میں سوربھ گانگولی نے ملک کے وقار میں چار چاند لگادیا ہے۔ موسیقی لکچر میں بنگال ہمیشہ آگے رہا ہے۔ ادب کے سلسلے میں میں کیا بولوں۔ پورے ہندوستان کی زبانوں کے ادب میں بنگلہ کا مقام کیا ہے؟ یہ نقاد دیکھیں۔

سوال: انگریزی کے مقابلہ میں بنگلہ زبان کے فروغ میں کیا آپ ہندوستانی زبانوں کو رکاوٹ مانتی ہیں۔ اگر نہیں تو ہندوستانی زبانوں کا معیار بڑھے، اس کے لیے آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: بنگلہ زبان کے فروغ اور ترقی میں انگریزی کے مقابلہ میں ہندوستانی زبانیں کیوں راستے میں آئیں گی بھلا؟ میرا تو ماننا ہے کہ ہندوستانی زبانیں بنگلہ کی ترقی میں مددگار رہی ہیں۔ ہندوستانی زبانوں سے کئی لفظ لے کر بنگلہ نے اپنے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ کئی لفظ بنگلہ نے دوسری ہندوستانی زبانوں سے لیے ہیں۔ جیسے "ہستال" اس نے گجراتی سے لیا ہے۔ سبھی ہندوستانی زبانیں متنوع ہیں، RICH ہیں۔ سب کا ادب سب کو ملنا چاہیے۔ انگریزی کے کتنے قاری ہیں۔ میں بار بار کہتی ہوں کہ میں ہندی میں شائع ہوئی تبھی پورے ہندوستان میں جانی گئی۔ انگریزی کتنے لوگ سمجھتے پڑھتے ہیں؟

سوال: ہندوستانی زبانوں کے فروغ کی حامی ہونے کے ناطے آپ بتایئے کہ ان کی ترقی اور سبھی زبانوں کے درمیان رابطے کے لیے کیا کچھ کیا جانا چاہیے؟

جواب: ترجمہ کے ذریعہ ہی ہندوستانی زبانیں ایک دوسرے کے نزدیک آئیں گی۔

کیرل میں ترجمہ کا کام بہت اچھا ہوتا ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ اور ساہتیہ اکادمی اس کام کو کچھ حد تک کر رہی ہیں۔ ہندوستان کی سبھی زبانوں کا ہر زبان میں پورا ترجمہ ہونا چاہیے۔ میرا ماننا ہے کہ لکشمن گائیکواڈ کی تصنیف کی ہوئی ''اچا‌یا'' اگر سبھی زبانوں میں آئے تو یہ سب کے لیے بڑا کارنامہ ہوگا۔

سوال: ملک کے موجودہ حالات کو دیکھ کر ذہن میں کوئی گہری فکر جاگتی ہے؟

جواب: کیوں، تمہیں نہیں فکر ہوتی ہے۔ کالاہانڈی دیکھ کر غریبی، جہالت، بے بسی اور استحصال دیکھ کر، آدی واسیوں کو انسانی حقوق سے محروم دیکھ کر۔ آج بھی ڈھائی کروڑ آدی واسی ملزم ہونے کے داغ کو لے کر جی رہے ہیں۔ آدی واسیوں کے استحصال اور فاقہ کشی کا جو کینسر ہے کیا اسی پر ملک کی عمارت کھڑی ہوگی۔ اگر بنیاد ٹھیک نہیں ہوئی تو عمارت گر جائے گی۔ مفلسی کا کینسر لے کر ترقی ممکن نہیں ہے۔

سوال: ملک کی آزادی کے پچاس برسوں میں سب سے اہم کارنامے کیا ہیں؟

جواب: ملک آزاد ہوا تو ۱۹۵۲ء میں CRIMINAL TRIBE ACT. کو ختم کر دیا گیا جو ۱۸۷۱ء میں نافذ ہوا تھا۔ اس وقت اس قانون کو اس لیے ختم کیا گیا کیونکہ عام انتخاب میں ووٹ حاصل کرنا تھا۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جو قانون ختم ہوا، عملی طور پر کبھی بھی اسے نافذ نہیں کیا گیا۔ یہ کارنامہ ہے آزادی کے پچاس برسوں کا۔ ڈھائی کروڑ آدی واسیوں کو اب بھی مجرمانہ ذہنیت کا مانا جاتا ہے۔ ان کو مجرم کہلانے جیسی باتوں سے آزاد کرنے کا کام صدی کے آخر میں ہم شروع کرنے جا رہے ہیں۔ ہماری یہ لڑائی مذہبی لڑائی ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہماری لڑائی ہتھیار بند نہیں ہے مگر ہمارے ساتھ سارے لوگ محنت کش ہیں۔ ہماری لڑائی میں روزانہ لوگ شامل ہوتے جائیں گے۔

سوال: آزادی کے پچاس برسوں میں ایک عام ہندوستانی میں کیا آپ کوئی بڑا فرق دیکھتی ہیں؟

جواب: میں تو کوئی فرق نہیں دیکھتی۔ جب بنیاد ہی ٹھیک سے نہیں رکھی گئی تو فرق کیا آئے گا؟

سوال: ایسا دیکھا جا رہا ہے کہ لوگ اپنی وراثت اور تہذیب سے کٹتے جا رہے ہیں۔ کن حالات کے تحت لوگ اپنی تہذیب کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گئے ہیں؟

جواب: اگر تہذیب سے کٹتے جا رہے ہیں تو ہماری تہذیب میں لوگوں کو پکڑ کر رکھنے کا دم نہیں تھا۔ لیکن تہذیب کچھ نہیں تھی، اسے میں پوری طرح نہیں مانتی۔ میں اس بات سے

بھی متفق نہیں ہوں کہ بھی لوگوں نے تہذیب کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے۔ آج بھی تہذیب سے بہت کچھ حاصل کر کے کافی لوگ خدمت کے جذبے، مہمانوں کا خیر مقدم، رحم اور نرم دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں ہندوستان کے کئی حصوں میں جاتی ہوں تو لوگ کافی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی تہذیب ہی ہے۔ تو میں کیسے مانوں کہ لوگ اپنی تہذیب سے دور ہو گئے ہیں۔ اب بھی لوگ پرانے رکھ رکھاؤ میں، انسانی قدروں میں یقین رکھتے ہیں۔ قدروں میں یقین نہیں ہوتا تو گنیش دوبے بڑودہ یونیورسٹی میں ہیڈ کی اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر آدی واسیوں کی خدمت میں شامل ہوتے؟ لکشمن گائیکواڑ ہیں، کئی لوگ ہیں۔ ایسے کئی لوگ ہندوستان میں ہیں جو پیسے کے لیے نہیں بلکہ GENUINE CAUSE کے لیے خدمت کے کاموں میں شامل ہوتے ہیں۔

سوال: کیا اپنے ملک کے سرمایہ دار طبقہ کی فکر میں تبدیلی کا امکان ہے؟

جواب: اپنے بعد کی زندگی میں نے CRIMINAL TRIBES کے درمیان گزاری۔ تاجروں اور سرمایہ دار طبقہ کے بارے میں غور نہیں کیا۔ اس لیے ان کی سوچ میں فرق کی گنجائش پر میں کوئی بھی رائے دینے کی حالت میں نہیں ہوں۔

سوال: ہندو اور ہندوستان کا مطلب آپ کی نظر میں کیا ہے؟

جواب: ہندو کا مطلب ہندوستانیت سے ہے۔ ہندوستان یعنی بھارت۔ یہ لفظ اتنا وسیع ہے کہ بھی مذاہب کو شامل کر سکتا ہے۔ مذہب کے بارے میں کچھ مت پوچھنا کیوں کہ تمہیں پتہ ہے میں دہریہ، ناستک ہوں۔

سوال: لیکن یہ تو بتائیے کہ کیا صرف اقلیت یا اکثریت ہونے کے ناطے خصوصی مراعات ملنی چاہئیں؟

جواب: سب کو برابر کے مواقع ملنے چاہئیں۔ یہ جو سیاست میں ہوتا ہے کہ کبھی کسی کو گرایا، کبھی کسی کو اٹھایا، یہ ختم ہونا چاہیے۔ ○○

# اصل حقیقت

*(The real things)*

پچھلے دنوں نادر مجسموں کی ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں جو سب سے قدیم نمونہ پیش کیا گیا وہ چونے کے پتھر کا ایک ناہموار سلیٹ تھا۔ اس کی جسامت ایک تختی (WRITING TABLE) کے برابر تھی۔ لوگوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ اس پر ایک عورت جسے غیر مرئی کہنا زیادہ مناسب ہے کا خاکہ ہے۔ اس چھوٹے سے پتھر پر کئی منٹ تک غور سے دیکھنے کے بعد بھی مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ سوائے ان سلوٹوں کے جو قدرت کے ہاتھوں اس پر پڑ گئی تھی۔ ذرا ٹھہریئے! یہ دو سڈول رانوں کا جوڑا تو نہیں ہے؟ اور یہ شوخ مثلث جو دونوں پہلوؤں میں جھول رہا ہے۔ یہ قدیم عہد کا پستان تو نہیں ہے؟ یہ لکیریں بڑی بے تکلف انداز میں کھینچی گئی ہیں۔ خاکہ دور حاضر سے اتنا مشابہ ہے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ لکیریں دس ہزار سال قبل یعنی برفانی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج کے دور سے نوادرات کے کیٹلاگ کے مطابق اس دور میں اس طرح کی لکیریں عام تھیں۔ یہ اس قدر صاف اور سیدھے انداز میں جلوہ گر ہوئی ہیں کہ اس میں فنکار اور اس کے عہد کا سماج واضح طور سے منعکس ہوتا ہے۔ ان خانوں میں ایک واضح مقصد جھلکتا ہے۔ اور یہ مقصد اسے ندی کے کنارے کی بھیگی زمین پر پڑے قدموں کے نشانات یا چونے کے پتھر پر شیل فش (SHELFISH) کے چھوڑے ہوئے نشانات سے مختلف بناتا ہے۔ کیوں کہ ان میں مقصد یا ارادے کا فقدان ہوتا ہے۔ فن ایک بلاارادہ اور منفرد انسانی عمل ہے۔ یہ ان مختلف نشانات کو سمجھنے کا علم تصور کیا جاتا ہے جو اطلاعات کی ترسیل میں کام آتے ہیں۔ فن، ان اشیاء کے استعمال سے، جو استعمال کرنے والے ہاتھوں سے زیادہ دائمی ہیں، ایک مطلق فنا کی حسرت کا اظہار کرتا ہے۔ اسے مستقبل پر امید لگائے ایک CALLING CARD سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ فن کا بنیادی پیام یہ ہے کہ "میرا بھی وجود ہے (I TOO EXIST)۔ میں نے یہ جگہیں دیکھی ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے محفوظ کر لیا ہے کہ اجنبی تم مجھے جان سکو۔" فن کا یہ

پیام ہر جگہ نظر آتا ہے خواہ وہ کانسے میں ڈھالا گیا ہو یا پتھر پر بنایا گیا ہو یا تہہ خانوں کی دیواروں پر یوں ہی بے خیالی میں لکیریں کھینچی گئی ہوں۔

برٹش میوزیم سے مستعار لئے گئے ان نوادرات کی نمائش میں کوئی بہت اہم نئی چیز نہیں تھی۔ شیشوں کے کیسوں میں بند اور اسٹینڈوں پر رکھی ہوئی یہ چیزیں وقت کے بے رحم ہاتھوں سے بچ گئی ہیں۔ ان نوادرات میں، خریدی ہوئی، چرائی ہوئی، استعمال شدہ، جنگ میں لوٹی ہوئی، کھوئی ہوئی، پائی ہوئی ہر طرح کی چیزیں موجود ہیں۔ بعض اوقات اس طرح کی چیزیں میوزیم تک پہنچنے سے قبل ہی ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس میں اکثریت ہاتھوں سے بنائی ہوئی منفرد اصلی (خالص) چیزوں کی ہے۔ ماضی میں جب اس کی نقل شروع ہوئی تو اس وقت تکنالوجی بہت ترقی یافتہ نہیں تھی۔ چنانچہ ان کی کامیاب نقلیں نہیں بن پاتی تھیں۔ یہاں تک کہ سانچوں میں ڈھل سکے تو بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔ کچھ چیزیں جیسے پیالے، دریاں، مہریں یہ سب اپنے تخلیق کار کی تابع ہوتی تھیں۔ مقبول پینٹنگس اور مجسموں کی نقل بنانے میں صرف ماہر فن آرٹسٹ ہی کامیاب ہو سکے۔ USE AND THROW (استعمال کرو اور پھینکو) قسم کی چیزیں مثلاً پلاسٹک کے پیالے ہزاروں کی تعداد میں بنائے جا سکتے ہیں اور یہ پیالے اپنے نمونے کے ہو بہو ہوں گے۔ لیکن ایک ہو بہو پینٹنگ بنانا ممکن نہیں۔

آج ہم ایک جیسی لاتعداد چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ روزانہ صبح آنے والے اخبار سے لے کر ملوں میں بنے کپڑوں کے ڈیزائن DESIGNER BAMBURDERS بینکوں کے نوٹ، فوٹو اسٹیٹ کاپیوں اور حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے والے سٹلائٹ، ٹیلی ویژن تک ہم یکسانیت کے سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ بیجنگ میں خریدا ہوا فیوجی فلم کا ایک رول (ROLL) پیرو میں بنے فیوجی فلم رول سے قطعی مختلف نہیں ہوگا اور اگر ان دونوں میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے تو ہم اس تضاد کی بنا پر فیوجی فلم کمپنی پر مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔ کثرت پیداوار کی وجہ سے ہماری توقعات بری طرح مجروح ہوئی ہیں۔ ہم مختلف برانڈ کی یکساں اشیاء میں سے کسی ایک شے کا انتخاب کرتے ہیں جبکہ کسی بھی انفرادی شے میں خواہ وہ کسی ایک برانڈ کا ہی ہو ان میں کوئی فرق نہیں پاتے۔ کوکا کولا اپنے آپ کو اصلی چیز کہتا ہے حالانکہ کسی اصلی چیز کی یہ بہت واضح اور قطعی تعریف نہیں ہے۔ جیسے کسی جاندار یا پودے کی ایک منفرد اور واحد تعریف ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص مارلن منرو کے متعلق بات کر سکتا ہے اور اس کے بعد اس کے جیسی نظر آنے والی اور اس کی نقل کرنے والی کے متعلق کہہ سکتا ہے۔ لیکن 'کوک' کا کوئی ایسا D.N.A نہیں ہے جس سے دوسری ساری سوفٹ ڈرنک کی بوتلیں بنائی گئیں۔ اس کو گاڑھا کرنے کا ایک

فارمولا تھایا ہے۔ ہمیں یہ منوانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ نارتھ اسٹار کی طرح مستقل ہے۔ حالانکہ 'کوک' کا استعمال کرنے والے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں بازار کی دوسری طاقتوں کے زیر اثر کوک میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ شروع میں جو کچھ اس 'اصلی چیز' (کوکا کولا) کے بارے میں کہا گیا آج اس میں سب سے اہم اور مضبوط دلیل یہی ہے کہ یہ اپنے آپ کو اصلی چیز (REAL THING) کہلانے پر زور دیتا ہے۔ کثرت پیداوار اور اس کے تصورات کے پروپیگنڈے نے فنون لطیفہ کو گہرا نقصان پہنچایا ہے۔ ہم لوگوں میں اکثر کے لئے قابل اعتماد ازسر نو پیداوار (REPRODUCTION) نے فن کے آسان راستے فراہم کردیئے ہیں۔ آج ہم ذرائع ترسیل عامہ کے خیال سے اتنا اتفاق رکھتے ہیں کہ اصلی اور مصنوعی چیز میں امتیاز نہیں کرپاتے۔ ریچرڈ ڈانبرو کی فلم "گاندھی" کی زبردست کامیابی کے کچھ سالوں بعد بعض اوقات ٹیلی ویژن پر اصلی گاندھی کے بجائے ان کا کردار نبھانے والے بین کنگسلے کو گاندھی کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایک مشتبہ کہانی ہے۔ ایک فنکار کسی پینٹنگ کی شہادت کے سلسلے میں پکاسو کے دوست سے ملتا ہے، پکاسو اس پینٹنگ کو جعلی قرار دیتا ہے مگر اس کا دوست اس پر زور دیتا ہے کہ اس نے بذات خود پکاسو کو یہ پینٹنگ کرتے دیکھا ہے۔ توقع ہے کہ اس بات کا پکاسو نے منہ توڑ جواب دیا ہوگا۔ ہاں کبھی کبھی اصلی پکاسو بھی اصلی نہیں رہتا۔

ماضی میں جب زیادہ تر چیزیں انسان اپنے ہاتھ سے تیار کرتا تھا کسی چیز کی قدر اس کی خوبصورتی، افادیت یا اس ایک تخلیق میں استعمال کئے گئے قیمتی مادوں کی وجہ سے ہوتی تھی۔ آج حالت یہ ہے کہ کسی چیز کا اصلی ہونا ہی اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے۔ ہم کسی بھی بے جان چیز کی اس کی پوری جزئیات کے ساتھ دوبارہ تخلیق پر عبور حاصل ہونے کے بعد آج اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ زندہ چیزوں کی نقل بھی بنانے لگے ہیں۔ آج ہم پکاسو کے بارے میں بات کرسکتے ہیں۔ اس کے اظہار خیال کو فلم یا ٹیپ میں قید (RECORD) کرسکتے ہیں۔ آئندہ جب ہم نقل کے کسی بازاری مرحلے سے دوچار ہوں گے تو ایک قدم اور آگے بڑھیں گے۔ ہوسکتا ہے ہم پکاسو کو اس کے پورے مادی وجود کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہوں۔ لیکن اس کی شخصیت نہیں پیش کرسکتے۔ کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی شخص کی زندگی کے تجربات کا کتنا حصہ اس آدمی کے مکمل اعداد و شمار کے لئے ضروری ہے۔ کیا لیونارڈو ڈونسی (LEONARDO DA VINCI) کی شراب زندگی کا ایک قطرہ تھا جس نے مونالیزا (MONALISA) (شہرۂ آفاق پینٹنگ) کے رخ پر تیوری کی تشکیل کی؟ کیا ایک شمعدان کی پانچ شمعوں کی تیز لوؤں کی جھلملاہٹ بیتھوون BEETHOVEN (عظیم موسیقار) کی زندگی میں مون لائٹ

سوناٹاؤ (چاندنی رات کی موسیقی) کی تخلیق کا سبب بنی؟ ہم اس کا فرق کیسے جان سکتے ہیں۔

کسی انسان کی زندگی کے حالات تمام کوائف کے ساتھ دوبارہ پیش نہیں کئے جا سکتے۔ مثال کے طور پر دو جڑواں قدرتی (فطری) طور پر ایک دوسرے کی نقل ہیں۔ لیکن وہ زندگی کو حقیقت کے دو دھاروں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اس صورت میں وہ اس طرح واضح اور اصلی ہیں جس طرح دوسرے ذی حس انسان۔ ایک ہی بدن سے تعلق رکھنے والے اعضا کے جوڑے بھی مختلف قسم کے حقائق سے دوچار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اپنی آنکھوں کو لیں۔ یہ دونوں ایک جیسی نظر آتی ہیں۔ یہ دو آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں دو دھاروں کی شکل میں براہ راست دماغ کے مرکزی حصے میں منتقل کرتی ہیں۔ جس سے دنیا کے ایک مخلوط امیج کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ جگہ جو دو آنکھوں کو الگ کرتی ہے ہمیں سپاٹ نظر آنے والے کسی DEPTH OF FIELD سے بخوبی واقف کراتی ہے۔ اس کے بغیر ہمیں دوری کا اندازہ لگانے یا کسی چیز کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ لگانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

فی الحال ہم DEPTH OF FIELD کی تعریف پر غور کرتے ہیں۔ اگر یہ ہماری آنکھوں کے درمیان کی دوری کی پیداوار ہے تب ہم منفرد اور ذی حس انسان DEPTH OF FIELD کو تجربے کی روشنی میں اس وقت خلق کرتے ہیں جب ہم فن کی ہیئت میں اسکو محفوظ کر لیتے ہیں۔ ہم اپنی ایک آنکھ سے عجائبات انسانی کو محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اصلی اور الگ اس DEPTH OF FIELD کے تئیں معاون ہوتا ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھے واقعات و حادثات کا بیان (اظہار، خواہ وہ کسی شکل میں ہو مصوری یا سنگ تراشی) کرتے ہیں تو ہم صدیوں کے علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال قبل کے انسان کی اصلی کاری گری کی نمائش کا منظر بہر حال اس قدر دلنشیں ہے کہ لفظوں میں اس کا بیان بہتر طور سے نہیں ہو سکتا۔ اس پر غور کرنا لازمی ہے۔ اس کی صدائے بازگشت بار بار سنائی دے گی اور ذہن میں اس کی یادیں محفوظ رہیں گی۔ نوع انسان کے عالم طفولیت میں رونے کی پہلی آواز سے لے کر یونان کے کلاسکی عہد کے شاندار شباب اور پھر اس کے بعد سے اب تک کے تمام نمونے ہمارا ورثہ ہیں۔ یہ ہمارے لازوال خزانے ہیں جو انسانی (محنت کی) روشنی سے درخشندہ ہیں۔ ○○

## منجولا پدما نابھن

ترجمہ :ابرار رحمانی

# ایک تمثیلی مختصر مزاحیہ

**A Skitten**

گزشتہ سال منجولا پدمانابھن نے اسٹیج کے لیے ڈرامہ نگاری کے پہلے یونانی بین الاقوامی مقابلے میں، جسے ۱۹۹۷ء سے اونیس فاؤنڈیشن نے شروع کیا ہے، پہلا انعام حاصل کیا ہے۔ اس مقابلے کے لیے موضوع دیا گیا تھا "نئی صدی میں عالم انسانیت کے لیے چنوتیاں" اس میں ۶۷ ملکوں سے ۱۴۶۰ لوگ شامل ہوئے۔ اونیس فاؤنڈیشن ہر سال مختلف موضوعات پر مختلف انعامات دیتا رہا ہے۔ جہاز رانی کے بے تاج بادشاہ ارسٹائل اونیس نے اپنی ساری جائداد کا نصف حصہ اس فاؤنڈیشن کو وقف کرتے ہوئے کہا کہ اس کے ذریعہ لگاتار انسانی تخلیق کے ان نئے گوشوں پر انعام دیا جائے گا جو یونانی تہذیب کے انسانی تصورات کو فروغ دیتے ہیں۔ اس نے اس فاؤنڈیشن کا نام اپنے پچیس سالہ جواں مرگ بیٹے کے نام پر الکوینڈر ایس اونے سس پبلک بینیفٹ فاؤنڈیشن رکھا۔ فاؤنڈیشن کے صدر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ اس سال سے فنون لطیفہ خصوصاً آرٹ، موسیقی اور مجسمہ سازی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد طے ہوا کہ ہمیں تھیٹر کو بڑھاوا دینا چاہیے۔ جس کے لیے قدیم یونان مشہور ہے۔ اس مقابلے میں پدمانابھن کے ساتھ فلپائن کے ڈاکٹر ہنٹن جوان اور امریکہ کے مسٹر ٹیل جیکسن کو دوسرا اور تیسرا اور امریکہ، یونان، برازیل اور ہنگری کو چوتھا انعام دیا گیا۔ انعام کی رقم ڈھائی لاکھ ڈالر، دو لاکھ ڈالر اور ڈیڑھ لاکھ ڈالر اور چوتھے انعام کی مجموعی رقم سات لاکھ ڈالر تھی۔ انتخاب کا طریقہ بہت ہی دشوار کن اور کئی مرحلوں پر مبنی تھا۔ اپنے ڈرامے 'ہارویسٹ' پر انعام قبول کرتے ہوئے پدمانابھن نے کہا کہ یہ "ایسا موضوع ہے جس پر سبھی کو غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی صدی فیصلہ کن ہوگی۔ اگرچہ بیسویں صدی میں ہمارا مقابلہ خوفناک قوتوں سے رہا۔ اکیسویں صدی میں ہمیں یہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے کن قوتوں کے ساتھ اس کائنات کا مقدر وابستہ ہے۔ اس بیسویں صدی میں ہم نے ایٹم بم، بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرناک نتائج کا نظارہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں انسانی ایجادات کی تخلیقی قوت خصوصاً مواصلاتی انقلاب کے ذریعہ بین الاقوامی ثقافت کے پھولتے ہوئے باغ کا نظارہ کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں ہمیں انتخاب کرنا پڑے گا" تباہی یا تخلیق کسی ایک کا۔"

○○

محبوب الرحمٰن فاروقی

(**ایک** تھیٹر کا منظر، اسٹیج پر مختلف چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ روشنی کے آلات، مختلف مناظر کے ٹکڑے، فرنیچر، شیشوں کے ٹکڑے پلاسٹر کے کھمبے، ایک بڑا پیانو، کاغذ کا نیا چینی راکچھس وغیرہ۔ ڈرامہ نویس جس کی جنس غیر واضح ہے وہ اوپر سے نیچے تک سیاہ لبادہ میں ملبوس سامنے اسٹیج پر ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ جبکہ اسٹیج کے دائیں طرف ایک لاغر اور سوکھے

بالوں والا طالب علم جھکا ہوا ہے)

ڈرامہ نگار: مجھے افسوس ہے، اسکے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دوڑو، اور اسے فوراً لاؤ۔

طالب علم: (ہکلاتے ہوئے) لیکن ......... مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کچھ اور چیزیں لانی ہیں۔ میں نے سوچا......

ڈرامہ نگار: تم نے کیا سوچا، اس کے بارے میں فکر مت کرو۔ تم ابھی ایک طالب علم ہو۔ اگر تمہارے خیالات اتنے اہم اور پختہ ہوئے تو ......... خیر۔ لیکن تم طالب علم ہونے کی وجہ سے پریشان کیوں ہو؟

طالب علم: (اسٹیج پر ڈھیتے ہوئے) میں ...... میں

ڈرامہ نگار: اور اس قدر مایوس نظر آنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم ایک ڈرامہ نگار بنا چاہتے ہو تو بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ میری آنکھوں میں سیدھے تھوک دو، اگر تم تھوک سکتے ہو۔

(لڑکا اور ہکا بکا نظر آتا ہے)

ڈرامہ نگار: آگے بڑھو۔ تم نے مجھے سنا۔ میری بے عزتی کرو۔ مجھ سے کہو کہ میں بے غیرت، مغرور، ظالم، سخت دل اور پرانا کیڑا ہوں۔ مجھ سے یہ بھی کہو کہ اگر میں اس سرزمین کا آخری ڈرامہ نگار ہوتا تو بھی تم مجھ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ مجھ سے یہ بھی کہو کہ میں اس مختصر سے ڈرامے کے آغاز میں کچھ چیزیں لانے کے لئے کہوں گا، بغیر یہ بتائے ہوئے کہ وہ چیز کہاں ملے گی۔ آگے بڑھو! اس طرح سے منہ پھاڑے کھڑے مت رہو۔

طالب علم: اف۔ مجھے معاف کریں۔ لیکن آپ (وقفہ) ظالم اور گھمنڈی ہیں۔ اوہ (ڈرامہ نگار اسے جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے) اوہ۔ سنگ دل۔ اوہ۔ (بری طرح کھانستا ہے) شاید گئے گزرے وقتوں کے۔ اوہ۔

ڈرامہ نگار: حقیر کیڑا، یہ فضلے کا بدل ہے۔ اگر تمہیں ڈرامہ لکھنا ہے تو تمہیں دلچسپ زبان لکھنی پڑے گی۔ گندی زبان نہیں۔ سمجھے؟ کسی بھی صورت میں تمہاری زبان گندی نہیں ہونی چاہیے۔ خاص طور پر اگر تمہارے تماش بین مہذب زبان استعمال کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ تماشائی ہی ہیں جن کے لیے ڈرامے لکھے جاتے ہیں۔ کیوں کہ اب ہمیں حقیقت کا اظہار کرنا پڑے گا۔ اگر تماشائی نہیں تو ڈرامہ بھی نہیں۔ زمانہ، چاہے یہ دلچسپ ادب ہی کیوں نہ ہو؟ لیکن کاغذ کا ایک بے کار ٹکڑا ہی ہے اور اسے پڑھنے میں کتنی ہی محنت کرنی پڑے لیکن کوئی ڈرامہ نہیں سمجھتے؟

طالب علم: مجھے معاف کریں لیکن اس مفروضہ کا کیا ہوگا جناب کہ فن کے وجود کے لئے کسی مفروضہ کی ضرورت نہیں۔

ڈرامہ نگار: (حقارت کے ساتھ ہنستا ہے) ہنہہ، عزیز، میرے عزیز۔ یہ ایک کھوکھلا، اپنی آن کا اظہار کرنے والا بیان ہے جو ڈرامہ نگار، شاعروں، پینٹر، مجسمہ ساز اور کبھی کبھی بہت تھکے لمحات میں ناول نگاروں سے بھی سنتا ہے۔ لیکن کوئی دوسرا ڈرامہ نگار اس طرح کی بات نہیں کرتا۔ سمجھے؟

(ایک عجیب طرح کی خاموشی طاری ہو جاتی ہے)

ڈرامہ نگار: (کچھ لمحوں کے انتظار کے بعد بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہتا ہے) تمہیں معلوم ہونا چاہیے طالب علم کہ اگر تم ڈرامہ لکھنا چاہتے ہو تو تمہیں ڈائیلاگ کا استعمال کرنا پڑے گا۔ ہوں، میرا مطلب ہے یہ مختصر ہو۔ لیکن اتنا ہی اہم ہو جتنا کہ ویمبلڈن، جس میں ہوا میں اچھلے ہوئے گیند کا اتنی دیر انتظار نہیں کرتے جب تک کہ تم اپنے حلق سے اپنی زبان نکالتے ہو۔

طالب علم: لیکن جناب! تنہائی میں بولے جانے والے ڈائیلاگ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اور من ہی من میں جو بات کرتا ہے اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ پھر عمل اور رد عمل کیا ہے؟ پھر گرم جوشی، ذیلی پلاٹ اور کردار نگاری، یہ سب کیا ہیں؟

ڈرامہ نگار: ان سب اکیڈمک بکواسوں پر دھیان مت دو۔ تم یہاں آؤ۔ کیا تم آرہے ہو؟

(طالب علم جھجکتا ہے۔)

ڈرامہ نگار: میں نے تم سے کہا۔ تم یہاں آؤ! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں آؤ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ (اسٹیج کے مرکز میں طالب علم ڈرامہ نگار کی طرف آگے بڑھتا ہے۔) ہاں ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو۔ میری طرف آؤ۔ میں تمہیں کاٹنے نہیں جا رہا ہوں۔ (اسے طمانچہ مارتا ہے۔) اب یہ کیسا عمل ہے؟

طالب علم: اف۔

ڈرامہ نگار: دوسری طرف کا گال سامنے کرو۔

(طالب علم۔ گھومتا ہے، ڈرامہ نگار اسے پھر طمانچہ مارتا ہے۔)

ڈرامہ نگار: اور۔ اور ماروں؟ یہی تماشہ ہے۔ کچھ اور چاہتے ہو؟ میں تمہیں لگاتار مار سکتا ہوں۔ صرف طمانچہ ہی نہیں، گھونسے، دوڑا کر پٹخنا، خنجر گھونپنا، پھانسی پر لٹکانا اور مختلف قسم سے حملہ کرنا۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے میں زیادہ طاقت کا استعمال نہیں کر سکتا تاکہ لوگ مجھے سمجھیں۔ ہلکے پھلکے مناظر ضرور دکھائی دینا چاہیے۔ اگر تم میرے اس مذاق کو

سمجھ سکے ہو۔ تمہارے سامنے بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ جنھوں نے سیٹیں حاصل کرنے کے لئے فیس بھی دی ہے، اور تمہیں ان کی اس فیس کے عوض کچھ نہ کچھ دکھانا ہے۔ زیادہ حرکت سے زیادہ اچھا ڈراما ہوتا ہے۔ یہی میرا اصول ہے۔ اب یہاں آؤ، سامنے آؤ اور اپنی ناک پر کچھ اور گھونسے برداشت کرو۔

(ڈرامہ نگار طالب علم کی طرف بڑھتا ہے جو اسٹیج کے داہنی طرف کھسکتا ہے۔)

طالب علم: یہ بہت غلط ہے۔ آپ نے میری بے عزتی کر دی۔ (اسٹیج پر نظروں سے دور اپنا چہرہ چھپائے ہوئے کھسکتا ہے۔)

ڈرامہ نگار: تم تو مجھے ٹھہاکا لگانے پر مجبور کر رہے ہو۔ تھیٹر اپنی فطرت میں ہی بہت قہر آلود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے جیسے باعزت مہذب خاندانوں میں پیدا ہوئے طالب علم مشکل سے ہی دلچسپ ڈرامہ تحریر کر سکتے ہیں۔ تم تو اپنی عزت کو ہی لے کر اس قدر پریشان ہو کہ تم ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں لکھ سکتے۔ تم بہت شریف، بہت نرم مزاج، زود حس ہو۔ (اس پر چھلانگ مارتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے۔)

(اس دوران طالب علم اس کی پہنچ سے باہر نکل جاتا ہے۔ ڈرامہ نگار اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ کمرے میں آگے پیچھے دوڑتے ہیں۔ ڈرامہ نگار ٹھہر جاتا ہے اور اپنی سانسیں برابر کرنے لگتا ہے۔)

ڈرامہ نگار: (ہانپتے ہوئے) برا نہیں۔ طالب علم یہ برا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ (طالب علم ڈرامہ نگار کے پیروں کے نیچے سے قالین کھینچ لیتا ہے۔ ڈرامہ نگار فرش پر اوندھے منہ گر جاتا ہے۔)

طالب علم: آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے جناب؟ آپ کا گرنا۔ (قہقہہ لگاتا ہے۔) اس بار یہ میرا مذاق تھا۔ دراصل جب آپ جانتے ہیں یہ پوری اسکرپٹ میں نے لکھی اور میں نے ہی اسے ڈائرکٹ کیا۔ اور اب میں آپ کے سامنے یہ یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ حرکات اب تھیٹر کے فیشن سے میل نہیں کھاتیں۔ میں نے صرف آپ کو اس بات کی اجازت دی کہ آپ اپنی بات کہہ سکیں۔ یہ دکھانے کے لیے کہ کردار اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے آزاد ہیں۔ چاہے وہ جدید تھیٹر کے پس منظر میں کتنا ہی مضحکہ خیز لگے۔

ڈرامہ نگار: (اتفاق میں سر ہلاتے ہوئے۔) ٹھیک۔ ٹھیک۔ اب تم بالکل صحیح جا رہے ہو۔ کردار کی ادلا بدلی اور اچانک حیرت میں ڈالنا تمہارے ڈرامے کی خاصیت ہے۔ میرے عزیز! اب تم بہت خوش ہو رہے ہو۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ میری باتوں سے انکار کرنے سے ہی

میرا مقصد پورا ہو رہا ہے۔ اسی سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے۔ جسے "ڈرامائی ٹینشن" کہتے ہیں۔

طالب علم: مجھے ڈرامائی ٹینشن کے بارے میں نہ بتاؤ۔ کیونکہ یہ میری لکھی اسکرپٹ ہے۔

ڈرامہ نگار: اوہ۔ کوئی فکر نہیں۔ میں اس بے معنی مختصر ڈرامے کے لیے کوئی کریڈٹ لینے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔

طالب علم: (پس و پیش میں۔) کیا واقعی ایسا ہے؟ میں نے سوچا کہ چونکہ کردار آپ کو ڈرامہ نگار کہتے ہیں۔ اس لیے آپ اس اسکرپٹ کو اپنا کہہ دیں گے۔

ڈرامہ نگار: نہیں۔ یہ تمہارا ہے۔ یقین کرو۔ میں ایسی کوئی بکواس چیز نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ اس کے اندر جو ہمارے ہم عصر ڈرامہ نگار کہتے ہیں، اس میں وہ چیز نہیں ہے، جسے اچھے ڈرامے کی تخلیق کے لیے نازک موڑ بولتے ہیں۔

طالب علم: مجھے اس کی کوئی فکر نہیں۔

ڈرامہ نگار: یہی وہ چیز ہے جسے ابتدا میں تم سے لانے کے لیے کہا تھا۔ تمہیں یاد ہے؟

طالب علم: ہمیں کیسے یاد رہ سکتا ہے؟ تم نے بتایا ہی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟

ڈرامہ نگار: ہاں۔ میں نے تمہیں بتایا۔ لیکن اس چھوٹے سے مختصر ڈرامے کے لیے بھی۔ سسپنس کے کچھ لمحے بہت ضروری ہیں۔

طالب علم: آپ اس طرح کی بے معنی اصطلاح استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

ڈرامہ نگار: SKITTEN (مختصر ڈرامہ) تمہارا مطلب ہے؟ میرا خیال ہے یہ اصطلاح بالکل صحیح ہے۔ اسے میں نے ہی وضع کیا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے۔ اسکرپٹ کی اسٹائل میں بہت چھوٹا ڈرامائی ٹکڑا۔

طالب علم: اچھا؟ تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ مجھے کیا لانا ہے؟

ڈرامہ نگار: یہ تو ظاہر ہے۔

طالب علم: آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔

ڈرامہ نگار: یہ وقت کی بات ہے۔ بہت آسان سمجھے؟ اس ڈرامہ کو مکمل کرنے کے لیے مجھے تم سے کہنا چاہئے تھا...... (ٹھہر جاتا ہے۔)

طالب علم: (بے چینی سے) آپ نے کس چیز کے لیے کہا تھا؟

ڈرامہ نگار: (فتح یابی کے ساتھ) اے بے وقوف! اس میں پلاٹ شامل کرو۔

(روشنی گل ہو جاتی ہے۔ پردہ کرتا ہے۔ اور تالیاں بجتی ہیں) OO

## اوتار سنگھ پاش

# ڈائری کے کچھ اوراق

(ترجمہ: حقانی القاسمی)

**۷ر اگست، ۱۹۷۱ء**

ہنگارا (چیلنج) بے حد مناسب عنصر ہے۔ دھوپ خوب صورت ہوتی ہے، زیادہ خوبصورت نہیں۔ ان دنوں راتیں چاندنی نہیں ہوتیں۔ دن چھوٹے ہیں مگر مصروف۔

میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، پتہ نہیں کب سے۔ یہ تب بھی جکڑے ہوتے ہیں جب میں کام کر رہا ہوتا ہوں یا کچھ بھی کر رہا ہوتا ہوں۔ ہاتھ ان کے بھی بندھتے ہیں، بے حد پر انداز، باقاعدہ، اتنا کافی ہے میری روح کی سرشاری کے لیے۔

ان کا نام میں نے کئی جگہوں پر نقش کر دیا ہے۔ دیواروں پر، زمین پر، پانی پر، ہواؤں پر، درختوں پر، اپنے دل پر، اب یہ نقش ہو گیا ہے اسے کون مٹائے گا۔

آدھی رات تک چاند نہیں چڑھتا۔ جنگ زوروں پر ہے۔ لوگ پریشان ہیں۔ عجیب سی ہلچل ہے۔ لوگوں میں اشتیاق ہے، لوگ جو اخباروں سے دور ہیں۔ لوگ جو عام طور پر ریڈیو بھی نہیں سنتے۔ اخبار گپی ہے اور ریڈیو جانب دار۔ لوگ اندھیرے میں لاٹھی چلا رہے ہیں۔ لوگوں کے چہرے ست ہیں۔ ہر ایک آدمی کے تعارف سے یا بھرپور نظر کا اثر پڑتا ہے۔

راتیں اور بھی بھیانک ہو گئی ہیں۔ دن کے وقت سب کچھ عام سا ہوتا ہے۔ ہم کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں لیکن ہمیشہ تازہ، ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔ گیہوں کے ساتھ چپہ چپہ ہو گئے ہیں۔ پہلا پانی دیا جانا شروع ہو چکا ہے۔ صبح کو سورج چڑھتا ہوا بے حد خوبصورت لگتا ہے۔ دھند میں لپٹا ہوا۔ صبح شام بہت ٹھنڈی ہوتی ہے، دوپہر گنگنی۔ پچھلے دنوں سبھی مصروف رہے ہیں۔ نگاہ کی حد کا بھی حصول ہوتا ہے۔

ایک تسلی، ایک جست بھرا چیلنج انسان کو مل سکنے والا سب سے اہم اشارہ۔

## ۲۲/دسمبر ۱۹۷۱ء

آج کل شاید دن نہیں صرف رات ہوتی ہے۔ جو وقت ہے وہ شاید ہمارے گاؤں میں تاریخی ہوتا ہے۔ ایک پھلتا سا چہرہ ہے جو زیادہ تر میری اپنی حقیقت کی ہی مٹی پر پھسل سکتا ہے لیکن پھسل کر بھی ایک مٹی پر تو رہنا ہی ہے۔

## یکم جنوری ۱۹۷۲ء

کوئی وقت تھا، میں اپنے ہر سال کا احتساب کرتا تھا۔ آج بھی ایک سال ختم ہوا ہے، ایک چڑھا ہے۔ مگر میں اپنے پچھلے سال کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔ رات کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ ۱۹۷۲ کی پہلی جنوری کی صبح ہو چکی ہے۔ یہ سال مبارک ہو مجھے اور میری دھرتی والوں کو، میں اس سال سے کچھ زیادہ ہی آس لگائے ہوئے ہوں۔ اس سال شاید میں بہت کچھ پالوں گا جو پہلے میں نہیں پا سکا ہوں۔

کلو ندر! اس سال میں تمہیں پا کر ہی رہوں گا۔ تم سے دل کا سچ کہنا دل کی بے ادبی ہے، سچ کی توہین ہے۔ تم سے گلہ کرنا عشق کی توہین ہے۔ جاؤ، تم پہلے میری شکایت کے قابل ہو کر آؤ، ابھی تو میری ہر ایک شکایت تمہارے قد سے کہیں زیادہ قد آور ہے۔

کبھی بھی مل سکتی ہے میرے بدن میں اداؤں کی یہ گھسی ہوئی خط و کتابت۔ کسی بھی وقت میرے سینے کی دھرتی طوفانوں کا حلف اٹھا سکتی ہے۔ یہ درد پتھریلا ہوتا ہے زندگی جیسا، زندگی گلشن نندہ کا ناول نہیں، وہ پہاڑی سڑک کی طرح کٹھن ہوتی ہے۔

## ۹/جنوری ۱۹۷۲ء

آج پنجاب میں سبھی سرکاری اور زیادہ تر غیر سرکاری کام کرنے والوں کی ہڑتال تھی، نچلے طبقہ میں اتنا اتحاد میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

سارا دن شہر میں گھومے، چائے پی اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں تھوڑی بات چیت چلی۔ رات میں کمارو کل سے اس کی زوردار نظم سنی۔

سونے سے پہلے میں بے حد بور ہو گیا تھا، ان پڑھے لکھے لوگوں سے۔ ان کے درمیان میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا۔ ہم میں بہت کم اشتراک ہے۔

### ۱۹؍ جنوری ۱۹۷۴ء

**فیصلہ**

(۱۹؍ جنوری کے صفحہ پر پاش نے بڑے حروف میں ''فیصلہ'' لکھا ہے)

فیصلہ کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ زندگی کوئی قابو میں آجانے والا گھوڑا نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ اچھلتی اور آدمی کو گھسیٹتی رہتی ہے۔

میں نے کل غلطی کی جو آج والے صفحہ پر ''فیصلہ'' لکھ دیا۔ پتہ نہیں میں کیوں چالاک نہیں بنتا۔

### یکم اپریل، ۱۹۷۴ء

رب جی ابھی لوٹے نہیں۔ بالٹی میں دوہے گئے دودھ پر گاتی جھاگ کا ذکر ہو رہا ہوگا۔ اداس سویرے، شراب کے نشے میں تھوڑی سہنے کے لائق ہو جاتی ہے اور کچھ نہیں۔ (پاش اپنی محبوبہ کو رب جی کہا کرتے تھے)

### ۲۲؍ مئی، ۱۹۷۴ء

میرے پاس کوئی چہرہ، خطاب نہیں۔<br>
زمین کا پگلایا عشق شاید میرا ہے۔<br>
میں ہر ایک چیز پر سے ہوا کی مانند<br>
سر سرا کے نکل جاؤں گا<br>
لوگو! میرے گزر جانے کے بعد بھی<br>
میری فکروں کا بازو تھامے رکھنا

### ۱۹؍ اگست، ۱۹۷۴ء

تخلیق سب سے بڑی انہونی ہے۔ اور کچھ بھی اتنا طاقتور نہیں۔ سوال تخلیق کو قبول کرنے کا ہے۔ جو کچھ کسی سے قبول نہیں ہوتا، وہی اس کے لیے دکھ کا سبب بن جاتا ہے۔ میرے راستے میں بہت سے ٹوٹے پھوٹے لوگ آئے، اور میرے لیے مکمل نکل آنا ہی سب سے بڑی جدوجہد رہی ہے۔ یہی میری تخلیق ہے۔

میں نے بہت سنجیدگی سے اپنی ہونی کو قبول کر لیا ہے۔ میں بہت کم دکھی ہوتا ہوں اور بہت ہی کم خوش۔ میں جو کہ میں نہیں ہوں۔ اور جو میں نہیں ہوں وہ میری تخلیق نہیں ہے۔ اس لیے میں نے کبھی اسے قبول کرنے یا مسترد کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

مجھے سب سے اچھا کون لگتا ہے؟ شاید کوئی بھی نہیں۔ سب سے اچھا ایک آدرش ہے، ایک خواب ہے۔ ہر ایک اچھا ہوتا ہے۔ سادھو گھوڑا بھی اور نیچ بھنگی یا چمن چودھری بھی۔ میرا وجود صرف ایک آئینہ ہے جس پر سے سال کے دھوکوں نے کہیں کہیں سے پانی اتار دیا ہے۔ میں اب بھی لوگوں کے چہروں کی عمدہ ڈھنگ سے عکاسی کرنے کی کوشش میں ہوں۔

## ۱۱/ اگست، ۱۹۷۴ء

میں سوچتا ہوں، روس میں اگر کوئی لینن نہ ہوتا تو کسی گورکی کا ہونا ناممکن تھا۔ المیوں کو برداشت کر کے وقت کو آگے بڑھانا کسی بہت بڑے سیاست داں کا کام ہے۔

اور اگر وقت نے اس طرح سے قدم نہ بڑھایا ہوتا تو گورکی کی انسانی اچھائی صرف نیچرل ہو کر رہ جاتی۔

وہ انسان میں اتنی تحریک اور فعالیت نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ ہندوستان میں نئے قلم کار گورکی سے ملتے جلتے نام رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہاں لینن کہاں ہے؟ قلم کار آخر وقت کا لنگ بھی نہیں اکھاڑ سکتے۔ انسان کے لیے محبت کرنا بہت تکلیف دہ ہے اور اس کے بغیر کچھ بھی بہتر رچا نہیں جا سکتا۔

## یکم جنوری، ۱۹۷۶ء

کتنا اداس حادثہ ہے کہ اس سال کے پہلے ہی دن جیل سے ڈائری لکھی جا رہی ہے اور اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ ڈائری میں بھی شاعری ہی لکھی جا رہی ہے۔ اصلی حادثات نہیں کیونکہ حادثات ہیں ہی نہیں۔ میں دونوں کناروں پہ ملک دشمن عناصر، جھوٹے اور کمتر لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں۔

اس سال کے آغاز کے ساتھ ہی مجھ میں ایک ناپسندیدہ اور غیر عقلی نظریہ کا یقین جنم لے رہا ہے کہ اسلام انسانی انحطاط اور جہالت کا بچا کچھا روپ ہے۔ اس سے بری اور نفرت کرنے کے لائق اور کوئی بھی مروجہ فکر نہیں ہے۔ میں

خود کو سیکولر سمجھتا رہا ہوں اور آج بھی ہوں۔ اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ ایسی روک لگادینی چاہیے کہ دنیا میں کسی کو بھی مسلمان بننے کا حق نہ ہو اس حقیقت کو آج مجھے فائنلائز کرنا پڑا ہے۔ میرے ساتھی قیدیوں نے مجھے ایسی رائے بنانے کے لیے زبردستی انسپائر کیا ہے۔(۱)

میرے ساتھ کوٹھی میں سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بی ایس بیدی ہے۔ وہ اپنے مکمل علم اور مذہبیت کے باوجود پیٹو ہے اور پیٹ کا پجاری بھی۔ اتنا کہ اس کے نزدیک والوں کو گھن آتی ہے۔ ایک پاؤ نکسلی ہے۔ اف! اس زمانے کے کامریڈوں کے دماغ کس طرح کے بنتے تھے۔

۴ر جنوری ۱۹۷۶ء

کسی نہ کسی دن یقیناً
اپنے بوسوں سمیت
ہم موسم کے گالوں پر نیلے نشان پائیں گے
ابھی کی طرح آسمان اب
پراسرار نہ رہیں گے
اور ہماری کی ساری دھرتی
ایک عجیب وغریب اخبار بنے گی
جس میں بہت کچھ ہونے کی خبریں چھپا کریں گی
کسی نہ کسی دن

---

(۱) مغربی ذرائع ابلاغ نے اسلام کی امیج کو مسخ کرنے کی جو منظم معاندانہ کوششیں کیں، اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ اس سے سیکولر ذہن رکھنے والے افراد بھی متاثر ہوئے۔ بنیادی غلط فہمی یوں پیدا کی گئی کہ مسلمانوں کے اعمال کے آئینہ میں اسلام کی تصویر کشی کی گئی اور اسلام کو ایک جارحیت پسند مذہب کی حیثیت سے پروجیکٹ کیا گیا جبکہ اسلام کی مبادیات اور تعلیمات مکمل طور پر اس کے منافی ہیں۔ اسلام ایک امن پسند مذہب اور مکمل انسانی نظام حیات سے عبارت ہے۔ اسلام سے زیادہ ترقی پسند مذہب اس روئے زمین پر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ماہرین اسلامیات نے لوگوں کی ان غلط فہمیوں کے ازالے کی کوئی کوشش نہیں کی، اس لیے یہ بدگمانیاں پھیلتی گئیں ورنہ منتشر اور غیر متعصب اذہان رکھنے والے بھی اسلام کو سب سے اچھا اور بہتر مذہب مانتے ہیں۔ قارئین اس سلسلے میں اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں کہ اس غلط فہمی کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ اور اس کے ازالے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟ (ادارہ)

## ۱۲ر جنوری ۱۹۷۶ء

آج بارش کا دن ہے۔ ایسے دنوں کا میں بہت بھوکا ہوں۔ میری پوری زندگی ہی شاید برسات کا انتظار ہے۔

## ۱۳ر جنوری ۱۹۷۶ء

لوہڑی کا تیوہار بنیادی طور پر ہمارے ملک کے عام آدمی کا تیوہار ہے۔ کسی کو بھی اس کی تاریخ کا پتہ نہیں۔ اس کے پاس حال کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا اوٹ پٹانگ سا لگتا ہے۔

ہر بار لڑکیاں دھونی سے اٹھنے سے پہلے گیت گاتی ہیں۔ پیاری سنگت! ہم پھر ملیں گے، پھر ملیں گے، دوسری بار ملیں گے۔ پھر ملیں گے اگلے برس...... "یا ایک گیت اور گایا جاتا ہے۔ "میری تختی پر رام دگوپال لکھ دے...... "لیکن ہر سال کسی نہ کسی کی تختی پر کوئی "لکڑ بگھا" لکھ دیتا ہے اور باقی لڑکیاں پھر سے گاتی ہیں ہم پھر ملیں گے۔ اصل میں "پھر ملنے" والی بات ایک سنہرا بھرم ہے۔ پھر کبھی نہیں ملا جاتا۔ جب پھر ملتے ہیں تو وہ اور ہوتے ہیں، پہلے والے نہیں۔

لڑکوں کے لیے یہ تیوہار یوں ہی پورا ہو رہا ہے۔ ان کے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ نہ گا سکتے ہیں نہ الاؤ تاپ سکتے ہیں۔ دارو اور گوشت میں انہیں لوہڑی نہیں مل سکتی۔ یہ کام تو کسی رشتہ دار کے آنے پر بھی ہو سکتا ہے۔ میں لڑکوں کی اداسی میں شامل ہوتا ہوں اور اس سے عدم اختلاف کرتا ہوں۔ رات ہم نے ٹیلوں پر جا کر بولیاں ڈالیں۔ آج شراب نہیں پی۔ ساری رات اکیلے جاگتے رہ کر گاؤں کی سونی چھوڑ دی گئی دھونیوں کو بار بار تاپتا رہا۔

## ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء

لو! یہ سال بھی گزر گیا۔ اس سال دھرم پال ہی ہمیں بہت بھلا لگا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اپنے کاموں میں یقین اتنا گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ سال اب اپنے آپ میں فینومینا نہیں لگتے۔

آج صبح پانچ بجے موٹر سائیکل سے واپس گاؤں آیا۔ بے شک آنے کا مطلوبہ فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی، کیا ہم نے فائدوں سے تو شادی نہیں کی ہے (رات گیارہ بج کر ے ۳ منٹ)۔

صبح ہی سے اکھنڈ پاٹھ شروع ہے، گردوارے میں رات پونے سات بجے سے نو بجے تک سامعین گردوارے سے گروکویتا سننے کی ریت نبھا کر جا چکے ہیں۔ پرگاشو کی چائے کی بالٹی لے کر آئی تھی۔ ان دونوں تینوں گھروں میں شاید مذہب کا زیادہ ہی لگن ہے۔ پٹواری ہو یا سرپنچ، یہ اپنے کو کسی دھنے سے کم نہیں سمجھتے ہوں گے۔ لیکن میں کبھی ان کے گناہ معاف نہیں کروں گا۔

ایک سے دس تک گرنتھ سے کویتا پاٹھ کے دور میں، چوتھے گرودوارے میں بہترین اور عمدہ الفاظ کی منظری کڑی کے تحت بہت گہرائی سے پڑھا۔ پہلے شاید کبھی بھی یہ حصہ دھیان سے پڑھا نہیں ہوگا۔ صفحات ۲۷۲ سے ۳۲۸ تک، بس مزہ آگیا۔

جب میں اٹھا تو بس بنتو ہی بھگت چوکڑی میں بیٹھی تھی اور بے حد ہکا بکا سی ہو کر گرنتھ پڑھنے والے کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس میں اچانک، اسی عمر میں مذہبی لگن نے جگہ بنالی ہے۔ پہلے اسے اپنی دولت کا اتنا غرور تھا کہ گرودوارے کے پاس سے نکلتے ہوئے شاید ہی کبھی اس نے سر جھکایا ہو اور اگر کبھی ماتھا ٹیکا بھی تو گھمنڈ سے بڑبڑاتے ہوئے۔ لوگوں کا دھیان اپنی طرف کھینچنے کے لیے بس اب جبکہ بیٹوں کی شادیاں نہیں ہو رہی ہیں، دو تین بیٹے تو اتنے گھس چکے ہیں کہ ان کی شادی کے بارے میں سوچنا بھی ایک سماج دشمن حرکت لگتی ہے۔ اور اب قرض پر لگائے انجنوں کی اکٹھا قسطوں نے اس کا سارا ذہنی تانا بانا توڑ دیا ہے۔ لگتا ہے کہ اب سچے پات شاہ سے سکھ مانگتی ہوگی۔ لیکن کیا پتہ...... شاید ذہنی سکون ہی چاہتی ہو۔

گردوارے کے ماحول کے بارے میں تھوڑی تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں۔ میرے گاؤں والوں کے دلوں میں اس کے بارے میں مسلسل نظریات بدلتے رہے ہیں۔

پہلے کا تو پتہ نہیں، مگر اب جو عوام کی عقیدت گردوارے کے تئیں ہے، وہ بے حد مضحکہ خیز ہے۔ ڈھلتی جوانی کی عورتوں میں یہ عقیدت بالکل اسی طرح بڑھنی شروع ہوتی ہے جیسے کہ تعلیم پر تعلیم دیئے جانا ان عورتوں کا مزاج بنتا چلا جا رہا ہے۔ بوڑھوں کی عقیدت سچی ہے، اس میں قطعی ریاکاری نہیں ہے۔ "ہرو" آتی ہے تو دیپ جلانے کے بعد تیل لگے ہاتھوں سے ہی گرنتھ صاحب کی پالکی کے ستونوں کو دبا دبا کر نشان ڈالتی جاتی ہے۔ دھنو ترکھانی (بڑھئی کی بیوی) نے شاید اب گپیں ہانکنی بند کر دی ہیں۔

باقاعدگی سے گرودوارہ آنے سے تو یہی لگتا ہے۔ یہاں بیٹھی ہوئی اس کے چہرے پر سنجیدگی تو کہرے کی طرح جمی رہتی ہے۔ اس سے صاف ہے کہ موت اصل میں بھیانک چیز ہوگی۔ ستونت کور 'بانی' سنتی ہوئی ایک طرف تو واہے گرو، واہے گرو کرتی جاتی ہے اور

دوسری طرف 'مینے' کے لیے بد دعائیں مانگتی جاتی ہے اور شرماتی بالکل نہیں۔

جیتو اور لچھو گردوارے کی تقریبات میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ لچھو کی مہاراج کے تئیں عقیدت سچی ہے لیکن اسے ہمیشہ ہی گردوارے میں اپنی نمائش کی کچھ زیادہ ہی فکر رہتی ہے۔ شاید وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی رعب دار حرکتوں سے عورتوں (لڑکیاں نہیں) پر کوئی اثر بھی ڈالنا چاہتا ہے۔ سکرانتی پر اس کا سوار روپیہ ہوتا ہے اور ہر گرو تیوہار پر ڈھولک بجانے کی سیوا۔ جلوس کے وقت پالکی اٹھانے کا کام اور شور کرتے لڑکوں اور لڑکیوں پر چوکسی کی نظر رکھنے کو ایک جیسا ہی ضروری کام سمجھتا ہے۔ اگر سرپنچ کہیں آس پاس ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ یا تو دارو پینے کے بعد الائچی کھا کر آئے ہیں یا ابھی جا کر پئیں گے۔ سرپنچ کی سچی عقیدت اس کے لکچر کے دوران اس کے لفظوں سے ٹپکتی ہے اور لچھو کے کیرتن سے جیتو ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ بدعنوان اور بھرشٹ بھگت ہے۔ بے شک اس کی عمر ڈھلان پر ہے، پھر بھی وہ اوپر اوپر سے مذہبی اور بھلا مانس ہونے کی حرکتیں کرتا ہوا، لڑکیوں اور نئی نویلی شادی شدہ عورتوں پر شہوت بھری نظر رکھتا ہے اور اپنے پانچ سال کے بیٹے 'صاحب' کو بھی اس کے پاس بھیجتا رہتا ہے۔ لیکن افسوس کہ گردوارے کا مناسب منچ بھی اس کے لیے مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ اس کے اندر کی تڑپ بھی کوئی شدت نہیں رکھتی۔ اب تو اسے یوں ہی بلکتے رہنے کی عادت پڑی ہے اور سماجی فلاح و بہبود کا بچا ہوا جذبہ اوپر سے چڑھا ہوا ہے۔ یہ معیشت کے بغیر ہر علاقہ میں بے عمل اور نکما شخص ہے۔

گردوارے میں دو اچھی شخصیتیں ہیں۔ جگیری اور جوگندر بخشی۔ جوگندر تو اتنے کمال کا آدمی ہے کہ اس کی عقیدت کے آگے خدا بھی خود کو کمتر محسوس کر سکتا ہے۔ اچھا بھلا کماؤ ہونے پر بھی لوگ اسے جوگندر بھائی کہتے ہیں۔ اس کا کام بس یہی ہے کہ گرنتھ صاحب کے سامنے، بائیں طرف بیٹھے بیٹھے دانوں کے ڈھیر سنوارتے رہنا، کبھی برتن کو ادھر ادھر سے ہلا ہلا کر آٹے کے نیچے کرتے جانا اور کبھی نیچے بکھرے پیسوں کو اٹھا کر قرینے سے گرنتھ والے کھمبے پر ٹکا دینا۔ آنے والی عورتوں سے دودھ لے کر لوٹے، گلاس، بالٹی میں انڈیلنا اور ان کے خالی برتنوں میں پرساد رکھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور بار بار چھوٹے بچوں کو سماجی شعور سے بھرپور رہ کر جھڑک دینا، اس کی عام عادت ہے۔ "اے لڑکو! خاموش رہتے ہو کہ نہیں؟ اگر شور مچانا ہے تو بھاگو اپنے اپنے گھر۔" اس کی اس ڈانٹ کا ڈیڑھ منٹ ہی اثر رہتا ہے اور کسی لڑکے کی کھی کھی کر کے ہنسی نکل آتی ہے۔ تبھی کوئی لڑکا بولے گا۔ اے! تم کو زیادہ ہی ہنسی آتی ہے۔ خاموش نہیں رہا جاتا؟" اور اس کا جواب بے حد سنجیدگی سے ملے گا۔ "تم بڑے

بیٹھے رہو چپ چاپ۔"

جوگندر قریب دس منٹ تک شور برداشت کرے گا اور پھر سے وہی کام شروع ہو جائے گا۔ پرساد پہلے عورتوں میں بانٹنا، خیرات و عطیہ اکٹھا کرنا اور پاٹھ کرنے والوں کو چائے بنا کر دینا اور کتھا پڑھنے والوں کی باری کی پوری تفصیل دینا اس کی ذمہ داری ہے۔ لیکن جب بھی لونڈوں کا شور بڑھا ہے یا اس شور میں مجھ جیسے ضدی جاٹ پتر شامل ہوئے ہیں تو اس نے اپنی خدمات سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ لڑکے باز نہیں آئیں گے۔ کوئی اس کی سنے گا نہیں اور فالتو کی باتیں ہوتی رہیں گی۔ راشن کا فضول استعمال رکے گا نہیں۔ اب تو یہ پرساد بانٹنے کے کام سے بھی ہٹ گیا ہے۔

جکیری کی بچپن سے ہی ایک ٹانگ خراب ہے۔ شاید اپاہج ہونا ہی اس کی مذہبیت کا سبب ہے۔ یہ چنور ڈلانے کا بے حد شوقین ہے، یا پھر ٹیڑھی سی پالتی مار کر منہ میں ہی پاٹ بڑبڑانے کا۔ یہ اتنے عرصے سے گرودھر کا عقیدت مند ہے کہ بہت سے پاٹھ اسے حفظ ہو گئے ہیں۔ وہ اکثر پاٹھ کے ساتھ بولتا ہی جاتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کی گھریلو زندگی پر اس کے اصولوں اور مذہبیت کا اثر قطعی دکھائی نہیں دیتا۔ وہاں وہ ایک ذمہ دار کماؤ آدمی ہے۔ یہ مکمل مذہبی دکھاوا گردوارے ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ فنڈ و نڈ کے چکروں سے یہ گریز کرنے لگتا ہے کیونکہ ہیر پھیر کی ایک دو شکایتیں اسے سننے کو ملی ہیں۔

ایک اور سابق محبوب ہے، کامریڈ قابل۔ دس سال پہلے تک یہ ایک اچھا سماجی ورکر اور گردوارے کی تقریبات کا اکیلا کارکن تھا۔ جب سے اس نے زمین کی خرید و فروخت شروع کر دی ہے اور جب سے اسے شراب کی لت لگی ہے اس کی عقیدت اور سماجی خدمت میں کمی آئی ہے۔ یہ پینے کی لت سے پیدا شدہ حقیر جذبہ ہے۔ آج ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۶ء کی رات کو پہلے تو یہ ایک تھانے دار کے ساتھ بیٹھا شراب پیتا رہا، پھر دھت ہو کر گردوارے میں گھس گیا اور حساب کتاب چیک کرنے لگا۔ اس لیے نہیں کہ اسے عطیہ کی رقومات میں کسی ہیرا پھیری کا شک رہا ہو گا بلکہ اس لیے کہ ایسا کر کے وہ اپنے خاص ہونے کے احساس کو جی سکے۔

جاگر بس بھوگ کے وقت آتا ہے اور آتے ہی اپنا ذکر شروع کر دیتا ہے۔ اس ذکر میں سبھی مرد اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ انہیں یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ یہاں کس لیے جمع ہوئے ہیں۔ پھر دس پندرہ منٹوں کی بوریت کے بعد عورتوں میں سے کوئی کہتی ہے کہ "بھائی جی! ہمیں پہلے ماہ کا نام سنا دو، یہ باتیں گھر جا کر کرتے رہنا۔ تب جاگر چپ ہو جاتا ہے اور چونک کر بھائی باہر نکلتا ہے۔ اور ایک دم سے گرنتھ صاحب سے رومالا (کپڑا، جس سے گرنتھ ڈھکا

جاتا ہے)اتار کر بھونچکا سا بے سری آواز نکالتا ہے۔ "ماگھ راجن سنگھ ساد ھو۔"

جیت مہنت جب سے نہنگ بنا ہے، اس کا گرودھر کے تئیں محبت کا دکھاوا شروع ہو گیا ہے۔ ویسے تو یہ اسمگلنگ کے رجحانوں کے چلتے عام طور پر سکرانتی پر گاؤں سے غیر حاضر رہتا ہے۔ کبھی گاؤں میں ہو تو اپنی چڑچڑی بدصورت لڑکی کے ساتھ گردوارے میں ضرور حاضری دیتا ہے اور وہ بھی بڑی شان سے۔ اس کے دکھاوے میں چور صاف نظر آتا ہے لیکن اس چور کو چھپانے کے لیے وہ کوئی خاص کوشش نہیں کرتا۔

(۱۹۸۲ء میں پاش نے اپنی ڈائری انگریزی میں لکھی اور ایک نظم ہندی میں بھی لکھی۔ انگریزی میں لکھے ان کے اقتباسات سے ان کی سلجھی ہوئی دانشورانہ بصیرت کے ثبوت ملتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے ۲/ جنوری ۱۹۸۲ کو لکھا ہے "SILENCE AND NOT WORD'S ARE THE STRENGHT OF DARKNESS" ۳/ جنوری ۱۹۸۲ء کو پاش لکھتے ہیں: "ELEMENTAL DARKNESS OF PASSION"' اس کے آگے وہ پنجابی میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یوں ہوگا۔ "آرٹ اپنا جوکھم دوسروں پر ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جوکھم اٹھانے سے ظاہر ہوتا ہے۔" ۵/ جنوری ۱۹۸۲ء کی ڈائری کی شروعات انہوں نے کی ہے۔ "STATE OF BEING IN LOVE" لکھ کر۔ ۹/ جنوری ۱۹۸۲ کو انہوں نے لکھا:

ACCEPTANCE OF ONE'S BODY, ITS NAKEDNESS AND INDIVIDUALITY TO ACCEPT WHOLE HEARTEDLY THE DEMANDS OF THE BODY"

۱۵/ جنوری ۱۹۸۲ء کو ہندی میں لکھی نظم دیکھیں۔

"وہ میرا برسوں کو بھولنے کا فخر دیکھا تم نے
اس جسم میں لکھی
لہو کی عبارت پڑھی تم نے
نظم ہونہ ہو تاریخ کو
مردہ جسم کے زندہ لوتھڑے کے ساتھ
صرف سانس کے دھاگے سے جڑا ہونا"

## ۱۵/ جولائی، ۱۹۸۲ء

بڑی سے بڑی آفت بھی نکل ہی جاتی ہے۔ موت بھی۔ آج موت کے بارے میں سوچنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ صبح دس گیارہ بجے لدھیانہ کے نزدیک کی بڑی نہر میں ست

بیر، باسی اور بلدیو جی کے ساتھ نہا رہا تھا۔ چھلانگ لگائی تو پانی کے نیچے سے کوئی کانچ یا لوہے کی تیکھی چیز پاؤں میں دھنس گئی۔ بے شک گاؤں آکر پٹی وٹی کرالی لیکن ٹانگ میں سرسراہٹ سے ٹٹنس کا شک بنا ہوا ہے۔ اگر ٹٹنس سے موت بھی آجائے تو مجھے کوئی دکھ نہیں۔ میں، کوئی پچھتاوا لے کر نہیں مروں گا۔ روح اور جسم کے رشتوں سے بچھڑنے کا صدمہ تو میرے حوصلے کے سامنے بونا ہے۔ بے شک مجھے اپنی بیٹی سے بے حد پیار ہے لیکن دنیا میں اور بھی ایسے بچے زندہ ہیں جو اپنے باپ کے بغیر رہ رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو زندگی ایک آزمائش ہے اور اس کو زیادہ حسین بنانے کے لیے سبھی کو کوششیں کرنی چاہئیں۔

۹ر ستمبر، ۱۹۸۲ء

آج میری سالگرہ ہے۔ ۳۲ سال کے اس جسم کے ساتھ میں نے لگ بھگ بیس سال کی ٹھوس عمر گزاری ہے۔ ۱۹۶۴ سے ۱۹۷۵ تک گیارہ برس میں بے حد تیز دوڑا ہوں۔ کسی بھی جانکار آدمی سے زیادہ۔ ۱۹۷۶ سب سے ست لیکن زرخیز سال تھا۔ ۷۸-۱۹۷۷ کے سال میں نے ایک معمولی طالب علم کی طرح گزارے لیکن سائنسی وجوہات سے INTUTION کو بھولا رہا۔

۱۹۸۲ء میں، میں نے INTUTION کے لیے دوبارہ بانہہ نہیں پھیلائی ہیں۔ عمر کا نیا سال، میں اسے تبدیلی اور حصولیابی کے سال کی حیثیت سے مانتا ہوں۔ سب سے پہلے واپس آئے گی میری قوت آرزو، پھر جسمانی اور ذہنی لیاقت۔ ۳۴واں سال معجزاتی کرامات سے بھرا ہوگا۔ یہ دنیا کی سب سے بچی پیش گوئی ہے۔

(بشکریہ: جن مت دہلی)

# اوتار سنگھ پاش (۸۸۔۱۹۵۰)

## سوانحی کوائف

| | |
|---|---|
| ۹/ ستمبر ۱۹۵۰ء | : پیدائش۔ تلونڈی سلیم جالندھر |
| ۱۹۶۴ء | : ہائی اسکول کھیوا سے مڈل پاس کر کے جونیر تکنیکل اسکول کپورتھلہ میں داخلہ مگر ڈپلومہ پاس نہیں کیا |
| ۱۹۶۵ء | : جالندھر کینٹ جین ہائی اسکول سے نویں کلاس پاس، سیکورٹی بارڈر فورس میں بھرتی ہو کر تین ماہ کے بعد نوکری چھوڑی۔ |
| ۱۹۶۹ء | : نکسل وادیوں سے میل جول۔ |
| ۱۹/ مئی ۱۹۷۰ء | : قتل کے جھوٹے مقدمہ میں قید ''لوہ کتھا'' کی اشاعت۔ |
| ستمبر ۱۹۷۱ء | : مقدمہ سے رہائی |
| ۱۹۷۲ء | : 'سیاڑ' اخبار نکالنا شروع کیا۔ موگا جرم میں قید |
| ۱۹۷۳ء | : سیاڑ بند، اودے باجان مگو کی اشاعت |
| مئی ۱۹۷۴ء | : ریلوے ہڑتال کے دوران قید ''ھیم جیوتی'' کی ادارت ''دیش پردیش'' (لندن) کی نامہ نگاری. ملکھا سنگھ کی خودنوشت، آپ بیتی 'فلائنگ سکھ' لکھ کر دی۔ |
| ۱۹۷۶ء | : میٹرک وگیانی پاس، ایوننگ کالج جالندھر سے بی۔اے سال اول (آنرز) |
| ۱۹۷۸ء | : جنڈیالے سے جے بی ٹی شروع کر کے شیخ پورہ (کپورتھلہ) سے آنرز کیا۔ |
| جون ۱۹۷۸ء | : راجوندر کور سندھو سے شادی۔ |
| | : 'ساڈے سمیاں وچ' کتاب کی اشاعت۔ |
| ۱۹۷۹ء | : گرونانک نیشنل مڈل اسکول کا افتتاح، ہاتھ سے لکھا ہوا اخبار ''ہاک'' نکالا۔ |
| ۱۹/ جنوری ۱۹۸۳ء | : بیٹی ونکل کا جنم |
| ۱۹۸۵ء | : پنجابی ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ایک سال کے لیے فیلوشپ ملی۔ |
| جولائی ۱۹۸۶ء | : انگلینڈ ہوتے ہوئے کیلی فورنیا جا کر ''اینٹی۔۴۷ فرنٹ'' اخبار نکالا۔ |
| مارچ ۱۹۸۷ء | : انگلینڈ میں ایک ماہ قیام کر کے امریکہ واپس۔ |
| اکتوبر ۱۹۸۷ | : ہندوستان واپسی |
| ۲۳/ مارچ ۸۸ | : دہشت گردوں نے دوست ہنس راج کے ساتھ گاؤں میں قتل کر دیا۔ |

# پاش کی نظمیں

انتخاب و ترجمہ : نعمان شوق

## خیرات

آپ نے مجھے دیا ہے صرف ایک کمرہ
اور وہ بھی بند
ناپنا تو مجھے ہے
کہ اس میں کتنے قدموں سے
پھل بنتا ہے
کتنے میل چل کر دیوار دیوار نہیں رہتی
اور سفر کے معنی واضح ہونے لگتے ہیں......

آپ نے مجھے حق دیا ہے۔۔۔
جلاوطنی کا
روٹی کے لیے مٹی ہونے کا
محبوب کے غم میں آنکھیں کھونے کا
اور موت کے بھیانک کہرے میں گم ہو جانے کا
لیکن ایک حق اور ہوتا ہے
جو دیا نہیں صرف چھینا جاتا ہے......
آپ کے پاس وعدوں کا سمندر
میرے ڈوبنے کے لئے
جس میں تیرتی ہیں
سنہری سپنوں کی مچھلیاں

لیکن تعبیر کا کنارہ او جھل ہونے سے قبل
میں نے تھام لی ہے بے وفائی کی پتوار
اور اب آپ کے پاس بچا ہے
مجھے دینے کے لیے صرف ایک انعام
موت
اور اے سخاوت میں نام کمانے والو
وہ بھی آپ خود ہی رکھنا چاہتے ہیں

## بس کچھ پل اور

بس کچھ پل اور
تیرے چہرے کی یاد میں
باقی تو تمام عمر
اپنے ہی نقش ڈھونڈنے سے فرصت نہ ملے گی

بس کچھ پل اور
یہ ستاروں کا گیت
پھر تو آسمان کی خاموشی
سب کچھ نگل ہی جائے گی
دیکھ کچھ پل اور
چاند کی چاندنی میں چمکتی
یہ تیتر کے پنکھوں سی بدلی
شاید ریگزار ہی بن جائے
یہ سوئے ہوئے مکان
شاید اچانک اٹھ کر
جنگل کی جانب ہی چل پڑیں......

## انتظار

نہیں
ایسا تو کبھی نہ ہوگا
کہ تارے ہی بہلا دیں گے محبوب کا دل
ہو سکتا ہے
راتوں کا زہر کم ہو جائے
جب اندھیرا مفتوح ہو جائے
پھر شاید سگریٹ سے درون کو جھلسانے کی
ضرورت نہ رہے
شاید آوارگی کی ذلت کم ہو جائے
ختم ہو جائے بے چارگی کا درد
شاید عمر کے صفحے پر
غلطیاں پہچاننے کی مشکل اتنی گہری نہ رہے
ہو سکتا ہے
نفرت میں بھاگنے کی مصیبت نہ رہے
اور اپنے چہرے کو پہچان کر
اپنا کہہ سکنے میں شرم نہ آئے
انتظار تو شاید
کبھی بھی ختم نہ ہو۔

## خطرہ ہے

اگر ملک کی حفاظت اسی کا نام ہے
کہ بے ضمیر ہونا زندگی کرنے کی شرط بن جائے
آنکھ کی پتلی میں 'ہاں' کے سوا کوئی اور لفظ
بے ہودہ ہو

اور ذہن بدکار لمحوں کے سامنے سر بہ سجدہ رہے
تو ہمیں ملک کی حفاظت سے خطرہ ہے

ہم نے ملک کو سمجھا تھا
گھر جیسی مقدس کوئی شے
جس میں حبس نہیں ہوتا
انسان موسلادھار بارش کی گونج کی طرح گلیوں میں بہتا ہے
گیہوں کی بالیوں کی طرح کھیتوں میں جھومتا ہے
اور آسمان کی بے کرانی کو مفہوم عطا کرتا ہے

ہم نے تو ملک کو سمجھا تھا آغوش جیسے ایک احساس کا نام
ہم نے تو ملک کو سمجھا تھا کام جیسا کوئی نشہ
ہم نے تو ملک کو سمجھا تھا قربانی سی وفا
لیکن اگر ملک
روح کی بے گار کا کوئی کارخانہ ہے
اگر ملک تجربہ گاہ ہے الو بننے کی
تو ہمیں اس سے خطرہ ہے

اگر ملک کا امن ایسا ہوتا ہے
کہ قرض سے پہاڑوں سے پھسلتے پتھروں کی طرح
ٹوٹتا رہے ہمارا وجود
اور تنخواہوں کے منہ پر تھوکتی رہے
قیمتوں کی بے شرم ہنسی
کہ اپنے خون میں نہانا ہی کار ثواب ہو
تو ہمیں امن سے خطرہ ہے

اگر ملک کی حفاظت ایسی ہوتی ہے

کہ ہر ہڑتال کو کچل کر امن کا رنگ چڑھایا جائے
کہ جوانمردی بس سرحدوں پر مر کر پروان چڑھے
فن کا پھول کسی بادشاہ کی کھڑکی میں ہی کھلے
عقل حکم کے کنویں پر رہٹ کی طرح زمین کو سینچے
محنت شاہی محلوں کی دہلیز کی جھاڑو بنے
تو ہمیں ملک کی حفاظت سے خطرہ ہے

## سب سے خطرناک

محنت کی لوٹ سب سے خطرناک نہیں ہوتی
پولس کی مار سب سے خطرناک نہیں ہوتی
غداری پر اکسانے والی لالچ کی مٹھی سب سے خطرناک نہیں ہوتی
بیٹھے بٹھائے گرفتار ہونا۔۔۔ برا تو ہے
سہمی سی خاموشی میں جکڑے جانا۔۔۔ برا تو ہے
لیکن سب سے خطرناک نہیں ہوتا

عیاری کے شور میں
برحق ہوتے ہوئے بھی دب جانا۔۔۔ برا تو ہے
کسی جگنو کی لو میں پڑھنا۔۔۔ برا تو ہے
مٹھیاں بھینچ کر غصے کو پی جانا۔۔۔ برا تو ہے
سب سے خطرناک نہیں ہوتا

سب سے خطرناک ہوتا ہے
بے روح سناٹے سے بھر جانا
بغیر تڑپے ہوئے سب کچھ برداشت کر جانا
گھر سے نکلنا کام پر
اور کام سے لوٹ کر گھر جانا

سب سے خطرناک ہوتا ہے
ہمارے سپنوں کا مر جانا

سب سے خطرناک وہ گھڑی ہوتی ہے
آپ کی کلائی پر چلتی ہوئی بھی جو
آپ کی نگاہ میں رکی ہوتی ہے
سب سے خطرناک وہ آنکھ ہوتی ہے
جو سب کچھ دیکھنے کے باوجود جمی برف ہوتی ہے
جس کی نظر دنیا کو محبت سے چومنا بھول جاتی ہے
جو اشیا سے اٹھتی اندھے پن کی بھاپ پر ڈھلک جاتی ہے
جو روزمرہ کے سلسلے کو پیتی ہوئی
ایک بے مقصد تکرار کی الٹ پھیر میں کھو جاتی ہے

سب سے خطرناک وہ چاند ہوتا ہے
جو ہر قتل عام کے بعد
ویران آنگنوں میں چڑھتا ہے
مگر آپ کی آنکھوں میں مرچ کی طرح نہیں چبھتا
سب سے خطرناک وہ نغمہ ہوتا ہے
آپ کی سماعت تک پہنچنے کے لئے
جو مرثیے پڑھتا ہے
دہشت زدہ لوگوں کے دروازوں پر
جو غنڈے کی طرح اکڑتا ہے
سب سے خطرناک وہ رات ہوتی ہے
جو زندہ روح کے آسمانوں پر ڈھلتی ہے
جس میں صرف الّو بولتے اور ہواں ہواں کرتے گیدڑ
ہمیشہ کے اندھیرے بند دروازوں دریچوں پر چپک جاتے ہیں
سب سے خطرناک وہ سمت ہوتی ہے

جس میں روح کا سورج غروب ہو جائے
اور اس کی مردہ دھوپ کا کوئی ٹکڑا
آپ کے جسم کے پورب میں چبھ جائے
محنت کی لوٹ سب سے خطرناک نہیں ہوتی
پولس کی مار سب سے خطرناک نہیں ہوتی
غداری پر اکسانے والی لالچ کی مٹھی سب سے خطرناک نہیں ہوتی۔

OO

نصیر احمد ناصر

# علی محمد فرشی کی قوس قزح

**میرے** نزدیک شاعری ارضی راستوں کو سماوی فاصلوں میں طے کرنے کا نام ہے۔ کبھی کبھی یہ فاصلے اتنے پھیل جاتے ہیں کہ مروج شعری پیمانے انہیں ناپنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ یا مقام ہوتا ہے جہاں آ کر تخلیق کار چپکے سے وقت کی لائٹ کون (LIGHT CONE) میں داخل ہو کر بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں جینے لگتا ہے اور اس

میرے سامنے علی محمد فرشی کا مجموعہ کلام "تیز ہوا میں جنگل مجھے بلاتا ہے" ۱۲۶ صفحات پر مشتمل خوبصورت ڈیزائن اور خوبصورت کتابت وطباعت کے ساتھ پہلی ہی نظر میں قاری کو متوجہ کرلیتا ہے۔ علی محمد فرشی صاحب نظم کے شاعر ہیں اور مجموعہ میں معہ دیباچہ کے ۶۸ نظمیں شامل ہیں۔ کتاب پر کوئی مقدمہ نہیں ہے فلیپ پر فرشی کی رائے بھی نہیں۔ کتاب کے آخر میں شاعر کا کوئی تعارف بھی نہیں۔ یعنی قاری کے لیے ایک چیلنج کہ وہ شاعری کے توسط سے ہی شاعر کو سمجھے بلکہ صرف شاعری کو سمجھے اور پرکھے۔

پہلی ہی نظر میں ان کی شاعری کا لب ولہجہ سب سے جداگانہ ایک نئی آواز نئی نگارشات، جو ہر قدم پر قاری کو سوچنے پر مجبور کرے اس کے ذہنی فکر کو مہمیز کرے۔ وہ نئے شاعر تو ضرور ہیں لیکن انہیں نہ جدید کہا جاسکتا ہے نہ ہی مابعد جدیدیت سے متاثر۔ ہاں وہ اپنے گردوپیش سے متاثر ضرور ہیں۔ لیکن بات کو ڈھکے چھپے انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے اظہار میں عجز نہیں لیکن جو علامات اور تشبیہات اور استعارے انہوں نے استعمال کئے ہیں ان کی معنویت تک رسائی اتنی آسان بھی نہیں۔ الفاظ کے دروبست سیدھے عام بول چال کی زبان، مصرعے چست، اور روانی سے بھرپور۔ بعض علامتیں بالکل سامنے کی ہیں۔ مثلاً کبوتر، دریا، ہوا، لیکن ان کو جس طرح انہوں نے نبھایا ان کی رمزیت کو سمجھے بغیر نظمیں سر سے گزر جائیں گی پھر بھی یہ کسی ریاضی داں کا گورکھ دھندہ بھی نہیں ہیں۔ گردوپیش اور روایات سے باخبری ضروری ہے۔

ان کی شاعری چونکا دینے والی شاعری ہے۔

اور اگر اسی طرح انہوں نے مشق سخن جاری رکھا تو بہت جلد وہ سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیں گے، ہاں آج کے نظم گو شعرا سے ضرور کہا جائے گا کہ وہ اس مجموعہ کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ نظم کس طرح کہی جاتی ہے۔

—— محبوب الرحمن فاروقی

ماورائی کیفیت میں اظہار کے ایسے نئے اور انوکھے سانچے وضع کرتا ہے جن میں ڈھل کر الفاظ فکری اور جمالیاتی امتزاج کا خوبصورت پیکر بن جاتے ہیں۔ اردو شاعری کے افق پر احساس و اظہار کے نئے رویوں اور لہجوں کی یہ قوس قزح ستر کی دہائی میں ابھرنا شروع ہوتی ہے۔ علی محمد فرشی کی شاعری اسی قوس قزح کی نمایاں ترین توسیع ہے جس کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ اس کے ساتوں رنگ کسی مصنوعی رنگ سازی کا نتیجہ نہیں بلکہ تخلیقی روشنی کا سارا سمندر فرشی اپنی ذات کے پرزم (PRISM) سے گزار کر صفحہ قرطاس پر لایا ہے۔ خدا جانے انعطافِ نور کے اس بظاہر لطیف عمل میں اس نے کتنا زہر، کتنا نیل، اپنی ذات کے اندر جذب کیا ہوگا، اسی لیے تو وہ اتنے دکھ بھرے وثوق سے کہتا ہے ؎

سات دنوں سے آگے کوئی رات نہیں
ساتویں دن کی شام سے ملنا
سات دنوں تک ہنس ہنس کھلنا
پاگل تتلی! اس سے اچھی کوئی بات نہیں

(وہ کہتی تھی)

سات دنوں کا یہ حوالہ ایک اور نظم "فراک" میں پھیل کر سات لاکھ سالوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ یعنی سات کا عدد زماں کا استعارہ (CHRONOLOGICAL METAPHOR) بن کر اس نظم کی ایک (COSMIC AGE) یا ایک "یگ" میں بدل جاتا ہے۔ حقیقت FANTASY کی طرف چلتی ہوئی اس نظم میں فراک جو ایک دکان میں سات روز سے ٹنگا ہوا تھا، اسے خریدنے کی خواہش مند بچی کی عمر سات سال تھی جس نے سات سال بعد اپنی گولک توڑی مگر فراک کل جمع شدہ رقم یعنی اس کی عمر سے مزید سات سال مہنگا تھا۔ بچی کی قوت خرید سے باہر ایک لمحہ نارسائی کی صلیب پر لٹکا ہوا یہ فراک جب سات لاکھ سال بعد دریافت ہوتا ہے تو "وہ" جو دراصل خود شاعر ہے، اسے چوم کر صلیب پر چڑھ جاتا ہے۔

صلیب پر
فراک تھا ٹنگا ہوا
ٹپک رہا تھا خون اس کی جھالروں سے
خون تھا کہ سرخ سرخ نور تھا!
جو سات لاکھ سال سے
فراک کی تلاش میں بھٹک رہا تھا
چیرتا ہوا ہجوم کو بڑھا
فراک کو صلیب سے اتار کر
زمیں کی نرم گود میں لٹا دیا
سلا دیا
وہ چوم کر فراک کو
صلیب پر ہوا بلند
خود فراک بن گیا

(فراک)

(FROCK)انگریزی لفظ ہے اور اس (OUTER GARMENT) کو کہا جاتا ہے جو عورتیں خصوصاً بچیاں پہنتی ہیں۔ اس لحاظ سے مذہبی اہمیت کا حامل یعنی عیسائی (SAINTS) کا یہ لباس زیادہ گہرے استعاراتی معانی کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ بچی جسے اس کی ماں فراک خرید کر نہ دے سکی، سات لاکھ برس کے بعد SAINT HOOD کو پہنچ گئی اور شہادت کی اس منزل کو پالیا جسے عیسیٰ نے پایا تھا۔ خون کی لکیروں کی طرح ٹپکتی جھالروں والا فراک اس بچی اور اس کی ماں کے (ECONOMIC MARLYRDOM) کا سمبل بن گیا۔ یہاں خون، جس کے بغیر انسانی حیات کا تصور ممکن نہیں اور جسے نظم میں "سرخ سرخ نور" کہا گیا ہے، کے حوالے سے انتہائی اہم بات یہ ہے کہ بائیو کیمسٹری میں بھی خون کی نیوٹرل PH تقریباً سات ہے، جو ڈسٹرب ہو جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ علی محمد فرشی کی نظموں کو سات مختلف مذہبی، تاریخی، علمی، ادبی، سائنسی، معاشی اور نفسیاتی حوالوں سے دیکھا جائے تو ان کی تہہ داری اور معنوی وسعت پر حیرت ہوتی ہے۔

عورت دوسری اہم علامت ہے جو علی محمد فرشی کی نظموں میں پورے تخلیقی اور تہذیبی رچاؤں کے ساتھ آئی ہے۔ لوک گیت کے (FORMAT) اِسم اشارہ کی تانیث میں پیاس، تتلی، برگد کی چھاؤں اور جٹائیں، مٹی، تخلیق کار، راہیں، آنکھیں اور آخر میں ماں، یہ سبھی تصویریں اِسم یعنی (PICTORIAL AND GRAPHIC NOUNS) یعنی اس مخلوق کی تصویر پیش کرتے ہیں جسے ہم عورت ذات کہتے ہیں۔

وہ کہتی تھی
سب سے اچھی پیاس بہتے دریاؤں کی
سب سے اچھی پیاس ہے برگد کی چھاؤں کی
گیان کی جھیل میں دبی، بوڑھی زرد جٹاؤں کی
(وہ کہتی تھی...... ۲)

وہ کہتی تھی
جو تخلیق کا دکھ سہتی تھی
مٹی پاک مقدر والی

مٹی...... جس سے بیج اُگے
بیج اُگے پودا بن جائے
کٹنے کا جب موسم آئے
درد کی شاخوں پر بیٹھے
گیت پرندے گائیں
آنکھیں...... راہیں بن جاتی ہیں
خالی آنگن رہ جاتی ہیں مائیں!
(وہ کہتی تھی...... ۲)

فرشی اور اس کی نظموں کی عورت اپنی تمام مرئی اور غیر مرئی صورتوں میں باہم پیوست ہو کر ایک ایسا شعری مرکب (SYNTHESIS) بناتے ہیں کہ انہیں الگ کرنے

کے عمل میں بذات خود تخلیقی کرب اور تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ انجذاب اور امتزاج کا یہ معاملہ کسی عمومی حادثے یا سطحی جذباتی رویے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی دائمی تلاش و طلب میں جتلا روحوں کی جسمانی اذیت کوشی کا تلافی نامہ ہے۔ عورت اور جنس کے حوالے سے فرشی کی سائیکی اتنی پیچیدہ ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے خود اس کا بطون ہی عورت ہے۔ لیکن وہ نہ تو ذو جنس (ANDROGYNOUS) ہے اور نہ ہی عورت اور مرد دونوں کی جنسی خصوصیات کا حامل یونانی دیومالا کا کردار ٹیسیاز، بلکہ اپنی ذات میں گہری کشش اور اپنے آپ میں تشدد کی حد تک لذت خیزی اس وجودنامے کا اقرار ہے۔ جس میں آدم اور حوا اصلاً ایک ہی تھے اور بطناً بعد بطن ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔

میرے اندر
پھن پھیلائے
زہر سمیٹے
جھوم رہی ہے
ایک گلابی ناگن

(ناگن)

ندامت کے بستر پہ بیٹھی ہوئی سوچتی ہے
کہانی میں جس مرد کا ذکر تھا
کہیں یہ وہی تو نہیں

(پرانی کہانی)

گندمی جسم کا ذائقہ
اس کے اندر اتر کر اسے کھا گیا
اب اندھیرا کنواں (سرد تنور) ہے
جس میں اک آدمی

کالی راتوں کے ہاتھوں سے گرتی ہوئی
راکھ میں دب رہا ہے
شاید کوئی عورت ہے
ہاں عورت ہے
برگد کی ٹہنی سے الٹی لٹکی ہے

(جادوگرنی بھوک بن جاتی ہے)

زندہ ہے...... شاید مردہ ہے
عین عورت کے نیچے
ایک پتھر پر
کوئی بیٹھا ہے
یوں لگتا ہے
جسے مرد گیان میں ہے
عورت اس کے دھیان میں ہے!!

(عورت گیان)

علی محمد فرشی نے اپنی نظموں میں علامتوں اور استعاروں کی ایک ایسی پراسرار فضا قائم کی ہے، جس میں ہوا اور جنگل اپنی تمام تر معنوی گھمبیرتا اور پھیلاؤ کے ساتھ انسانی ذات سے پھوٹتے ہوئے پورے گلوب کا احاطہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی شاعری میں یہ دونوں علامتیں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔ ہوا ایک کثیر المعانی علامت ہے جو زندگی، حرکت، کوشش،

لاابالی پن، مسافرت، آزادی، معصومیت اور عورت کے مختلف روپ دھارتی رہتی ہے۔ فرشی کی نظموں میں ہوا کا روپ کہیں مثبت ہے اور کہیں منفی، کہیں مترنم ہے اور کہیں تشدد، کہیں ہوا دکھ کی ماری ہوئی عورت ہے جو لوریاں سناتی، دلاسے بانٹتی ہے، کہیں عورت کا ہسٹریائی روپ دھار کر عالم دہشت یا وحشت میں ہری چیخیں چباتی، جھاڑیوں میں رقص کرتی ہے۔ کہیں ہجر توں کا اذن ہے اور کہیں شفاف جھیلوں کے کنارے محبوبہ کے جسم کی خوشبو کا جھونکا۔

## اندھی ھوا

رو تی ہوئی گھر بال پھیلائے ہوئے
گلیوں میں ننگے پاؤں چلتی ہے
سڑک پر بکھرے پتوں کو
پرانے زرد خوابوں کو
اٹھا کر چومتی ہے
لوری سناتی ہے!
دلاسے بانٹی ہے!!

(ہوا جب اذان دیتی ہے)

گرا کر گھونسلے شاخوں سے ہنستی ہے
لرزتے، کانپتے، ڈرتے، اڑانیں مانگتے
پرندوں کو پٹختی ہے
لہو میں تر، بکھرتے پر اڑاتی ہے
کڑکتی، ٹوٹتی شاخوں کو کھاتی ہے
ہری چیخیں چباتی ہے
جھاڑیوں میں رقص کرتی ہے

.......

ہوا جب اذان دیتی ہے
تو شاخوں کو پرندے چھوڑ جاتے ہیں
شجر کے سبز دھاگے توڑ جاتے ہیں

(تیز ہوا میں جنگل مجھے بلاتا ہے)

جہاں وہ جسم کی خوشبو
دھند لکے میں جگاتی ہے
ہوا مجھ کو بلاتی ہے

فرشی کی نظموں میں ہوا کی علامت زندگی کے متنوع روپ بہروپ بھرتی ہوئی بالآخر ایک ایسے سانچے میں بدل گئی ہے جس نے سارے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یوں اردو شاعری کی اس خوبصورت اور (MULTIVALENT) علامت کو جمالیاتی اور معنوی کلائمکس پہ لانے کے بعد فرشی اعلان کر رہا ہے کہ۔

## "ھوا مر گئی ھے"

ابھی شام چوکھٹ سے لگ کر کھڑی
کپکپاتے ہوئے سرد ہاتھوں سے
جاتے ہوئے سال کو الوداع کہہ رہی تھی
کہ ٹی وی نے اپنے خصوصی بلیٹن میں
اس سانحے کی خبر دی
خبر پڑھنے والی کی آنکھوں پہ افسوس کی تیز

بارش تھی
ہونٹوں سے الفاظ یوں ٹوٹ کر گر رہے تھے
کہ جیسے خزاں کی کسی رات کو تیز آندھی چلے تو
درختوں کے پتے
بکھرتے بچھڑتے ہوئے، دربدر
کھڑکیوں سے پنہ مانگتے ہیں!

نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی
'بس اک دکھ ہی تھا
ٹپکتا ہوا
سرخ قالین تک آ گیا تھا
"ہوا مر گئی ہے!"

(ہوا مر گئی ہے)

جنگلی انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء، عرفان ذات، پراسرار خواہشوں اور داخلی بھول بھلیوں سے گھنیرا پھیلاؤ ہے۔ جنگل جس میں درخت مکالمہ کرتے ہیں اور جس کی رموز بہت گہری ہوتی ہیں۔ جو ہمیشہ سے سادھوؤں، بھکشوؤں، رشیوں، یوگیوں، فلسفیوں، عاشقوں، صوفیوں، اپسراؤں، دیوی دیوتاؤں کی آماجگاہ رہا ہے۔ جنگل، جس میں "بن دیوی" رہتی ہے جو سارے جنگل کی ماں ہے........ جنگل، جس میں شکنتلا کے دل میں پہلی بار راجہ سے ملاپ اور بار آور ہونے پر محبت اور بے قراری پھوٹی........ جنگل، جس میں صدیوں پہلے کپل وستو کے شہزادے سدھارتھ گوتم نے نروان اور تلاش کا راستہ اختیار کیا........ جنگل، نیندوں کا ہو یا خوابوں کا، تنہائی کا جنگل ہو یا انسانوں کے ہجوم کا، باتوں کا ہو یا خاموشی کا، حرفوں کا ہو یا بے اسم جذبوں کا، جنگل انسان کے اندر ہو یا باہر، جب بہت گھنا ہو جاتا ہے تو ہوا کو بھی راستہ نہیں ملتا۔ لیکن یہی جنگل تیز ہوا میں فرشی کو بلاتا ہے۔ اسی جنگل کے راستے میں پڑی ہوئی (فرشی کی) نظم لفظوں کی گھنیرتا میں فکر و فلسفہ اور احساس و آگہی کے نئے راستے بناتی ہے۔

بہت تھک چکے ہو
اب آرام کر لو
درختوں سے نیچے اتر کر

ہوا میٹھی لوری سنانے لگی ہے
(یہاں تم زمیں پر پڑے ہو) یہاں سے ذرا اور آگے
پرانے درختوں کے سائے تلے
ایک دلدل تمہارے لیے نرم بستر لگانے لگی ہے۔

فرشی کے شعری (SPECTRUM) میں فراک، عورت، ہوا اور جنگل کے ساتھ برف، دریا اور کبوتر کے علامتیں نمایاں ہیں، لیکن فرشی نے ان علامتوں کو پہلے سے مستعمل اور متعین معانی نہیں دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں میں برف، لینڈ سکیپ، دریا، بہتے ہوئے وقت اور کبوتر محض امن و آشتی کی علامت نہیں ہیں۔ بلکہ ان علامتوں کا ایک اپنا جہان صد رنگ ہے۔ اور

ان کے درمیان استعاروں، پیکروں اور لفظوں کے ان گنت SPECTRA ہیں، جو انہیں MACROCOSMIC بناتے ہیں۔ اور اس قوس قزح کے معنوی افق کو حد نظر سے ورالے جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے کئی بار نظری دور بینوں کے لیز راور ماسکی فاصلے بد لنے پڑتے ہیں۔ اور تقابلی ادب کے ماہر ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے بقول "فرشی کے ہاں امیج سے آگے جانے اور معنی کی تہہ در تہہ سطحوں پر اس امیج سے آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی قدرت موجود ہے۔"

برف پڑی ہے
مسجد کے گنبد پر
منبر سے گرے لفظوں پر
محراب کے اوپر طغرے پر
طاق میں رکھے پہلے بیج پر
رحل کے نیچے بہنے والے سرلہو پر
اللہ ہو پر
مینار سے گرنے والی صدا پر
ننھی دعا پر!
طوفانی بارش
دور کناروں تک گرتی ہے
قبروں میں سوئی یادیں گیلی ہو جاتی ہیں
چہرے کتنے بن جاتے ہیں

مرنے والے بوڑھے لمحے
سانپوں کے چکیلے جسم بدل لیتے ہیں
جلدی میں جانے والا دریا
واپس آکر سارا شہر نگل لیتے ہیں
(دریا جلدی میں ہوتے ہیں)
مقدس زبان سے
میں خوب آشنا ہوں
مقدس زباں کو ہمیشہ سے سنتا رہا ہوں
زمانے کے جھولے میں مجھ کو
مقدس زبان میں وہ لوری سناتی رہی ہے
وہ لوری سناتے ہوئے رو پڑی تھی!
کبوتر! اسے جانتے ہو.............؟
(کبوتروں کے پروں پر لکھی لوری)

سینٹ آگسٹائن (ST.AUGUSTINE) نے اپنی کتاب "THE CITY OF GOD" میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ:

"WHAT DID GOD TO BEFORE HE CREATED THE UNIVERSE?"

لیکن اس کا جواب نہ دیا۔ تاہم علی محمد فرشی کی نظمیں پڑھتے ہوئے اس سوال کا جواب بآسانی مل جاتا ہے کہ وہ جب شاعری نہیں کرتا تھا تو کیا کرتا تھا؟

سارے بچے
ریت کے گھروندوں کے

ان سب سے دور
اکیلا بیٹھا

ننھی سی اک قبر بناتا رہتا تھا"

شہر بناتے رہتے تھے
لیکن میں

یہ ہے وہ "TWINS PARADOX" جو بیک وقت بچپن اور بڑھاپے میں سفر کرتے ہوئے فرشی کی شاعری میں در آیا ہے۔ شاید اس کے دھندنے وقت کی وہ حتمی شکل مرتب کرلی ہے جسے سائنسداں اور فلاسفر ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔ اسی لیے اسکے ہاں موت بھی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ اپنے جمالیاتی تارو پود میں فرشی کی نظمیں گندھرو کی اپسرا اور رشی کی طرح ہیں جو مرد کو روشنی میں عریاں نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور اپنے آہنگ (RHYTHMICS) میں برہما کی محبوبہ سرسوتی سے مشابہ ہوتی ہیں جو نغماتی زیروبم سے کائنات کی تخلیق در تخلیق کرتی ہیں۔

"اگر تو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی
زمانہ دکھ بھری باتوں کی میلی پوٹلی لے کر
اندھیرے کے سمندر میں اتر جاتا
مجھے اس شام ساحل پر
تری خوشبو
مکمل جسم کے ملبوس میں ملتی"

یہ نظمیں بظاہر کسی مخصوص (MYTHICAL) حوالے کے بغیر جدید تمثیل نگاری کی عمدہ مثال ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے شعور کی اسکرین پر جو تصویر ابھرتی ہے وہ دن کی تیز روشنی کا منظر پیش کرنے کی بجائے خواب شب یا (NIGHT VISION) کی پر اسراریت لیے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے انہیں اپنے عہد کی جدید شعری دریافت کہا جاسکتا ہے۔ OO

# علی محمد فرشی کی نظمیں

## انتخاب : نعمان شوق

علی محمد فرشی نے نظم کو ایسی بے شمار نادر علامتوں اور استعاروں سے آشنا کیا ہے جو کسی بھی بڑی شاعری کی بنیاد ہوتی ہیں۔ ان علامات و استعارات کے پردے میں معنی و مفاہیم کی جو دنیا آباد ہے وہ بھی کم پر کشش اور حیات انگیز نہیں۔ تخلیقی پیکر تراشی بھی علی محمد فرشی کے شاعرانہ مزاج کا حصہ ہے۔ یہ پیکر تصوراتی سطح پر ایک خوشگوار ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں میں مابعد الطبیعات عناصر کی موجودگی بھی شاعری کی مجموعی فضا میں ایک خاص قسم کی پیچیدگی اور آہنگ پیدا کرتی ہے۔ میرے نزدیک فرشی کی شاعری کا سب سے اہم وصف اس کا FLOW ہے جو قاری کو ایک لمحہ بھی ٹھہرنے کی مہلت نہیں دیتا اور ایک ایسی نامعلوم دنیا میں بہالے جاتا ہے جس کی فضا نامانوس ہوتے ہوئے بھی دل پذیر معلوم ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں کے مطالعے سے جو جمالیاتی کیف حاصل ہوتا ہے وہ ہم عصر نظموں میں تقریباً مفقود ہے۔

**—نعمان شوق**

### میں نظم کا تابوت بنا سکتا ہوں

میں اپنی مٹی میں رہتا ہوں
اور اپنے دریاؤں میں بہتا ہوں
میں اپنے خوابوں میں سوتا اور اپنے جگراتوں پر روتا ہوں
میرے برف کا اپنا دکھ ہے اور دھوپ کا اپنا سکھ
میں اپنی مٹی سے نظم اگا سکتا ہوں
لیکن اس کی ناؤ بنا کر دریاؤں کے پار نہیں جا سکتا
میں اپنے خوابوں پر رونے والی آنکھیں
اور اپنے خوابوں پر ہنسنے والے ہونٹ نہیں، نظم بناتا ہوں
میں اپنی نظم سے ناؤ نہیں تابوت بنا سکتا ہوں
اس میں اپنی برف بچھا سکتا ہوں اور دھوپ کی چھاؤں بنا سکتا ہوں
میں اپنا تابوت اٹھائے اپنے خوابوں میں چل سکتا ہوں
اپنے جگراتوں میں جل سکتا ہوں

## نوری فاصلے مٹی سے طے ہوتے نہیں

مرے مولا!
ہزاروں سال کی نوری مسافت پر
شب اسریٰ کے اسرار حریری
اوڑھ کر بیٹھا ہوا ہوں
مدینے کی طرف
دو پاؤں چلتا ہوں تو گر پڑتا ہوں
نوری فاصلے مٹی سے طے ہوتے نہیں

مرے مولا!
شب اسریٰ کے اسرار حریری کھولنے والے!
کروڑوں سال کی نوری مسافت کو
پلک بھر میں
زمین کو آسماں سے جوڑنے والے!

مرے مولا!
مدینے کے لیے مکہ کی دھرتی چھوڑنے والے!

مرے مولا!
ہزروں سال کی نوری مسافت پر
شب ہجرت کی خواہش کے کنارے پر کھڑا ہوں
شب اسریٰ کے اک روشن ستارے کے سہارے پر کھڑا ہوں

## کوٹ سارنگ شانگریلا کا قدیم نام ہے

دھوپ سے جھلسی ہوئی ویراں گلی میں
وقت اپنی سانس روکے چپ کھڑا ہے

انتظار آنکھوں میں کنکر بھر گیا ہے
بس ابھی نٹ کھٹ ادھر سے کھلکھلاتا آئے گا
اور اس کی پشت پر چابک لگائے گا
کہانی چل پڑے گی دور تک پھیلے خلاؤں کی طرف
بانس کے پہلے سرے سے دوسرے تک
دور تک...... نیچے خلا پھیلا ہوا ہے
اک تنی رسی پہ چلتے چلتے میرے پاؤں پتھرانے لگے ہیں
اب مرے اندر کہیں رکنے کی خواہش چل پڑی ہے
کوٹ سارنگ کی حویلی سے
ابھرنے والی چرخے کی صدا سننے کی خاطر
میں رکوں گا (بس صدی بھر)
گر پڑوں گا
دور تک پھیلے خلا میں
دھوپ سے جھلسی ہوئی ویران گلی میں

(ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے لیے)

○○

# نصیر احمد ناصرؔ کی نظموں میں روشنی کی علامت

قطعیت اور رمزیت میں سے کسی ایک طریقہ کار کے انتخاب کے حوالے سے دیکھیں تو ناصر کے ہاں روشنی کی علامت بعینہ اس طرح دبے پاؤں ابھر کر آتی ہے، جسے ہنری ڈی رینے (HENRY DE REGINER) نے ابہام اور صراحت کے درمیان ایک "سبک اور دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی آواز کا رشتہ" کہا تھا۔ رینے نے ہی اسے ایک OXYMORON اصطلاح کی شکل میں وہ CONSTRUCTION کہا تھا جو بیک وقت OBSCURE بھی ہے اور OBVIOUS بھی۔ اس لحاظ سے رینے اپنے پیش رو سٹیفن ملارمے STEPHANIE MALARME اور ایبے دی گورمے REME DE GONRME سے مختلف نظریہ رکھتا تھا۔ ملارمے نے فرانسیسی علائم نگاروں کی شعری تخلیقات کے حوالے سے علامت کی رمزیت اور ترسیل کی سطح پر اس کی صراحت کو ایک ہی ساختیے (STRUCTURE) کے دو رخ سمجھا جو مختلف النوع سیاق و سباق میں مختلف معانی رکھتے ہوئے بھی اپنے اصل معانی میں قائم و دائم ہے۔ ناصر کی نظم "لائٹ ہاؤس" کو ہی لیں۔ قطع نظر عنوان یعنی "روشنی کا مینار" کے جو بحری سفر کی صعوبتوں کی تیرگی اور طوفان باد و باراں سے جہازوں کو بچانے کا ضامن ہے اور روشنی کی "موجودیت" کا سمبل ہے۔ اس نظم میں "روشنی" کا لفظ لغوی معانی میں ڈھل کر کہیں نہیں آیا، ماسوائے ایک جگہ کے جہاں یہ ایک مخلوط تمثال کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔

"بتا روشنی کے نشاں!"

بحری سفر سے مستعار کچھ امیج نظم کے تار و پود کو صحیفیاتی، تاریخی اور جغرافیائی ناتوں کی رنگین بنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ "بتا ساحلوں کی ہوا اور وہ جس نے سمندر کے بھیگے سفر میں کہا تھا / محبت جزیرہ ہے / دکھ بادباں ہے / پانیوں میں چھپی سر بریدہ چٹانوں کی آبی شبیہیں / جہازوں کے چپو چلاتے / غلاموں کی بے عکس چیخوں کی تجسیم ہیں / غلغلتی صداؤں کے مستول دل میں اترنے لگے ہیں /" لیکن نظم قرات کی اس سطح تک ہی محدود نہیں ہے، کیوں کہ عین آغاز میں "لائٹ ہاؤس" کے عنوان سے شروع ہو کر روشنی کے مختلف النوع دائرے بناتی ہوئی یہ نظم روشنی کی ہی ایک تمثال تک پہنچتی ہے۔ "بتا اے زمینی ستارے!" پوری نظم اپنی

ظاہری سطح سے نیچے اتر کر تہہ آب AMBIVALENT اور MULTIVALENT سطحوں پر روشنی کے ہمہ جہت استعارے کے دھنک رنگ GIG LAMP سے پیدا شدہ ایک روشن دھند لکے کی فضا پیدا کرتی ہے۔ لائٹ ہاؤس ایک زمینی ستارہ ہے، جس سے جہاز ران اپنے اطراف، گرد و پیش کا تعین بھی کرتے ہیں اور منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی سمت بھی طے کرتے ہیں۔ لائٹ ہاؤس، روشنی کا UNAMBIGUOUS، سامنے کے الفاظش سے مرتب ARCHETYPAL IMAGE ہے، لیکن خضر راہ کے طور پر زندگی کے بحری سفر ODYSSEY میں یہ پانیوں میں چھپی سر بریدہ چٹانوں سے بچ کر نکلنے کی تلقین کرتا ہے۔ شروع سے اختتام تک یعنی "لائٹ ہاؤس" سے زمینی ستارے تک روشنی پہلو بدل بدل کر کہیں مرئی اور کہیں غیر مرئی اشکال میں نمودار ہوتی ہے۔ بطور علامت MULTIVALENT سطحوں پر یہ عہد قدیم کے آثار دریافت ہونے کی کیفیت "بوڑھی صدیوں کی تجریدیں" (ہڑپہ، مہنجودڑو؟ آریائی یا بدھ مت کے آثار قدیمہ کی کھدائی؟) بھی ہے، اور "داستانی سفر" بھی ہے، جس میں "قلقی صداؤں کے مستول" دل میں اترتے ہیں۔ (اوڈیسی؟ میر قاسم کا پہلا حملہ جس سے برصغیر میں اسلامی معاشرے کا پہلا بیج پڑا؟) علامت کی MULTIVALENCE ہوا میں بھی معلق ہے (وقت کی، شام کی حد پہ اڑتے طلسمی پرندے) زمین پر بھی استادہ ہے۔ (کسی درد کی سرزمین پر/ خدا بار شیں رو رہا ہے!) سمندر میں سطح آب پر بھی مرکوز ہے (جہازوں کے چپو چلاتے / غلاموں کی بے عکس چیخوں کی تجسیم ہیں) زیر آب بھی ہے (پانیوں میں چھپی سر بریدہ چٹانوں کی آبی شبیہیں) اور "ستارے" کے حوالے سے آسمان پر بھی ہے۔ مخلوط تمثالیں، قلقی صدا، بے عکس چیخیں، قوت باصرہ اور قوت سامعہ کے امتزاج سے ترتیب دی گئی ہیں، لیکن ان میں روشنی کا عنصر، اپنی مثبت (قلقی) اور منفی (بے عکس) دونوں حالتوں میں موجود ہے۔

"روشنی تیرے جنم یگ پر ایک نظم" بھی سفر کے استعارے سے متعلق ہے۔ لیکن "لائٹ ہاؤس" کے برعکس جلتی بجھتی ہوئی روشنی اس استعارے کو تجسیم اور تفہیم کے مختلف پہلو بخشتی ہے۔ سفر کے متن سے حاملہ یہ نظم، حمل کے معرض وجود میں آنے یعنی حمل کے ٹھہرنے کے لمحے سے پیدائش کے لمحے تک اذیت ناک سفر طے کرتی ہے۔ روشنی تو وقت کی کوکھ میں ہے۔ اسے وقت آنے پر پیدا ہونا ہے، لیکن سفر کے استعارے سے پیدا شدہ یہ انتظار نو ماہ؟ نو سال؟ نو صدیاں؟ نو یگ؟ نایافت بھی ہے اور نادریافت بھی۔ اس کرب کی لایعنی معنویت ABSURBITY AND MEANINGLESSNENS کا طلسم نظم کے واحد متکلم پر ایسے طاری ہے کہ وہ ارض و سما کے حضور میں بے دعا اور بے عبادت کھڑا ہے، لیکن متمنی ہے

کہ وقت کی کوکھ سے روشنی ظہور پذیر ہو۔ روشنی ''اوتار'' کی شکل میں ظاہر ہو۔

| | | |
|---|---|---|
| راکھ پر آنکھیں بناتی | آنکھیں | روشنی |
| انگلیوں کا بے بصر اندھا کمال | بے بصر | روشنی کا فقدان |
| دم بدم رنگت بدلتے موسموں کے درمیاں | رنگت | روشنی |
| پھول کھلتی، دھول ملتی، خواہشوں کا اندمال | کھلتی | روشنی |
| بے عبادت، بے دعا ارض و سما کے روبرو | ارض و سماء | روشنی |
| ایک تابیدہ کو مجسم دیکھنے کی جستجو | تابیدہ | روشنی |

اس ''تابیدہ تیقن'' کا جسم میں آنا، اس کا جنم ہونا، اس کا اوتار لینا، ناگزیر ہے، لیکن اس تابیدہ تیقن تک پہنچنے کا راستہ کٹھن ہے۔ مجھے آخری سطر میں لفظ ''جستجو'' بے محل محسوس ہوا۔ شاید اسے ''آرزو'' ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ناصر سے یہ سہو اچھوٹ گیا ہو، کیوں کہ روشنی کا جنم لینا اور اس جنم دن کا ''جنم یگ'' بن جانا تو لازمی امر ہے لیکن اس سلسلے میں نظم کا واحد متکلم، جو بنی نوع انسان کا جمع متکلم بھی ہے، کچھ کر سکنے کے نااہل ہے، یعنی آرزو تو کر سکتا ہے، جستجو نہیں۔ وہ ایک لایعنی ABSURB ''لا تیقن'' کا شکار ہے (بے دعا، بے عبادت) لاء مساوی انسان کی یہ کیفیت ہر شاعر کی قسمت کا نوشتہ ہے۔ کچھ حالتوں میں یہ ایک ناقابل بیان اذیت کی انبساط سے ہم کنار ہونے کے ذہنی تجربہ کا زائدہ بھی ہے اور تبدل بھی، کیوں کہ اس سانحہ کے بعد ہی روشنی کا یگ شروع ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ دو نظمیں یعنی ''لائٹ ہاؤس'' اور ''روشنی تیرے جنم یگ پر ایک نظم'' بہم دگر ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

اب آیئے IMAGIDT نصیر احمد ناصر کی ''علائم پروری'' کے طریق کار پر غور کریں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ شاعر کے وجدانی ارتعاش اور فوری طور پر تخلیقی اشتعال کے تین CATALYTIC AGENT ہوتے ہیں۔ یا تو زندگی کے ہمہ جہتی ارژنگ کا کوئی پہلو اس پر فوری طور پر اثر انداز ہو یا کوئی تجربہ یا اس کی دھندلی سی یاد شاعر کے باطن میں ایک مدت تک خوابیدہ حالت میں پلنے کے بعد کسی ایک لمحے میں بیدار ہو کر تخلیقی عمل کی کارکردگی کا جوہر دکھانے لگے (ورڈز ورتھ کی تھیوری آف پوئٹری --- THE DAFFODILS) یا وہ کسی دوسرے ادیب، شاعر، مصور کی کسی تخلیق سے یوں اثر قبول کرے کہ اس کے تجربے کو اپنے تجربے کی بھٹی میں پگھلا کر اپنے خام لوہے کو ایک نئی شکل میں ڈھال دے۔ (شکسپیئر کے تقریباً سبھی ڈراموں کا ماخذ موجود ہے۔)

ناصؔر کے طریق کار سے اگر کوئی شہادت ملتی ہے تو وہ ناسٹیلجیا کی بے قراری اور ماضی کی ناحصول خواہشوں کے حاصل اور لاحاصل ہونے کے بیچ میں معلق ہونے کی کیفیت ہے۔ اور اس حوالے سے وہ شاید اپنی نظموں کی "شان نزول" کے لیے دوسری وجہ اشتعال کے مرہون منت ہیں اور ورڈزورتھ کی تھیوری آف پوئٹری کے زیادہ قریب ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تقریباً سبھی نظموں کی اضطرابی کیفیت میں ایک تخاطب کا پہلو ہے۔ مہرباں عورت (سفر مجھ کو صدائیں دے رہا ہے) ماں (روشنی تمہارے لیے ایک اداس نظم) آنکھوں کی ازلوں میں ٹھہرے ہوئے نم، ساحلوں کی ہوا، روشنی کے نشاں، وقت کی (شام کی) آخری حد پہ اڑتے طلسمی پرندے اور زمینی ستارے (لائٹ ہاؤس) براہ راست تخاطب روشنی سے (روشنی، تمہارے لیے ایک اداس نظم)۔ یہ کچھ ایک مثالیں ہیں لیکن ناصر کے ہاں یہ ایک عادت ثانیہ کی طرح موجود ہے، اور تقریباً ہر نظم میں براہ راست کلمہ تخاطب موجود ہے۔

ایلن پائے ویو ALLAN PAIVIO نے ۱۹۷۲ء میں امیج اور معنی کے باہمی تعلق کے سلسلے میں اپنے دو ضابطہ ماڈل DUAL CODE MODEL کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہم اکثر زبان (لغہ) اور امیج جو دو متوازی تقسیم اصطفات ہونے کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ اور اس الزام سے کہ امیج صرف EPIPHENOMENON ہے، اس طرح بری الذمہ ہوتے ہیں کہ وقوع پذیر ہونے والا ہر تجربہ ذہن انسانی میں امیج کے طور پر اور لغہ کے طور پر الگ الگ لیکن مساوی ضابطوں کی شکل میں ریکارڈ ہوتا ہے۔ دیگر ماہر نفسیات کے علاوہ اختر حسن نے (۱۹۸۶ء) اسے ایک تکونے ماڈل TRIPLE MODEL کی شکل میں دیکھا۔ IMage یعنی 'I' SOMATIC۔ (طبعی یا جسمانی رد عمل) یعنی "S" اور MEANING یعنی "M"...... ان تین حروف ابجد کے مرکب ISM کو سہ جہتی اکائی کی صورت میں دیکھنے سے امیج کی ہمہ جہتی اور پل پل بدلتی ہوئی VARIATIONS کا پتہ چلتا ہے۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ امیج لفظ سے پہلے جنم لیتا ہے یا دونوں متوازی اور مساوی حالت میں بیک وقت ذہن انسانی میں ارتعاش اور اشتعال کے پہلے لمحے کے وقت اجاگر ہوتے ہیں، یا SOMATIC RESPONSE کن حالتوں میں ان پر اثر انداز ہوتا ہے، میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ناصر کے ہاں یہ ہمہ جہت مرقع ایک ایسے پروسیس کی مکمل سائیکل کے بعد بنتا ہے جو امیجری کے مطالعہ کے حوالے سے اہم ہے بھی اور نہیں بھی۔ میں اپنی بات کی وضاحت ان الفاظ سے کرنا چاہوں گا۔

ناصؔر کی نظموں میں یہ پروسیس بسا اوقات ایک کہانی یا تمثیل کی شکل میں ڈھلتا ہے۔ بہت سی نظمیں ایک اساطیری یا نیم اساطیری تمثیلچہ بن کر سامنے آتی ہیں۔ یہ اساطیر یونانی،

ہندوی یا کسی دیگر قدیم تہذیب سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ شاعر کے خود ساختہ ذاتی UNIVERSE OF MYTH کی دین ہے۔ یہ شاعر کا PERSONAL MYTH ہے کہ وہ روشنی کو وقت کے بطن میں پرورش پاتا ہوا ایک بچہ تصور کرے (روشنی تیرے جنم یگ پر۔۔۔) یا اوڈیسس اور سائیکلوپس کے مابین مکالماتی باریک بینیوں کی شعری وضاحت کرے (اب جان کر کیا کرو گے ؟) یا وضاحتی بیانیہ کی سطح پر DEFINITIONAL STATEMENTS کی ایک سلسلہ وار دستاویز پیش کرے (کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے) یہ تمثیلچے یا منی ڈرامے I.S.M کی سہ جہتی اکائی کا ماڈل کی مختلف VARIATIONS کا طریق کار استعمال کرتے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث یہ ممکن نہیں کہ میں مختلف نظموں کے حوالے سے اس پروسیس کی وضاحت کر سکوں اور چارٹ بنا کر پیش کر سکوں کہ روشنی کی امیج کے حوالے سے چھ مختلف VARIATIONS یعنی (ایک)ISM۔ (دو)IMS۔ (تین) MIS (چار)MSI (پانچ)SIM اور (چھ)SMI کی تکون کے زاویوں کی متعدد اور بوقلمون VARIATIONS میں کہاں کہاں روشنی کا امیج پہلے بیچ میں یا آخر میں ابھرتا ہے۔ (شاید یہ موضوع ایک TEM PAPER کے لیے اپنے کسی طالب علم کو دے سکوں)۔

ناصر کے ہاں لفظیاتی حوالہ جات کے پیچھے جو تخلیقی عمل کارفرما ہے، ساختیات کے پیمانوں کے روسے اور قاری اساس تنقید کے ضوابط کے تحت اسے ان مخصوص تمثالوں سے بھی پیمانہ زد کیا جاسکتا ہے، جو ان کی نظموں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان میں مفرد تمثالیں بھی ہیں، تجریدی بھی مخلوط بھی اور منتشر بھی، لیکن ناصر ایک "سچا سچا" انسان ہے اور "سچا سچا" انسان شاعر بھی اسی قماش کا ہی ہو سکتا ہے، اس لیے ناصر عادتاً شاید مفرد تمثالوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ "روشنی تمہارے لیے ایک اداس نظم" میں ان مفرد تمثالوں کی تعداد ایک درجن سے بھی زیادہ ہے۔

| | |
|---|---|
| ـــ خط، کتاب، ٹیبل، کاغذ | ـــ مطالعے کے حوالے سے روشنی |
| ـــ زمین، مٹی، مٹھی، بھر بھری ریت | ـــ زمینی اور مکانی حوالے سے روشنی |
| ـــ ماں، آنسو، خوشی، محبت، خواب | ـــ جذباتی اور محسوساتی حوالے سے روشنی |
| ـــ بٹن | ـــ بجلی کے بلب جگانے کے حوالے سے روشنی |

تجریدی اور مخلوط تمثالوں میں سے کچھ یہ ہیں۔ لاجوردی روشنی، زندگی کی رات، اولین ساعت، نیم روشن الاؤ، نادیدہ بہاؤ (ابد کے اس طرف بھی فاصلے ہیں) روشنی کا لمس، جسم کا بستر، مخروطی اذیت، سلگتی ریت کی پابستگی، تکونی خواہشیں۔ (کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے) تباشیری دن۔ تباسی خواہشیں۔ تن کی لوستی تپتی زمین وغیرہ۔ یعنی "روشنی" کے حدت

میں تبدیل ہونے کا پروسیس (مجذوب خواہش کا خمیازہ)۔
میں نے اس مضمون میں ناصر کی صرف چند نظموں سے حوالہ جات اخذ کئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس خوبصورت شاعر کی حالیہ چند برسوں کی ساری، یا تقریباً ساری نظموں اور ڈیڑھ دو دہائی پرانی بعض نظموں میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے روشنی کا امیج در آتا ہے۔ کہیں یہ صرف روشنی ہے یا حر کی اکائی (VOLTAGE) کے حوالے سے اس کے بڑھنے یا گھٹنے کا عمل ہے، یا اس کا فقدان ہے یا منفی دراندازی سے روشنی اور تاریکی کے بہم دست و گریبان ہونے کا احوال ہے۔ یا روشنی کے حرارت اور حدت میں تبدیلی ہونے کا عمل ہے، یا حدت سے روشنی اخذ کرنے کا تمثیلچہ ہے (روشن الاؤ) کہیں یہ عورت کی طلب کی روحانی تپش سے پیدا شدہ روشنی ہے۔ کہیں یہ "لباس جسم کی نادیدگی" ہے، جس میں روشنی کی نفی یعنی اندھیرا مرد کا لباس بن جاتا ہے اور روشنی "نربان" (نروان؟) کی شکل میں ایک ناقابل حصول تلمیح ہے۔ (اروشی نے سچ کہا تھا؟) کہیں یہ LET THERE BELIGHT کی چیختی ہوئی گونج ہے۔ "روشنی! روشنی! الوداع! الوداع!" (رقص عمر میں وصال)۔ کہیں چراغ محبت صرف غم کی انوکھی نمی میں جھلملانے کے لیے جلتے ہیں۔ کہیں ہجر کے بانجھ پن میں بے دعا زندگی اُجالوں کی ضد ایسے ہی کرتی ہے، جیسے بالک چاند کے لیے کرے (یہاں تو وہی خواہش آب ہے)۔ کہیں روشنی دل کی منزلوں کا گھاؤ ہے۔ جبکہ وقت مسیح بھی ہی اور گوتم بھی۔ ایک زخم کو اچھا کرتا ہے تو دوسرا زخم کے درد کے احساس کو بھول جانے کی تلقین کرتا ہے۔

"بے کراں دکھ کی مسافت میں
مسافر رات کے انتم کنارے ڈھونڈتے ہیں
میں ادھورے گیت کی لے پر
خود اپنے دل کی دھڑکن گنگناتا ہوں
تمہارے خواب کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں
مگر ان بے پڑاؤ راستوں میں
کون جانے
روشنی گھاؤ ہے دل کی منزلوں کا
وقت گوتم ہے
کئی صدیوں کی سرگم ہے
زمیں اک لاغر و بیمار خلیے کی ولادت ہے۔"
(بے کراں دکھ کی مسافت)

کہیں یہ ایک لمسیدہ پرچھائیں کو چھونے کی خواہش میں ساری عمر سلیٹی ہو جانے کا المیہ ہے (واپسی) کہیں یہ جسم مرئی (روشنی زادی) کی معرفت درد کی صدیوں میں ڈھل کر نادیدہ زمانوں کے ابد آباد کرتی ہے۔ (مسافر راستوں سے لوٹ آتے ہیں) یعنی عورت، وقت اور روشنی کی تثلیث کا ایک لمسِ تاباں کی لامتناہیت میں تحلیل ہو جانا۔ کہیں تصور کائنات میں روشنی کے طبعیاتی اور مابعد طبیعاتی حوالے ہیں۔

صد ہزار سالوں میں
ایک نور لمحے کا
ٹوٹ کر بکھر جانا
حادثہ تو ہوتا ہے
واقعہ نہیں ہوتا

(پانی میں گم خواب)

کہیں یہ رات کی تمثیل اور صبح کی تاویل کا احوال نامہ ہے (اگر اس خواب کی وحشت سے بچنا ہے) اور کہیں یہ دور گاؤں میں نسل در نسل اچھے دنوں کے خواب دیکھنے کا آموختہ ہے۔

"بہت دور گاؤں ہے میرا
جہاں لالٹینوں کی مدہم لرزتی ہوئی روشنی میں
سبق یاد کرتے ہوئے
میں نے اچھے دنوں کے کئی خواب دیکھے۔"

(بہت دور ایک گاؤں)

لالٹینوں کی مدہم لرزتی ہوئی روشنی ہو یا کسی بڑے شہر میں بجلی کے چمکتے ہوئے قمقمے ہوں، گاؤں سے شہر تک، بچپن سے جوانی تک ناصر ان سب نظموں میں I.S.M کے سہہ جہتی ماڈل کی مختلف VARIATIONS میں روشنی کے استعارے کے حوالے سے اپنی بات کہتے رہے ہیں۔

جن دو نظموں کا میں نے تفصیلی جائزہ لیا ہے، یا جن نظموں کو میں نے روشنی کی علامت کے تناظر میں دیکھتے ہوئے، صرف اس حوالے سے ان کی لفظیات میں سے کچھ تمثالیں اخذ کی ہیں، وہ سب ایک عمیق حدت رکھتی ہیں۔ سبھی میں تخاطب کی سطریں ایک REFRAIN کی طرح بار بار آتی ہیں۔ لیکن یہ تخاطب خطبہ نہیں بنتا، اپنی شدت احساس سے بلند آہنگی کا لہجہ اختیار نہیں کرتا۔ شدت احساس کا یہ لہجہ سکوت اور ست روی سے انحراف کا بھی ہے اور بلند آہنگ خطابت سے بھی اپنا دامن بچا کر چلتا ہے۔ ان نظموں میں اگر شکست ذات کا سر ابھرتا ہے تو وہ بھی مدھم لے میں۔ اگر ہجر نومیدی رقص زندگی دل کے ساتھ قدم

ملا کر شامل ہوتی ہے تو وہ بھی طبلے کی سبک ترین تھاپ کے ساتھ۔

نصیر احمد ناصر اپنی نظموں میں علامتوں اور استعاروں کا ایک ایسا نظام تشکیل دیتے ہیں جو فکری اور جمالیاتی ہر دو سطحوں پر لامحدود معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں بین السطور اور پس الفاظ لاتعداد فکری جہتیں، بے شمار کائناتی سچائیاں اور پرت در پرت ایسی معنوی خوبصورتیاں دریافت ہوتی چلی جاتی ہیں کہ حساس قاری کے لیے مرئی اور غیر مرئی کے درمیان باریک سی حد فاصل رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ناصر کی نظمیں اپنی نامیاتی وحدت اور امیجری کے اعتبار سے ایک ایسے شاعر کی نگارش ہیں جو اپنے لیے ایک منفرد لفظیات کا ذخیرہ مجتمع کر چکا ہے، ایک نیا اسلوب ترتیب دے چکا ہے، جو اس کے کئی ہم عصروں اور اس کے بعد آنے والوں کی شعری نگارشات میں شعوری اور لاشعوری طور پر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ یہ نیا اسلوب کس نئے شعری تصوف کی ترسیل کی فقیرانہ قبا پہن کر چلتا ہے اس کے لیے تو ایک الگ مضمون درکار ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ ناصر اپنے اشاروں، استعاروں اور علامتوں کی تراش و تجسیم میں اپنے بزرگ شاعروں اور ہم عصر دوستوں سے کچھ فاصلے پر ہٹ کر کھڑا ہے۔

OO

# نصیر احمد ناصر کی نظمیں

## انتخاب ۔ انیس امروہوی

### کہانی ٹوٹ کر مربوط ہو گئی ہے

محبت جسم کے بستر پہ سوتی ہے
مگر آنکھوں میں ہر دم جاگتی ہے، نیند روتی ہے
تکونی خواہشیں
تکمیل کے کن زاویوں کو ڈھونڈتی ہیں؟
روشنی کا لمس
بوسوں کی عبادت
سلگتی ریت کی پابستگی
چھاؤں میں چلنے سے کہیں بہتر ہے
مخروطی اذیت کائناتی دائرے تصلیب کرتی ہے
کبھی لفظوں کے ملبے سے بھی سامان سفر ملتا ہے
میری جان!
کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے
لڑتے ہوئے مرنا بہت آسان ہوتا ہے!!

○○

### تاریخ کا جنمانتر

تم مجھے کہاں رکھو گی؟
دل میں، آنکھوں میں
دھنک رنگ ہونٹوں کی نیم واقوسوں میں
دودھیا پھولوں سے بھری گھاٹیوں میں
آدھی ادھوری نظموں میں
یا کسی بے نام کہانی کے لفظوں میں؟؟
میں تمہاری نیندوں کی
گزرگاہوں میں جاگتا ہوا
صدیوں پرانا ان دیکھا خواب ہوں
خواب ہمیشہ صدیوں پرانے ہی ہوتے ہیں
ہم گزرے زمانوں میں ملتے ہیں
یا آنے والے وقتوں میں
حال، جس میں ہم زندہ ہیں
محض ایک قوسی پل ہے
دو انتہاؤں کو ملاتا اور جدا کرتا ہوا
جسے کراس کرتے ہوئے
ہم چلنا بھول جاتے ہیں
خواب لکھنے اور پوسٹ کرنے کا کوئی سے نہیں ہوتا
میں ہر عہد میں تمہاری راہ دیکھتا رہا ہوں
وقت کا ڈاکیہ روز گزرتا ہے
کسی یگ، کسی جنم، کسی عمر، کسی صدی میں
تم جب بھی خود کو پوسٹ کرو گی
میں تمہیں وصول کرلوں گا
جنم دن کے تحفے کی طرح

لیکن تاریخ اور محبت کا کوئی جنم دن نہیں ہوتا
یہ تو خود دنوں کو جنم دیتی ہیں!!
کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات کی طلب
مہرباں لفظوں کو چھونے کی خواہش
کیا خواب میں دم گھٹنے کی اذیت سے بہتر نہیں؟
رونا ہی برحق ہے
تو پھر آؤ!
مل کر ایک ہی بار رولیں
سارے جنموں کا رونا
اپنے منزہ و مقدس آنسوؤں کی شبنم
میری پلکوں پہ گرنے دو
کائنات بھی ایک آنسو ہے
خدا کی آنکھ سے ٹپکا ہوا
مجھے اجازت دو
میں تمہارا ہاتھ تھامے ہوئے
پل صراط سے گزرنا چاہتا ہوں
مرنے سے پہلے مر کر
خدا کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہوں
تم میرے اندر کا صحرا نہیں پاٹ سکتیں
میں تمہاری آنکھوں کا جنگل عبور نہیں کر سکتا
میرا سفر اتنا طویل مت کرو
کہ میں تمہارے پاس بھی رکنا بھول جاؤں
مجھے ٹھہرنے کا اذن!!

ہم لاعلمی کی چادر اوڑھے
علم کے جوتے پہنے چل رہے ہیں
تم جانتی ہو
درد کی ڈوری کا آخری سرا کہاں گم ہوا ہے
مجھے معلوم ہے
اسے کہاں سے تلاشنا ہے
اس گنجلتا میں
کون کہاں الجھا ہے
ہم کو پتہ ہے
لیکن پاؤں کے جوتے تنگ ہو جاتے ہیں
ڈرائنگ روم میں بچھے راستے طے کرنے میں
عمریں کم پڑ جاتی ہیں
خود سے لپٹ کر بیٹھے
ہم اپنی اپنی اصل کو دور سے دیکھتے رہتے ہیں
محبت اور دانش میں
ایک ادھوری نظم کا فاصلہ حائل رہتا ہے

گزرے وقتوں میں
فرمان شاہی سے
لوگ اپنا قبیلہ، حسب و نسب بدل سکتے تھے
مجھے حکم دو
کہ میں اپنے جسم کا چوغہ بدل کر
تمہاری روح، تمہاری اصل میں شامل ہو جاؤں
مجھے ہجر میں پروانہ وصل دو
تاکہ جب کبھی میرا یہ متروک بدن
ناکردہ وفاؤں کی پاداش میں قتل کیا جائے

تو میں تمہاری محبت کا فرمان دکھا کر
اپنی اصل کی امان پاؤں
اور تم خود پر رونے سے بچ سکو۔۔۔۔۔۔!!

○○

## آخری نظم

مجھے دوستوں نے بالکل تنہا کر دیا ہے
وہ میرے لفظوں کو سانس بھی نہیں لینے
دیتے
اور ان پر اپنی قبروں کی مٹی ڈال دیتے ہیں
اس کے باوجود ایک لفظ
کبھی کبھی اتنا پھیل جاتا ہے
کہ آنکھیں اس کا نصف محیط بھی نہیں دیکھ
سکتیں
دیکھو میں ایک بار پھر تمہارے سامنے ہوں
ایک ازلی خواب نامہ رقم کرتے ہوئے
روشنی میرے ہاتھوں کی لکیروں میں
گرم گرم سیال لاوے کی طرح بہہ رہی ہے
اداسی ایک بار پھر میرے وجود سے گزر رہی
ہے
اپنی لاکھوں سال پرانی گمبھیرتا کے ساتھ
لیکن اب میں کوئی نظم نہیں لکھوں گا
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ ہر انتہا پر
ایک اور ابتدا جبڑے کھولے منتظر ہے،
میں کسی کے نقش پا پر اپنی قبر نہیں بنا سکتا
کیا چلنے کے لیے راستہ بہت ضروری ہے؟
روشنی بل دار ہو کہ سیدھی
خلا کی بے لمس تاریکی تو دور نہیں کر سکتی
دیکھو میں یہاں
لکیریں کھینچتے کھینچتے
دائروں کی ابدیت میں نابود ہو چکا ہوں
اور وہاں، تمہارے جسم کے ساحل پر
وقت کا بہاؤ
آہستہ آہستہ شانت ہوتا ہوا
دم توڑ رہا ہے
قدموں کی رفتار تیز کرو!
کائناتی کلاک سے باہر
ایک دائمی لمحے کی پکار
تمام بازگشتوں پر غالب آ رہی ہے
ابدی ترتیب سے بھٹکا ہوا وجود
اپنے خلیوں اور سالموں میں چھپا ہوا سچ
تلاش کرتا ہے
کیا زندگی صرف اس لیے تھی
کہ ہم ایک بے مہلت رات کے انت پر
آنسوؤں کے چراغ روشن کرتے
اور شہاب ثاقب کی طرح جل بجھ کر
لامتناہی اندھیروں کے غبار میں گم ہو جاتے
؟
ایک بے تھاہ کھائی۔۔۔
اور سوالیہ ہک سے لٹکی ہوئی کائنات
نادیدہ پانیوں پر تیرتی ہوئی
بہت سی لاکلامی، بہت سا کلام
الاپ اور معدوم ہو جانے کی اذیت۔۔۔
دور۔۔۔ کسی لامکاں کے بے جہت کھودی
گوشے میں

کوئی اپنی غیر مرئی انگلیوں سے
پیانو کو چھیڑتا ہے
اور کہیں بہت قریب سے
ساکن اور بے آواز (آسمانی) گیت سنائی دے
رہا ہے
تالمودی راستوں کے اطراف میں
صلیبی پھول کھل رہے ہیں
لفظوں اور خوابوں کی کلوننگ (CLONING)
نہیں کی جاسکتی!
روشنی، اجازت طلب کرنے کا وقت
آپہنچا ہے
اتنی بڑی عمارت سے
رخصت کرتے وقت
کیا تم مجھے گیٹ تک چھوڑنے بھی نہیں
آؤگی؟

OO

# گیان پیٹھ اور علی سردار جعفری

## جاہ زعلم بے خبر علم زجاہ بے نیاز

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ آن سلامت رہتی ہے
اس جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

جی ہاں، شعر اور بھی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس جاں بازی، سرفروشی اور کجکلاہی کی عملی زندگی میں نظریں ہمارے آپ کے دور سے پہلے اتنی عام نہ تھیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دیو جانس کلبی کے بارے میں سنتے آئے ہیں۔ سکندر اعظم فاتح عالم ہو کے لوٹا اور اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ خواہش کی کہ دیو جانس کلبی جو چاہے اس سے مانگ لے، تو دیو جانس نے صرف اتنا کہا کہ ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ سقراط کے پاس ایک صاحب شاگرد ہونے گئے تو اس نے سر سے پیر تک انہیں دیکھا اور کہا۔ "کیا تمہارے اندر علم حاصل کرنے کی ہمت ہے۔" مراد یہ تھی کہ ہر سچا علم قربانی اور بے نیازی چاہتا ہے۔

جاہِ زعلم بے خبر علم زجاہ بے نیاز

جی ہاں، یہ وہی غالب جو عمر بھر درباری شاعر ہونے کا فرمان کرتے رہے۔ پنشن کی فکر میں ہر انگریز افسر کے قصیدے لکھتے رہے۔ جن پر غدر دہلی میں بہادر شاہ کا مسکہ کہنے کا الزام لگا تو انگریز بہادر کو اس کی صفائی دیتے رہے...... مگر جب دلی کالج کا پرنسپل پہلے دن کے بعد دوسرے دن ان کے استقبال کو نہ آیا تو کالج میں نوکری کرنے ہی سے انکار کر دیا۔

یہ سب تو تھا مگر ۱۹۳۶ء میں ترقی پسندوں نے جب اپنی کلاہ کج کی تھی تو اس کی شان ہی نرالی تھی اور یہ عزت نفس اور خودداری اور قلندری خود اپنی زبان کی خاطر نہیں تھی، اپنے فن اور اپنے ضمیر کی خاطر تھی۔ ریڈیو اسٹیشن ملک میں جگہ جگہ کھل گئے ہیں۔ مگر اکثر ترقی پسند ادیبوں کے لیے ان کے دروازے بند ہیں۔ ان کے رسالوں کی خریداری پر پابندی ہے۔ ان کے جلسوں میں سرکاری ملازموں کے شریک ہونے پر پابندی ہے۔ اور یہ کوئی دور غلامی کی

باتیں نہیں، یہ تو ہماری آپ کی قومی حکومت کے زمانے کے سچے واقعات ہیں۔ جب ہمارے آزاد ملک کے وزیر داخلہ ہوا کرتے تھے سردار پٹیل اور وزیر اعظم تھے جواہر لعل نہرو اور شاید وزیر اطلاعات تھے ڈاکٹر کیسکر۔

خیر، نام گنوانے سے کیا فائدہ؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ ادیبوں پر اس قسم کی سختیوں کے باوجود کم سے کم اردو ادیبوں کو حکومت زیر نہیں کر سکی اور یہی وجہ تھی کہ اردو شاعروں اور ادیبوں میں سے بہت سے غیور اور باہمت لکھنے والے جاں نثار اختر کی طرح اپنی سرکاری یا نیم سرکاری نوکریاں چھوڑ کر فلمی دنیا میں قسمت آزمانے چلے گئے ـــــ یہاں بھی عالم یہ رہا کہ اختر الایمان ہوں یا مجروح سلطان پوری، اپنی سنجیدہ شاعری اور اپنے فلمی کاروبار کی نثر و نظم کو الگ الگ رکھا اور بقول حسن نعیم ۔

گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

یعنی شہرت تو بہت پائی مگر اس کی گرد کا ایک ذرہ بھی اپنے دامن پر پڑنے نہ دیا۔ یہ کجکلاہی کی روایت ہے جس پر اردو شاعری کو فخر رہا ہے۔

ادھر اقتدار کے محلوں میں اس کلاہ افتخار کی خریداری کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ادھر عالم یہ تھا کہ سردار جعفری نے آزادی پر نظم لکھی مگر اس نظم کے چھپنے کا موقع آیا تو اس پر یہ نوٹ بھی شامل کر دیا کہ یہ محض ایک خواب ہے۔ پھر یہی سردار جعفری جب آزاد ہندوستان میں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے اور یہاں کے اہل اقتدار کی مصلحت کوشیاں دیکھیں تو نہرو کی ہجو کہی۔ جس کا ایک شعر مجھے مسخ شدہ حالت میں کچھ اس طرح یاد آتا ہے ۔

دختر دشمن ناموس کا لیجئے بوسہ
اور اس کو صلۂ خون شہیداں کہئے

(یا اس قسم کے الفاظ جو مجھے بجنسہ یاد نہیں)

اور یہ وہ سردار جعفری تھے جنہوں نے آزاد ہندوستان میں جیل کی سختیاں سہیں اور انقلاب کا پرچم بلند کیا۔ پھر مخدوم محی الدین تھے جو حیدر آباد کے محبوب شاعر بھی تھے اور اسی قدر محبوب انقلابی اور مجاہد بھی تھے۔ جو تلنگانہ تحریک میں سب سے آگے آگے تھے اور آزادی اور انقلاب کے گیت گا رہے تھے۔

اور ایک دن ایسا آیا کہ انہیں دونوں شاعروں نے خاموشی سے مزاحمت کا سارا ذخیرہ خبر دان میں رکھا اور وزیر اعظم نہرو کی شان میں نظمیں لکھنے اور خود انہیں کو سنانے لگے۔ یہ وہ

کام تھا جو ہوتا آیا تھا زمانے سے، مگر اردو شاعری کی اس نئی روایت نے اسے نہیں اپنایا تھا۔

مگر ابھی کیا تھا؟ ابھی تو بہت کچھ دیکھنا تھا ـــــ تلنگانہ تحریک کے خاتمے کے بعد سے اور عالمگیر امن کی تحریک کے پردے میں اور روس اور ہندوستان کی دوستی کی بنا پر اب سارے ترقی پسند ادیب کل کے دشمن نہرو کی تعریف میں قصیدے لکھنے لگے۔ جب کہ نہرو بھی وہی تھے اور ان کی پالیسی بھی وہی۔

پھر بھی ایک پہلو یہ تو تھا کہ اس میں ذاتی عنصر شامل نہ تھا...... مگر آخر یہ عنصر اب کتنی دور تھا۔ اسی دوران چین اور ہندوستان کی جنگ درپیش ہوئی اور یہ اس قدر تیزی سے سامنے آئی کہ بہت سے ادیبوں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی ہندوستان کی حمایت میں نظمیں اور افسانے لکھ ڈالے۔ پوری اطلاعات اس وقت تک سامنے بھی نہیں آئی تھیں۔ اردو ادیبوں کی وہ حمایت جو اس سے پہلے حکومت وقت کو پاکستان کے خلاف جنگوں میں بھی حاصل نہیں رہی تھی، وہ چین کے خلاف جنگ میں کم سے کم وقتی طور پر حاصل ہو گئی اور ادیبوں کو، خاص طور پر ترقی پسند ادیبوں کو ـــــ حکومت وقت کی حمایت کرنے اور اس کی پالیسی کی حمایت کرنے یا اس کی توصیف میں نظمیں اور افسانے لکھنے کا حوصلہ ہونے لگا۔

اب ارباب اقتدار کی منزل بہت قریب تھی۔ یہی موقعہ تھا مصلحت کوشی کو بے نقاب کرنے کا۔ یہی موقعہ تھا ارباب فکر کے کھوکھلے پن کو ننگا کر دینے کا۔

چنانچہ ان کے گرگے آگے بڑھے۔ یہ تو جانے دیجئے کہ حکومت کے ادارے اور ادبی انجمنیں سرگرم کار ہوں تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں مگر ملک کے تمام اہل ثروت اور کون اہل ثروت؟ جن میں سیمنٹ اور تیل اور دیگر ضروریات زندگی کے فروخت کرنے اور ان کے بل پر دولت اور ثروت ہی نہیں، ملک کے ارباب اقتدار کو خریدنے کے الزامات بھی ہیں۔ آخر کار آگے بڑھے اور ساہتیہ اکادمی اور دیگر ادبی اداروں کے انعامات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ادیبوں اور فن کاروں کو انعامات دینے لگے۔ سوال صرف یہ تھا کہ بکنے کو کوئی اہل ہنر تیار ہے یا نہیں۔

کچھ آج سے نہیں، کئی دہے پہلے سے یہ منصوبہ بنا ہوا ہے کہ ایسے تمام بے ضرر ادیبوں کو انعامات سے نوازا جائے جن کے ہاں مدافعت کی یا کارکردگی کی کوئی رمق پائی جائے۔ اردو ادیب بھی اس صف میں شامل سمجھے گئے ـــــ گو ساحر لدھیانوی اور مخدوم محی الدین دونوں نے اس موضوع پر دو اچھی نظمیں لکھیں کہ اردو پر جب یہ ستم روا رکھا گیا ہے کہ اس کی تعلیم پر قدغن لگا دی گئی ہے تو پھر اس کے لکھنے والوں پر لطف و کرم کے کیا معنی ہیں؟ مگر اقتدار تو ان باثر آوازوں سے ڈرتا ہے جو عوام میں مقبولیت رکھتی ہیں۔ خواہ وہ مشاعروں میں ابھریں یا

الفاظ کی شکل میں کاغذ پر چھپیں۔

افسوس صد افسوس۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے وہ مجاہد شعراء اور ادیب بھی صف باندھے انعام واکرام کے انتظار میں کھڑے ہوگئے۔ سب کا حال تو معلوم نہیں مگر پہلے وہی گرے جن پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا بقول فیض ؎

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے

ان ایوارڈوں اور انعامات کے دینے والے اب تو بہت ہیں مگر سرسوتی ایوارڈ اور گیان پیٹھ ایوارڈ قابل ذکر ہیں ـــــ سرسوتی ایوارڈ کا کچھ حال معلوم نہیں ـــــ گیان پیٹھ ایوارڈ جب دیا جاتا تھا کہ پہلے چراغ جلایا جاتا ہے پھر سرسوتی کی پوجا ہوتی ہے اور شنکھ بجایا جاتا ہے۔ گویا ساری فضا روایتی اور نیم مذہبی عقیدت مندانہ ہوتی ہے جو سرکش ادیبوں کو راس نہیں آنی چاہیے۔ مگر کیا کیا جائے کہ اسی فضا میں اردو کے ایک نہیں دو نہیں تین خوددار ادیبوں نے اس انعام کو قبول کیا ہے۔ پہلے قرۃ العین حیدر نے پھر فراق نے اور پھر سردار جعفری نے۔

قرۃ العین حیدر کا مسلک کبھی واضح نہیں رہا۔ کم سے کم اپنے ناولوں میں۔ خصوصاً آخری شب کے ہم سفر میں۔ وہ انقلابیوں کا مذاق ہی اڑاتی آئی ہیں ـــــ گو ترقی پسند ہمیشہ انہیں اپنی صفوں میں شامل کرتے آئے ہیں ـــــ مگر ان کے شدت سے 'مسلمان' ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ رہے فراق صاحب تو وہ تھے تو ہندو مگر تھے روشن خیال اور ترقی پسند۔ گو انعامات قبول کرتے وقت وہ اپنی معتقدات اور اپنے ترقی پسند نظریات تک تو نہ بھول جاتے تھے۔ یہ تو ہوا، مگر سردار جعفری۔!! وہ تو ہمارے مجاہد شاعر تھے جو عملی اور ذہنی (اور جذباتی) سبھی طور سے اس عظیم جدوجہد میں شریک تھے جو اس زمانے میں سبھی لکھنے پڑھنے اور سوچنے سمجھنے والوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی...... اور جو پتھر کی دیوار جیسی نظموں کے خالق تھے۔ ان نظموں میں شعریت ہو یا نہ ہو مگر ملک اور قوم کے لیے جان قربان کر دینے کا جذبہ اور اعلیٰ اقدار کے لیے زندہ رہنے کا ولولہ ضرور تھا۔ اب اگر سردار جعفری جیسے مجاہد تھک جائیں تو پھر کیا ہوگا اس ملک میں آئیڈیل ازم کا؟ کیا مستقبل کے خواب دیکھنے والوں پر گزرے گی ـــــ کیفی کا شعر ہے۔

میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

اس دوران بہت کچھ ہوا۔ ایک تو وہ ٹوٹ پھوٹ تھی جو آزادی اور سب کے لیے خوشحالی اور عزت کی زندگی کا خواب دیکھنے والوں کے آدرشوں میں ہوئی۔ انہوں نے خود کو اپنی قیادت کے بجائے نہرو کی قیادت میں پایا اور کچھ دیر کے لیے ہی یا یوں کہیے ایک دور کے

لیے ہی سہی یہ باور کر لیا کہ نہرو کا مقابلہ پٹیل کی رجعت پسندی سے ہے اور اس میں نہرو کی حمایت کرنا ان پر فرض ہے ـــــ اسی فریضے کا یہ پہلو بھی سامنے آیا کہ نہرو کی خارجہ پالیسی کی بھرپور حمایت اور خاص طور پر پاکستان کی مخالفت میں ان کے ہاتھ مضبوط کرنا اور سردار پٹیل اور ان کے قبیل کے لوگوں کے مقابلے میں نہرو کی حمایت ہی ان کا فریضہ ہے اور یہی سچا سوشلزم ہے اور یہی ان کے فن کا تقاضہ بھی ہے۔ پھر یہ سلسلہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ نہرو کی حمایت اور پٹیل کی مخالفت کا سلسلہ آگے بڑھ کر اندرا گاندھی کی حمایت اور مرارجی ڈیسائی کی مخالفت تک جا پہنچا۔

یہی سلسلہ ایمرجنسی تک پہنچا اندرا گاندھی کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ آیا تو ہمارے تقریباً سبھی ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے اندرا جی کا ساتھ دیا اور ان کے فاشزم کے اقدامات کو جمہوری قرار دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی اور پھر جب پاکستان سے لڑائی ہوئی تو اس لڑائی کے دوران ہر روز ایک نئی نظم لکھ کر 'پیراہنِ شرر' کے نام سے اندرا گاندھی کے حضور میں پیش کرنے میں بھی سردار جعفری جیسے 'انقلابی' شاعر نے تامل نہیں کیا۔

اس وقت تک اہلِ اقتدار کی سازش کامیاب ہو چکی تھی ـــــ شاعروں، ادیبوں اور اہلِ دانش کے حلقوں میں بکری کا رجحان اور انعام کی طلب بڑھتی جا رہی تھی اور جمہوری تحریکوں اور انقلابی تصورات سے ان کا رشتہ کٹتا جا رہا تھا ـــــ ایمرجنسی کے دور میں اس اطاعت کو ایک فکری بنیاد بھی مل گئی تھی۔ اس کے بعد کے دور میں یہ بھی ہوا کہ علی صدیقی نے اردو تقریبات کا وہ سلسلہ شروع کیا اور اس پر اتنا خرچ کیا کہ نظریں خیرہ ہو گئیں اور آخر ایک دن یوں بھی ہوا کہ علی صدیقی صاحب اردو کے مشاعروں کا قافلہ لے کر راجیو گاندھی کی سالگرہ پر مبارک باد دینے کے لیے بھی پہنچ گئے۔ اس قافلے میں کیسے کیسے بانکے اور غیور فن کار شامل تھے جن کی پاپوش میں لگی تھی کرن آفتاب کی...... کیفی اعظمی، اختر الایمان، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، اتفاق سے ان دنوں علیل تھے لہٰذا شریک نہ ہوئے۔ اس تہنیتی وفد پر اسی قلم سے ایک طنزیہ نظم بھی ہو گئی تھی جو "ابلیس کی تیسری مجلسِ شوریٰ" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اسی کا تسلسل ہے جواب جوش، مجاز اور فیض کے بعد کے دور کے سب سے اہم 'انقلابی' شاعر کے گیان پیٹھ ایوارڈ اٹل بہاری واجپئی کے ہاتھوں قبول کرنے پر مکمل ہوا۔

جی ہاں۔ یہ تذلیل بھی ہماری قسمت میں لکھی تھی کہ زمانے کا الٹ پھیر اقتدار کا مکٹ کانگریس اور اس کے حکمراں خاندان کی 'ذریات' سے چھین کر سر پر رکھا بھی تو کس کے؟ بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی فرقہ پرست جماعت کے سربراہ کے سر پر۔ اور پھر ہماری زبان

کاایک برگزیدہ شاعران کے ہاتھوں سے یہ ایوارڈاور "اعزاز" پائے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ایوارڈ خواہ کوئی ہو۔ قومی ہو یا انقلابی۔ یقیناً سردار جعفری، فراق، قرۃ العین حیدر اور تو اور شمس الرحمٰن فاروقی میں سے اکثر سے زیادہ کے مستحق ہیں اور اس کی مبارک باد انہیں خط کے ذریعہ بھی پیش کرتا ہوں اور اب بھی پیش کرتا ہوں مگر افسوس یہ ہے کہ انہوں نے کس سے یہ ایوارڈ لیا اور کس کے ہاتھوں اور کس سرمایہ دارانہ نجی ادارے نے دیا۔

جی ہاں، مجھے اعتراف ہے کہ اس سے پہلے سردار جعفری کو جو دو ایوارڈ اسی قبیل کے اداروں سے مگر بہتر شخصیتوں کے ہاتھوں ملے تھے ان پر میں نے انہیں مبارکباد دی تھی۔ مبارک باد اس بار بھی دی۔ گو اس حادثے سے قبل دی یعنی اٹل بہاری باجپئی جی کے ہاتھوں انعام قبول کرنے سے پہلے دی مگر تقریباً ہر بار اس شعر کے ساتھ دی:

ترے جوہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

اور سردار جعفری تو محض شاعر نہیں، سخن فہم بھی ہیں۔ وہ اس اشارے کو بھی ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ یہاں ذکر ان لوگوں کے اپنے کو بختاور سمجھنے کا ہے جنہوں نے اپنے انعام و اکرام کے جال میں ہمارے شاعر کو گھسیٹ لیا ہے۔

خیریت گزری کہ شاہیں زیر دام آ ہی گیا

ایک بار تو سردار نے اپنے دفاع میں مجھ سے کہا بھی تھا کہ میں نے یہ ایوارڈ لینے سے پہلے ڈانگے سے پوچھا تھا (ڈانگے اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ تھے) ـــــ اور ان کی رضامندی حاصل کر کے ہی یہ ایوارڈ لیا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہو تو بھی ڈانگے کا جو انجام ہوا اور ان کے ارباب اقتدار کے ایجنٹ ہونے پر سے جو پردہ اٹھا ہے، وہ بھی ڈانگے ہی کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی نہیں ہے ـــــ ان کے مشوروں اور فرسودات کا بھی بھانڈا پھوڑ دینے کے لیے کافی ہے...... وزیرے چنیں شہریارے چناں۔

اس بار یہی ہوا ـــــ مبارک باد میں نے سردار جعفری کے فن کو دی، مگر اس حادثے کو کیسے برداشت کریں کہ بقول انہیں کے محبوب شاعر اقبال کی تضمین کردہ غنی کاشمیری کی غزل کے شعر کے مطابق۔

کہ نور دیدۂ وش روشن کند چشم زلیخا را

مگر کسے معلوم تھا کہ انعام و اکرام ہمارے شاعر کو ملے گا بھی تو باجپئی کے ہاتھوں!

یہ شکوہ دوسرے اردو کا انعام پانے والوں سے کہیں زیادہ سردار جعفری سے ہے۔ کیونکہ وہ ان سب سے زیادہ انقلابی بھی رہے ہیں اور ہوشمند بھی اور ارباب اقتدار ہی کے نہیں انتہائی رجعت پسند عناصر کی سازشوں اور دیدہ دلیریوں سے واقف بھی۔

دراز دستئ ایں کوتہ آستیناں بیں

کیسا المیہ ہے کہ بقول جعفر علی خاں اثر ہمیں ایک شاعر ملا تھا جسے بھیڑیے اٹھالے گئے۔

جب وہ شاعر نہیں تھا محض نعرہ باز تھا تو وہ ہمارا تھا اور ہم اس کے تھے ـــــ پھر وہ شاعر ہوا تو ارباب اقتدار والے ہمارے غنیموں کے ہاتھ آگیا اور ان کی مصلحت میں ایسا اسیر ہوا کہ انہیں کے گیت اپنے دل نواز لے میں گانے لگا۔ پھر جب اس کی فن میں کچھ پختگی اور شاعری میں کچھ نغمگی اور کیفیت آئی تو وہ کنول کا شیدائی ہوا اور تعصب اور تنگ نظری کے علمبرداروں کے ہاتھوں سے انعام و اکرام قبول کرنے لگا...... اور اقتدار کے ہاتھوں فروخت ہو گیا!! اور ایسی حالت میں جب اس کی زبان اور کلچر پر پہلے ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بدیسی کہہ کر برا بھلا کہا جاتا رہا، اس نے گردن جھکا کر اپنے قاتلوں کے دست جواہر نگار سے انعام و اکرام قبول کر لیا اور اس کے لکھے ہوئے سارے انقلابی گیت اس کے جلو میں درد و کرب سے چیختے اور تڑپتے رہے مگر ان کی فریاد کون سنتا؟

ایسا نہیں ہے کہ سردار جعفری کا میں سرے سے قائل ہی نہیں رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان کی عام طور پر مقبول نظموں کا مداح نہیں ہوں، لیکن ان کی شاعری نے 'ایک خواب اور' کے بعد جو کروٹ بدلی (گو ان سے ان کا کمٹ منٹ کا غلو کمزور پڑا اور وہ تقریباً شاعرانہ "ناوابستگی" کی دنیا میں آگئے) وہ کروٹ انہیں یقیناً شاعری سے قریب لے آئی اور اس کے بعد اس شاعرانہ کیفیات میں برگ و بار آئے۔ میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی ہیجانی نظموں میں بھی سردار جعفری نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ آزاد نظم کو ظلمت پسندی، ذاتیاتی علامت نگاری اور مریضانہ داخلیت سے نکال کر اسے بوقلموں ذریعہ اظہار بنایا اور اس میں سماجی معنویت پیدا کی۔ یہ اور بات ہے کہ اسے انہوں نے خطاب میں غرق کر دیا۔ دوسرے یہ خدمت بھی کم نہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے شعری ہی نہیں ذہنی افق کو وسیع تر کیا۔ گو اس میں اکثر شعریت مجروح بلکہ نابود ہو گئی مگر نظم کو خصوصاً آزاد نظم کو نئی وسعت ملی۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ اس دور میں جوش اور کسی قدر احتیاط کے ساتھ اقبال کے مقلد تھے، مگر شاعری میں شعریت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی، فکر ان کے سمائے شاعری میں نہیں سماتی تھی اور شاعری کی حد بندیاں توڑ کر نکل جاتی تھی۔ پھر جب مارکسیت سے انہوں نے رشتہ توڑا تو اس میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں یا اس سے کچھ بعد میں

فیض کی شاعری کو قبول عام ملا۔ یہ وہی فیض تھے جن کی نظم کے لہجے پر یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، کے حوالے سے سردار نے یہ اعتراض جڑ دیا تھا کہ آزادی پر یہی مصرعہ تو کوئی رجعت پسند بھی کہہ سکتا ہے۔ شاعری میں تو میم کی جگہ تخصیص کی ضرورت ہے۔ (لطف یہ ہے کہ سردار جعفری نے اس زمانے میں جس رجعت پسند پارٹی کا نام لیا تھا اسی فکر کے سربراہ اٹل بہاری باجپئی کے ہاتھوں گیان پیٹھ کا ایوارڈ وصول کر کے خوش ہوئے۔ انعام بھی گیان پیٹھ کا اور اسے دینے والا بھی اسی نظام فکر کا۔) اس کے بعد کا سفر سردار کے لیے فیض کی تقریباً تقلید کا سفر ہے۔ کہیں کہیں پبلو نرودا کی نظموں کے ترجمے اور منظوم اور مؤثر ترجمے (مثلاً میر اسفر) یا اخذ د ترجمہ کا کام بھی ہوتا رہا۔

انعام واکرام کے اس سفر میں تکلیف دہ بات صرف اتنی ہے کہ یہ ایک ایسے فرد کا سفر تھا جسے ہم نے اپنی کم فہمی سے اب تک مجاہد سمجھا تھا۔ حد یہ ہوئی کہ شکریے کی تقریر میں کنول کا ذکر تو بار بار آیا۔ (یہ وہی سردار ہیں جو بقول ان کے جواہر لعل نہرو اور اندرا گاندھی کی طرح نومبر کے مہینے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس پر نظم بھی لکھ چکے ہیں) اور کنول کس طرح تاج محل کے گنبد تک پہنچا ہے، نہیں آیا تو ذکر اردو زبان کا نہیں آیا (بلکہ دروغ بر گردن راوی، قومی آواز کے دہلی ایڈیشن میں یہ بیان بھی سردار جعفری کے حوالے سے چھپا کہ ان کے نزدیک اب ہندوستان میں اردو کی صورت حال بہتر ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ درست ہے کہ سردار اردو زبان کے بارے میں بیانات بدلتے رہتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں انڈین لٹریچر کے ایک انگریزی مضمون میں انہوں نے اردو کو رسم خط بدلنے کا مشورہ دیا تھا۔ گو اس کی دشواریوں پر بحث کی تھی۔ پھر اس کے دو گرداں ہوئے اور اردو کو اسی کے رسم خط کے ساتھ زندہ رکھنے کے حامی ہوئے۔ مگر اب گیان پیٹھ ایوارڈ ملنے پر تو دو آنسو انہیں ضرور اردو کے حال زار پر بہانے چاہئیں۔

کر کر شراب خوری جرعہ خشاں بر خاک

مگر کیا کیا جائے؟ ہمارے عمائد اور اکابر بک گئے۔ آبرو مند بے آبرو ہوگئے۔ مجاہدوں کی تلواریں ٹوٹ گئیں۔ زبانیں گنگ ہو گئیں یا صرف مدح خوانی کے لیے وقف ہو کر رہ گئیں۔ بقول خورشید الاسلام۔

ویرانیوں نے بڑھ کر گلے سے لگا لیا
لے کر دلوں میں کیسے خزانے چلے تھے ہم

○○

# بیان: ایسا کاری زخم، جس سے رہ رہ کر خون ابلتا ہے

## (ایک خط ذوقی کے نام)

ذوقی:
کیسے لکھ پائے تم
اتنا دل دوز المیہ
بغیر خون کے آنسوؤں کے
ــــــ ڈاکٹر محمد حسن

سچ یہ ہے کہ ذوقی، تم نے ایک عظیم ناول لکھا ہے۔ بیان: اور خون جگر سے لکھا ہے: ہر لفظ کثرت استعمال سے گونگا ہو جاتا ہے۔ میرے لفظوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اس ڈھڑکتے ہوئے ناول کی کیفیات کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ صرف آنکھ میں تیرتے آنسو ہی اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اقبال نے داغ پر نظم لکھی تھی جس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح سعدی۔ بغداد کی تباہی پر اور ابن بدروں قرطبہ کی بربادی پر فریادی ہوئے تھے؛ اسی طرح جہان آباد کی تہذیب کا ماتم داغ کے نصیب میں تھے۔ تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ تباہی پر بہت کچھ لکھا گیا مگر ۶ دسمبر کی تباہی اس سے مختلف بھی تھی۔ اور اس سے کہیں زیادہ بھیانک بھی کہ اس نے ہمیشہ کے لیے بال مکند شر ماجوش جیسے انسان نما فرشتوں کا آخری کتبہ لکھ دیا اور یہ صرف انہی کا بیان نہیں ہے بلکہ اس پوری نسل کا تمہ ہے۔ جسے بقول شاعر۔ "پایا تھا آسماں نے جسے خاک چھان کر" کیسی عظیم تہذیب جس کی تعمیر میں صدیوں تک ہندو مسلمان سب شریک رہے اور اس کا کیسا عبرت ناک انجام ...... جس پر جان دینے کے لیے اکیلے بالمکند شر ماجوش قتل ہونے کے لیے منا اور اس المیہ کو رقم کرنے والے تم ......

اس زندہ المیہ کو ناول کی حیثیت سے دیکھنا یا اس پر کچھ لکھنا بھی ستم ہے ...... یوں بھی ابھی ہم اس سے پوری طرح گزرے کہاں ہیں، گزر رہے ہیں۔ بقول فیض

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوے قاتل ٹھہر جائے

تمدن کی ہر ادا تہذیب کی ہر روش اس قتل عام کی زد میں ہے۔ محسوس سب کرتے ہیں لیکن لفظ سب کو نہیں ملتے کہ درد و داغ و جستجو و آرزو کا یہ کارواں اور اس کا یہ سر بازار قتل برداشت ہو بھی جائے تو بیان نہیں ہوتا ............ (پھر کیا تعجب ہے کہ بال مکند شر ماجوش کو بھی آخری بیان کے لیے لفظ نہ ملے ہوں) تم نے بڑی ہنر مندی سے اس آخری بیان کو سر بہ مہر ہی رکھا ہے ........ مگر اب اس کی امید بھی فضول ہے کہ کوئی آبلہ پا ہمارے بعد بھی ان منزلوں میں بھٹکنے کے لیے کبھی آئے گا۔

تمہارے اس ناول کو ناول کی طرح پڑھنے اور پرکھنے کے لیے ابھی کچھ اور وقت اور کچھ اور فاصلہ درکار ہے۔ ابھی تو ایک ایسا کاری زخم ہے جس سے رہ رہ کر خون ابلتا ہے، اسے میں احتجاج نہیں کہوں گا۔ اسے میں دور حاضر کی گواہی بھی نہیں کہوں گا۔ یہ ناول ان اصطلاحوں سے کہیں بڑا ہے اور ان دو متوازی واقعات کے سلسلے پر قائم ہے جو منا کے قتل اور بال مکند شر ماجوش کی موت سے عبارت ہے ........... بلکہ یوں کہوں ان دونوں کے ساتھ ایک عظیم تہذیب کے قتل سے عبارت ہے۔ تم نے اسے بڑے اہتمام اور احتیاط سے بیان کردیا ہے۔ کیسے لکھ پائے تم ایسا دلدوز المیہ بغیر خون کے آنسوؤں کے ........... ! تعجب ہے! یہی غیر حاضر بلکہ شاید غیر موجود 'بیان' ہی سب سے بڑی فرد جرم ہے، جو ایک عظیم تہذیب کے قاتلوں پر عائد ہوتی ہے ........... مگر سوال یہ ہے کہ سزا وہ دے جس کے ہاتھ خون سے پاک ہوں اور پہلا پتھر وہ مارے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہو۔ بے گناہ اب بھی بہت ہیں مگر وہ صرف قتل ہونے کے منتظر ہیں ........... ایک تمہارے ہاتھ میں قلم ہے اس کی عزت کرو جو ایسے درد مند لمحوں کی کہانی اس قدر دلدوزی اور دلدوز انداز میں لکھ سکے۔ یہ بال مکند شر ماجوش ایک پوری تہذیب کا نام ہے جو غروب تو ہوتی ہے، مکمل طور پر کبھی مٹتی نہیں کہ انہیں سے تو انسانیت کی رمق زندہ رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ظالموں کے تذکرے اور ۶ دسمبر کی یادیں۔

اس ناول کا محاکمہ دیر طلب ہے جب تک وقت ان زخموں کو بھر نہیں دیتا یہ کام شاید ممکن نہ ہوگا۔

OO

## عبدالسلام عاصمؔ



# ایٹمی تجربات: سہمے سہمے سے ہیں جذبات

(دل ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر نہیں جڑتا، ایٹمی تجربات نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔
سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ یعنی تعلقات بہتر نہیں تھے تو بدتر بھی نہیں تھے مگر اچانک پچاس برس قبل کا زہر اپنی نفرت کی انتہا کے ساتھ سامنے آ گیا۔۔۔ کیا سچ مچ یہ دونوں ملک تعلقات کی بہتری کا ناٹک کر رہے تھے۔ مگر سیاست کے درپردہ دونوں ملکوں کے عوام کا وہ بہیمانہ رقص بھی مت بھولئے جو ان ایٹمی تجربات کے جشن کے طور پر کیا گیا تھا۔ اُف، آپس میں کس قدر تلخی، نفرت اور زہر بھرا ہوا تھا۔ دراصل تقسیم کی آندھی سے نکلے سوالات قائم تھے۔ یہ سوالات پیڑھی در پیڑھی نفرت بن کر ایک سانس میں دوسرے سانس پر منتقل ہو رہے تھے۔ کشمیر تو محض بہانہ ثابت ہو رہا تھا۔ ہم اب تک اس غلط فہمی میں تھے کہ شاید یہ سیاست کا گھناؤنا کھیل ہے جس نے دونوں ملکوں کے درمیان اَنا کی ایک دیوار حائل کر دی تھی۔ مگر مسئلہ صرف اَنا کا نہیں تھا۔ مسئلہ کشمیر کا نہیں تھا۔ مسئلہ کا بیج، جنون کی بارود آہستہ آہستہ برسوں سے سلگتے رہے تھے اور یہ بارود اور بیج لاشعوری طور پر ہی سہی، دونوں ملکوں کے عوام کے اندر بھی پرورش پا رہے تھے۔ ٹی وی پر، اخباروں میں ہم نے دونوں ملکوں کے عوام کا یہ تانڈو دیکھا ہے۔ نفرت کے اس جشن کو یہ آنکھیں ابھی بھولیں گی نہیں۔ مگر ہم، جو کبھی ادب کے سہارے، کبھی امن کی تلاش میں ان دلوں کو جوڑنے کا ناٹک کر رہے تھے، ہمارا کیا ہوگا۔؟ قصے کا یہ احتجاج آج کی اس گندی سیاست کے نام بھی ہے، ایٹمی تجربات کے خلاف بھی، جس نے ہمارے اندیشے پر سچ کی مہر لگا دی ہے۔ کیا سچ میں یہ دل اب کبھی نہیں جڑ پائیں گے۔؟ اس سے بھی بڑا سوال ہے۔ اس ناٹک کا انجام کیا ہوگا۔؟ کیا پچاس برسوں کے زہر کو مل بیٹھ کر، دھونے کا کام اب مستقبل میں کبھی بھی ممکن نہیں ہو پائے گا۔؟

**ادارہ**

ہندوستان اور پاکستان کے ایٹمی تجربات کے تعلق سے عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ ہندوستانی دھما کے جہاں غیر متوقع تھے وہیں پاکستان سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس معاملے میں ہند کی ہمسری کرنے سے باز رہے گا۔ لیکن قوموں، حکومتوں اور سیاسی

و معاشرتی انقلابات کی تاریخ کی روشنی میں ان دھماکوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ دونوں ہی دھماکے غیر متوقع نہیں تھے۔

آج ہم جس نسل کی نمائندگی کر رہے ہیں اس نے اب تک فسطائیت کو تاریخ کے حوالے سے جانا تھا اور پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے کرداروں میں اسے دیکھا تھا، مگر ۲۱ ویں صدی کے موڑ پر آج ہم خود کو بھی ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کے درمیان پا رہے ہیں جنہوں نے فسطائیت کی داستانیں نہیں پڑھیں بلکہ اسے جھیلا تھا۔

ہماری متحدہ قومی سیاست آزادی سے پہلے جہاں ہندوستان کی ناگزیر تقسیم کا سبب بنی وہیں ہندوستان کی آزادی اور قیام پاکستان کے بعد کے ماحول میں بھی ہم سیاست میں جذبات کی تجارت ہی کرتے رہے۔ اس سیاست کا منفی رخ آئینے کی طرح ہمیشہ ہمارے سامنے رہا مگر سیاسی نگار خانے میں ہمیں اس آئینے کے سوا ہر وہ چیز عزیز رہی جو قومی، تہذیبی اور معاشرتی طور پر ہمیں ایک غیر صحت مند مسابقت کی دوڑ میں شامل ہونے کی ترغیب دیتی رہی۔ یہ دوڑ چونکہ بے سمت تھی اس لیے انجام کی پروا کیے بغیر از بس حرکت کو ہی زندگی مان کر ہم دوڑتے رہے اور آج تکان کی وجہ سے جس موڑ پر ہمیں رکنا پڑا ہے وہاں سے آگے کا راستہ بدترین تباہی و بربادی کی ایک عمیق کھائی سے گزرتا نظر آرہا ہے اور اس پر مصیبت یہ کہ دونوں طرف کمان عقل کی جگہ جنون کے ہاتھوں میں ہے۔

ہندوپاک کی پچاس سالہ تاریخ کے اس سفر میں فسطائیت کا یہ موڑ کیسے سامنے آیا اور تاریخ کے گم شدہ کرداروں کو دوبارہ زندگی کیسے مل گئی، ان تمام سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں کسی محقق یا لائبریری سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف چہروں کو پہنچاننے کی ہے اور یہ سمجھنے کی ہے کہ محبت، اخوت، رواداری اور بہتر ہمسائیگی کی قدیم تہذیبوں کے قصیدہ گو جو آج حالات پر مرثیہ خواں ہیں، کہیں وہ "خود کردہ را علاج نیست" کے زمرے میں تو نہیں آتے اور اگر آتے ہیں تو پھر انہیں ہرگز یہ رونا دھونا زیب نہیں دیتا۔ وہ اس تباہی اور بربادی کی عمیق کھائی میں گر کر مٹ جانے کے مستحق ہیں۔ انہیں تاریخ پورے اہتمام کے ساتھ ان کرداروں کے شجرے میں شامل کر لے گی جس میں ابھی تک برصغیر کی نمائندگی نہیں ہو پائی تھی۔

آزادی سے پہلے کی غلامی اور آزادی کے بعد موجودہ اندیشۂ تباہی دونوں کے ذمہ دار وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہمہ جہت اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی فروغ کو ہمیشہ ان مٹھی بھر لوگوں کے لیے خطرہ تصور کیا جو سماجی انصاف اور مساوات کی بھیڑ میں گم ہونے کو اپنی

نام نہاد انجمن صفت ذات کے لیے ہتک سمجھتے رہے۔ اس انداز فکر نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ایک ایسے جاگیردارانہ نظام کو مختلف شکلوں میں زندہ رکھا جس میں محض پندار وذات کے احترام کے لیے ہمیشہ بڑی بڑی حماقتوں کو تجربات کے نام دیئے گئے۔ ہندوپاک کے حالیہ ایٹمی تجربات بھی ایسی ہی حماقتوں کے زمرے میں آتے ہیں اور فسطائیت کے عروج و زوال کی تاریخ شاہد ہے کہ جب جب فرزانوں نے دیوانگی کی حد پار کی ہے قوموں کو زبردست تباہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسی فرزانگی کے سبب آج صورتحال یہ ہے کہ ہندوستان کے ایٹمی تجربے کو جہاں اس کے مبینہ توسیع پسندانہ عزائم کی روشنی میں دیکھا جارہا ہے وہیں پاکستان کے ایٹمی دھماکے کو چین کے ساتھ اس کے نیوکلیائی گٹھ جوڑ کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بعض تجربہ کار تو اس سے بھی آگے نکل کر یہ فرمانے لگے ہیں کہ ان دونوں دھماکوں میں امریکہ اور مغربی سرمایہ داروں کا دخل ہے جو جنوبی ایشیا میں تباہی مچاکر اپنی تجارت کی ایک اور منڈی کھولنا چاہتے ہیں۔ یہ حالت ہے ہماری سیاسی اور تہذیبی بصیرت کی جو اس حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے کہ برسر موقع جائزہ لینے اور رائے قائم کر لینے کو ہی تمام عوامل و غوایت کو سمجھ لینے کے لیے کافی سمجھا جارہا ہے جبکہ اس منظر کے پیچھے جھانکنے سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ صورتحال کی اس تبدیلی کے اصل محرک وہ عناصر ہیں جو فسطائیت کے بغیر اپنے وجود کو منوانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو عرصہ غلامی میں بھی غلامی کے خلاف اپنی قوم کا استحصال کرنے میں آزاد تھے اور آزادی کے بعد بھی اپنے پیروں کو تمام اخلاقی و معاشرتی پابندیوں کی زنجیروں سے آزاد رکھے ہوئے ہیں۔

تقریباً ایک ارب آبادی والے ملک ہندوستان اور چودہ پندرہ کروڑ کی آبادی والے پاکستان میں آج بھی ایک بڑی اکثریت زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ آج بھی ان ملکوں میں قدرتی آفات، بیماریوں اور فسادات کے ساتھ بھوک بھی موت کا ایک سبب بنی ہوئی ہے۔ مذاہب انسانیت کی جگہ عوام رواداری کی علامت بن کر رہ گئے ہیں اور طبقاتی تقسیم کے اسباب میں اب ذات پات، معشیت اور تعلیم کے ساتھ کنزیومر کلچر بھی شامل ہو گیا ہے۔ جن ملکوں کی سرحدوں کے اندر حالات اس شرمناک حد تک خراب ہوں وہ ممالک قومی سلامتی کے نام پر ایٹمی طاقت حاصل کر کے آخر اپنی کن خوبیوں کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں قوم کے داغدار بدن کو ہی چھپانا مقصود ہے تو وہ اپنے میزائلوں اور ایٹمی ہتھیاروں کا رخ ان سیارچوں کی طرف کیوں نہیں موڑ دیتے جو دن رات ہماری عریانی اور بے سروسامانی کی تصویریں لیتے پھرتے ہیں مگر نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو اس کے

تاجر ہیں۔ تاجر اگر اپنے سامان کی کشش پر نظر کا پہرہ بٹھادے تو کمائے گا کیا اور کھائے گا کیا۔

ایٹمی دھماکوں پر امریکہ اور اس کے حلیفوں کی طرف سے طرح طرح کی پابندیوں کی دھمکیوں پر ہندوپاک کے رہنماؤں نے اپنی اپنی قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے جو بیانات جاری کیے ہیں وہ ان کے انتخابی وعدوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ جس طرح دونوں ملکوں میں قائم ہونے والی ہر نئی حکومت تمام پریشانیوں کے لیے سابقہ حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے اسی طرح اقتصادی پابندیوں سے پیدا ہونے والے بحران کے لیے بھی وہ اپنے عمل کے بجائے رد عمل کو ہی مورد الزام ٹھہرائیں گے۔

سودیشی تحریک چلا کر یا پوری قوم کو گھاس کھلا کر اگر ہندوستان اور پاکستان کے موجودہ جنونی قائدین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جنگ جیت لیں گے تو وہ احمقوں کی جنت میں ہیں۔ جارحانہ قوم پرستی کے ابال سے جب جرمنی فائدہ نہیں اٹھا سکا تو کمزور معشیت، اقتصادی بحران اور سیاسی عدم استحکام سے دوچار ہندوستان اور پاکستان اپنی قوموں کے لیے آسائش حاصل کرلیں گے؟

البتہ ان دھماکوں کے حقیقی اثرات اسلحے کی دوڑ کی شکل میں مرتب ہوں گے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ سعودی عرب اور ایران سمیت کئی ممالک شامل ہو سکتے ہیں۔ بظاہر ہندوستانی بم کے مقابلے میں پاکستانی بم پر ناز کرنے والے ملکوں کی تعداد کسی خاص سبب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ تو کیا دنیا ایک بار پھر کئی بلاکوں میں تقسیم ہونے جارہی ہے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو کیا یہ تیسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا؟

ان سوالوں پر غور کرنا آج کی اہم ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے جنونی حکمرانوں کو بھیانک جنگی جرائم کے ارتکاب سے روک سکیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہندوپاک کے عوام اپنی اپنی حکومتوں کی موجودہ روش کے خلاف سراپا احتجاج بن جائیں اور حالیہ دھماکوں کے اقتصادی اور معاشرتی عواقب کو سامنے رکھ کر اپنی حکومتوں کو خبردار کریں کہ محض انا کی جنگ کے لیے انہیں پوری قوم کے جان و مال کو داؤ پر لگانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور کم از کم ہندوپاک تو ایسی کسی جنگ کے متحمل ہی نہیں جس میں فاتح جشن فتح بھی نہ منا سکے۔

ہندوپاک کی نام نہاد ایٹمی طاقت سے وہ مسائل حل نہیں ہوں گے جن کے لیے ایک زبردست معاشرتی انقلاب کی ضرورت ہے اور ایک ایسے معاشرتی انقلاب کے بعد ہی ہندوستان اور پاکستان بھی امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی طرح زندگی کے راستے پر ایک دوسرے سے بے خوف اور تمام تر خوشحالیوں کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ○○

# ہمارے مورخین اور مسخ شدہ تاریخ

تاریخ مشترکہ انسانی وراثت کا ایک اہم حصہ ہے۔ تاریخ کے بدلتے ہوئے دھاروں کو اپنے اندر جذب کر کے قومیں اپنے عروج کے قصے رقم کرتی ہیں لیکن آج ہندوستان میں تاریخ خود غرض سیاستدانوں کے جبر سے کراہ رہی ہے۔ تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر معصوم عوام کے سامنے پیش کرنے کی مذموم کوشش زور پکڑتی جارہی ہے اور یقیناً غیر جانبدار مورخوں اور دانشوروں کے احتجاج کی لے بھی اونچی ہوتی جارہی ہے۔ ماضی میں تاریخ کو اپنے ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے صہیونی اور فسطائی طاقتوں نے کس طرح استعمال کیا اس کا جائزہ وصی الرحمٰن کے مقالے میں لیا گیا ہے۔ تاریخ کے ساتھ ہو رہے جبر کے خلاف احتجاج میں ادارہ بھی شامل ہے۔

**شاید** یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب تاریخ انسانی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ ایک مورخ کا فریضہ بڑا ہی مقدس ہوتا ہے۔ ایک مورخ اپنے ذاتی تعصّبات اور مفادات کو بالائے طاق رکھ کر سچ اور صرف سچ لکھتا ہے لیکن یہی مورخ اگر کسی طرح کی مصلحت کا شکار ہو جائے تو انسانیت کے لئے آج کے طاقتور ترین کیمیاوی اسلحہ سے بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد اور حکومت کے قیام کے بعد انتظامی امور کے لئے انگریز افسران کو ہندوستان کی تواریخ و تہذیب، قوانین اور عوام کی ذہنیت سے آشنائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریز افسران کے ہندوستان آنے سے قبل ان کو HAILY BURY کالج میں یہاں کی تواریخ و تہذیب کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اسی کالج میں JAMES MILL کی تین جلدوں میں لکھی ہوئی ہسٹری اور برٹس انڈیا نصاب کی شکل میں پڑھائی جاتی تھی۔ JAMES MILL کی یہ کتاب ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئی اور اسی کتاب میں MILL نے ہندوستان کی تواریخ کو ہندو مسلم اور برٹش عہد میں تقسیم کردیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ابتدائی دو عہد کو مذہب سے منسوب کردیا جب کہ کرسچن عہد کے بجائے برٹش عہد کا نام تجویز کیا۔

تاریخی نقطہ نظر سے کیا یہ حد بندی درست ہے؟

کیا مذہب پر مبنی عہد کی تقسیم غیر منطقی اور غیر سائنسی نہیں ہے؟ چالس ولنکس (CHARLES WILNKS) ایچ ٹی۔ کول بروک جیسے ORIENTALLIST نے سب سے پہلے ہندوستانی تہذیب و تواریخ کا مطالعہ شروع کیا۔ ولیم جونس کی مساعی سے ہی ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جرمنی کا MAX MULLAR تو ہندوستانی زبان و تہذیب کا اس قدر شیدائی ہو گیا کہ اس نے اس نام کو سنسکرت کی شکل میں موکشا مولا (MOKSHA MULA) لکھنا شروع کردیا۔ حالانکہ وہ ہندوستان کبھی نہیں آیا تھا۔ ان حضرات نے INDO EUROPEAN HOME LAND اور سنسکرت اور گریک تہذیب کی COMMON ANCESTARY کا کلیہ پیش کیا۔ ہندوستان کی آرین تہذیب اور یورپ کی گریک تہذیب کے مابین رشتے تلاش کئے گئے۔ آرین نسل کے قصیدے گائے گئے۔

مذہبی بنیاد پر ہندوستانی تواریخ کی عہد سازی کوئی اچانک واقعہ یا لغزش قلم نہیں بلکہ یک سوچی سمجھی تحریک تھی۔ ایک منصوبہ تھا۔ ایک سازش تھی ہندوستان میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے مخصوص پالیسی اپنائی گئی۔ اس پالیسی کے تحت ہندوستان کی تواریخ نویسی میں فرقہ واریت اور مذہب کا رنگ ڈالا گیا۔ اس حکمت عملی کی مثال مندرجہ ذیل اقتباسات ہیں۔

سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ووڈ نے لارڈ ایلجن کو لکھا

WE HAVE MAINTAINED OUR POWER IN INDIA BY PLAYING OF ONE PARTY AGAINST OTHER AND WE MUST CONTINUE TO DO SO.

اسی طرح سکریٹری آف اسٹیٹ فور انڈیا جارج فرانسیس ہیملٹن نے کرزن کو لکھا

WE SHOULD SO PLAN THE EDUCATIONAL TEXT BOOK THAT DIFFERENCE BETWEEN COMMUNITY AND COMMUNITY ARE FURTHER STRENGTHENED

اسی طرح ایک معینہ پالیسی کے تحت تواریخ کی کتابوں میں واقعات کو اس طرح پیش کیا گیا کہ مسلم حکمراں جابر و ظالم بن کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کی تواریخ نویسی کا مقصد ہندوستانیوں میں یہ احساس دلانا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ظالم حکمرانوں کے ظلم جھیلنے کے عادی رہے ہیں اور برٹش حکومت ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کر رہی ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلم ہمیشہ سے الگ اور ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں اور تیسری غیر جانبدار طاقت (یعنی برٹش) کی غیر حاضری میں وہ ایک ساتھ امن چین سے

نہیں رہ سکتے۔ اس ضمن میں H.E.E. ELLIOT کی مشہور کتاب

THE HISTORY OF INDIA TOLD BY RENOWNED HISTORIAN.

کے پیش لفظ کا یہ جملہ قابل غور ہے۔

OUR NATIVE SUBJECT MORE SENSIBLE OF THE IMMENSE ADVANTAGES ACCURING TO THEM UNDER MILDNESS AND EQUITY OF OUR RULE.

V.A.SMITH I.C.S ۱۸۶۹ء میں ہندوستان آیا اور ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں رہا۔ تاریخ نویسی کی جس روش کی بنیاد JAMES MILL نے ڈالی اسی ڈگر پر اسمتھ بھی چلا۔ اسمتھ کے نزدیک تواریخ نویسی کا مقصد برٹش حکومت کے جواز کو تاریخی نقطہ نظر سے ثابت کرنا تھا۔

SMITH اور MILL کی تواریخ نویسی کے زیر اثر جو ہندوستانی تعلیم یافتہ نسل اتری اس نے قدیم ہندوستان کو UTOPIA ثابت کرنے میں خود کو وقف کردیا۔ عہد قدیم میں ہندوستان کی ساری عظمت تلاش کی جانے لگی رام کرشن پرم ہنس وویکانند کے ذریعہ ہندو مذہب کی برتری قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ دیانند سرسوتی مہاراج نے ویدک زمانے میں لوٹ جانے کا مشورہ دیا۔ وید کو دنیا کی سبھی DISCOVERIES کا STORE HOUSE تصور کیا جانے لگا۔ قدیم ہندوستانی سماج کے تمام منفی پہلوؤں بشمول سماجی غیر ہم آہنگی کی طرفداری کی جانے لگی۔ ہندوستانی تہذیب کی قدامت کو مضحکہ خیز ڈھنگ سے قدیم تر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی (مگر ۲۴۔ ۱۹۲۳ء میں ہڑپا تہذیب کی دریافت نے اس خیالی تاریخ سازی کا بھی قلعہ قمع کردیا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ آرین باہر سے آئے ہی نہیں۔ ہندوستان ہی ان کا حقیقی گھر ہے۔ گرو گوالکر نے بہت ہی مضحکہ خیز بات یہ گھڑلی کہ آرین شمالی قطب کے رہنے والے لوگ تھے مگر شمالی قطب پہلے ہندوستان کے ہی بہار اور اڑیسہ میں واقع تھا۔ یعنی یہ کہ شمالی قطب ہی ہندوستان سے کھسک کر چلا گیا آرین ہندوستان کے ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ اسی طرح ساری کوتاہیوں کے باوجود گپتا عہد کو "عہد زریں" کہا جانے لگا۔ گپتا نوازی میں تاریخ داں یہ بھول بیٹھے کہ اسی گپتا عہد میں SERFDOM کی بنیاد پڑی۔ ذات پات کی لعنت شدید تر ہوئی۔ عورتیں ملکیت کی اشیا بن گئیں۔ تجارت کا زوال ہوا۔ اسی گپتا کے زمانے میں فاہیان سماج کے سب سے نچلے طبقے چنڈال کی بدحالی کا رونا روتا ہے۔

انگریز مورخوں کے زیر اثر ابھرنے والے ہندوستانی تواریخ دانوں نے بھی شعوری طور پر MILL کی تواریخ کی فرقہ وارانہ تقسیم سازی کو قبول کرلیا۔ B.C ۱۰۰۰ سے ۱۲۰۰A.D

کو ہندو عہد کہا جانے لگا۔ مگر اس عہد کے درمیان پڑنے والے دیگر خاندان مثلاً INDO GREEK شاک SHAKAS کشان کے مذاہب کو نظر انداز کردیا گیا۔ B.C ۱۰۰۰ سے A.D ۱۲۰۰ کو ہندو عہد کہا جانا محض MILL کی ذہنی اختراع ہے۔ قدیم ہندوستان میں کہیں بھی "ہندو" لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ سب سے پہلے عربوں نے ہی ہندو لفظ کا استعمال کیا۔ قدیم ہندوستانی لٹریچر کے لئے یہ لفظ اجنبی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں آمد کے ساتھ تواریخ نویسی میں جو فرقہ واریت کا رنگ بھرنا شروع کیا تھا وہ رنگ لایا۔ R.S.SHARMA کے الفاظ میں۔

LEADING HISTORIAN FROM BENGAL WELCOMED THE ESTABLISHMENT OF BRITISH RULE IN EASTERN INDIA AS BLESSING

جادوناتھ سرکار نے برٹش حکومت کے قیام کو ACT OF DELIVERENCE کہا۔

R.C.MAJUMDAR نے ہندوستان کی تواریخ و تہذیب کئی جلد میں شائع کی۔ مسلم عہد کے ساتھ اختصار برتا گیا جبکہ عہد قدیم کے لئے کئی جلدیں وقف کردی گئیں۔ کلکتہ یونیورسٹی میں سب سے پہلے ANCIENT INDIAN HISTORY AND CULTURE کا شعبہ کھولا گیا اور نئی پود کے BRAIN WASH کے لئے راجپوتوں، مراٹھا اور سکھوں کی تواریخ پڑھائی جانے لگی۔ اسی خاص مقصد کے تحت MONOGRAPHS تیار کئے گئے۔

مسلم خاندانوں کی حکومت کو مسلم حکومت سے تعبیر کیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ صرف حکمراں مسلمان تھے۔ عوام کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ قاضی مغیث الدین کو حسرت ہی رہ گئی کہ شریعت کے مطابق حکومت چلتی۔ علاءالدین خلجی نے صاف لفظوں میں قاضی صاحب کو جواب دے دیا تھا کہ حکومت کے حق میں جو بہتر سمجھتا ہوں وہی کرتا ہوں۔ اس کی فکر نہیں کرتا کہ قیامت کے دن میرا کیا ہوگا۔ برنی کو بھی اسی کا رونا ہے کہ محض حکومت کی خاطر شرع کو بالائے طاق رکھ کر حکمراں سزائیں تجویز کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت نظام الدین لکھتے ہیں کہ بلبن نے امور سلطنت کو ہمیشہ مذہب پر ترجیح دی۔ ترکوں نے جب بارہ ہزار سپاہیوں کی مدد سے اپنی سلطنت قائم کی تو یہاں کے مروجہ نظام کو ISLAMISATION پر مبنی کیا۔ نچلے طبقہ پر HINDU RULING CLASS جیسے راجہ۔ رانا۔ زمیندار۔ حسب دستور موجود رہے۔ زمینداروں کو ان کی زمین سے بے دخل نہیں کیا گیا۔ جناب ہربنس مکھیا کے الفاظ میں۔

IT IS THE HINDUS WHO THUS HELPED THE TURKISH

ESTABLISHMENT THEIR EMPIRE AND THEY RAN ITS ADMINISTRATION FOR THEM.

اسی طرح ہندو حکمراں طبقہ کے اہم جز بن گئے اور ہربنس مکھیا کے الفاظ میں

(THIS) "EXPLAINS THE COMPLETE ABSENCE OF ANY POPULAR RESISTANCE TO THE ADVANCEMENT OF TURKISH ARMY.

محمد تغلق کے عہد میں علی شاہ نتھو کو مالگزاری وصول کرنے کے لیے کچھ زمین دی گئی۔ بھرن نام کے ایک ہندو نے حاکم وقت سے شکایت کی کہ نتھو نے کچھ روپیہ خرد برد کر دیا ہے۔ اس شکایت پر علی شاہ نتھو کی زمین بھرن کو دے دی گئی۔ علی شاہ نتھو نے کافی احتجاج کیا مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا علی شاہ نتھو پر ایسا اثر پڑا کہ اس نے بغاوت کر دی۔ اسی طرح وصولیات مالگزاری میں انصاف کو ترجیح دی گئی نہ کہ مذہب کو۔

اسی طرح شیواجی اور اورنگ زیب کو معدوم کرنے کے لیے طرح طرح کی ذہنی اختراع کی گئی جب کے شیواجی کی جنگ صرف حب الوطنی کے تحت تھی۔ وہ مغلوں کو حملہ آور تصور کرتے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کو حکمراں تسلیم کرنا ہند کے لیے کسر شان خیال کرتے ان کی جنگ مذہبی بنیاد پر نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا سپہ سالار ایک مسلمان ابراہیم کیوں ہوتا۔ صرف اسی حد تک نہیں شیواجی کو مسلم صوفیوں سے خاصی عقیدت تھی جس کی جیتی جاگتی مثال ان کے ذریعے تعمیر کردہ ستارہ کی مسجد ہے۔ اسی طرح اورنگ زیب نے بھی مذہب کو امور سلطنت پر فوقیت نہیں دی۔ اس نے ذاتی زندگی کو مذہب اور شرع کا پابند ضرور رکھا مگر دوسروں کو جبراً تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس کا سپہ سالار ہندو تھا۔ حکومت کے کلیدی عہدوں پر ہندو فائز تھے۔ یہاں تک مشاہیر میں بھی ہندوؤں کی کثرت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر راجہ مہاراجہ اس کے امداد پر کمربستہ نہ ہوتے تو دکن کی جنگی تسخیر جوئے شیر لانے کے مصداق ہوتی۔ جزیہ کے متعلق بھی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔ اسے ہندو عوام پر تضحیک کی علامت قرار دیا گیا۔ جزیہ غیر مسلموں کی حفاظت کی گارنٹی کے بدلے ایک ٹیکس تھا۔ اگر جزیہ سے مقصود ہندوؤں کی دل آزاری رہا ہوتا تو سرکاری عملہ، افسر، فوجی، عورتیں، معذور، غربا، بچے، برہمن قحط سالی، اور وبائی امراض سے اثر انداز علاقے کے جزیے معاف کیوں کر دیئے جاتے۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں محض ۱۰ فیصدی مالدار ہندوؤں پر ڈھائی سو روپیہ پر چھ روپیہ کی شرح سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اورنگ زیب نے جزیہ اپنی حکومت کے ۲۲ برسوں کے بعد نافذ کیا اور زندگی

کے آخری لمحات میں جزیہ ختم کرنے کا حکم دیا۔ جس طرح ہندوؤں پر جزیہ لگتا تھا اسی طرح مسلمانوں پر مذہبی ٹیکس، زکات لگایا گیا۔ زکات اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے ۲۵ برسوں بعد مسلمانوں پر لگایا۔

اسی طرح انہدام منادر کے واقعات کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا انہدام کے پیچھے کوئی مذہبی جذبہ کار فرما نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے اقدام سے ایک طبقہ کی نفرت مول لی جاسکتی ہے ان کا دل نہیں جیتا جاسکتا۔ اسی طرح انہدام منادر مذہبی جذبے کے تحت نہیں ہوا اور نہ ہی تبدیلی مذہب کی غرض سے۔ درحقیقت ویسے ہی منادر زد میں آئے جو مفسدانہ سازشوں کے اڈے کے طور پر استعمال کئے جاتے اور ایسے اڈوں کے خلاف شہنشاہ نے اشتعال میں عملی قدم اٹھایا۔ اور ان سب کو تعصب کی شہادت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ متھرا کا مندر اورنگ زیب نے ۱۶۷۰ء میں منہدم کروایا یعنی تخت نشین ہونے کے قریب ۱۳ سال بعد۔ سوال یہ ہے کہ یہ مندر ۱۳ سال تک کیوں منہدم نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مندر جاٹ حکمران کے ذریعہ بنوایا گیا تھا اور جاٹ لوگوں نے علم بغاوت بلند کردیا تھا۔ جس کے پیش نظر یہ واقعہ پیش آیا۔ K.N.PANNKKAR کے الفاظ میں:

MORE THAN A RELIGIOUS ACT IT WAS ASSERTION OF POWER

اورنگ زیب کے ذریعہ وشواناتھ مندر بنارس کے انہدام کی کہانی کچھ اور مختلف ہے جسے B.N.PANDAY نے کافی تفصیل سے اپنے ایک فاضل مقالے DISTORTION OF MEDIVAL INDIAN HISTORY میں پیش کیا ہے۔ اس انہدام کا مندر کے تہہ خانے میں "کچھ" کی رانی کی آبروریزی سے واسطہ ہے۔ B.N.PANDAY لکھتے ہیں۔

AURANGZEB ORDERED THAT AS THE SACRED PRECINETS HAVE BEEN DESPOILED, LORD VISHWANATH MAY BE MOVED TO SOME OTHER PLACE. THE TEMPLE BE RAZED TO THE GROUND AND MAHANT BE ARRESTED AND PUNISHED.

اگر مندر کا انہدام اورنگ زیب کا مذہبی جنون مان لیا جائے تو اسی کے ذریعہ مسجد گولکنڈہ کے انہدام کو کیا کہئے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں تو تاریخ داں مسلم حکمرانوں کے ذریعہ انہدام مندر کو کافی مرچ مصالحہ لگا کر پیش کرتے ہیں وہیں ہندو حکمراں کے ذریعہ منادر کے انہدام سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

پرہار خاندان کا حکمراں سبھت ورمن (۱۲۱۰۔ ۱۱۹۳) نے جب گجرات پر حملہ کیا تو ڈبوئی (DABHAI) اور کھمبات (COMBAY) کے بہت سارے جین مندروں کو لوٹ لیا۔ کاشمیر کا حکمراں ہرشا (HARSHA) اپنی شاہی تجوری بھرنے کے لئے اپنی ہی حکومت کے منادر کو لوٹتا رہا۔ اتنا ہی نہیں اس نے تو مندر لوٹنے کا ایک باضابطہ محکمہ بنادیا تھا اور ایک افسر دیوتاپٹ نایکا DEVTO PATANEYAKA بحال کر رکھا تھا۔ کیا برہمن راجہ نے بودھوں کے بودھی درخت کو نہیں کاٹ دیا تھا۔ تاریخ کے صفحات میں ارونگ زیب کے سر مندروں کے انہدام کا جرم تو منڈھا جاتا ہے مگر اس بات کو نظرانداز کردیا جاتا ہے کہ اس کے کچھ مندروں کو جاگیریں بھی عطا کیں۔ مثلاً

(۱) سدیشورناتھ مہادیو مندر الہ آباد۔ (۲) جنگم بادی شیوا مندر بنارس۔ (۳) اجین مندر۔ (۴) بالاجی مندر چترکوٹ۔ (۵) اوما مندر گوہاٹی۔ (۶) جین مندر شطرونجی۔ (۷) بہار کی مشہور عبادت گاہ بودھ مندر (بودھ گیا)

B.N.PANDAY لکھتے ہیں۔

GENERALLY HISTORIANS TALK OF THE DEMOLITION OF CHINTAM TEMPLE CONSTRUCTED BY THE NAGAR SETH OF AHMADABAD BUT THEY REMAIN DUMB ON THE FACT THAT THE SAME AURANGZEB GAVE LAND TO THE SHATRUNGAY AND ABU TEMPLE OF THE SAME "NAGAR SETH".

۱۱ مارچ ۱۶۵۹ء کو اورنگ زیب نے بنارس کے حاکم ابوالحسن کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان بنارس فرمان کے نام سے مشہور ہے جو سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں ASIATIC SOCIETY OF BENGAL کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس فرمان کے مطابق ایک مسلمان مندر کو توڑ کر شاہراہ عام بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے اس فرمان کے ذریعہ سختی سے روک لگادی اور مندر کے انہدام کی ممانعت کی۔ اس فرمان میں اس نے نئے مندر کی تعمیر پر روک ضرور لگائی مگر اس پابندی پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا۔ اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد بھی بنگال کے وشال پور میں ۱۶۸۱ء میں دو اور ۱۶۹۰ء میں ایک مندر کی تعمیر ہوئی۔ متعصب ذہنیت کے تاریخ داں اس بات کو نہ معلوم کیوں بھول بیٹھے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنی عمر کے آخری ۲۷ سال جنوبی ہند میں گذارے مگر اس مدت میں جنوبی ہند میں منادر منہدم کیوں نہیں کئے گئے۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اورنگ زیب پر ایک اور الزام یہ عائد کیا کہ اورنگ زیب نے اپنے زمانے کی تاریخ نویسی پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مگر ایک ہم عصر مورخ محمد ہاشم خفیہ طور پر اس زمانے کے حالات لکھتا رہا اس لئے وہ خاص خاں کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے یہ نتیجہ اپنے پیش رو انگریز آقاؤں کی تقلید میں اخذ کیا ہے۔ یہ غلطی محض اس لئے ہوئی کہ محمد ہاشم کا لقب خواص خاں ("و" سے خواص) کے بجائے خاص خاں (الف سے خاص) شائع ہوا۔ پروفیسر موصوف نے اس پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا کہ ہاشم خواص خاں موضع خواص پور کا رہنے والا تھا اسی لئے وہ "خواص" کے لقب سے مشہور ہوا نہ کہ اس لئے کہ اس نے خفیہ طور پر اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ لکھی۔

جادو ناتھ سرکار ابھی سر جادو ناتھ سرکار نہیں ہوئے تھے۔ "سر" کا خطاب بغیر آقا حاکم کو خوش کئے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے سرکار نے بھی اپنے آقا تواریخ دانوں کی طرح تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ اکثر اوقات انہوں نے ایسا کیا کہ کسی عبارت سے بیچ سے نقل کر لیا اور اوپر اور نیچے کی عبارتیں حذف کر ڈالیں نتیجہ یہ ہوا کہ عبارت کا مفہوم ہی بدل گیا۔

"احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبجات صادر شد کہ مدارس و معابد بے دینان دست خویش انہدام سازند"

اس عبارت کا ترجمہ کر کے سر جدو ناتھ سرکار نے یہ مجموعی نتیجہ اخذ کیا کر دیا کہ ہندوؤں کے سب کے سب پاٹھ شالے اور مندر کو توڑنے کا حکم اورنگ زیب نے دے دیا تھا۔ اگر اس فرمان کا عام اطلاق لیا جائے جو "سرکار" جان بوجھ کر لینا چاہتے ہیں تو اس فرمان کے بعد ہندوستان کے اندر کسی مندر یا پاٹھ شالہ کا وجود باقی نہیں رہنا چاہئے تھا۔ حالانکہ ماثر عالمگیری کی پوری عبارت اس طرح ہے۔

"بہ عرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھ و ملتان خصوص بنارس برہمنان بہ طاقت نشان در مدارس مقرر بہ تدریس کتب باطلہ اشتغال دارند۔ وراغباں و طالباں از ہندو و مسلماں منانتہائے بعیدہ طے نمودہ، جہت تحصیل علوم شوم۔ نزد آں جماعت گمراہ می آیند۔ احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات ھادر شد کہ مدارس و معابد بے دیناں دست خویش انہدام سازند"

اسی طرح CAL MILES نے یہ دعوئ کیا کہ اس کی لکھی ہوئی ٹیپو سلطان کی تواریخ ایک ایسی MANUSCRIPT کے ترجمے پر مبنی ہے جو کوئین وکٹوریہ کی PERSONAL

LIBRARY میں موجود ہے۔ CAL MILES نے اپنی اس کتاب میں شوشہ چھوڑا کہ:

"THREE THOUSAND BRAHMINS COMMITTED SUICIDE AS TIPU WANTED TO CONVERT THEM FORCIBLY IN THE FOLD OF ISLAM".

مگر حیرت کی بات ہے کہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس طرح کا کوئی مسودہ اسکرپٹ وہاں ہے ہی نہیں۔ اس طرح CAL MILES نے جو تواریخ گڑھی اس کو ان کے وفادار ہندوستانی ساتھیوں نے اڑالیا اور بغیر جانچ پڑتال کے نصاب کا حصہ بنادیا تاکہ آقا کی پالیسی کامیاب ہو سکے۔ اسی واقع کو ہری پرشاد شاستری نے بھی اڑالیا اور کلکتہ یونیورسٹی کے کورس میں داخل کر دیا۔ دریافت کرنے پر انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے اسے میسور گزیٹیئر سے لیا ہے۔ جناب B.N.PANDAY نے اس کی چھان بین کی تو میسور گزیٹیئر میں کہیں اس کا پتہ ہی نہیں تھا۔ ٹیپو سلطان کے متعلق بے بنیاد باتیں کورس کی کتابوں میں داخل کر دی گئیں۔ مگر اس کا ذکر نہیں کیا گیا کہ اس کا وزیر اعظم پورنیہ (PURNEA) ایک برہمن تھا۔ اسی کا کمانڈر ان۔ چیف کرشن راؤ ایک برہمن تھا۔ وہ ۱۵۶ منادر کو سالانہ گرانٹ دیا کرتا تھا۔ اور اپنے محل کے احاطے میں واقع LORD RAJNATH کا مندر دیکھنے برابر جایا کرتا تھا۔

اب ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے اس کی آزادی کے لئے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تمام مذاہب کے لوگوں نے مل جل کر قربانیاں دیں لیکن ہمارے بیشتر مورخین آج تک انگریزوں کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ اب انگریزوں کی لکھی ہوئی تواریخ کی صداقت کی نئے سرے سے تحقیق کرانی چاہئے اور ایسے اقتباسات حذف کئے جانے چاہئیں جو ہندوستان میں رہنے والے مختلف عقائد اور فرقوں کے لوگوں میں منافرت کا بیج بوتے ہیں تب ہی گاندھی کے خوابوں کا ہندوستان وجود میں آسکے گا۔ ○○

# امرتیہ سین۔ ایک درد مند ماہر اقتصادیات

ابھی رات کی سیاہی چھٹی بھی نہ تھی کہ فون کی گھنٹی گھنگھنا اٹھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ خدانخواستہ کوئی بری خبر نہ ہو۔ یوں بھی جیٹ لیگ سے بدن کے کل پرزے ڈھیلے پڑے ہوئے تھے اور ذہن شائیں شائیں کر رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ نیویارک کے اپنے ہوٹل کے کمرے میں لوٹے تھے۔ یہاں وہ ماہر اقتصادیات مرحوم محبوب الحق کی یاد میں رکھی گئی ایک نشست میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ خیر ریسیور اٹھانے پر جب انہیں دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی تو سب سے پہلے انہوں نے چین کی سانس لی۔ پھر انہیں وہ خبر ملی جس کا انہیں ہی نہیں، ان کے ہزاروں چاہنے والوں کو بھی برسوں سے انتظار تھا۔ اسٹاک ہوم کی اس کال کے بعد انہوں نے سب سے پہلے سات سمندر پار ہندوستان میں بیٹھی ہوئی اپنی ستاسی سالہ ماں کو یاد کیا اور انہیں یہ خوشخبری سنائی۔ مگر ٹیگور کے شانتی نکیتن کی باسی امیتا سین کو یقین نہ آیا اور آتا بھی کیونکر؟ دس سال سے ہر برس اکتوبر کے مہینے میں وہ اس خبر کا انتظار کرتی رہی تھیں اور وقت گزر جاتا تھا۔ کتنی ہی بار تو انہیں یہ خبر ملی بھی مگر بعد میں وہ فقط افواہ ثابت ہوئی۔ امیتا نے فوراً ٹی وی سیٹ آن کیا۔ بین الاقوامی خبروں کے درمیان انہیں دنیا بھر کے صحافیوں کے بیچ گھرے ہوئے اپنے لاڈلے کا چہرہ دکھائی دیا، تب جا کے انہیں یقین آیا کہ امرتیہ سین کو سچ مچ ۱۹۹۸ء کا نوبل پرائز ملا ہے۔

ویسے امرتیہ سین کو اکونومکس کا نوبل پرائز ملنا کئی معنوں میں اہمیت رکھتا ہے، خاص کر ایسے وقت میں جب ویلفیئر اکونامی کا نام لینا بھی پچھڑے پن کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ مارکسی اصولوں پر کھڑی سب سے بلند و بالا عمارت سوویت یونین کا شیرازہ بکھر چکا ہو اور دنیا کے تمام مفکرین نے اپنے مخصوص ''ایڈ فلمی انداز'' میں (بقول پیپسی تھنگ آفیشیل اباؤٹ اٹ) کمیونزم کی فاتحہ خوانی بھی مکمل کرلی ہو، نیا 'پروفیشنل کلاس' سینہ پھلا پھلا کر مارکیٹ فورس کی دہائی دے رہا ہو۔ کسی نیو مارکسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے شخص کو اقتصادیات کا نوبل پرائز ملنا یقیناً حیرت کی بات تھی۔ مگر شاید ۱۹۹۸ء کا سال ہی کچھ ایسا تھا۔ اس سال کے شروع میں ہی دنیا کے بڑے بڑے اور بظاہر مضبوط نظر آنے والے اقتصادی قلعے تہہ و بالا

ہوتے نظر آئے اور خالص CAPITALIST اصولوں پر کھڑا یہ اقتصادی نظام اندر سے کتنا کھوکھلا اور کمزور ہے، اس کی اصلیت واضح ہونے لگی۔ یوں تو ساری دنیا ہی ایک نئے مالی بحران کی چپیٹ میں آتے آتے رہ گئی، مگر اس درمیان سب سے زیادہ خراب حالت رہی جنوب مشرقی ایشیا کے ان ممالک کی جنھیں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں کے سامنے بطور ماڈل پیش کیا کرتے تھے۔ یہی نہیں کینس اور ایڈم اسمتھ کی ان تمام ناجائز اولادوں کو زبردست منھ کی کھانی پڑی جو بے لگام گھوڑوں کی طرح امریکہ کی جڑواں باندیوں (ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف) کی شہہ پر نام نہاد 'رفورمس' کا جھنڈا لیے دوڑے چلے جارہے تھے۔ اب بھلا اس اندھی گھوڑ دوڑ میں ہندوستان جیسے پسماندہ، غریب اور کمزور ملک کی کیا اوقات کہ ثابت قدم رہ سکے؟ اور پھر ان کے پیچھے پیچھے 'رفورمس' کا کورس گاتا ہوا، تالیاں پیٹتا ہوا ایک قافلہ رواں دواں تھا جس میں سبھی شامل تھے...... اسٹوڈنٹس، پروفیسران، ڈاکٹرس، انجینئرس، ماہر اقتصادیات، ماہر حیوانیات، کمپیوٹر ایکسپرٹ، بیوروکریٹس، صحافی، اسپورٹس مین۔ یہاں تک کہ میرے محلہ کا بنیا بھی LIBERALISATION اور PRIVATISATION کے فائدے کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ مگر افسوس کہ امرتیہ سین دنیا کے نامی گرامی ماہر اقتصادیات ہوتے ہوئے اتنی موٹی سی بات کبھی نہ سمجھ سکے اور ویلفیئر اکانومی کے وہی پرانے آؤٹ فیشن نظریہ کا ڈھول پیٹتے رہے۔ مگر جواب نہیں اس ڈھول بازی کا کہ اس نے دنیا کو رفورمس کے اتنے گہرے نشے سے جگا کر ہی دم لیا۔ ورنہ ڈائناسور جیسی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں جن کا سالانہ ٹرن اوور ہی تیسری دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی کل مالیت سے زیادہ ہے، اتنے تگڑے ڈوز کا انجکشن لگا رہی تھیں جو آدھی صدی کے لیے کافی ہوتا۔ اس پر سے فیشن پرست مفکرین کے سروں پر مارکیٹ فورس کا بھوت کچھ اس طرح چڑھا تھا کہ اس کی مخالفت میں کچھ بھی کہنا خود کو ذلیل کرنا تھا۔ ایسے وقت میں امرتیہ سین جیسے ویلفیئر اکونومسٹ کو اقتصادیات کا نوبل پرائز ملنا بے شک ایک اہم تاریخی واقعہ ہے جس کی گونج دور تلک جائے گی اور دنیا کے اقتصادی نظام میں بہت سی چونکا دینے والی تبدیلیاں سامنے آئیں گی۔ سوئیڈ مین کی رائل اکیڈمی آف سائنس کی سلیکشن کمیٹی کے ذریعہ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں لیے گئے اس چھوٹے سے فیصلے نے صرف امرتیہ سین کی قابلیت اور بلندی کو ہی نہیں سراہا بلکہ ایک پورے مکتبہ فکر، ایک نظریہ کو نیا RECOGNITION دیا ہے۔ یہاں یہ سوال، بجا طور پر اٹھ سکتا ہے کہ بھلا کسی نظریہ کو RECOGNITION کی محتاجی کیوں ہو، نظریہ تو اپنی سچائی کی قوت پر ٹکا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے مگر اقتصادی نظریہ کے معاملے میں سچائی کے ساتھ

طاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ طاقت سیاستدانوں کی ہو یا صنعت کاروں کی یا پھر دنیا کے نظام فکر سے تعلق رکھنے والے کسی بااثر حلقے کی، اور یہیں رکوگنیشن کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اگر کسی نظریہ کو طاقت کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو وہ نظریہ کتنا ہی سچا، کھرا اور سود مند کیوں نہ ہو، وہ جلد ہی تاریخ کے ڈسٹبن میں پڑا نظر آئے گا۔ اقتصادی نظام میں سچائی نہیں، بلکہ پیسہ بولتا ہے اور خوب بولتا ہے اور ہر وہ نظریہ فکر جو اس پیسہ کی طرفداری کرتا ہے، سر چڑھ کر بولتا ہوا نظر آئے گا۔ اور یہ پیسہ صرف کچھ لوگوں کے پاس ہی ہے، اس کا اندازہ بہتر طریقے سے اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ ایک اوسط حساب سے ایک ارب سے اوپر کی آبادی والے اس ملک کی کل مالیت کا ۷۵ فیصد حصہ صرف بیس گھروں میں بٹا ہوا ہے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ۵۰ فیصد سے زائد لوگوں کو ایک وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے نصیب نہ ہوتی ہو تو حیرت کی بات نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جو بھی اقتصادی نظریہ کچھ لوگوں کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ہوگا، اسے ہی افضلیت حاصل ہوگی۔ مگر جو نظریہ سبھی ہوگا وہ سب کے لیے فائدہ مند ہوگا، نہ کہ کچھ لوگوں کے لیے۔ اور یہی CONTREADICTION ہے جو سہی نظریہ کو پنپنے، پھلنے، پھولنے کا موقع نہیں دیتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ کوئی بھی نظریہ محض اپنی سچائی کی طاقت پر ٹکا رہ سکتا ہے، صرف کتابی باتیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر اچھے نظریہ کو ایک اچھے معمار کی بھی تلاش ہوتی ہے۔ جو اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنی ذہنی طاقت اور ہمت سے اس کی تشکیل کر سکے اور ساتھ ہی وقت کے سرد گرم اور مخالفت میں اٹھنے والی آندھیوں کے تھپیڑوں سے بھی بچائے۔ ویلفیئر اکونومی کا نظریہ فکر بھی اپنے کسی معمار کی تلاش میں ہے۔

جب بات مارکیٹ اکونومی اور مارکیٹ فورس کی چلی ہے تو اس ضمن میں یہ واضح کرنا بہتر ہوگا کہ دراصل مارکیٹ فورس کسی ایسی مافوقی طاقت کا نام نہیں جو اقتصادی نظام کی تمام خرابیوں کو طلسماتی انداز میں خود بخود ٹھیک کر دے گا۔ جیسا کہ اس کو بکثرت استعمال کرنے والے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ محض یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو سپلائی اور ڈمانڈ کو بیلنس رکھنے میں مدد کرتی ہے۔ مگر مارکیٹ بذات خود چونکہ ایک بے حد پیچیدہ شے ہے۔ جہاں نفع ونقصان کے زاویہ کو اولیت حاصل ہے اور اس کے لیے ہر قسم کے جائز ناجائز ذرائعیوں سے کام لیا جاتا ہے اور اتنے قسم کے MANIPULATION اور الٹ پھیر لیے جاتے ہیں کہ مارکیٹ فورس جیسی OVER SIMPLIFIED اصطلاح بے چاری منہ دیکھتی رہ جاتی ہے اور دوسرے فیکٹرس اس پر بازی لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ویلفیئر اکونومسٹ مارکیٹ فورس پر زیادہ منحصر رہنے کو غلط سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں اچھے اقتصادی نظام کے لیے بہتر

STATE CONTROLاور CLOSE MONITORING ضروری ہے، تاکہ MARKET-RELATED MENOPULATERS عوام کے فلاح و بہبود پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

امرتیہ سین نے ایک جگہ کہا تھا کہ یہ نظریہ فکر کہ علم اقتصادیات کا اصل مقصد غریبوں، ناداروں اور کمزوروں کی بہتری ہے میرے دل کے قریب ہے۔ ایک دوسری جگہ انہوں نے اور صاف الفاظ میں کہا تھا کہ GLOBALISATION کو میں بھی ایک طاقت مانتا ہوں مگر اس کے ساتھ ضروری ہے کہ سرکار اندورن ملک DEVELOPMENT ECTIVITEIS کو بھی تیز کرے۔ اور اسی لیے امرتیہ سین بار بار عوام کی اہم ضرورتوں جیسے عام تعلیم، ہیلتھ اور روزگار پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

انہی باتوں کی وجہ سے میسا چوائس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے نوبل انعام یافتہ روبرٹ سلو نے انہیں اقتصادیات کا ضمیر کہا تھا۔

اقتصادیت کے نوبل پرائز کا اصل نام ہے بینک آف سوئیڈین پرائز ان اکونومکس سائنز الفریڈ نوبل کی یاد میں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پڑ گئی کہ ابھی حال ہی میں اس بات کو لے کر ایک بے وجہ کی کنٹروری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انعام کی کل رقم مبلغ ۹ لاکھ ۸۷ ہزار ڈالر، یعنی چار کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ ہے۔ امرتیہ سین، ربندر ناتھ ٹیگور، سرسی وی رمن، ہرگووند کھرانا، وی سبرامنیم، مدر ٹریسا کے بعد چھٹے ہندوستانی ہیں اور دوسرے بنگالی جنہیں یہ امتیاز حاصل ہوا ہے۔

سین کے حالات زندگی ایک ایسی کھلی کتاب کی طرح ہیں جس کا ہر ورق ایک خوشگوار زندگی اور خوش آئند مستقبل کی طرف اشارہ کرنے والی یادگار تصویر کی طرح ہے۔ جس کی شروعات ۱۹۳۲ء سے ہوتی ہے، جب ربندر ناتھ ٹیگور کے سیکریٹری کی لاڈلی بیٹی امیتا کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اس کا نام گرودیو ٹیگور کی رائے سے امرتیہ رکھا جاتا ہے۔ امرتیہ یعنی دوسری دنیا کا۔ امرتیہ سین نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ شروع میں ان کی خواہش ایک فرسٹ ریاضی داں یا ناول نگار بننے کی تھی مگر ملک کی غریبی اور ان کے حساس ذہن نے انہیں اکونومسٹ بنا دیا۔

سین کا بچپن ڈھاکہ میں گزرا اور وہیں انہیں دس سال کی چھوٹی سی عمر میں اپنی زندگی کا سب سے ہولناک منظر دکھائی دیا جو آج بھی ان کے ذہن میں ایک ڈراؤنے خواب کی طرح موجود ہے۔ معاذ اللہ ۱۹۴۳ء کا بنگال کا قحط تاریخ کا ایسا حادثہ تھا جسے ایک بار دیکھنے کے بعد کوئی بھی حساس انسان تا عمر بھول نہیں سکتا اور اس حادثہ کی سب سے خاص بات یہ تھی

کہ یہ حادثہ کارگریٔ فطرت کا نمونہ تھا، بلکہ انسانی حرص اور غازب وقت کی بے رحمانہ طبیعت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے برطانوی حکمراں ونسٹن چرچل کے حکم سے یہاں کا سارا غلہ اور اناج میدان جنگ میں لڑرہی انگریز فوج کے پاس بھیج دیا تھا۔ جس سے کہ بنگال میں قحط جیسی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ دس سالہ امرتیہ سین نے بارہا اپنے سے بڑوں کو ان حالات پر تبصرہ کرتے سنا، اور وہ بڑے بھی کون تھے، ملک کی چند برگزیدہ ہستیاں۔ ان کے نانا آچاریہ ششی موہن سین سنسکرت کے بہت بڑے اسکالر تھے اور شانتی نکیتن میں ٹیگور کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ سین کے والد اسوتوش سین ایک اگریکلچر سائنٹسٹ تھے اور بعد میں وہ اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے صدر بھی بنے۔ ان تبصروں کا اثر یہ ہوا کہ اس چھوٹے سے بچے نے غریبی کی وجہ ڈھونڈنا اپنی زندگی کا مقصد ہی بنالیا۔ اور ظاہر ہے کہ انہیں اس جدوجہد میں نمایاں کامیابی بھی ملی۔

۱۹۵۳ء میں کلکتہ کے پریسی ڈینسی کالج سے انہوں نے گریجویشن کی اور ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک وہ جادوپور یونیورسٹی میں اکونومکس کے پروفیسر رہے۔ اسکے بعد انہیں ٹرینٹی کالج لندن کی فیلوشپ مل گئی۔ ۱۹۶۳ء میں وہ فیلوشپ کی تکمیل کے بعد ہندوستان واپس آئے اور دہلی اسکول آف اکونومکس میں بطور پروفیسر بحال ہوگئے۔ اس درمیان وہ مختلف میدانوں میں بہت زور شور سے سرگرم عمل رہے۔ خاص کر یونین ایکٹی ویٹیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ دہلی یونیورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے وہ بہت مقبول ممبر تھے مگر ان سب کارگزاریوں کے باوجود ان کا اکیڈمک ڈسپلن غضب کا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ ان کی ریسرچ اور رائٹنگ حسب معمول جاری رہی۔ ۱۹۸۵ء میں امرتیہ سین کی سب سے پہلی، سب سے زیادہ مقبول اور سب سے اہم کتاب COLLECTIVE CHOICE AND SOCIAL WELFARE منظر عام پر آئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی شہرت آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی، اور انہیں ایک بین الاقوامی حیثیت کا ماہر اقتصادیات تسلیم کیا جانے لگا۔ اس کے فوراً بعد انہیں لندن اسکول آف اکونومکس سے بلاوا آگیا، جہاں وہ ۱۹۷۷ء تک پروفیسر رہے۔ بعد ازاں تین سال تک آکسفورڈ کے نوفیلڈ کالج میں اور سات سال تک یعنی ۱۹۸۷ء تک آکسفورڈ میں ہی ڈرمنڈ پروفیسر آف پولیٹکل اکونومی رہنے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔

۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۸ء تک امرتیہ سین امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں لیمنٹ پروفیسر آف اکونومکس اور فلسفہ رہے۔ پھر انہیں دوبارہ ٹرینٹی کالج لندن سے بلاوا آگیا اور وہ ماسٹر آف ٹرینٹی بن کر انگلینڈ واپس آگئے۔ ماسٹر آف ٹرینٹی کا اعزاز ہی اپنے آپ میں نوبل پرائز سے

کم نہیں تھااور وہ دنیا کے پہلے نان برٹش شخص ہیں جنہیں یہ امتیاز حاصل ہوا تھا۔ اور پھر اسی سال ۱۹۹۸ء میں ہی انہیں دوسرا سب سے بڑا اعزاز حاصل ہوا، یعنی انہیں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔

امرتیہ سین کے بارے میں ان کے اسکول کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ انہیں کبھی پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ ہاں بحث مباحثوں میں وہ ضرور سب سے آگے رہا کرتے تھے۔ یوں بھی بنگال کے چائے خانوں کی اڈے بازیاں مشہور ہیں۔ ان میں سین کے بھی کچھ مخصوص اڈے تھے۔ ایک تو اسکول کے بالکل قریب تھا جہاں ایک بار ان کی ماں امیتا نے انہیں بحث کرتے ہوئے اس وقت پکڑا تھا جب اسکول میں امتحان شروع ہونے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ مگر وہ اس سے بے فکر دنیا کی صورت حال پر گرما گرم بحث میں لگے ہوئے تھے۔ کالج کے دوران بہت دنوں تک وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن (AISF) سے جڑے رہے۔ اور شاید اسی درمیان ان کی مقررانہ صلاحیت عروج پر پہنچی جو بعد میں بطور لیکچرار ان کی زبردست مقبولیت کا سبب بھی بنی۔ کہا جاتا ہے وہ جہاں بھی پروفیسر رہے ان کے کلاس کے ہر کونے کھدرے میں لڑکے لڑکیاں بیٹھے یا کھڑے نظر آتے تھے۔ سب سے مزیدار بات تو کورنیل یونیورسٹی میں ہوئی۔ وہاں انہیں لیکچر دینے کے لیے بلایا گیااور لیکچر کا انتظام شعبہ اقتصادیات کے سیمینار روم میں کیا گیا۔ لیکچر شروع ہونے کے ایک گھنٹہ پہلے ہی سیمینار روم کھچا کھچ بھر چکا تھااور اس سے دگنا ہجوم باہر تھا۔ ظاہر ہے تمام شعبہ میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی اور جلدی جلدی جگہ بدلی گئی اور پھر لیکچر کا انتظام سب سے بڑے لیکچر ہال میں کیا گیا۔ مگر پندرہ منٹ پہلے تک وہاں بھی وہی حال ہو گیا۔ یعنی لیکچر ہال بھر چکا تھااور باہر ایک ہجوم تھا۔ اب تو انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ ایک ہنگامی میٹنگ بلائی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب ایک ہی جگہ بچتی ہے جہاں اتنی بھیڑ کو اڈجسٹ کیا جاسکتا ہے اور وہ جگہ ہے کورنیل سنیما ہال۔ آخر کار امرتیہ سین نے کورنیل سنیما ہال میں ہی اپنا لیکچر دیااور اپنے خوبصورت انداز بیان اور زبردست علمی صلاحیت سے پورے ہجوم کا دل جیت لیا۔

سین کی گھریلو زندگی میں کئی طوفان آئے۔ سب سے پہلے تو پندرہ سال تک تقریباً پرسکون فیملی لائف گزارنے کے بعد یکایک طلاق کی نوبت آگئی، جسے پریس اور میڈیا نے بھی کافی اچھالا۔ کیونکہ ایک طرف اگر مشہور ماہر اقتصادیات تھے تو دوسری طرف بنگال کی مشہور شاعرہ نوبیتا دیو۔ بالآخر طلاق ہو ہی گئی۔ اس کے بعد سین کی دوسری شادی اپنے ڈی ایس ای کے ایک دوست کی طلاق شدہ بیوی ایوا کولورنی سے ہوئی، جن کا ۱۹۸۵ء میں کینسر سے انتقال ہوگیا۔ سین کی موجودہ بیوی ایما رو تھس چائلڈ، کیرج یونیورسٹی میں تاریخ کی پروفیسر ہیں۔

یہ تو تھا امرتیہ سین کے حالات زندگی کا ہلکا سا خاکہ، مگر کسی دانشور کو سمجھنے کے لیے اس کے حالات زندگی سے زیادہ اس کے نظریہ کو سمجھنا ضروری ہے، تبھی اس کی شخصیت پوری طرح کھل کر سامنے آتی ہے۔ آخر سین کے اقتصادی نظریہ میں ایسی کون سی خاص بات ہے، جو ان کو دوسرے ہم عصر اقتصادیات کے ماہروں سے منفرد کرتی ہے۔ یوں تو اسے سمجھنے کے لیے اقتصادیات کے مختلف موضوع پر گہری نظر چاہیے تاکہ باریک بینی سے اس کا تجزیہ کیا جاسکے۔ مگر آسان زبان میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے زیادہ تر اقتصادی ماہروں کے نظریے ایک ہی مرکز کے ارد گرد رواں دواں ہیں اور وہ مرکز ہے افزائش یعنی GROWTH، اور اس سلسلے میں یہ بھرم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ افزائش اور ارتقاء (DEVELOPMENT) ایک ہی چیز ہے۔ یہ فریب کاری صنعت کاروں کے لیے تو سود مند ثابت ہوسکتی ہے اور ہو بھی رہی ہے مگر عوام اس سے نقصان میں ہی رہتا ہے۔ کیونکہ جب ملک کی اکونومک پالیسیوں کا سارا زور GROWTH پر ہوگا تو دوسری ارتقائی کارگزاریاں اثر پذیر ہوں گی، خاص کر وہ جن سے عوام کی فلاح بہبودی کا سیدھا جڑاؤ ہے۔ اس کے برعکس سین یا اس حلقے کے وہ سبھی ماہر اقتصادیات جو ویلفیئر اکونومی سے جڑے ہیں، کے نظریہ کا مرکز ارتقاء ہے۔ مارکیٹ اکونومی یا مارکیٹ فورس کی رٹ لگانے والے ماہرین ارتقا اور افزائش کے اس باہمی باریک لیکن اہم فرق کو گول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں سین کی کتاب ECONOMIC INEGRATLY شائع ہوئی، جس میں انہوں نے غریبی کی پیمائش کا نیا نظریہ پیش کیا۔ جس کے ذریعہ کسی بھی معاشرے کی اقتصادی کمزوریوں کی بہتر تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ سین کی سب سے اہم دریافت ہے، جسے سین انڈیکس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جس کی مدد سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی خاص علاقے میں کوئی شخص غریبی کی سطح سے اور کتنا نیچے جاسکتا ہے۔ آج تمام ماہرین اس نکتہ پر متفق ہیں کہ کسی بھی ملک کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے سب سے بہتر پیمانہ ہیومن رسورس ڈیولپمنٹ انڈیکس (HDI INDEX) ہے، اور یہ انڈیکس مرحوم محبوب الحق کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس ایچ ڈی آئی انڈیکس کے حساب کتاب میں سین انڈیکس بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان انڈیکسوں کو ڈیولوپ کرنے والے ان دونوں ماہرین کے اپنے ملک اس قطار میں سب سے پیچھے دنیا کے چند پسماندہ، اس تنگ حال خطوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ HDI INDEX کے مطابق ہندوستان کا نمبر ۱۳۹ رواں ہے اور پاکستان کا ۱۴۱ ار واں، اور پھر یہ لسٹ دو چار اور ناموں جیسے نیپال، سومالیہ، برما وغیرہ کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم نیوکلیئر دھماکے کرتے بھی رہیں تو بھلا دنیا ہماری بڑائی کیونکر تسلیم کر سکتی ہے۔ ایچ ڈی آئی انڈیکس کے آخر میں وہی ملک آتے ہیں جہاں انسانیت کراہ رہی ہوتی ہے اور آبادی کا ایک بڑا حصہ کیڑے مکوڑوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

امرتیہ سین کا پہلا اہم CONTRIBUTION تھا مشہور امریکی ماہر اقتصادیات کینتھ ایرو کے IMPOSSIBILTY THEORAM کو بعید از قیاس ثابت کرنا۔ ایرو نے اپنے تجزیہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایسا کوئی ووٹنگ سسٹم بنانا قطعی ناممکن ہے جو بیک وقت RATIONAL بھی ہو اور مساوات اور جمہوریت کے معیار پر بھی کھرا اترے۔ ایرو نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر کوئی ووٹنگ سسٹم بہت LOGICAL، بہت کھرا اور سہی ہو تو وہ سب کے لیے یکساں نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا تانا شاہی خصلت کا ہونا لازمی ہے۔ اس تھیورم کو بڑے پیانہ پر علم اقتصادیات میں استعمال کیا جانے لگا تھا اور بہت سے دوسرے عجیب وغریب نتائج سامنے آرہے تھے۔ سین نے اپنی کتاب ۱۹۷۰ء میں COLLECTIVE CHOICE AND SOCIAL WELFARE میں اس تھیورم کی کمزوریوں کو واضح کیا کہ ایک کامیاب ونگ سسٹم کو عملی شکل دینے کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ جمہوریت کے راستے سے ہٹ کر کوئی راہ اپنائی جائے۔ آگے چل کر انہوں نے اپنی اس بحث کو فلسفیانہ موڑ دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جمہوریت میں سماجی ذمہ داری کے ساتھ انفرادی آزادی پر کوئی حرف نہیں آتا ہے بلکہ اس کے برعکس انفرادیت کی نشوونما کے زیادہ امکانات روشن ہوتے ہیں۔ OO

# ہندی فلموں کے مسلم کردار

ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں مسلم سوشل فلموں کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے اور ہر دور میں مسلم کرداروں کے ساتھ یا مکمل طور پر مسلم سوشل فلمیں بنتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی پہلی بولتی فلم "عالم آراء" بھی ایک مسلم سوشل فلم ہی تھی۔ فلم انڈسٹری کے شروع کے دور میں چونکہ مسلم تہذیب کا کافی اثر ہندوستان پر تھا، اس لیے بھی اس قسم کی کہانیاں کافی تعداد میں فلمائی گئیں جن میں مسلم کرداروں کو پیش کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی کے بعد کامیاب مسلم سوشل فلموں کا فی صد بہت ہی کم رہا ہے۔

جہاں تک کامیاب مسلم سوشل فلموں کا سوال ہے، تو ایسی فلموں کی فہرست بہت ہی مختصر ہے۔ مسلم تاریخی فلموں کو چھوڑ کر گرودت کی 'چودھویں کا چاند' ایچ ایس رویل کی 'میرے محبوب' اور 'لیلیٰ مجنوں' جاں نثار اختر کی 'بہو بیگم' سہراب مودی کی 'مرزا غالب' 'آر چندرا کی 'برسات کی رات' ونود کمار کی 'میرے حضور' ایس یو سنی کی 'پالکی' کمال امروہوی کی 'پاکیزہ' راجندر سنگھ بیدی کی 'دستک' ایس ایم ستھیو کی 'گرم ہوا' ششی کپور کی 'جنون' لیش چوپڑہ کی 'نوری' مظفر علی کی 'گمن' ساگر سرحدی کی 'بازار' بی آر چوپڑہ کی 'نکاح' اور سنجے خان کی 'عبد اللہ' ہر لحاظ سے معیاری مسلم سوشل فلمیں کہی جاسکتی ہیں۔

ان فلموں میں مسلم تہذیب و تمدن اور مسلم معاشرے کی بہترین عکاسی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک فہرست مسلم سوشل تاریخی فلموں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں سہراب مودی کی سب سے کامیاب فلم 'پکار' اور اس کے بعد کے۔ آصف کی 'مغل اعظم' سرفہرست ہیں۔ فلمساز تولہ رام جالان کی فلم 'انار کلی' اپنے گیتوں کی وجہ سے بے حد کامیاب رہی۔ شیخ مختار کی 'نور جہاں' اچھی اور قیمتی فلم ہوتے ہوئے بھی کچھ خامیوں کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو گئی، جس کی وجہ سے شیخ مختار کو ہندوستان ہی چھوڑنا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں اوم پرکاش کو بھی ایک تلخ تجربہ ہوا، فلم 'جہاں آرا' کی ناکامی سے۔ فلمساز اے کے۔ نڈیاڈ والا کی فلم 'تاج محل' جس کے ہدایت کار ایم۔ صادق تھے، کامیاب رہی تھی۔ ان سب کے علاوہ کمال امروہوی کی سب سے قیمتی فلم 'رضیہ سلطان' بھی ناکام ہو گئی تھی۔ ان تاریخی فلموں کے

علاوہ 'شاہ جہاں' بابر، ہمایوں، عدل جہانگیر، ٹیپو سلطان، شیش محل، نوشیرووان عادل، اور پرانی 'رضیہ سلطان' بھی ایسی فلمیں ہیں جنہیں کوئی خاص کامیابی باکس آفس پر حاصل نہیں ہو سکی۔

مسلم سوشل فلموں کے نام پر گزشتہ برسوں میں جو فلمیں بنائی گئی ہیں، ان میں زیادہ تر فلمیں ایسی ہیں جن میں مذہبی جذبات کا سہارا لیا گیا ہے۔ مگر ایسی فلمیں مذہبی تبلیغ کا کام بھی انجام نہیں دے پاتی ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ زینت، زیارت گاہ ہند، شان خدا، میرے غریب نواز، نیاز اور نماز، دیار مدینہ، دین اور ایمان، سلطان ہند، اولیائے اسلام اور نواب صاحب، اس کی مثالیں ہیں۔ حالانکہ ان میں کئی فلموں نے اچھا بزنس بھی کیا مگر ایسی فلموں کو مکمل طور پر مسلم سوشل فلمیں کہنا مناسب نہیں ہو گا۔

ہماری انڈسٹری میں مسلم سوشل فلموں کا ایک مخصوص سا ٹرینڈ بن کر رہ گیا ہے۔ کچھ خاص چیزیں ہر مسلم سوشل فلم کے ضروری اجزاء بن کر رہ گئے ہیں، اسی لیے ان سب فلموں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ہیرو کا شاعر، نواب یا قوال ہونا، شعر و شاعری کا ایک مقابلہ ہونا، ایک طوائف اور اس کے دو چار مجرے، اور کرداروں کا کارٹون جیسا میک اَپ.......... یہ تمام چیزیں ہی مسلم سوشل فلموں کا کل فارمولہ بن کر رہ گیا ہے۔

کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک گھریلو پردہ نشین عورت جو ایک منظر میں برقعہ استعمال کر رہی ہے، اگلے ہی منظر میں بے پردہ نظر آجاتی ہے اور اس سے اگلے منظر میں پھر پردے میں دکھائی دیتی ہے۔ کسی کردار کی موت پر اذان پڑھوادی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسے موقع پر سورۃ یٰسین پڑھوانی چاہئے۔ میک اپ میں عجیب قسم کی داڑھی لگادی جاتی ہے۔ حالانکہ مسلم بوڑھوں میں بھی کافی تعداد میں کلین شیو مل سکتے ہیں۔ یہ مانا کہ لباس کا کافی اثر کردار پر پڑتا ہے، مگر اچھے خاصے کردار کو کارٹون بنادینا کہاں تک مناسب ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کرداروں کے ساتھ مسلم تہذیب کا بھی مذاق اڑایا جارہا ہے۔

اس قسم کی فلموں میں ایک جیسے کردار دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئی ہیں اور دماغ بوجھل ہو گیا ہے۔ آخر مسلمانوں میں ڈاکٹر، انجینئر، کلرک، فوجی، بزنس مین، صنعت کار، ٹیکسی ڈرائیور، مزدور اور چھوٹے دوکاندار وغیرہ بھی تو ہوتے ہیں۔ آخر یہ نواب اور شاعر کب تک مسلم سوشل فلموں کے ہیرو بنتے رہیں گے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم ایس۔ ایم ستھیو نے 'گرم ہوا' میں اٹھایا اور انہوں نے اپنے کردار کو اس روایتی پن سے بچا کر خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ اس کے بعد راجندر سنگھ بیدی نے 'دستک' میں ایک مڈل

کلاس کے مسلمان کا کردار اور مسائل پیش کیے۔ فلمساز ہدایت کار مظفر علی نے بھی اپنی پہلی فلم 'گمن' میں ایک بے روزگار نوجوان اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کا کردار پیش کر کے اس لکشمن ریکھا کو توڑا ہے جو لوگوں نے مسلم کرداروں کے چاروں طرف کھینچ رکھی تھی۔

آج ہندوستان میں بیس کروڑ مسلمان مختلف قسم کے مسائل سے دو چار ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے روزگاری سے وہ بھی اتنے ہی متاثر ہوتے ہیں، جتنے دوسرے لوگ۔ کاروباری مسائل، سیاسی معاملات، ملازمتوں کا مسئلہ اور ملک و قوم کے دیگر مسائل سے وہ بھی برابر متاثر ہوتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی رائٹر یا ڈائریکٹر مسلمانوں کے دوسرے مسائل کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ صرف مذہبی رجحانات، عشق و محبت کی داستان اور شعر و شاعری کو ہی بنیاد بنا کر انتہائی گھٹیا درجہ کی فلمیں آخر کب تک پیش کی جاتی رہیں گی؟ جبکہ مسلم کرداروں کے ساتھ بہترین قسم کی سوشل کہانیاں بھی فلمائی جا سکتی ہیں۔ آزادی کے بعد جتنی بھی فلمیں مسلم کرداروں کو لے کر بنائی گئی ہیں، ان میں تین چار فلموں کے علاوہ کوئی فلم بھی مسلمانوں کے موجودہ مسائل کی ترجمانی نہیں کرتی۔ حالانکہ فلم ہی اس دور کا سب سے بڑا، مضبوط اور آسان ذریعہ ہے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ فلم 'گرم ہوا' میں آزادی کے فوراً بعد کے مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی' تو لوگوں نے اس فلم کو پسند کیا۔ اسی طرح راجندر سنگھ بیدی کی صاف ستھری فلم 'دستک' بھی مسلم سوشل فلموں کے روایتی پن سے بالکل الگ ہٹ کر بنائی گئی تھی۔ اسی طرح 'گمن' میں ایک مسلم بے روزگار نوجوان کے چند مسائل بڑی خوبصورتی سے پیش کیے گئے اور ساتھ میں بڑے شہروں کے مسائل کو بھی جوڑ دیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک اور فلم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، وہ ہے ششی کپور کی 'محافظ'۔ حالانکہ اس فلم کا موضوع بھی ایک شاعر کی زندگی ہی ہے۔ مگر وہ آج کے مسلم کردار کے مسائل بیان کرتی ہے اور ڈگر سے ہٹ کر بنائی گئی ایک بہترین فلم ہے۔

یوں تو ہندی فلموں میں بے شمار مسلم کردار پیش کیے جا چکے ہیں۔ مگر وہ زیادہ تر روایتی ہی رہے ہیں۔ مثال کے طور پر فلم شعلے میں امام صاحب کا کردار اور فلم قلی کا امیتابھ بچن یا دیوار کا یونس پرویز.......... اس طرح کے تمام کردار مسلم جذبات کو ابھار کر ٹکٹ کھڑکی پر ناظرین کی بھیڑ تو جمع کر سکتے ہیں مگر ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتے، ان کے مسائل اور ان کے حالات بیان نہیں کر سکتے۔ اسی طرح فلم امر اکبر انتھونی میں اکبر کے کردار کو صرف ایک عاشق کا روایتی انداز ہی مل سکا ہے اور اس کے ساتھ ہی نیتو سنگھ کے والد کے کردار میں مقری کو تو بالکل کارٹون بنا کر پیش کیا ہے اور ایک گانے 'طیب علی پیار کا دشمن' میں

اس کا مذاق ہی اڑایا گیا ہے۔ اسی طرح فلم 'نکاح' میں راج ببر کا کردار لیں تو وہ پان کھاتا، شعر سناتا اور ہر وقت آداب عرض ہی کرتا رہتا ہے۔

راج شری والوں کی ایک فلم آئی تھی دلہن وہی جو پیا من بھائے۔ اس فلم میں ایک کردار افتخار نے ادا کیا تھا، جو مدن پوری کا فیملی ڈاکٹر ہے۔ یہ کردار پوری فلم میں متاثر کرتا ہے اور روایت سے ہٹ کر ایک بہترین کردار ہے۔ حال ہی میں ریلیز فلم 'تمنا' میں بھی منوج باجپئی نے ایک بہترین مسلم کردار ادا کیا ہے حالانکہ اس کردار میں بھی روایتی مسلم کردار کی جھلک ملتی ہے، مگر کہانی اور فلم کے ماحول نے اس کردار کے ہلکے سے روایتی پن کو اس پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔

فلم 'سرداری بیگم' میں حالانکہ پوری فلم کا ماحول مسلم معاشرہ ہی ہے مگر خود سرداری بیگم کا مرکزی کردار پوری طرح سے روایت سے ہٹ کر ہے اور ساتھ میں سرداری بیگم کا بھائی اور اس کی بیٹی جو ایک جرنلسٹ ہے، پوری طرح روایتی مسلم کرداروں سے الگ ہٹ کر پیش کیے گئے کردار ہیں۔ موجودہ دور میں اس فلم کے تانے بانے کو جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ ایک مثال ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ فلموں میں مسلم کرداروں کی صحیح عکاسی کی جائے اور ان کے لباس سے، ان کے میک اپ سے اور ان کے انداز واطور سے وہ آج کے دور کے ہی مسلم کردار لگیں۔ ان کے مسائل آج کے دور کے ہی مسائل ہونے چاہئیں۔ محض مسلمانوں کے جذبات بھنانے یا اس معاشرے کا مذاق اڑانے کے لیے اس طرح کے مسلم کردار پیش کرنا دیانتداری نہ ہوگی۔ کسی بھی فلم میں مسلم کردار پیش کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ وہ بھی ہمارے ہی سماج کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ○○

# قابل مطالعہ کتابیں

- مشرف عالم ذوقی کا 'بیان'

—— کفیل آزر

- ڈرواساکا 'دس دن'

—— مشرف عالم ذوقی

- سن اے کاتب: حقیقت سے افسانے تک

—— مشرف عالم ذوقی

- مہاساگر

—— ایم. قمر

- میر شناسی

—— نعمان شوق

- اردو افسانے کا پس منظر

—— کوثر مظہری

- حکیم کلب علی شاہد: شخصیت اور فن

—— مسعود التمش

اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ

—— خورشید مصطفی رضوی

# ایک غیر معمولی، ناقابل فراموش ناول: بیان

## کفیل آذر

**مشرف** عالم ذوقی کا نام صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ ان تمام قارئین کے لیے بھی نیا نہیں ہے جو اچھے افسانے اور ناول پڑھتے ہیں۔ ذوقی کے بیشتر افسانے میں نے ہندو پاک کے تقریباً سبھی ادبی رسائل میں پڑھے ہیں اور متاثر ہوا ہوں ___ کیونکہ ذوقی نے ہمیشہ بیباکی، اور نڈرتا سے دیش، سماج، معاشرے، تہذیب و تمدن اور انسانیت کے بنتے بگڑتے نقوش کو نہ صرف اپنی تیز آنکھوں سے دیکھا ہے، مشاہدہ کیا ہے بلکہ اس کرب کو دل میں اتار لیا ہے۔ اور پھر ان کے قلم نے اپنے موضوع کے ساتھ بھرپور طریقے سے انصاف بھی کیا ہے۔ ذوقی کا لہجہ، ان کا انداز بیان۔ کم الفاظ میں بہت بڑی بات کہنے کا فن مانگے کا اجالا نہیں بلکہ یہ ان کی بصارت اور بصیرت کا واضح ثبوت ہے۔ ذوقی "بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں۔ تجھے اے زندگی ہم دور سے پہنچان لیتے ہیں" کا وصف رکھتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی رائے سے مجھے مکمل اتفاق ہے۔ کہ اس دور میں جتنی بڑی کہانیاں ذوقی کے قلم سے نکلی ہیں دوسرے قلمکاروں کے یہاں اس کا فقدان ہے یا جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے الفاظ میں ذوقی بڑے اہم موضوعات پر بڑے پن کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ اور اردو میں ایسا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے ذوقی کے اس ناول کو صرف پڑھا نہیں ہے بلکہ محسوس بھی کیا ہے۔ بڑے ادیب یا شاعر کی پہچان عمر یا بہت زیادہ لکھنے سے نہیں ہوتی۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ کسی افسانہ نگار کا پہلا اور ایک ہی افسانہ ہزاروں افسانوں کو بے اثر کر دیتا ہے۔ یا کسی مبتدی شاعر کا ایک شعر اکثر بڑے بڑے استاد شعراء کے دماغ کی چولیں ہلا دیتا ہے۔ میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تخلیق وہی بڑی ہوتی ہے جو قاری کے دل میں اتر جائے۔ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ علامتیں اتنی ٹیڑھی میڑھی نہ ہوں کہ وہ سر سے گزر جائیں یا خود تخلیق کار جب انہیں دیکھے تو اسے سوچنا پڑے کہ یہ کیا ہے۔ تخلیق وہی بڑی ہوتی ہے جس کے ساتھ قاری خود کو محسوس کرے۔ اسے اپنی روح میں اتار لے۔ اس کی خوشیاں اور غم۔ اندھیرے اجالے، درد والم سب اپنے معلوم ہوں۔ ایک دور آیا تھا جب جدید ادب کے نام پر بہت سی بے ہودگیاں ہوئیں۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق زندگی،

زمین، سماج، معاشرے اور فرد کی اچھائی برائی سے نہیں تھا اسی لیے ایسی تخلیقات لوگوں کی توجہ کی مستحق نہ ہو کر کچھ ہی دن میں اپنی موت آپ مر گئیں۔

ذوقی مجھے اس لیے پسند ہیں کہ اب تک ان کے کسی بھی افسانے میں، جو میں نے پڑھے ہیں سے لے کر بیان تک کہیں مصلحت پسندی، خود نمائی، شہرت کا ہیضہ، ٹرانی یا تمغہ پانے کی تمنا نہیں نظر آتی۔ ان کے کردار زمینی کردار ہوتے ہیں۔ جیتے جاگتے چلتے پھرتے جنہیں ہم اور آپ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں مگر وہ ان کی نفسیات پڑھ کر کہانی کا موضوع بنا لیتے ہیں۔

ذوقی کے قلم نے ہمیشہ روزمرہ پیش آنے والے واقعات، حادثات کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور جس طرح محسوس کیا اسی سچائی سے کاغذ پر اتار دیا۔ ان کا لہجہ، اسلوب انداز بیان بالکل نیا ہے۔ کہیں کہیں علامتیں بھی ہیں مگر ابہام کہیں نہیں۔ یہی خوبی انہیں ان کے ہم عصروں میں ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار فرضی نہیں ہوتے۔ موضوعات، واقعات گھڑے ہوئے نہیں ہوتے۔ وہ حقیقت پسند ہیں اور انجام سے بے پروا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی "بیان" جیسا بولڈ ناول نہیں لکھتے۔ بیان ایک طرح سے سیاست سے جڑا ہوا ناول ہے۔ بابری مسجد کے انہدام یا شہادت کا مرثیہ ہے۔ بدلتی ہوئی سماجی قدریں۔ معاشرہ تہذیب و تمدن، زبان، نفرت، فرقہ پرستی، ذات پات کے فاصلے، پرانی تہذیب و روایات، وضع داری، نیک نیتی، آپس کا بھائی چارہ، عید بھی سب کی دیوالی بھی، مگر اب...... اب تو نہ جانے اس آزادی کو کس کی نظر لگ گئی کہ ہم غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہم جو آج ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں۔ ہماری زبان جو آزادی سے پہلے سب کی زبان تھی اور آج پوری دنیا میں پڑھی، بولی اور سمجھی جا رہی ہے وہ پلک جھپکتے ہی مسلمان ہو گئی۔ آج ہم اپنے روایتی لباس پہنتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ ہجوم میں کسی کے چہرے پر یہ نہیں لکھا کہ وہ کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ یا تو یہ میری کم مائیگی ہے یا حقیقت کہ میں نے بابری مسجد کی شہادت پر کسی کا افسانہ نہیں پڑھا۔ البتہ کچھ مشاعرے باز شاعروں نے جاہل مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے والے شعر کہہ کر نعرہ تکبیر ضرور لگوا دیا اور اگلے مشاعرے میں اپنی قیمت بڑھوا لی۔ خلوص اور مذہب کا احترام یہاں بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم خود اپنے آپ کو امیدوں کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے تو حق کہاں سے ملے گا۔ حق آج کل مانگا نہیں جاتا چھینا جاتا ہے مگر آج جو حالات ہیں انہوں نے مسلمانوں کو اتنا بے بس اور مجبور کر دیا ہے کہ وہ بھول ہی گئے کہ ہم نے اور ہمارے اجداد نے بھی اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنی بیویوں کو بیوہ، اپنے بچوں کو

یتیم اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بے آسرا کیا ہے۔ کیا اس قربانی کی کوئی قیمت کوئی صلہ نہیں ہو گا۔ آج ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستانی ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ اردو کو پاکستان کی زبان کہہ کر در بدری پہ مجبور کیا جا رہا ہے۔ آزادی ملے ہوئے پچاس سالوں میں ہمارے سینے سے لگ کر اس طرح پیٹھ میں خنجر گھونپا گیا کہ ہم اپنی پہچان اپنے رسم و رواج اپنی روایات، اپنی تہذیب سب کچھ بھول گئے۔ آج ہمارے بچے ہندوستان کی سب سے خوبصورت زبان سے ناواقف ہیں۔ افسوس ہوتا ہے جب چند پڑھے لکھے اور شاعروں یا ادیبوں کو اپنے بچوں کو ہندی میں خط لکھنا پڑتا ہے کہ اب یہی ان کی مادری زبان ہو گئی ہے۔ مگر پچاس سال میں ہم ہندی کو اس قابل نہیں بنا سکے کہ وہ رابطہ کی زبان بن سکے۔ اب بھی ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ لباس میں، زبان میں، یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہمارے ملک کے بننے والے پرائم منسٹر تک ہندی نہیں جانتے۔ اس لیے کہ اب ہم بھارتی نہیں ہیں۔ پنجابی ہیں، مراٹھی ہیں، گجراتی ہیں، یعنی اب تہذیب، روایات رسم و رواج اور زبان صوبوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہم ہندوستانی اپنے بچوں کو کانوینٹ میں اس لیے پڑھاتے ہیں کہ وہاں انگریزی میڈیم ہے۔ جیسے انگریزی پڑھنے والا ہی پڑھا لکھا ہوتا ہے۔ اسی کے لیے نوکریاں ہوتی ہیں۔ ہم اپنی زبانوں کو انگریزی سے کم تر سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ جو عام زندگی میں ہم دیکھتے اور سوچتے رہتے ہیں، ذوقی نے ان سب باتوں کو اپنے ناول میں بہ کمال فنکاری، قید کر لیا ہے۔

قابل مبارکباد ہیں ذوقی کہ انہوں نے محسوس کیا، کہ پچاس سال سے ہمیں دھوکہ دیتا ہوا یہ کھوکھلا سیکولرزم اب زیادہ دن کا مہمان نہیں نظر آ رہا ہے۔ اب اس کی جگہ "ہندوتو" کی حکومت ہو گی۔ آج کے تعلیم یافتہ دور میں بھی پڑھے لکھے لوگ آپسی میل ملاپ محبت اور بھائی چارگی کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ پھر جاہلوں کی سوچ کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں اور آنے والا وقت شاید اس سے بھی زیادہ بھیانک اور فرقہ پرست ہو گا۔ پتہ نہیں پھر ہمارا وجود باقی رہے گا بھی یا نہیں۔ ایسے حالات میں ذوقی نے انجام سے بے پرواہ ہو کر ایک مجاہد کی طرح ہاتھ میں قلم کی تلوار پکڑ کر فرقہ پرست اور دھوکے باز پارٹیوں کے نام لے کر ان کے چہروں سے جھوٹ کا خول اتارا ہے۔ ان کی اصلیت کو بے نقاب کیا ہے۔ اور اپنا انجام میرے خیال سے خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ کاش یہ جرأت ہمارے اور ادیب و شعرا اپنا فرض سمجھ کر دل میں پیدا کر لیں تو پھر قلم کی تلوار فرقہ پرستی، تعصب، دھرم و مذہب کے بیچ انسانی خون کی لکیر کھینچنے والوں کے منہ پر طمانچہ مار کر اپنا حق چھین لیں گے۔ عوام کو بیدار کریں گے۔ اس بات سے میری مراد قطعاً یہ نہیں ہے کہ ذوقی نے کوئی اسلامی ناول، نسیم حجازی یا

مولانا صادق سردھنوی بن کر لکھدیا ہے۔ بلکہ انہوں نے آج کے حالات کا صحیح آئینہ لوگوں کو دکھایا ہے۔ راستے اور منزل کی نشاندہی کی ہے تا کہ کچھ مائی کے لال اپنے ایمان کی انگلی پکڑ کر بے عزتی کی زندگی کے گندے پانی کو آسانی سے پار کر کے اپنے سر پر عزت کا تاج رکھ لیں۔ یہ ذمہ داری زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں پر آتی ہے کیوں کہ "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" نے ہندوستانیوں کے خون میں جوش کی مشعلیں روشن کی تھیں اور ایک ایسی قوم کو اس ملک سے نکالا تھا جس نے تقریباً دو سو سال ہمیں غلام بنائے رکھا۔

آج ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہونے کی امیدیں ہیں انہیں اچھی طرح پہچان لیا گیا ہے۔ اسی لیے یہ ناول اتنا المناک، درد بھرا، اور سچائیوں سے پڑ ہے۔ یہ ناول بالمکند جوش کے بیان سے شروع ہوتا ہے وہ بیان جو وہ زندگی بھر نہیں دے پائے۔ اور سورگواسی ہوگئے۔ جوش اور برکت حسین اس تہذیب، سماج، معاشرہ، زبان، رسم و رواج، بھائی چارے کی علامت ہیں جو اب اپنا جنازہ خود اپنے کاندھوں پر اٹھائے ماتم کناں ہیں کہ یہ کیا ہو گیا، کیا ہو رہا ہے۔ یہ محبت کے پیڑ میں پھولوں کے بجائے کانٹے کہاں سے پیدا ہو گئے۔

۱۹۴۷ء کے بھیانک فساد کے المیے پر ترقی پسند افسانہ نگاروں نے بہت کربناک اور حقیقت پر مبنی کہانیاں لکھیں۔ ایک ٹرین پاکستان سے لاشوں کو لادے لا رہی ہے تو دوسری ٹرین ہندوستان سے زندگی سے چھٹکارہ دلا کر پاکستان جا رہی ہے۔ معاشرے میں پھر انقلاب آیا۔ سماجی قدریں بدلیں، پرانی روائتیں رد کر دی گئیں۔ آپسی بھائی چارہ فرقہ پرستی میں بدل گیا۔ ذات پات اور اونچ نیچ کے جھگڑے زور پکڑ گئے اور دھرم و مذہب زندگی یا موت کا پروانہ بن گئے۔ آئے دن فساد ہونے لگے۔ مسلمانوں کو ان کے حق سے غیر محسوس طور پر محروم کیا جانے لگا۔ پولیس اور سرکاری عملہ بھی متعصب ہو گیا۔ تب مشرف عالم ذوقی کا جنم ہوا۔ اور انہوں نے بیان دے دیا۔ اس بیان کے مرکزی کردار جوش، اور برکت حسین کے علاوہ بھاجپا اور کانگریس بھی ہیں۔ یہ ناول اپنے آپ میں ایک بھرپور المیہ ہے۔ مرثیہ ہے اس بد نصیب ملک کا جو بھارت کہلاتا ہے۔ ذوقی نے کہیں کہیں ایسے لفظ اور ایسے جملے استعمال کئے ہیں کہ بے ساختہ یا تو دل بھر آتا ہے یا اس تباہی پر غصہ آتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ مستقبل کا عفریت اپنے خطرناک دانت نکالے سب کچھ مٹا دینے کے ارادے سے دلوں کو خوف و ذلت کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس ناول کا پہلا باب ہے۔ ڈراؤنا خواب، اس میں جوش اور برکت حسین اپنے ماضی کو کھوج رہے ہیں۔ کبھی ناامید ہوتے ہیں کبھی پرامید۔ برکت حسین ابھی تک مسلمانوں کی اس روایت کا احترام کر رہے ہیں کہ پان کھا کر اگالدان ہوتے ہوئے پیک زمین یا

دیوار پر تھوکیں گے۔ بالمکند جوش اردو اور فارسی کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ اور برکت حسین ان کے عزیز ترین دوست، سخن فہم، شاعری کے دلدادہ۔ جوش کی یہ خصوصیت کتنی پیاری لگتی ہے کہ وہ مشاعرے میں جانے سے پہلے دیوان حافظ سے فال نکالتے ہیں کہ آج کامیابی ملے گی یا نہیں۔ ان کا لباس رہن سہن، رسم ورواج، زبان، تہذیب وتمدن بالکل مسلمانوں جیسا ہے، اس لیے کہ وہ ہندو مسلمان کے فلسفے سے بے نیاز ہیں۔ یوں وہ اپنے مذہب کی پابندیاں بھی قبول کرتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کی دو جنگیں بھی ان دو کو الگ نہیں کر سکیں بلکہ دونوں مل بیٹھ کر اس نادانی کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چلئے، بیان کے کچھ اقتباسات پر سرسری نظر ڈالتے ہیں:

برکت حسین کے یہ مکالمے۔ 'وقت کو گالی مت دو جوش بھائی۔ ہم ہی خراب ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے عیب ڈھونڈتے ہیں۔ سامنے آؤ تو گلے ملتے ہیں اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں ایک دوسرے کے چھرا بھونکتے ہیں'۔ کتنی سچائی ہے اس مکالمے میں۔ یا برکت حسین کا یہ مکالمہ 'ابھی اینٹھو مت زیادہ جوش بھائی۔ ایک دن وہ آئے گا جب بازار میں مول کرنے جاؤ گے تو پوچھا جائے گا کس کی تھالی چاہیے۔ ہندو کی تھالی۔ یا مسلمان کی تھالی ــــــ یہ کتنا بڑا المیہ ہے ــــــ تھالیاں بھی ہندو مسلمان ہو گئیں۔

''نہیں اپنی مسکراہٹ کسی بری خبر کی طرح ٹوٹتی ہوئی لگی 'کتنا نیا پن ہے اس لہجے میں۔' اپنی ہی آواز نہیں پہچان پائے جوش صاحب'۔ ایک بوڑھا جیسے اپنی ہی ناراضگی کی سولی پر چڑھ گیا۔

جوش صاحب کی پوتی ان سے پوچھتی ہے آپ مسلمان ہیں کیا۔ بہت ضد کرنے اور ڈانٹنے پر وہ جواب دیتی ہے 'آپ اردو جو پڑھتے ہیں' ابھی سے بچوں کے ذہن کو پراگندہ کئے جانے کا المیہ۔ بچی مسلمانوں کی برائی میں ان کے نہ نہانے اور کپڑے نہ بدلنے کا ذکر کرتی ہے۔ 'جانوروں کو مارتے ہیں'۔ 'بدمعاش ہوتے ہیں، قتل کرنے سے نہیں چوکتے، سیکھا کہاں سے ــــــ ڈیڈی بتاتے ہیں۔ کبھی کبھی ماں بھی بولتی ہے 'بتایئے یہ تعلیم نابالغ کمسن اور معصوم بچوں کے ذہنوں کو کیا بنائے گی ــــــ کیا سکھائے گی۔ 'تجارتی زبان سیکھ گئے' آج کل کی بے ایمانی اور منافع زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے والے کس طرح سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ ایک ہی جملے میں اتنے معنی ہیں۔ یہ جملہ جوش صاحب نے ادا کیا ہے کیونکہ انہوں نے وہ دور دیکھا ہے جب تجارت ایمانداری سے ہوتی تھی۔ 'پھول آپ کا استقبال کریں گے'۔ مگر اب اولاد نے سارے پھولوں کو روند کر کچل کر

فالتو زمین کار آمد کرلی۔ دکانیں بنا کر کرائے پر اٹھادیں۔ برکت حسین خفا تو ہوئے۔ تھوڑے دنوں تک ناراض بھی رہے۔ 'پھر وقت کی آواز سن کر چپ ہو گئے۔ یہی ان کی مرضی۔ صرف ایک پیڑھی کے فرق نے ان کی دلی خوشیاں اور گھر کی رونق چھین لی اور انہوں نے بے بسی سے اپنی مجبوری کا تماشہ دیکھا۔ یہ جملے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں مگر حالات کی مجبوری پر کس طرح نوحہ کناں ہیں۔ 'خوشبو کا کیا کرنا ہے، ابّا، کتنا بڑا طنز تھا۔ ظاہر ہے خوشبو نہ پیٹ بھر سکتی ہے نہ روز روز کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔

''اب تو سینکڑوں برس کا فاصلہ ہے' کبھی کبھی لگتا ہے میاں'' ''سارا دن بس شطرنج لے کر بیٹھ گئے اسی میں تو تباہ ہوئے مسلمان ـــــــ کتنی سچائی ہے اس جملے میں۔ اب مات ہی مات ہے ہمارے لیے۔ ہاتھوں سے پیادے گرادیئے''۔

آواز لرز گئی۔ ''تم کیا ہراؤ گے میاں! اب تو ہم لگاتار ہار رہے ہیں۔ ہر محاذ پر۔ ہمارے لیے ہار ہی ہار لکھی ہے''

یہ حقیقت بیانی کتنی خوبصورتی سے لکھی ہے۔ سب جیسے کل کی بات ہے اور کل بہت زیادہ پرانا نہیں لگتا جیسے ابھی ابھی پاس سے گزرا ہے...... کوئی گزرا تو باادب ہو گئے ہاتھ پیشانی تک جاکر سلام بن جاتے۔ کتنے حسین جملوں میں مٹی ہوئی تہذیب کا مرثیہ بیان کیا ہے اور ہاتھ پیشانی تک جاکر سلام بن جاتے' کتنا اچھوتا انداز ہے ـــــــ **اظہر عنایتی** کا شعر یاد آرہا ہے اس میں بھی یہی المیہ ہے۔

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

''اب تم بھی خطرے میں ہو بالمکند۔ کیوں؟ تمہارے نام کے ساتھ 'جوش' لگا ہے آدھے مسلمان' میاں ایسا ہوا تو ازار بند کھول کر''......اور حقیقت میں یہ ہوا ہے۔ دو انسان اپنی بے چارگی پر طنز کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اب اس پیراگراف کی سچائی دیکھئے اور ان انسانوں کی دوربینی سے وہ منظر دیکھئے ـــــــ جو ہو رہا ہے اور ہونے والا بھی ہے۔

''کھولو گے تب بھی فرق نہیں پڑے گا نہیں۔ تب بھی فرق نہیں پڑے گا جوش میاں کیونکہ اب ہمارے بعد تم ہو۔ تم جیسے سیکولر سوچنے والے۔ اب وہ چن چن کر تمہیں ختم کریں گے۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں تلاش کریں گے اور ختم کر دیں گے'۔ یعنی گلے صرف مسلمانوں کے نہیں کٹیں گے بلکہ اس ملک کے سیکولرزم کے ٹکڑے کر کے ان کی چتا جلادی جائے گی۔ اور پھر صرف ہندوتو ہو گا۔'' کتنی بامعنی ہے یہ علامت اور اس کا احساس۔

بالمکند جوش اور برکت حسین اپنے ماضی کی رواداری، آپسی بھائی چارے، ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار کے مسکراتے ہوئے چہرے پر فرقہ پرستی کی سیاہی پوت کر اسے کریہہ بناتے ہیں۔ اور وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتے ہیں کہ اب بابری مسجد کو شہید کرنے والوں کی بھیڑ میں اپنے دونوں بیٹوں انل اور نریندر کو بھی دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور پھر نہ جانے کتنے انل اور نریندر ان کے ساتھ شامل ہو کر عہد رفتہ کی ایک مقدس نشانی کو زمیں بوس کر دیتے ہیں۔ جوش یہی خواب دیکھتے ہیں اور ڈر جاتے ہیں۔

بابری مسجد کے سانحہ پر اس سے خوبصورت، جامع، اور حقیقت پر مبنی تحریر ابھی تک نہیں پڑھی۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد سب سے زیادہ خطرناک فساد بمبئی میں ہوا تھا۔ یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ مضمون سے ذرا الگ ہٹ کر میں کچھ اپنی بات کرلوں۔ میں وہیں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں پر پولیس اور پی اے سی کی گولیاں برستی دیکھیں۔ آنسو گیس نے مجھے بھی تکلیف پہنچائی۔ بم پھٹے۔ عورتیں اور بچے روتے چیختے ادھر سے ادھر اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھے۔ پولیس اسٹیشن کے سامنے بمبئی کے ایک مقتدر صحافی کے گھر کو شیو سینکوں نے آگ لگائی اور پولیس تماشائی بنی رہی۔ پولیس نے گھر میں روٹی بناتے ہوئے بنگلہ دیشی جوان لڑکوں کو سڑک پر زبردستی بھگا کر گولیوں سے بھون ڈالا۔ اور اسے کاؤنٹر فائرنگ کا نام دے دیا۔ مسلم علاقوں میں عورتیں اور مرد رات رات بھر جاگ کر پہرہ دیتے تھے۔ اس پر بھی پابندی لگ گئی۔ اور اس کے بعد مہاراشٹر کے کاغذی شیر بال ٹھاکرے نے اپنے اخبار سامنا میں ان شیو سینکوں کو بدھائی دی اور کندھے پھلا کر لکھا کہ مجھے ان شیو سینکوں پر گرو ہے جنہوں نے ڈھانچہ گرا دیا۔ اور ہندو دھرم کی آبرو بچالی۔ بمبئی میں ساری آگ بال ٹھاکرے نے لگائی تھی۔ لیکن اب جب کورٹ نے ۴۹ مجرم لوگوں کو بابری مسجد شہید کرنے کا مجرم پاکر انہیں نوٹس دیا تو وہ کاغذی شیر بوکھلا گیا اور سفید جھوٹ بولنے لگا کہ میں نے ایسا نہ کہا نہ لکھا۔ کسی کے پاس ثبوت ہو تو پیش کرے۔ اب اس سے کوئی پوچھے کہ جہاں لوگ اپنے سانسوں کو ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے وہ ثبوت کہاں سے اکٹھا کرتے۔ اس وقت بی جے پی۔ وشو ہندو پریشد۔ بجرنگ دل۔ راشٹریہ سوئم سیوک دل کے لوگوں نے بھی زبان بند کرلی تھی۔ کرسی اور اقتدار کے لالچ میں چاہے انہوں نے کوئی جرم کیا ہو مگر آخر کار ان کے اندر بھی ایک انسان ہے جس کا ضمیر بھی ہے اور وہ انسانوں کے خون کی ہولی سے تکلیف محسوس کر کے کراہنا بھی بھول گئے تھے مگر یہ کاغذی شیر ایک لمحہ اپنی زبان بند نہیں رکھ سکا۔

"فلاں مندر سے اعلان ہوا مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنے دی جائے گی۔ رائٹ ہو تو پولیس اور ہندوؤں کی دوستی دیکھنے میں آتی ہے۔" جس ملک کا انتظامیہ بھی متعصب اور فرقہ پرست ہو جائے وہاں کس طرح گزر ہو سکتی ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی ہمت و جرأت ہے کہ وہ یہاں رہ رہے ہیں۔

برکت حسین سے منا کے بارے میں انسپکٹر پوچھتا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ برکت حسین کو پھر رونا آیا آپ پوچھ رہے ہیں میں کیا چاہوں گا ——— میرا بیٹا غائب ہے۔ ایک بوڑھا باپ ایسے میں کیا چاہ سکتا ہے۔ موت کتنی آسان ہو گئی ہے۔ موت سب سے آسان ہو گئی ہے۔ واقعی اور اب تو جھوٹ بھی سچا نہیں ملتا۔

"سچائی یہ ہے کہ ہندو کبھی ہنسک نہیں ہو سکتا۔ ہندو اہنسا کا ہی دوسرا نام ہے۔" فرقہ پرستوں پر کتنا گہرا طنز ہے۔ "برکت حسین اس کے چہرے کے زخمی اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے" "کیا زبان ہے سبحان اللہ۔" "ساڑھے بارہ بجے اور ڈیڑھ بجے کے درمیان واقعات نے دنگوں کا لباس پہن لیا" "دنگوں کا لباس" کیا استعارہ ہے۔ جوش کا جملہ برکت حسین سے۔ "یہ ہو رہا ہے بھائی کہ اب تم سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ میاں بالمکند جوش! تم ایک مرتی ہوئی تہذیب کا تماشہ دیکھنے کے لیے زندہ ہو۔ اپنے گھر میں ہی کس پر ادھیکار ہے تمہارا۔ اپنے بچوں پر......؟"

"ایک گھٹی ہوئی سانس چھوڑتے ہیں وہ...... میرے بچے کہاں ہیں۔ یہ تو بھاجپائی ہیں یا کانگریسی"

"اس جھوٹ کو غلط نہیں کہا گیا ہے جو سچ کے درشن کرنا چاہتا ہو اور ویکتی کو نرک سے مکتی دلاتا ہے۔ ایسا جھوٹ ہزار سچ پر بھاری ہے"۔ ایک جھوٹ کو مذہب کا لباس پہنا کر کتنے غلط کاموں کے لیے استعمال کرنے کا المیہ ...... منچ کے ایک کونے میں خاموش خاموش تحسین بھی بیٹھا تھا۔ ایک مسلمان کے اندرونی جذبات کی کشمکش کے لیے خوبصورت جملے۔ تحسین بھاجپا میں شامل ہو گیا ہے۔ اور یہ آخری جملہ۔ "اور ایک بار پھر دھیرے دھیرے شہر کی فضا بارودی رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔" بالمکند جوش کی باتوں میں کتنی المناکی چھپی ہے۔ "تعتیہ کلام وہ بھی ایک ہندو کی زبان سے؟' بوڑھا آدمی اپنی خواہشوں کا غلام ہوتا ہے۔ کتنے پیوند لگیں گے اس گھر کو، کاش سب ہندو بالمکند جوش اور سب مسلمان برکت حسین ہو جائیں تو اس دیش کی مانگ کبھی خون سے نہیں بھری جائے گی۔ لیکن بدلتے وقت نے پرانی قدروں کو کس حد تک زخمی کیا تھا جسے وہ دیکھ رہے تھے، محسوس کر رہے تھے کہ وقت کی

گردش کا انداز بدلا تھا۔ سورج کا نکلنا ڈوبنا، صبح شام رات کا ہونا۔ موسم کا بدلنا۔ سب میں ایک نمایاں فرق آیا تھا۔ ایک سچے اور اچھے شاعر کی اور عظیم انسان کی سوچ اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ وہ روزمرہ کے دستور میں بھی فرق محسوس کرنے لگا تھا۔ آزادی سے پہلے کا ہندوستان جو غیروں کا غلام تھا اور اپنی اس بے بسی کو محسوس کر کے آزادی کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ اس لڑائی میں نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان۔ سب ایک تھے۔ تعصب اور فرقہ پرستی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مذہب اور دھرم کے جھگڑے نہیں تھے۔ بابری مسجد کی شہادت اور رام للہ کی جائے پیدائش کا شاید اس وقت کے ہندو پنڈتوں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی کیا تاریخ ہے۔ اب اچانک ہی اتنی بہت سی معلومات کہاں سے آگئیں؟ نوابوں اور زمینداروں کے حالات کی بہت صحیح عکاسی کی ہے ذوقی نے۔

"ایک نام بالمکند گھر کے لیے رہ گیا تھا۔ دوسرا 'جوش' والا حصہ ان کے لیے محفوظ تھا۔ جینے کے نام پر کچھ تسلی بچا کر رکھنے کے لیے۔ 'یہ جوش بھی چھن جاتا تو بھلا جینے کے لیے کیا رہ جاتا؟ نام کے دو ٹکڑے ہونا علامت ہے۔ تہذیب و تمدن کے ٹکڑے، خون کے رشتوں کے ٹکڑے۔ انسانیت۔ مذہب اور دھرم کے ٹکڑے۔ مادر وطن کے ٹکڑے۔ نام کے دو ٹکڑوں میں کتنی بامعنی اشاریت اور غم انگیز کہانیاں پوشیدہ ہیں۔ جوش کہتے ہیں۔ 'ٹھیک کہتے ہو، میرے لڑکے بھی یہی کہتے ہیں اردو آپ کی نہیں مسلمانوں کی زبان ہے، تم بھی یہی کہتے ہو، کسی سنتوش کو کیوں لیا گیا، جوش صاحب ایسی غلط سوچ رکھ کر اپنی زبان کو ختم کرانے والے نادان مسلمانوں پر کیا بھرپور طنز کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم جیسے کم علموں نے اردو کو صرف اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھ لیا ہے۔ زبان تو سب کی ہوتی ہے۔ کسی ایک مخصوص فرقے کی نہیں۔ فرق صرف رسم الخط کا ہے جو اس معاشرہ، تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے۔ جوش، اردو تو ہماری زبان تھی ہی نہیں ...... یہ ہماری بے وقوفی تھی۔ یہ تو ...... تمہاری جاگیر تھی۔"

"منا کمرے میں آگیا۔ ابا جو پوسٹر اور اشتہارات ہاتھوں میں لیے کسی سنگ کی طرح کھڑے تھے، یہ سب آپ کو کہاں سے ملا؟ سوال اس کا نہیں ہے یہ کہاں سے ملا۔ یہ ہے کیا، یہ وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں، آگے کچھ مت پوچھئے گا۔ ایک جملے نے ساری کہانی کہہ دی کہ منا بھاجپائی ہو گیا ہے۔

برکت حسین منا کی تعزیت کو آئے ہوئے بھاجپائیوں کا جھوٹ سنتے سنتے پریشان ہو گئے اور بولے 'لوگو! اب مجھ سے کیا چاہتے ہو، مجھے جو کھونا تھا وہ تو میں نے کھو دیا۔ اپنا یقین، اپنی وفاداری، اور اپنا بیٹا ـــــ یہ محلے کے مسلمان بھی مجھے ہی گناہ گار سمجھتے ہیں۔ دیکھو کوئی

نہیں آیا۔ کوئی نہیں آیا۔ "اس درد کو وہی انسان سمجھ سکتا ہے جسکے سینے میں ایماندار دل ہو۔۔۔
شروع سے آخر تک ایسے اقتباسات کی کمی نہیں۔ ذوقی کا ہر لفظ چونکاتا ہے۔ ہر جملے میں بلا کی تاثیر ہے۔ یہ ایک ناقابل فراموش ناول ہے۔ بیان سچ مچ ایک ایسا ناول ہے جس پر صرف اردو زبان کو نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو فخر کرنا چاہیے۔
آج اس عہد میں جہاں ارندھتی رائے کی "دگولڈ آف اسمال تھنگس" اور وکرم سیٹھ کی اے سیوٹیبل بوائے، جیسے معمولی درجہ کے ناول شہرت اور مقبولیت کے منازل طے کر رہے ہیں، خواہش ہوتی ہے کہ کاش ذوقی کا یہ بیان انگریزی زبان میں بھی شائع ہوا ہوتا اور انگریزی کو اولیت دینے والے یہ جان سکتے کہ اردو زبان میں کیسی کیسی انوکھی اور عمدہ چیزیں تحریر ہو رہی ہیں۔ OO

## دُرواسا کا دس دن ٹوبہ ٹیک سنگھ سے دس دن تک

### مشرف عالم ذوقی

ابھی حال میں، جب ایک غیر ملکی ادیب کو ڈکنس کے GREAT EXPECTATIONS کی ماڈرن پیش کش پر ایک بڑے انعام سے نوازا گیا، تو مجھے خیال آیا کہ ہمارے یہاں کے ادیب عظیم 'گمشدہ' کرداروں کی بازیافت کیوں نہیں کرتے ہیں۔
میں اکا دکا مثالوں کی بات نہیں کر رہا، مگر کسی کھوئے ہوئے کردار کو تلاش کرنے کی روایت ہمارے یہاں نہیں رہی ہے۔ دیکھا جائے تو اردو اور ہندی کہانی میں بکھرے ہوئے ایسے کتنے ہی کردار ہیں جن کو آفاقی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آپ وقت اور زمانہ بدل دیجئے لیکن اس کے باوجود وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ چاہے وہ پریم چند کا ہوری ہو، کرشن چندر کا کالو بھنگی، بیدی کی لاجونتی ہو یا منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
یہاں خصوصی طور پر میں منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ تقسیم کے المیہ سے متاثر ہو کر یوں تو سینکڑوں کہانیاں لکھی گئیں مگر منٹو کو جو بھی کہنا تھا، اس نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے حوالے سے، بغیر جذباتی ہوئے بہ آسانی کہہ دیا۔ یعنی آپ پاگل کہہ لیں، کچھ بھی کہہ لیں، کسی بھی نام سے یاد کر لیں، مگر تقسیم ہمیں منظور نہیں۔ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پاگل سہی، مگر وہ نہ ہندوستان کا رخ کرتا ہے، نہ پاکستان جانے میں اس کی دلچسپی ہے۔ "اس کا تو ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی گم ہو گیا ہے اور وہ وہیں NOMAN'S LAND پر دم توڑ دیتا ہے جس پر نہ ہندوستان کا اختیار تھا، نہ پاکستان کا۔

”بشن سنگھ کے گلے سے ایک تیز چیخ نکلی۔ کئی افسر دوڑے ہوئے آئے۔
دیکھا کہ وہ آدمی، جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا تھا،
اوندھے منہ پڑا تھا۔ ادھر کانٹے دار تار کے پیچھے ہندوستان تھا۔ اور ادھر
پاکستان۔ بیچ میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک
سنگھ پڑا تھا۔“

ٹوبہ ٹیک سنگھ گر پڑا اور منٹو نے کہانی ختم کردی۔ اور اس عظیم سانحہ پر اپنا دوٹوک نظریہ بھی واضح کر دیا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی موت کے ساتھ منٹو کی کہانی تو ختم ہوگئی لیکن کسی نے بھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ بعد میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ہوا کیا؟ آیا، اس کی لاش کے ساتھ کیا کیا گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ آزادی کے پچاس برس گزر گئے۔ مگر کسی کو بھی اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی لاش کے بارے میں مزید تحقیق کی کوشش کی جائے۔ اب جبکہ آزادی اپنے پچاس سالہ جشن، کے ہنگاموں سے فرصت پا چکی ہے، درواسا کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ اس ’لاش‘ کی تفتیش ہونی چاہئے۔ یعنی منٹو کی کہانی جہاں ختم ہوتی ہے ’دس دن‘ کی کہانی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔

”لاش شہر کے درمیان پڑی تھی۔ وہ وہاں کب سے پڑی تھی۔ کتنے برسوں
سے، کوئی بھی بتا نہیں پا رہا تھا لیکن اس کی سڑاند سارے شہر میں پھیل چکی
تھی۔ اس محلے کے بچے یہاں کے جوان بھی بتاتے تھے کہ اس لاش کو وہ
ہوش سنبھالنے کے وقت سے ہی دیکھ رہے تھے۔ بزرگوں میں کچھ کا کہنا تھا
کہ لاش وہاں لگ بھگ چالیس پچاس برسوں سے پڑی سڑ رہی تھی۔ کچھ کے
مطابق تو وہ اس سے بھی کہیں زیادہ پرانی تھی۔ کچھ بزرگ، جنہیں کچھ یاد تھا،
بتاتے تھے کہ قریب پچاس برس پہلے شہر میں بھیانک دنگے ہوئے۔ کئی
لوگ مارے گئے۔ بستی کی بستی اجڑ گئی۔ پھر ایک دن سب نے دیکھا سڑک پر
وہ لاش پڑی تھی۔“

درواسا کے یہ دس دن اتنے بھیانک ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تیزی سے بدلتی ہوئی سماجی قدروں اور آزادی کے پچاس برسوں میں سڑاند دینے والی سیاست کے وہ صفحات ہیں، جس کو پڑھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یقین نہیں ہوتا کہ یہ اسی ملک کی آپ بیتی ہے جسے سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا کہا جاتا ہے۔ درواسا نے منٹو کے ٹوبہ

ٹیک سنگھ کو ایک نئے انداز میں پرو دیا ہے۔ یہاں یہ صرف ایک متحرک لاش نہیں ہے۔ یہ ہم سب کی، تمام ہندوستانیوں کی، اور ان لوگوں کی بھی جو کسی نہ کسی صورت میں تقسیم کے ذمہ دار رہے ہیں۔ لاش اور تفتیش کا ہر مرحلہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

دس دن۔ لیکن یہ صرف دس دن نہیں ہیں۔ آزادی کے پچاس برسوں کی تاریخ میں جانے کتنے سیاہ دن آئے ہوں گے۔ لیکن ان پچاس برسوں کے یہ صرف دس دن، ان پچاس برسوں کو آئینہ دکھانے کے لئے کافی ہیں۔ اور حقیقتاً ان دس دنوں میں پچاس برسوں میں ہونے والے بھیانک کانڈوں کی ہی گونج دفن ہے۔ اور یہ ہر گونج ہمیں قدم قدم پر شرمندگی کے بحر ذخار میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ کہنے کو تو ملک آزاد ہو گیا مگر حیف! فیض کی صدا کہیں اب بھی سبک رو انداز میں اپنی تباہ کاریوں کا مژدہ سنا رہی ہے:

کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

حقیقت یہ ہے کہ ہم سارے الزامات انگریزوں پر رکھ کر فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ کہ انگریز تو چلے گئے مگر جاتے جاتے ہندو مسلمانوں کے درمیان شر کی چنگاری رکھ گئے۔ نفرت کے بیج بو گئے۔ اور پچاس برسوں میں سیاست کی یہ شعبدہ بازی یا آتش بازی اپنا رنگ دکھاتی رہی۔ نہیں۔ شاید یہ ان پچاس برسوں کا بولا جانے والا وہ جھوٹ ہے جس کا استعمال بھارت واسی محض اپنی تسلی کے لئے کرتے آئے ہیں۔ حقیقتاً ہم میں کئی چیزوں کی کمی رہی۔ تبھی تو یہ نفرت کے بیج بارود بنتے رہے۔ مثلاً کردار کی۔ ہم برسوں پرانی سنسکرتی کا ڈھول ضرور پیٹتے رہے لیکن آزاد فضا میں یہ سنسکرتی باقی کہاں تھی۔ جو باقی بچی تھی، وہ تھی ہماری نیم کچری، شرم۔ باقی تھا تو گھناؤنے قسم کا ہمارا شرمیلا پن۔ ہم نہ جذباتی تھے، نہ دردمند ہم صرف اس گھوٹالہ سنسکرتی کا ایک حصہ بنے ہوئے تھے۔

اور ایسے میں وہ لاش وہیں موجود تھی۔ وہ لاش برسوں سے وہیں پڑی تھی۔ برسوں سے ہر کوئی اسے دیکھتا آیا تھا اور وہ لاش جو سڑاند دے رہی تھی، دراصل وہ مصنف کے شبدوں میں اس IMPOTENT RAGE یعنی نپنسک کرودھ کی علامت ہے، جس سے اس ملک کے لوگ پچھلے پچاس برسوں سے گزرتے چلے آئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے درواسا کا دس دن ایک بڑا ناول ہے جس کا ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں استقبال ہونا چاہیے۔

ہندی ایڈیشن : کتاب گھر

اردو ایڈیشن : تخلیق کار پبلشرز۔ مترجم۔ ابرار رحمانی

OO

# سن اے کاتب: حقیقت سے افسانہ تک

## مشرف عالم ذوقی

'THE FRAGRANCE OF GUAVA' گبریل گارسیا مارکیز کے طویل مکالموں پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جس کو اس کے دوست پلینیو اپو لینو سیند وزرانے ترتیب دیا تھا۔ ان طویل مکالموں میں اپنی کہانیوں اور ناولوں سے متعلق مارکیز کے وہ خیالات ہیں، جس میں اس نے اپنے تخلیقی کرب کے حوالے سے مفصل گفتگو کی ہے۔ مثلاً مارکیز کا کہنا ہے کہ حقیقت کے بغیر کوئی ادب بڑا ادب ہو ہی نہیں سکتا۔ مارکیز نے اپنے مشہور زمانہ ناول ONE HUNDRED YEARS OF SOLITUDE اور دوسری تخلیقات سے متعلق بتایا کہ ان میں کوئی بھی تخلیق ایسی نہیں ہے، جس کے کردار فرضی ہوں۔ یہ سارے کے سارے کردار دراصل وہ لوگ ہیں جنہیں وہ بچپن سے، بہت قریب سے دیکھتا اور محسوس کرتا آیا ہے۔

'سن اے کاتب' کے پس ورق پر جابر حسین کی کہانیوں سے متعلق کچھ ایسے ہی خیالات رقم کئے گئے ہیں۔

> "آلام لاجا اسے کرچیں تک، اس کتاب میں جو کردار آپ کو ملیں گے وہ سب کے سب زندہ کردار ہیں۔ آپ چاہیں تو بہار کے گاؤں میں اپنی آنکھوں سے انہیں خود دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو اور فرصت بھی تو آپ اپنے کانوں سے ان زندہ کرداروں کی پرالم داستانیں سن سکتے ہیں۔"

سن اے کاتب میں جابر حسین کی چھوٹی چھوٹی تیس کہانیاں شامل ہیں۔ دراصل یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، وہ چھوٹی چھوٹی دنیائیں ہیں جو جابر حسین نے خلق کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جابر نے ان کہانیوں کے توسط سے اردو فکشن کو ایک نیا ڈکشن، ایک نیا لب ولہجہ دیا ہے۔ انہوں نے کہانیوں کے ان مروجہ اصولوں سے گریز کیا ہے، جہاں کہانیاں ایک محدود FRAME-WORK میں الجھے الجھے پیچیدہ فلسفوں اور فارسی آمیز زبان کے بوجھل ماحول میں گم کردی جاتی ہیں۔ جابر جانتے ہیں کہ فکشن میں زبان اہم نہیں، موضوع اہم ہے۔ وہ محض الفاظ کی قلابازی پر یقین نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی کسی چونکانے والے کلائمکس پر۔ جابر حسین کا اصل یقین تو وہ زندگی ہے کہ بقول ہیمنگ وے "ہم انسان ہیں اور ہمیں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔" ایسا لگتا ہے جیسے جابر ایک ایسا فوٹوگرافر ہے، جو قطب مینار کی اونچی چوٹی پر کھڑا اپنے

گرد و پیش کے حالات کی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ لیکن وہ محض فوٹو گرافر رہنا نہیں چاہتے، ان کے اندر کا فنکار ایسے تمام واقعے، حادثے یا المیہ پر بہت خاموشی کے ساتھ اور بغیر آواز کے اپنی مداخلت یا اپنا احتجاج درج کرائے بغیر نہیں رہتا۔ مثال کے لئے ـــــــ

"......اور شاید یہ بھی اتفاق نہیں کہ شانیتا پندرہ دن بیت جانے پر آج بھی گاؤں کی سہر گولی میں رات گئے آکر کسی دروازے پر سہمے، سوئے، جاگے بے زمینوں کو دھمکا جاتے ہیں۔ جو شایکا کا ہوا، وہی تمہاری عورت کا ہوگا، اگر زبان کھولی۔
اپنی عورت کسے پیاری نہیں؟

ـــــــ شانیتا

جانے کیوں اسکولی دنوں میں پڑھی یہ کہانی آج میری یادداشت پر سیاہ بادلوں کی طرح چھاگئی ہے۔

ـــــــ نرتکی

موت کی نیند سونے والا نندالوٹ کر اس سوال کا جواب دینے نہیں آئے گی مگر ایک سال چھ مہینے کے بچے روی کو اس کا جواب چاہئے۔ کون دے گا یہ جواب۔

ـــــــ کالے چمڑے کی بیلٹ

احتجاج کا یہ رویہ ان کی تمام کہانیوں کا وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں مصنف نے اپنا آکروش درج کرایا ہے۔ اب سوال ہے، ایسا ہونا چاہئے تھا، یا نہیں۔ فکشن کے مروجہ اصولوں کی نفی تو نہیں کر رہا؟ ـــــــ آپ کا جواب جو بھی ہو، میرا سیدھا سا جواب ہے۔ بیشک، ایسی کہانیوں / حادثوں / المیوں کی تصویریں اتار دینا کافی نہیں ہے۔ ایسی کہانیوں میں مصنف کی مداخلت ضروری ہے۔

سن اے کاتب کی (میرے خیال سے) تمام تر کہانیاں بہار سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں بہار کے کھیت کھلیان ہیں، مزدور ہیں۔ مظلوم عورتیں ہیں۔ دبے کچلے کمزور طبقے کے لوگ ہیں جو برسہا برس سے ظلم و زیادتی کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ جابر حسین دھیرے دھیرے کیمرہ پین کرتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک تصویر۔ غلامی کی، جسمانی غلامی کی، ظلم کی، بربریت کی... برتری کی... کمتری کی... کیمرہ دھیرے دھیرے ہر تصویر پر چارج ہوتا ہے اور۔ جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں لکھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی دنیائیں.... اور ان چھوٹی چھوٹی

دنیاؤں کی تخلیق کے لئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت بولتے ہوئے جملے، ہندوستانی زبان۔ یہی وہ نیا ڈکشن ہے جسے جابر حسین نے اپنایا ہے اور اس نئے ڈکشن کی بدولت وہ اردو فکشن کو ایک نیا ڈائمنشن دینے میں کامیاب رہے ہیں۔

اردو سے بےلوث محبت کرنے والے اس شخص کا سفر بے حد تیزی سے جاری وساری ہے اور یقیناً یہ سفر تھمے گا نہیں، رکے گا نہیں۔ 'نئی کہانی' دریافت کرنے والوں کے لئے سن اے کاتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

OO

# مہاساگر

## ایم۔ قمر

مہاساگر کے ایک ایک لفظ سے گزرنا میرے نزدیک صدیاں طے کرنا جیسا تھا۔ سب سے پہلا تاثر جو اس کے محض چند صفحات کے مطالعہ کے بعد ہی میرے اندر ابھرا، وہ تھا:......... ذوقی کا ناول "بیان" جیسے کسی اناڑی کے ہاتھوں میں چلا گیا ہو.........

میں اس بیان کے لیے معافی چاہتا ہوں، لیکن مہاساگر کے حوالے سے اپنے آکروش، اپنے غصّے کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں.........

مہاساگر......... یہ کیا ہے۔ اس ناول میں مصنف کی جگہ کوئی رکشہ والا کیوں سمایا ہوا ہے...... بچکانا مکالمے۔ انتہائی کمزور Observation۔ کہیں کہیں سیاسی بحث ایسی ہے کہ عبدالصمد جیسے تمام اردو کے لکھنے والوں پر شرم آتی ہے۔ کیا یہی لوگ ساہتیہ اکادمی کے انعام کے لیے منتخب کئے جاتے ہیں...... جو نہ سیاست سمجھتے ہیں، نہ ہی عوام کے احساس اور جذبات سے ان کا کچھ لینا دینا ہے۔ جب یہ ملک، ملک کی سالمیت اور مسلمانوں کا مسئلہ چھیڑتے ہیں تو چھت کی بالائی منزل پر بیٹھ کر۔ چیخ چیخ کر رونے کو خواہش ہوتی ہے کہ یا اللہ...... یہ کہاں جا رہا ہے...... یہ تو بچوں کی آپس میں ہونے والی بات چیت بھی نہیں ہے...... آج کے بچے تو اس سے کہیں زیادہ ذہانت کی باتیں کرتے ہیں...... پھر یہ 'بات چیت' کون سمجھتا ہے؟ ان پر لکھتا کون ہے؟ ان پر انعامات کون دیتا ہے؟

اور جب ان پر غور کرنے کی باری آتی ہے تو آج کا مکمل تنقیدی نظام سوال اور شک کے دائرے میں آجاتا ہے۔ یعنی ایک تو بچکانہ تخلیق، اور دوسرے، اس پر باتیں کرنے والے

بچکانہ ناقد.........اردو زبان و ادب کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا......؟

بہت ممکن ہے، کہا جائے، یہ تبصرہ نہیں Escape ہے......میں نے نہ کہانی پر بات کی، نہ مثالیں پیش کیں اور ایک بیان دے دیا......

تو قارئین! مہاساگر میں کوئی کہانی نہیں ہے۔ جیسے کوئی بچہ الٹی یا تے کرتا ہے۔ مسلمانوں کے تعلق سے چھوٹے، نچلے طبقہ کے گھروں میں جیسی اور جتنی افواہیں جنم لیتی ہیں، انہیں سلسلہ وار ایسے لکھا گیا ہے کہ کوئی واقعہ چھوٹنے نہیں پائے۔ مصنف کی اس 'بھاگم بھاگ' سے کئی مقام پر ہنسی کم آتی ہے، افسوس زیادہ ہوتا ہے.........میں نے مثالیں اس لیے نہیں گنوائیں کہ کون سی مثال گنوائی جائے......اس ناول کا تانا بانا بنا جانا ہی اپنے آپ میں ایک حادثہ ہے اور اس حادثہ کے لیے عبدالصمد یا کسی بھی ادیب کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔

OO

# میر شناسی

## نعمان شوق

میر شناسی شکیل الرحمٰن کی تازہ تنقیدی کتاب ہے جو اردو مرکز عظیم آباد سے شائع ہوئی ہے۔ یہ مرکز جابر حسین کی سرپرستی میں اردو کی اہم اور گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ میر شناسی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

شکیل الرحمٰن نے جمالیات پر خاصہ کام کیا ہے۔ دراصل میر شناسی بھی میر کی غزلیہ شاعری کا ایک COMPREHENSIVE جمالیاتی تجزیہ ہے۔ میر کی شاعری پر مختلف ناقدین و مبصرین نے اپنے اپنے منفرد انداز میں روشنی ڈالی ہے لیکن میر کی جمالیات کے حوالے سے اس میں 'شرینگار رس' کی دریافت شکیل الرحمٰن کا اہم کارنامہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ہندوستانی جمالیات میں شرینگار رس کو تمام رسوں کا سرچشمہ تصور کیا گیا ہے۔
یہ رس محبت اور غم کے جذبوں سے پیدا ہوتا ہے اور فن میں ان جذبوں کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے......میر تقی میر شرینگار رس کے ممتاز شاعر ہیں۔''

محبت اور غم کا جذبہ شاعری کے بنیادی محرکات میں سے ہے۔ بالخصوص انگریزی کی رومانی شاعری کا تمام تر سرمایہ ان ہی جذبوں کی اپج ہے، محبت اور غم کے جذبات مل کر شاعری میں ایک

خاص قسم کی جاذبیت اور چاشنی کا اضافہ کرتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ شیلی (SHELLEY) نے کہا:

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF THE SADDEST THOUGHT.

محبت اور غم کے یہ جذبات بسا اوقات میرؔ کی شاعری میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ محبت اور غم ایک ہی کیفیت کے دو نام معلوم ہونے لگتے ہیں اور یہ کمال شرینگار رس کا ہے۔

آشنا ہو اس سے ہم مر مر گئے آئندہ میر
جیتے رہئے تو کسو سے اب نہ یاری کیجیو

احساسِ حُسن کی شدت اور رومانیت کی میرؔ کے کلام میں شکیل الرحمٰن نے از سر نو تلاش کی ہے کیونکہ ان دونوں عوامل کے بغیر شرینگار رس کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔ میرؔ کو ان دونوں کا گہرا ادراک ہے یہی سبب ہے کہ میر نے دنیا کو ایسے حسین اور مسحور کر دینے والے اشعار عطا کئے:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ کے کلام میں SENSUOUSNESS اس لئے ہے کہ میر کا جمالیاتی تجربہ جسمانی سطح سے کشید ہوتا ہے۔ شاعر کا وجدان اور تخیل اس کے لہجے کو سرور اور نغمگی عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکیل الرحمٰن نے میر کی شاعری کو حسن کے حسی ردِ عمل کی ایک بڑی خوبصورت شاعری کہا ہے۔

میر کی شاعری میں حیرت و استعجاب کی جو کیفیت اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ احساس حسن کی شدت کی مظہر ہے اور اشعار کی دلآویزی میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ اشعار میں یہ دلآویزی شرینگار رس کے سبب بنتی ہے۔ بقول شکیل الرحمٰن "میر شرینگار رس کی شیرینی، مٹھاس، نفاست اور دلآویزی کے لئے تحیر کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت تجربوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں تحیر لئے تجربوں کے چھوٹے چھوٹے نقش ملتے ہیں۔ انہیں SMALL WONDER کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔"

OO

# اُردو افسانے کا منظر: پس منظر

## کوثر مظہری

زیرِ مطالعہ کتاب اس لئے لائق توجہ ہے کہ اس سے اردو فکشن کے ابتدائی نقوش کی بازیافت ہوتی ہے۔ داستانوں اور قدیم تمثیلوں میں ایسے افسانوی عناصر کی جستجو جو آئندہ چل کر اردو فکشن کے باب میں اضافے کا باعث ہو، یہ ایک کار محال ہے۔ اس کام کو جناب فیاض رفعت نے تحقیقی نقطۂ نظر سے انجام دیا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ نہ صرف اردو اور عربی وفارسی حوالوں کی روشنی میں بات کی ہے بلکہ مغربی ذخائر سے بھی اکتساب کیا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ چوں کہ انہیں مغربی ادب سے بھی خاصا شغف رہا ہے اس لئے اردو فکشن کی جڑیں مضبوط کرنے میں جن مغربی ذرائع کا ہاتھ رہا ہے ان سے بھی فیاض رفعت نے بحث کی ہے۔

فیاض رفعت نے رامائن اور مہابھارت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہ محض سنسکرت کی رزمیہ داستانیں ہی نہیں بلکہ ایک پورے دور کی تہذیبی علامتوں کا سرچشمہ بھی ہیں، جہاں مذہب، سیاست، حسن وعشق اور رزم و بزم کے شیدائی قدیم ہندوستانی پیکر میں اس طرح سموگئے ہیں کہ انہوں نے صنمیاتی اور اسطوری حیثیت اختیار کرلی ہے (ص ۱۷)

یہ سچ ہے کہ رزم و بزم اور مذہب وسیاست سے متعلق تحریروں میں افسانوی نقوش بہت ملتے ہیں۔ انسانی زندگی اور سماجی تبدیلیوں کے باعث بھی ادب اور فکر میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ذہنی ساخت اور ضروریات زندگی کے پیش نظر ادب تخلیق ہوتا ہے۔ فیاض رفعت نے اپنی اس کتاب میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے۔ انہوں نے ہندو اور مسلم قوم کے بڑے لکھنے والوں کو بھی سامنے رکھا ہے اور مختلف تہذیبوں کے اختلاط اور اس سے پیدا شدہ حالات پر بھی غور و فکر کیا ہے۔ اسی طرح ایسے (ESSAY) میں بھی فکشن کے ابتدائی نقوش کی تلاش کی ہے۔ پھر انہوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر کی تصنیف 'رسوم ہند' کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ اس میں ہنود اور مسلم کے اخلاق و عادات اور عقاید پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں الگ سے تین قصے بھی موجود ہیں۔ (۱) ہندوؤں کی ذاتوں کا بیان (۲) ہندوؤں کی مذہبی باتوں کا بیان (۳) من سکھی اور سندر سکھی کا قصہ۔ آخری پیراگراف میں فیاض رفعت لکھتے ہیں:

''حقیقت تو یہ ہے کہ رسوم ہند میں جو تین قصے دستیاب ہوتے ہیں، انہیں اردو ناول اور افسانے کا پیش رو قرار دیا جانا چاہیے۔''

ظاہر ہے کہ اس موقف سے بحث کا سلسلہ بھی شروع ہو سکتا ہے۔
یہ کتاب تحقیقی نوعیت رکھتی ہے جو معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ ○○



## حکیم کلب علی شاہد: شخصیت اور فن

### مسعود التمش

امروہہ کی چھوٹی سی قدیم بستی ہمیشہ علم و ادب اور دانش و حکمت کا گہوارہ رہی ہے اور یہ چمن ہمیشہ گل ہائے رنگارنگ سے مہکتا رہا ہے۔ چنانچہ حکیم کلب علی شاہد موجودہ دور میں اس چمن کا وہ دیدہ ور ہیں جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں حکیم صاحب کی شخصیت پر مشاہیر اہل قلم کے تاثرات اور رشحات قلم یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان رشحات قلم میں سخی حسن نقوی کا مضمون اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے حکیم صاحب کا خاکہ بڑے دلچسپ و دل نشین انداز میں لکھا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا مضمون پوری کتاب کی جان اور آن ہے اور انہوں نے اپنے مخصوص طرز و انداز میں بڑی پر مغز باتیں بیان کردی ہیں۔ غیور امروہوی نے پر مزاح رنگ میں تاثرات تحریر کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر احمد حسین سیفی نے رموز مطب بیان کئے ہیں۔ سیادت نقوی نے طب و حکمت میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ تابش مہدی نے ان کی گراں بہا شخصیت اور کردار پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ حصہ نظم میں ڈاکٹر مغیث الدین فریدی مدظلہ نے دل ربایانہ الفاظ و انداز میں ہدیۂ آفرین و ستائیش پیش کیا ہے۔ ان کا مقطع ہے:

فریدی کو نہ کیوں ہو ناز اپنی خوش نصیبی پر
کہ فیض شاہ ابنؒ سے ملا کلب علی شاہد

آپ کے علاوہ پروفیسر نثار احمد فاروقی، شہباز امروہوی اور دیگر حضرات کے اشعار بھی شامل ہیں۔

کتاب نہایت دیدہ زیب اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے خوب ہے۔ ٹائٹل پر امروہہ کے ہی ایک مایۂ ناز آرٹسٹ کی کاریگری یعنی حکیم صاب کی تصویر ہے اور قابل داد ہے۔ طباعت کا سہرا تخلیق کار پبلشرز کے سر ہے جو اپنے سابقہ معیار کے مطابق اس پیشکش کے لئے بھی کامیاب اور بہتر کارکردگی پر قابل مبارکباد ہیں۔ ○○

# اُردو مثنویوں میں جنسی تلذذ

## خورشید مصطفی رضوی

زمانہ کچھ ایسا آگیا ہے کہ جنسی میلان اور اختلاط کو انسانی خواہشات اور فطری گرسنگی کا نام دے کر اخلاقی اور مذہبی قید و بند سے آزاد کرنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ گو ہمارا ملک ابھی دوسرے ترقی یافتہ اور 'مہذب' ملکوں سے اس معاملے میں سو سال پیچھے ہے کیونکہ ان ممالک، خصوصاً مغربی ممالک میں تو نہ صرف LIVE SEX SHOW گھومتے ہوئے اسٹیج پر منعقد ہوتے ہیں اور تماشائی سینما اور تھیٹر کی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ہم جنسی اختلاط کو بھی باہمی رضامندی کی شرط پر جواز کے خانے میں لایا جارہا ہے۔ ہر چہار سمت عریاں فلموں کی بھرمار، بلیو فلموں کے سیلاب، کیبرے ڈانس کے شو قدم قدم پر نظر کے سامنے ہیں۔ جوئے بازی کو طرح طرح کے جدید نام دے کر عام کیا جاچکا ہے اور شراب 'مہذب' سوسائٹی میں پانی کی طرح بہتی ہے اور اب ناروا تسلیم ہی نہیں کی جاتی۔ ایسی صورت میں اخلاقی یا مشرقی قدروں کا رونا گویا "شیخ قرآن دکھاتے پھرے ......" کے مصداق ہوگا اور ڈر ہے کہ رقیب تھانے میں جاجا کر رپٹ لکھوادیں گے۔

یوں تو اگر اردو کے شعراء کی زندگی کے ورق الٹیں یا تاریخ کے صفحات دیکھیں تو اس طرح کے افسانے جگہ جگہ نظر آجائیں گے۔ مغل سلطنت کا تو بیڑہ ہی جنسی بے راہ روی کے سمندروں میں غرق ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اس دور کے معاشرہ میں اخلاقی قدروں، مشرقی روایات اور ہندوستانی تہذیب کی جھلک بھی صاف نظر آئے گی اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ آزاد جنسی اختلاط کے رجحانات سے سماج کو قریب لانے میں برطانوی سامراج کے دو سو سالہ اندھیروں کا بڑا ہاتھ ہے۔

اردو شعراء کے یہاں بھی عشقیہ اور جنسی اشارات بعض جگہ حد سے گذر گئے ہیں۔ میر ہی کے کلام میں "راتوں پاس گلے لگ سوتے ......" جیسے اشعار ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر شعراء کے یہاں ایسے اشارے اور تشبیہات بے حد ہیں کہ

دیکھو نہ بولیں گے ہم گر پھر پلنگ بولا
واہ کیا بات کورے برتن کی
بوسے اس بت کے چٹا چٹ میں تو سب لینے لگا

کہہ کے یوں یہ اب کے دو، یہ جب کے دو، یہ تب کے دو
بدگماں ہرگز نہ ہوں وہ ہم جو ان کو چت کریں

بہتر ہوگا کہ اب اصلی مقصد کی طرف آئیں۔ ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی کی تازہ کتاب 'اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ' جو تخلیق کار پبلیشرز نے زیور طبع سے آراستہ کی ہے، پیش نظر ہے۔ کتاب کا عنوان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت مخصوص اور محدود موضوع ہے لیکن ایسا ہے نہیں بلکہ کتاب میں بہت سے کار آمد مباحث آگئے ہیں جو اردو کے ہر طالب علم اور محقق کے لئے مفید اور قابل مطالعہ ہیں۔ نہ صرف مثنوی بلکہ تمام اصناف سخن پر مدلل بحث ہے اور مصنف نے بڑی صلاحیت سے بھرپور جائزہ لیا ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی اور فارسی شاعری کا تجزیہ بھی اسناد اور دلائل کے ساتھ ہے اور مثنوی پر تو بہر حال اس قدر تفصیل اور خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس موضوع پر کتاب منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ پہلے اور دوسرے باب میں مثنوی کی تعریف سے لے کر اردو میں مثنوی نگاری، دکن، دہلی اور لکھنؤ کی مشہور مثنویاں اور دور جدید کی مثنویوں تک پر گہری نظر اور عمیق تبصرہ ہے۔

یہاں لکھنؤ وغیرہ کی بعض مثنویوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جن میں صفیر کاکوروی کی مثنوی واجد علی شاہ کے سفر پر۔ آغا شرف کی مثنوی 'افسانہ لکھنؤ' (قلمی۔ ۱۲۹۰ھ)۔ امان علی سحر کی مثنوی جشن تخت نشینی واجد علی شاہ پر۔ رضا خاں عاشق کی 'رشک ماہ تمام' (قلمی ۱۲۷۶ھ) وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ قلمی مثنویوں میں فتح محمد تائب کی مثنوی بھی اہمیت کی حامل ہے۔ شاہ سید محمد امین غازی کی مثنوی 'فیروزی نامہ' (قلمی) فارسی میں ہے لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے منفرد مقام کی حامل ہے۔ ایک اور مثنوی مولوی ظہور علی کی "مثنوی سید محمود مالا مال کرمانی" کے نام سے ہے جو ۶۲ء میں طبع ہو چکی ہے۔ یہ موضع گٹھاولی ضلع بلند شہر میں ۱۲۶۶ھ میں تصنیف کی گئی ہے۔

باب سوم اور چہارم میں جنس کی تعریف، اردو شاعری کا مزاج اور اس کے جنسی اشارات اور مثنویات میں اظہار جنس پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر اہم مثنوی نگاروں کا تذکرہ ہے۔ غرض یہ کہ کتاب اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ ○○

# ہماری اہم مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| پھول جیسے لوگ (ناول) | انور خان | 80.00 |
| یادبسیرے (افسانے) | انور خان | 80.00 |
| لمحوں کی قید (افسانے) | کشور سلطانہ | 80.00 |
| افسانہ ۸۹ء (انتخاب) | انیس امروہوی | 80.00 |
| موجِ سحر (شاعری) | ڈاکٹر انجنا سندھیر | 60.00 |
| قندوز قند (طنز ومزاح) | فیاض احمد فیضی | 80.00 |
| برزخ (افسانے) | ہاجرہ شکور | 80.00 |
| فرات (ناول) | حسین الحق | 100.00 |
| نیلام گھر (ناول) | مشرف عالم ذوقی | 90.00 |
| گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے) | علی امام نقوی | 60.00 |
| کیامذاق ہے؟ (مزاحیہ شاعری) | اسمٰعیل آذر | 60.00 |
| بھوکا ایتھوپیا (افسانے) | مشرف عالم ذوقی | 110.00 |
| کانچ کی چادر (شاعری) | مریم غزالہ | 60.00 |
| رنگین پرواز (شاعری، اردو رہندی) | پی۔این۔رنگین | 80.00 |
| اردو تنقید حالی سے کلیم تک (تنقید) | سید نواب کریم | 125.00 |
| دل کی بات (افسانے) | ڈاکٹر شبیر صدیقی | 60.00 |
| کاغذ کی دیوار (افسانے) | محافظ حیدر | 60.00 |
| ادھار کی زندگی (افسانے) | مہر چند کوشک | 60.00 |
| اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید) | ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی | 125.00 |
| رت جگے (شاعری) | رحمت امروہوی | 60.00 |
| پیاسا سمندر (افسانے) | عقیلہ تبسم | 60.00 |
| ڈار سے بچھڑے (افسانے) | سیّد محمد اشرف | 100.00 |
| غالبیات اور ہم (تنقید) | ڈاکٹر ابو محمد سحر | 50.00 |
| آخری داستان گو (ناول) | مظہر الزماں خاں | 80.00 |
| رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (تنقید) | خواجہ محمد اکرم الدین | 80.00 |
| دختر ابلیس (افسانے) | محمد شبیر علی محمدوی | 60.00 |
| حکیم کلب شاہد: شخصیت اور فن (شخصیات) | خورشید مصطفیٰ رضوی | 60.00 |

| | | |
|---|---|---|
| ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفر نامہ) | پروفیسر علیم اللہ حالی | 50.00 |
| ساغر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (شخصیات) | ڈاکٹر سلمیٰ شاہین | 100.00 |
| مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تنقید) | ڈاکٹر توحید خان | 80.00 |
| لیکن جزیرہ نہیں (افسانے) | تبسم فاطمہ | 60.00 |
| اپٹا اور اردو ڈراما (تنقید) | شاہد رزمی | 60.00 |
| روتا ہوا آدمی (افسانے) | رئیس نجمی امروہوی | 80.00 |
| فلسطین کے چار ممتاز شعراء (تنقید) | عبدالحق حقانی القاسمی | 60.00 |
| کنیادان (ڈراما) | وجے تنڈولکر (ترجمہ: ڈاکٹر صادق) | 80.00 |
| شہر چپ ہے (ناول) | مشرف عالم ذوقی | 90.00 |
| بیان (ناول) | مشرف عالم ذوقی | 100.00 |
| منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانے) | احمد صغیر | 60.00 |
| سخنورانِ شاہجہان پور (شخصیات) | مبارک شمیم | 125.00 |
| راہ میں اجل ہے (افسانے) | زاہدہ حنا | 100.00 |
| مطالعہ مثنویات مصحفی (تنقید) | ڈاکٹر سعیدہ وارثی | 100.00 |
| بے زبانی کا ہنر (شاعری) | ڈاکٹر سجاد سید | 60.00 |
| حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (شخصیات) | مجیب احمد خاں | 80.00 |
| اسرارِ غالب (غالبیات) | سید قدرت نقوی | 60.00 |
| اردو فکشن کی تنقید (تنقید) | ڈاکٹر ارتضیٰ کریم | 250.00 |
| تذکرۂ خطیر (تنقید) | تاباں نقوی | 60.00 |
| بالمشافہ (انٹرویوز) | معصوم مراد آبادی | 60.00 |
| حریم شوق (شاعری) | نازش سہسرامی | 60.00 |
| سنگ اٹھانے کا حوصلہ (افسانے) | رضاء الجبار | 80.00 |
| مظہر امام کی تنقید نگاری (تنقید) | محمد رضا کاظمی | 60.00 |
| شاخیں (مضامین) | پروفیسر علیم اللہ حالی | 60.00 |
| پوسٹر (افسانے) | قاسم خورشید | 60.00 |
| جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے) | جوگندر پال | 90.00 |
| ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفر نامہ) | ڈاکٹر قمر رئیس | 100.00 |
| کن فیکون (افسانے) | رضوان احمد | 90.00 |
| ادب میں گھوسٹ ازم (طنز و مزاح) | ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی | 80.00 |

| | | |
|---|---|---|
| سلسلے (شاعری) | مدہوش بلگرامی | 60.00 |
| اجنبی ساعتوں کے درمیان (شاعری) | نعمان شوق | 60.00 |
| ایک جام اور (شاعری) | فرحت قادری | 60.00 |
| سوادِ جاں (شاعری) | مبارک شمیم | 60.00 |
| رابطہ (مضامین) | جوگندر پال | 90.00 |
| جمیل مظہری: بحیثیت نثر نگار (تنقید) | ڈاکٹر نعمت اللہ | 80.00 |
| جدید ہندی شاعری (تنقید) | خورشید اکرم | 80.00 |
| ایک غیر مشروط معافی نامہ (افسانے) | خورشید اکرم | 60.00 |
| منڈی (افسانے) | مشرف عالم ذوقی | 100.00 |
| تکمیل (شاعری) | من موہن تلخ | 80.00 |
| سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (افسانے) | حسین الحق | 80.00 |
| نہروں کا جال (شاعری) | خالد عبادی | 60.00 |
| قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیات) | ڈاکٹر سلمیٰ شاہین | 250.00 |
| بے اصطلاح (مضامین) | جوگندر پال | 90.00 |
| ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے) | انجم عثمانی | 80.00 |
| اردو افسانے کا پس منظر (تنقید) | فیاض رفعت | 60.00 |
| دستک (شاعری) | اختر شاہجہان پوری | 80.00 |
| بے ارادہ (افسانے) | رفیع حیدر انجم | 80.00 |
| ادب کی تفہیم (مضامین) | ڈاکٹر شمس الحق عثمانی | 80.00 |
| آئینے کی گرد (افسانے) | شکیل جاوید | 80.00 |
| ہندوستان میں جنگ جمہوریت (سوانح) | جگت رام ساہنی | 90.00 |
| سب رس: جدید اردو میں (تنقید) | قاضی انیس الحق | 100.00 |
| وینس کا پھول (افسانے) | سہیل اعجاز صدیقی | 90.00 |
| موسم عذابوں کا (افسانے) | علی امام نقوی | 80.00 |
| غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے) | مشرف عالم ذوقی | 120.00 |
| وہ دن (افسانے) | غیاث الرحمٰن | 80.00 |
| مراثیٔ شاد کا فکری پہلو (تنقید) | پروفیسر اظہار احمد | 100.00 |
| شام اودھ (ڈرامے) | ڈاکٹر شبیر صدیقی | 100.00 |
| اردو کے نثری اسالیب (تنقید) | شہاب ظفر اعظمی | 150.00 |

| | | |
|---|---|---|
| کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید) | ڈاکٹر ابرار رحمانی | 150.00 |
| جھلتے جنگل (ناول) | انور عظیم | 100.00 |
| اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید) | ڈاکٹر شہناز شاہین | 200.00 |
| میری کہانی (سوانح) | اویس احمد دوراں | 120.00 |
| دس دن (ناول) | دُرواسا | 90.00 |
| معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبال (اقبالیات) | ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی | 150.00 |
| ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تحقیق) | احمد سہیل | 200.00 |
| ذبح (ناول) | مشرف عالم ذوقی | 90.00 |
| ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے) | مجتبیٰ حسین | 90.00 |

## ہماری آئندہ اشاعتیں

| | | |
|---|---|---|
| یوں بھی کھلے پھول (ناول) | اقبال دیپ | 80.00 |
| لابوہیم (افسانے) | انور عظیم | 90.00 |
| اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید) | ڈاکٹر ابو محمد سحر | 80.00 |
| بساط (ناول) | علی امام نقوی | 80.00 |
| شش و پنج (طنز و مزاح) | مسرور آروی | 90.00 |
| درد کا پورٹریٹ (ڈرامے) | مظہر الزماں خاں | 90.00 |
| مسلمان (ناول) | مشرف عالم ذوقی | 100.00 |
| گلدستۂ بیت بازی (شاعری کا انتخاب) | ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی | 90.00 |
| وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات) | انیس امروہوی | 100.00 |
| افسانہ ۹۹ء (افسانوں کا انتخاب) | انیس امروہوی | 90.00 |
| صوبہ سرحد میں جنگ آزادی (سوانح) | جگت رام ساہنی | 90.00 |
| مکالمہ (آج کل کے اداریے) | محبوب الرحمن فاروقی | 100.00 |
| غم دل وحشت دل (ناول) | ڈاکٹر محمد حسن | 100.00 |
| آدھی رات کی شبنم (شاعری) | مرغوب علی | 90.00 |

# اپنی لائبریری اسکیم

قارئین کی سہولت اور اردو سے ان کا تعلق بنائے رکھنے کے لیے ادارہ تخلیق کار پبلشرز نے ایک لائبریری اسکیم کا پروگرام بنایا ہے۔ اس اسکیم کے تحت لائبریری کے ہر ممبر کو گھر بیٹھے اردو کی کوئی بھی کتاب بہ آسانی مل سکتی ہے۔ آپ ہندوستان میں شائع ہوئی کسی بھی کتاب کے لیے ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر بھیج دیجئے۔ کتاب گھر بیٹھے چھپی ہوئی قیمت کی وی۔پی سے آپ کو مل جائے گی۔ وی پی خرچ اور دوسرے ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوں گے۔ آپ کو صرف کتاب کی مطبوعہ قیمت ہی ادا کرنی ہوگی اور آپ کتاب کی تلاش میں بھٹکنے سے بھی بچ جائیں گے۔

"اپنی لائبریری" کا ممبر بننے کے لیے آپ کو ایک بار صرف سو روپے (-/100)ڈپازٹ کے طور پر پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ کی صورت میں تخلیق کار پبلشرز کے نام بھیجنا ہوگا۔ کسی بھی وقت ممبر شپ ختم ہونے کی صورت میں ڈپازٹ کی رقم سو روپے واپس کئے جاسکتے ہیں۔

تخلیق کار پبلشرز کی تمام کتابوں پر لائبریری کے ممبروں کو دس فیصد رعایت بھی الگ سے دی جائے گی۔ گزشتہ دنوں سے بڑھی ہوئی ڈاک شرح کی وجہ سے اس سے زیادہ رعایت دینا ممکن نہ ہو سکے گا کیونکہ وی۔پی خرچ اور دیگر ڈاک خرچ نیز پیکنگ خرچ بھی ہمارے ذمہ ہوں گے۔

دوسرے اداروں کی کتابوں پر کوئی رعایت دینا ممکن نہ ہوگا۔ آپ کو یہ سہولت حاصل ہوگی کہ آپ کتنی ہی کتابیں گھر بیٹھے منگوا سکتے ہیں اور ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔

یہ ساری سہولتیں حاصل کرنے اور اردو کی ترسیل و فروغ میں عملی تعاون کرنے کے لیے آج ہی سو روپے کا پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ روانہ کر کے "اپنی لائبریری" کے ممبر بن جائیے اور گھر بیٹھے اپنی پسند کی معیاری کتابیں حاصل کیجئے۔

ادراہ تخلیق کار پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہونے والی تمام کتب کی اطلاع ماہنامہ قصے کے ذریعے تمام ممبران کو پہلے ہی کر دی جائے گی۔ لائبریری کے تمام ممبران کو ماہنامہ قصے کی خریداری پر بھی خصوصی رعایت دی جائے گی۔

رابطہ: **تخلیق کار پبلشرز** 104/B۔ یادر منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۹۲

(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر نگار عظیم

قیمت: -/100

انسانی سماج اور متوسط طبقہ کی شائستہ معنی خیز لیکن انتشار آلود زندگیوں کی کہانیاں

رابطہ: **تخلیق کار پبلشرز**

104/B- یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

QUISSEY (Urdu Monthly) Feb. 2000
R.N.I. 47285/87
104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

# ہماری اہم مطبوعات

## افسانے:

| | | |
|---|---|---|
| موسم عذابوں کا | علی امام نقوی | =/۸۰ |
| غلام بخش اور دیگر کہانیاں | مشرف عالم ذوقی | =/۱۱۰ |
| وینس کا پھول | سہیل اعجاز صدیقی | =/۱۰۰ |
| آئینے کی گرد | شکیل جاوید | =/۸۰ |
| وہ دن | غیاث الرحمن | =/۸۰ |
| ٹھہرے ہوئے لوگ | انجم عثمانی | =/۸۰ |
| سوئی کی نوک پر رکا لمحہ | حسین الحق | =/۸۰ |
| منڈی | مشرف عالم ذوقی | =/۱۱۰ |
| غیر مشروط معافی نامہ | رشید اکرم | =/۶۰ |
| کن فیکون | رضوان احمد | =/۹۰ |
| جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب | جوگندر پال | =/۹۰ |
| پوسٹر | قاسم خورشید | =/۶۰ |
| سنگ اٹھانے کا حوصلہ | رضاء الجبار | =/۸۰ |
| منڈیر پر بیٹھا پرندہ | احمد صغیر | =/۶۰ |
| روتا ہوا آدمی | رئیس نجمی امروہوی | =/۸۰ |
| راہ میں اجل ہے | زاہدہ حنا | =/۱۰۰ |
| لیکن جزیرہ نہیں | تبسم فاطمہ | =/۶۰ |
| دختر ابلیس | محمد شبیر علی محمدوی | =/۶۰ |
| ڈار سے بچھڑے | سید محمد اشرف | =/۱۲۵ |
| پیاسا سمندر | عقیلہ تبسم | =/۶۰ |
| ادھار کی زندگی | مہر چند کوشک | =/۵۰ |
| کاغذ کی دیوار | محافظ حیدر | =/۸۰ |
| دل کی بات | ڈاکٹر شبیر صدیقی | =/۶۰ |
| بھوکا ایتھوپیا | مشرف عالم ذوقی | =/۱۱۰ |
| گھٹتے بڑھتے سائے | علی امام نقوی | =/۸۰ |
| برزخ | ہاجرہ شکور | =/۶۰ |
| انتخاب افسانہ ۸۹ء | انیس امروہوی | =/۸۰ |
| لمحوں کی قید | کشور سلطانہ | =/۸۰ |
| یاد بسیرے | انور خان | =/۸۰ |

## ناول:

| | | |
|---|---|---|
| ذبح | مشرف عالم ذوقی | =/۹۰ |
| بساط | علی امام نقوی | =/۹۰ |
| یوں بھی کھلے پھول | اقبال دیپ | =/۸۰ |
| بیان | مشرف عالم ذوقی | =/۱۰۰ |
| شہر چپ ہے | مشرف عالم ذوقی | =/۸۰ |
| آخری داستان گو | مظہر الزماں خاں | =/۸۰ |
| نیلام گھر | مشرف عالم ذوقی | =/۹۰ |
| فرات | حسین الحق | =/۱۰۰ |
| پھول جیسے لوگ | انور خان | =/۶۰ |

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092